۶۱۹ شمارہ (۱)

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ — دس روپے
قیمت فی پرچہ — دو روپے ۵۰ پیسے

کتابت ابو طاہر زیدی

سید بنیاد علی پرنٹر و پبلشر نے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر دفتر علی گڑھ سے

اردو ادب

فہرست مضامین

یاس بنتا کہ تمنا کہ تصور احساںؔ   عشق ہر رنگ سے دل میں مرے پنہاں ہوتا

تعداد اشعار (۹) ہے

جناب شیخ فیض الدین صاحب اثرؔ شاگرد جناب احسانؔ شاہجہانپوری

دل تڑپتا کہ مری موت کا ساماں ہوتا   کوئی کاہے کو شریکِ غمِ ہجراں ہوتا

اے اثرؔ خوب جو ہم رات کے مضمون لکھے   بے سبب اور بھی دل میرا پریشاں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب مرزا کاظم علی صاحب اخگرؔ شاگرد جناب جولاںؔ مقیم حیدرآباد

جلوہ گر بام پہ گر وہ مہِ کنعاں ہوتا   کوئی بے خود کوئی ششدر کوئی حیراں ہوتا

جلوہ گر بزم میں اک رات جو ہوتا وہ کبھی   میں بھی پروانۂ شمعِ رخِ جاناں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد احسان اللہ صاحب احسانؔ برادر جناب منعمؔ شاگرد جناب بےریاؔ

آپ کو چاہیے اے حضرتِ زاہد جنت   یاں تو رندوں کے لیے کوچۂ جاناں ہوتا

یوں تو آنے کو اجل آئے گی اک روز ضرور   آج کل ہجر میں آجاتی تو احساں ہوتا

صرف یہ دو شعر ہی درج ہیں

جناب منشی محمد علاءالدین خاں صاحب اخترؔ از مقام شکوہ آباد

تم چمن میں نہ گئے خوب کیا خوب ہوا   نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

چہچہے گلشنِ مدحت میں سناتا سب کو   ہمصفیری میں مری کاش جو حساں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمود حسین صاحب افسرؔ شاگرد جناب حسرتؔ لکھنوی مقیم بڑودہ

سوئے گلشن جو کبھی جوشِ جنوں میں جاتا   نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

تیر پیکانِ جگر دوز جو رہ جاتا کبھی   آرزومند نہ یوں یہ دلِ نالاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب مولوی سید محمد خیرات علی صاحب احقرؔ کمنپوری شاگرد جناب بےریاؔ

غیر کی کیا تاب مشق میں جو خط کرے کر   اے تصور تو رواں جانبِ جاناں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی واجد علی صاحب بسمل کاکوروی شاگرد جناب امیر لکھنوی

کیوں گلہ تیغ کا کیوں شکوۂ پیکاں ہوتا   دل ہی کم بخت اگر قابل مہماں ہوتا
پوچھتا بات اگر خنجر قاتل بسمل   میرے سر کیوں ملک الموت کا احساں ہوتا

تعداد اشعار (۹) ہے

جناب مولوی فیض الحسن صاحب بیزار بجنوری ابن جناب رسا ازبلاسپور

کاش تربت پہ مری آکے وہ گریاں ہوتا   خاک ہی میں کہیں ٹھنڈا دل سوزاں ہوتا
دھجیاں اڑتیں اور اک تار نہ باقی رہتا   دامنِ یار اگر حشر کا داماں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب بیتاب شاہجہانپوری شاگرد جناب صدیق

حشر میں دل کی نکلتیں تری اس دم بیتاب   ہاتھ میں سیدِ مختار کا داماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب ڈاکٹر حتو میاں صاحب تمنا سورتی

خواب میں جلوۂ جاناں جو نمایاں ہوتا   صبح کی طرح نہ میں چاک گریباں ہوتا
رونق افروز اگر وہ مہِ تاباں ہوتا   شمع ساں بزم میں دل کاہے کو گریاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی لالہ سری نواس صاحب تمیز مقیم کوٹھی چلاسنی

ہے غضب وہ شبِ عشرت میں بھی فرماتے ہیں   ہاتھ ہٹا لو کہ مرا دل ہے پریشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد رضا علی صاحب جوہر خلف سید حاجی محمد حاتم علی صاحب متوطن فتحپور

آتشِ ہجر سے جلتا ہوں نہیں بزم میں دخل   خوب ہوتا میں اگر شمع شبستاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب مولوی حافظ سید نذر الرحمٰن صاحب حفیظ عظیم آبادی

لطف تب چاندنی کا اے مہِ تاباں ہوتا   آج کی رات اگر تو مرا مہماں ہوتا
یہ فلک وہ ہے کہ بھولے ہی رلاتا مجھ کو   ایک دن خواب میں بھی گر کبھی خنداں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

لخت دل آنکھ سے بہہ جاتے ہیں خوں ہو ہو کر — ورنہ سینہ بھی مرا گنج شہیداں ہوتا
حسن خالق کو بھی پیارا ہے سمجھ اے زاہد — چاہتا تو بھی حسیں کو جو مسلماں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب رائے اجودھیا پرشاد صاحب زیبا تلمیذ جناب احسان شاہجہانپوری

اے غم یار جو تو آکے نہ مہماں ہوتا — یہ مرا خانۂ دل اور بھی ویراں ہوتا
نام تک شکوۂ دوری کا نہ آتا لب پر — میرے کہنے میں جو زیبا دل ناداں ہوتا

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب بانکے لال صاحب ناسہ بدایونی از چھاتہ شاگرد جناب نیاز خیرآبادی

چھیڑ خوباں سے نہ کرتا دلِ ناشاد اگر — نہ یہ حیراں نہ پشیماں نہ پریشاں ہوتا
دلِ پرسوز کو پامال نہ کرتے جو حضور — کفِ پا میں کبھی چھالا نہ نمایاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب مولوی محمد عبدالمجید صاحب سوختہ گڑھ مکتیسری

بے ترے سیر کو گلشن کی میں جاتا کیونکر — نکہت گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا
جان دینی تھی نہ یوں چوک گیا قیسِ حزیں — خاک ہوتا بھی تو خاکِ درِ جاناں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب سید توکل حسین صاحب سحاب زیدی از شکوہ آباد شاگرد جناب طلسم

چاندنی رات میں گر وصل کا ساماں ہوتا — ہائے کس شوق سے میں یار پہ قرباں ہوتا
حسرتیں اس دلِ شیدا کی نکلتیں کیا کیا — ایک دن یار مرے گھر میں جو مہماں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد سعید خاں صاحب سعید مرادآبادی مقیم بڑودہ شاگرد جناب فدا

دیکھ لیتا تری صورت اگر اے آئینہ رو — صورتِ آئینہ بہزاد بھی حیراں ہوتا
حسرت دل تو نکلتی مری اوس وقت کہ جب — حلق پر میرے ترا خنجرِ براں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب رکن الدین صاحب سلیمان شاگرد جناب احسان لکھنوی

اپنے قابو ہی میں جو یہ دلِ ناداں ہوتا — تو نہ اغماض تمھیں اتنا مری جاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید محمد باقر صاحب شوق ابن سید قاسم علی صاحب رئیس قصبہ کھرڑ

کیا مسیحا ہے تجھے کام تھا اے شوخ اگر — تیرے ہاتھوں سے مرے درد کا درماں ہوتا
دل بہلتا تو کہاں سیرِ چمن سے اے شوق — نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب منشی احمد علی صاحب شوق مالک اخبار آزاد لکھنؤ شاگرد جناب اسیر مرحوم

صدقے کرتا کسی بت پر اگر ایماں ہوتا — آج حسرت ہے کہ میں کاش مسلماں ہوتا
غیر سے شوق جو ملتا وہ تو مرجاتے ہم — یہی ہوتا یہی ہوتا یہی ہاں ہاں ہوتا

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب محمد امیر الحق صاحب شمیم ساکن ضلع دہلی ملازم بھوپال از گڑھی آنبا پانی

گر چمن میں بھی خیالِ رخِ جاناں ہوتا — نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا
جان سینے سے چلی ہمرہِ پیکاں یارب — کاش دل میں مرے کچھ اور بھی ارماں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب کاظم حسین صاحب شیفتہ ساکن کنتور از اطراف لکھنؤ مقیم حیدرآباد

گیسوؤں سے جو نمایاں رخِ تاباں ہوتا — مہر غیرت سے چراغِ تہِ داماں ہوتا
سیکڑوں قول ہیں کچھ یاد ہے او عہد شکن — بھول کر ایک تو پورا کبھی پیماں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب منشی شیخ حسین صاحب شائق ساکن احمد نگر مقیم بھوساول

بزم میں گر وہ اُلٹتے رخِ روشن سے نقاب — کوئی بیدل کوئی مجنوں کوئی حیراں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب مولوی عبد الحق صاحب صفا رام پوری شاگرد جناب جلال لکھنوی

طور پر جلوہ نما خود رخِ جاناں ہوتا — قابلِ دید اگر عاشقِ حیراں ہوتا
اے صفا جان مرے تن سے جدا ہو جاتی — پھر جدا مجھ سے نہ ہرگز غمِ جاناں ہوتا

تعداد اشعار (۱۳) ہے

جناب مولوی قاضی محمد صدیق اللہ صاحب صدیق متوطن جودھپور

غیر کے کہنے سے گر قتل نہ کرتے مجھ کو آپ کا آپ کے بندے پہ یہ احساں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید عباس حسین صاحب طلسم شاگرد جناب تنیر مرحوم

کاش قابو میں ہمارا دلِ ناداں ہوتا دامِ گیسو میں نہ پھنستا نہ پریشاں ہوتا
عیدِ قرباں ہے وہ غیروں سے گلے ملتے ہیں مجھ سے ملتے تو دل و جاں سے میں قرباں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی محمد عبدالباسط صاحب ظہیر مدراسی کلرک ریلوے سپرنٹنڈنٹ آفس بھاول

بزم میں وہ جو اٹھاتا رُخِ روشن سے نقاب کوئی بیخود، کوئی دم بھر ہی کا مہماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب کنور عنایت سنگھ صاحب عنایت رئیس و تعلقدار بریلی

نفع میرا تھا نہ کچھ آپ کا نقصاں ہوتا ایک بوسہ مجھے دے دیتے تو احساں ہوتا
اے عنایتؔ میں بہت شکرِ عنایت کرتا میرے گھر جذبۂ دل سے جو وہ مہماں ہوتا

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب محمد یحییٰ علی صاحب عاصی کاکوروی اہلکار منصفی نگینہ

کیوں کوئی حال ہمارا دیکھ کے خنداں ہوتا آپ ہی حال پہ اپنے جو میں گریاں ہوتا
اللہ اللہ یہ نزاکت جو گلستاں جاتے نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب منشی محمد حسن صاحب عجیب گورکھپوری

مصحفِ رُخ پہ ترے کون نہ قرباں ہوتا بات ایسی تھی کہ کافر بھی مسلماں ہوتا
فیضِ اُستاد نے یہ لطف دکھایا ہے عجیبؔ ورنہ شاعر ہی میں ہوتا نہ غزل خواں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمود حسن صاحب عقیل شاگرد جناب اوج لکھنوی

تو نہ گلشن میں اگر زیبِ گلستاں ہوتا نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا
خوب ہوتا جو مقدر سے یہ ساماں ہوتا تم چھری پھیرتے گردن پہ میں خنداں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی ریاض علی صاحب عاشق از بھوپال

اپنی محفل میں بلاتا وہ اگر عاشق کو — دیکھ کر دل میں عدو خوب پشیماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد خاں صاحب غریب سہارنپوری اہلمد پیشی صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر

داغ دل لالہ و گل میں جو نمایاں ہوتا — ہر شجر باغ میں اک سروِ چراغاں ہوتا

زندگی ہجر میں مشکل ہے مگر کیا کیجے — مرنا دشوار نہیں تھا اگر آساں ہوتا

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب سید ظل حسین صاحب قضا رئیس جلالی شاگرد جناب بقا لکھنوی

اپنے پہلو میں نہ مضطر دلِ نالاں ہوتا — یا الٰہی کوئی اس درد کا درماں ہوتا

اے قضا کیفیت بادہ کشی تھی اس دم — ابر تر ہوتا وہ گل ہوتا، گلستاں ہوتا

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب شیخ عبداللہ صاحب فصیح از چاندپور ضلع بجنور

دل کو میرے جو نہ عشقِ رخِ جاناں ہوتا — اس قدر وہ بتِ مغرور نہ نازاں ہوتا

کیا مزا ہوتا شبِ وصل جو ہنگامِ سحر — ہاتھ ہوتا مرا اور یار کا داماں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب خلیفہ فیض بخش صاحب فیضی سردھنوی شاگرد جناب داغ دہلوی

قتل کرتا جو وہ قاتل مجھے اک بار تو میں — اے اجل کیوں ترا شرمندۂ احساں ہوتا

دیر ہوتی تو مرا شوقِ شہادت فیضی — ابھی قاتل سے بہم دست و گریباں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی فدا حسین صاحب فدا خیرآبادی وارد حیدرآباد

یار جھوٹوں جو مرے حال کا پرساں ہوتا — حشر میں سر نہ اٹھا سکتا وہ احساں ہوتا

دل تو پامال کیا آپ نے غصے سے مرا — اور اس میں جو کوئی آپ کا ارماں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب ہرگوبند صاحب توفیق سررشتہ دار محکمہ جنگل ریواں

جلوہ گر بام پہ گر وہ مہِ تاباں ہوتا — چاند اک اور نیا چرخ نمایاں ہوتا

کھینچ کر تیغ ڈراتے تو ہو صاحب ہر روز   امتحاں بھی تو کسی دن سر میداں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب فدا حسین صاحب فدا مختار کار ملازمی اسٹیٹ سکیٹیلی

جان جاتی نہیں پورا نہیں ارماں ہوتا   آتی اس وقت میں اے موت تو احساں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عبد القادر صاحب قادر احمد نگر آبادی مقیم بھوساول شاگرد جناب مضطر

زیست کا ہوتا اگر کچھ بھی بھروسا قادر   چاک کیوں صورت لالہ اپنا گریباں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد شاہ خاں صاحب کاوش رام پوری شاگرد جناب جلال لکھنوی

سیر تھی کوئی حسیں اور جو خواہاں ہوتا   دل مرا پھیر کے کہا کیا وہ پشیماں ہوتا

جس بہ یزاد کو دل تو نے دیا ہے کاوش   قدر کرتا وہ تری کچھ بھی جو انساں ہوتا

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب پنڈت برج کشن صاحب کول کیفی دہلوی

چاک کیا کرتے جو باقی نہ گریباں ہوتا   اشک کیا پوچھتے ثابت جو نہ داماں ہوتا

میں ہی کیفی تھا لڑے خوب ہی آنکھیں ان سے   کیا میں آئینہ تھا جو دیکھ کے حیراں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب منشی محمد کریم بخش صاحب کریم وکیل عدالت فتحپور

باغ میں گر نہ مرا رشک گلستاں ہوتا   نکہت گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب امیر محمد خاں صاحب گرامی شاگرد جناب نامی لکھنوی

کہیں آجاتے اگر مصر کے بازار میں تم   ٹکے ٹکے داموں کوئی یوسف کا نہ خواہاں ہوتا

کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا اس نے   اس سے بہتر تھا گرامی نہ مسلماں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب مولوی ممتاز احمد صاحب ممتاز رفیق نواب ذوالفقار علی خاں رئیس سورت

بخت برگشتہ سے وہ موت کا ساماں ہوتا   وعدۂ مرگ ترے وصل کا پیماں ہوتا

دل لگاتا نہ بتوں سے نہ پشیماں ہوتا ۔۔۔ ہائے ممتاز نے مانا نہ ہمارا کہنا

تعداد اشعار (۱۰) ہے

جناب حکیم میر احمد علی صاحب مسیحا حیدرآبادی شاگرد جناب احسان شاہجہانپوری

نام کیوں میرا مریض غم ہجراں ہوتا ۔۔۔ بر سر زخم جو وہ عیسیِ دوراں ہوتا

آج پھر مجمعِ عشاقِ پریشاں ہوتا ۔۔۔ تم نے کیوں آکے سرِ بزم نہ گیسو کھولے

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب محمد منظور احمد صاحب منظور بدایونی مختار شکوہ آباد شاگرد جناب داغ

اور مرے ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہوتا ۔۔۔ کاش گلزار میں وہ سروِ خراماں ہوتا

نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا ۔۔۔ سیرِ گلشن کو نہ منظور گئے، خوب ہوا

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب محمد مستجاب اللہ خاں صاحب مقبول لونوی ضلع علی گڑھ

اپنے آغوش میں وہ رشکِ گلستاں ہوتا ۔۔۔ یا الٰہی کبھی پورا مرا ارماں ہوتا

دہنِ زخم میں مقبول جو پیکاں ہوتا ۔۔۔ قصۂ شوق سنانے کو زباں بن جاتا

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب کنج بہاری لال صاحب مسکینؔ خلف لالہ لچھمن پرشاد صاحب متوطن قصبہ سدھو

گھر مرا رشکِ دہِ بزمِ سلیماں ہوتا ۔۔۔ رونق افروز جو تو اے شہِ خوباں ہوتا

میرے کہنے میں اگر یہ دلِ ناداں ہوتا ۔۔۔ مبتلا درد و مصیبت میں نہ ہوتا مسکیںؔ

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب شیخ مظہر علی صاحب مظہر لکھنوی شاگرد جناب ہمت لکھنوی

شمع رو شکل پہ تیری نہ میں قرباں ہوتا ۔۔۔ آہ قابو میں جو اپنا دلِ ناداں ہوتا

آج پھر بوسہ کا تو مجھ سے ہے خواہاں ہوتا ۔۔۔ ہنس کے فرماتے ہیں کل کھائی ہے منھ کی تم نے

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب منشی محمد عبدالمجید صاحب مجید کھیرتیوری ملازم فوجداری ضلع علی گڑھ

تھا جو مرنا مجھے دشوار وہ آساں ہوتا ۔۔۔ تم دمِ نزع جو آتے تو یہ احساں ہوتا

میرے قابو میں جو میرا دلِ ناداں ہوتا ۔۔۔ بھول کر بھی نہ قدم کوئے بتاں میں رکھتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب منشی سید سعد الدین صاحب محو جلیسری تلمیذ حضرت داغ دہلوی

کبھی جھالا جو مرا وہ گلِ خنداں ہوتا رشکِ گلزارِ ارم خانۂ ویراں ہوتا

یاد رخسار میں عاشق کو پڑھنا ہردم حضرت محو جو ہیں حافظ قرآں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد عبد الواحد صاحب محزون ساکن تھانہ بھون محرر جوڈیشل گوڈاور

رونق افزا جو کبھی وہ گلِ خنداں ہوتا رشکِ گلزارِ ارم کلبۂ احزاں ہوتا

ہجر میں سیرِ چمن سے مجھے ہوتی وحشت نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی لالہ پورن لال صاحب ممتاز شاگرد جناب احسان مکنپوری

گر نہ سودائے رُخِ گیسوئے جاناں ہوتا یوں دلِ زار نہ حیراں نہ پریشاں ہوتا

حال ممتاز کا مجنوں بھی نہ پوچھا تم نے یہی انداز محبت کا ہے اے جاں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد اسحاق خاں صاحب مائل از قصبہ برلہ

جلوہ فرما جو لبِ بام وہ جاناں ہوتا کوئی بے خود کوئی ششدر کوئی حیراں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سورج بھان صاحب مضطر شاگرد جناب پیرجی ماجد علی صاحب تجانوی

یہی ہوتا جو گذر سوئے گلستاں ہوتا نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب حافظ محمد منظور الدین صاحب منظور تعلیم ریاست [illegible]

آہ کی شعلہ فشانی تمھیں کیا دکھلاؤں [illegible] سوزاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی محمد عبد المجید صاحب [illegible]

[illegible]

صرف یہی (۱) اشعار درج ہیں

جناب عبدالغفار خاں صاحب ناطق ساکن مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد

پیکش اُس کے کباب دل بریاں ہوتا ۔۔۔ غم دلدار کبھی آ کے جو مہماں ہوتا
پوری ہوتی جو تمنائے شہادت ناطق ۔۔۔ سجدۂ شکر تہ خنجر بُراں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب محمد نظیر صاحب نظیر وکیل فتحپور

زاہد آتا تو جو مرا دل بھی کسی کافر پر ۔۔۔ تو یہ نہ زہد نہ تقوی نہ یہ ایماں ہوتا
کاش کام آتی خجالت ہی دم حشر نظیر ۔۔۔ ڈوبتی کشتی عصیاں جو میں گریاں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب سکھدیو پرشاد صاحب نود انوپ شہری ماسٹر اسکول بھرتپور

درد الفت جو ترا ساتھ نہ ہوتا ظالم ۔۔۔ کاروان دل کا مرے بے سروساماں ہوتا
تپش دوری دلبر نہ جلاتی دن رات ۔۔۔ شعلۂ عشق جو سینے میں نہ پنہاں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب محمد شفیع صاحب ناظم سب اورسیر مین پوری

ساتھ اپنے نہ اگر وہ گل ریحاں ہوتا ۔۔۔ نکہت گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا
شیخ تو کیا ہیں خدا کی بھی نہ سنتا ناظم ۔۔۔ اپنے پہلو میں اگر وہ بت ناداں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب مولوی سید نوازش صاحب نوازش مونگیری

عمر بھر دشت جنوں سے نہ نکلتے باہر ۔۔۔ یہ بیاباں ترے دیوانوں کا زنداں ہوتا
ہائے کیوں چھوڑا نوازش نے در پیر مغاں ۔۔۔ یاں جو رہتا تو وہ کم بخت مسلماں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب سید نظیر حسین صاحب نظیر خلف سید وزیر حسین صاحب سب جج رائے بریلی

کیوں ارمان مرے دل سے نکلتے اے چرخ ۔۔۔ ایک شب بھی جو مرے گھر میں وہ مہماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب میاں ناصر خاں صاحب ناصر بنگلوری شاگرد جناب میر فیاض علی صاحب

تم نہ دریا میں اگر دست حنائی دھوتے کہو پانی میں کہاں پنجۂ مرجاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب قاضی محمد ولی الحق صاحب ولی ردولوی انسپکٹر سرشتہ پارٹی چہارم

روز کرتے ہو نیا وصل کا وعدہ مجھ سے کبھی تو پورا تو کبھی آپ کا پیماں ہوتا

میں نے وہ خاک اڑائی ہے بیابانوں کی دیکھتا قیس تو انگشت بدنداں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب قاضی وحید الحق صاحب وحید ردولوی خلف قاضی ظہور الحق صاحب

ہجر کی شب جو خیال رخ جاناں ہوتا داغ فرقت کا قمر بن کے درخشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب پنڈت مصر بہاری لال صاحب وفا شاگرد جناب احسان لکھنوی

بھول کر بھی نہ کوئی نام محبت لیتا بے وفا تم سا جو ہر ایک مری جاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عبد الغفور صاحب یتیم نیٹو ڈاکٹر جیل گونڈہ

بزم دلبر میں میں جاتا جو یہ ساماں ہوتا تخت دل ہاتھ میں اور چاک گریباں ہوتا

ہاں مجھے چین جب ہی اے دل نالاں ہوتا آکے مہماں جو ترا یار کا پیکاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد یوسف صاحب یوسف ولد شیخ قاسم صاحب سالدار پونہ

دیکھ لیتا جو کبھی حسن خداداد ترا صدقے سو بار ترے مہر درخشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عاشق صاحب یاس ایرانی نژاد کنٹریکٹر کیمپ جالندھر

ہم سکھلاتے نہ اگر تجھ کو یہ ناز و انداز کوئی بھی تیرا خریدار نہ اے جاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید ذاکر حسین صاحب یاس لکھنوی شاگرد جناب جلال لکھنوی

کون لیتا یہ بلا کون پریشاں ہوتا عشق گیسو میں وہ پھنستا کہ جو ناداں ہوتا

ہجر میں دل کی لگی کو مری ہوتی تسکیں مہرباں مجھ پہ اگر دیدۂ گریاں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب غلام عبدالقادر صاحب آمیرؔ میونسپل کمشنر ترکیڑہ شاگرد جناب نسیمؔ

یاد میں اس یم خوبی کے جو گریاں ہوتا میرے اشکوں سے بپا خلق میں طوفاں ہوتا

اس پہ یزداں سے ہو جاتا اگر وصل آمیرؔ آج میں اپنے تصور میں سلیماں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب منشی محمد کبیر صاحب تحصیل بنگلوری حال مقیم ترکیڑہ

چاک ہاتھوں سے مرے دامن عصیاں ہوتا کاش صحرائے جنوں حشر کا میداں ہوتا

باندھتے زلف پریشاں کے جو مضموں تحصیلؔ جمع ہرگز نہ کبھی آپ کا دیواں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب محمد سعید صاحب اثیرؔ و خوشترؔ مچھلی شہری از گورکھپور

گر نہ ہمراہ مرے وہ گل خنداں ہوتا نکہت گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

کاش وہ سیر ہی کرتے کبھی اس کی آکر کثرت داغ سے سینہ جو گلستاں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب خواجہ محمد عبدالصمد خاں صاحب خواجہ جاگیردار پرگنہ ناہن تعلقہ اکولہ

سیج پھولوں کی شب ہجر بچھاتے لیکن نکہت گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

ابروئے یار سمجھ کر نہ تڑپتا دم ذبح دست قاتل میں اگر خنجر براں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد الہ داد خاں صاحب رنجورؔ محرر پولیس چھاتہ ضلع متھرا

پیار سے آکے مرا حال کبھی پوچھتا گر تو دل و جاں سے میں اس شوخ پہ قرباں ہوتا

موت آئی ہوئی بالیں سے مرے پھر جاتی آج رنجورؔ جو وہ عیسیٔ دوراں ہوتا

تعداد اشعار (۴) ہے

جناب پنڈت جگموہن ناتھ صاحب شوقؔ از اندور

فصل گل میں مجھے سودے کی جو شدت ہوتی پھر نہ دامن مرا ہوتا نہ گریباں ہوتا

؎ غزلیات ذیل دیر میں موصول ہونے سے بے ترتیب درج ہیں۔

رنج و غم درد و الم جمع تھے دل میں میرے   کس طرح چین بھلا پھر شب ہجراں ہوتا

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب بالکرشن صاحب قمر خلف بادے لال صاحب شاگرد جناب بیخود [illegible]

خانۂ دل میں نہ ہوتی اگر اتنی وسعت   یہاں کون سے گھر میں غم جاناں ہوتا
کیا کہیں بھول گئے عشق نہ کرنا تھا ہمیں   کام پہلے سے وہ کرتے کہ جو آساں ہوتا

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد فاضل صاحب صنم ساکن کمپ ہو ضلع اندور

نالۂ بلبل شوریدہ سے ہوتی وحشت   نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی عبدالغفور خاں صاحب عاجز مدرس فارسی اسکول بھرتپور

تو جو غیروں سے مرے سامنے خنداں ہوتا   حشر کو ہاتھ مرا تیرا گریباں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب عزیز احمد صاحب عزیز از مقام شکوہ آباد

بے ترے سیرِ گلستاں کو اگر میں جاتا   نکہتِ گل سے دماغ اور پریشاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید شاہ فدا حسین صاحب فدا شاگرد جناب کیفی بہاری

کل کا وعدہ تھا مگر یار کا احساں ہوتا   آج ہی سے جو مرے گھر میں وہ مہماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمود بیگ صاحب ممتاز ملازم کلب کوئٹہ

نامہ بر تو جو مرے یار کی لا دیتا خبر   دل و جاں سے میں ترا بندۂ احساں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب راج نراین صاحب نظیر پسر رائے کشن صاحب تحصیلدار مہراج گنج

حالتِ نزع میں آ جاتے تو احساں ہوتا   زندگی کا کوئی دم اور بھی ساماں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی خواجہ نظام الدین صاحب نظام لکھنوی

وہ زلیخا کی طرح آپ پہ قرباں ہوتا　　اس زمانے میں اگر یوسف کنعاں ہوتا

صرف یہی ایک شعر درج ہے

اس کے بعد بعنوان "غزلیاتِ غیر طرح" چند شعراء کی غزلیات ہیں۔ شاعر کا نام مع تخلص اس کی غزل کا پہلا اور شعر نیز تعداد اشعار حسب ذیل ہے:۔

جناب کھڑک سنگھ صاحب حبیب رفیق جناب ملک سیالکوٹی

گر کوئی مژدہ لائی ہے تو صبا　　یوں سنا کوئی دوسرا نہ سنے

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید محمد باقر صاحب شوق ابن سید قاسم علی صاحب رئیس قصبۂ کھرڑ

کشتۂ ناز کا تنِ بے جاں　　اس طرح سے اٹھے صبا نہ سنے

ایک جان اور مصیبتیں بے حد　　کیا سنے میری کوئی کیا نہ سنے

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب حافظ رحیم بخش صاحب اخگر شاگرد جناب بسمل خیرآبادی

آجائیں سرِ شام ہی وہ خود مرے گھر آج　　دکھلا دے تو اے آہ مجھے اتنا اثر آج

بیتاب ہوئے جاتے ہو کیوں حضرتِ اخگر　　آجائیں گے وہ شام تلک آپ کے گھر آج

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب شیخ فدا حسین صاحب فدا از کوٹھی چلاسنی

فدائے زلف ہوں ہے کیا تعجب　　اُگے سنبل جو مرقد کی زمیں سے

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی محمد قادر علی صاحب قادر از کانپور

مہمان کوئی دم کا ہے بیمارِ محبت　　تم نے اسے اے عیسیٔ دوراں نہیں دیکھا

خوں حسرتیں ہوتی رہیں یاں دل کی ہمیشہ　　پورا کبھی ہوتا کوئی ارماں نہیں دیکھا

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب مولوی محمد عبدالحی صاحب نجم بدایونی وکیل شاہجہانپور

کیا خیالِ رُخِ گلگوں دلِ پُر غم میں رہے　　کبھی جنت کو سنا ہے کہ جہنم میں رہے

راحت و رنج دو عالم کی خبر کیا ... [illegible] معلوم نہیں کون سے عالم میں ہے

تعداد اشعار (۹) ہے

اس کے بعد بعنوان "اطلاع" یہ عبارت درج ہے

"پرچہ پہنچتے ہی فوراً اس طرح میں (سایے کی طرح ہم پس دیوار رہے ...) غزلیات بھیجنا چاہئیں، ذیل میں ۲۰ اگست تک۔ ورنہ درج ہونے سے رہ جائیں گی۔

میں بھی ایسا انھیں چھیڑوں کہ بہت یاد کریں۔ یاد قافیہ

"ٹائیٹل پیج کا آخری ورق غائب ہے اس لیے اس کی تفصیلات دینے سے قاصر ہوں۔ پیام یار علاوہ ٹائیٹل پیج ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ مناسب اور طباعت و کتابت بھی خاصی اچھی ہے۔

اگست اور ستمبر ۱۸۸۵ء کے شمارے میرے پاس یہاں نہیں ہیں۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء کی تفصیلات یہ ہیں:

پیام یار بابت اکتوبر ۱۸۸۵ء

سرورق کی ترتیب اور عبارت بالکل وہی ہے جو پیام یار[1] بابت ماہ مئی ۱۸۸۵ء میں بیان کی گئی ہے ماہ مئی کی جگہ ماہ اکتوبر درج ہے اور نمبر ۵ کی جگہ نمبر ۱۰۔

سرورق کے اندرونی صفحہ کی ترتیب و عبارت بھی وہی ہے جو پیام یار بابت ماہ مئی ۱۸۸۵ء کے میں ظاہر کی گئی ہے۔

صفحہ (۱) پر حسب معمول جلی حروف میں "مصرع طرح پیام یار" تحریر ہے اور اس کے نیچے مصرع "سر پٹکتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو" درج ہے۔ اس کے بعد شریک گلدستہ شعرا کی غزلیات درج ہیں۔ ہر شاعر مع تخلص۔ اس کی غزل کا پہلا اور آخری شعر اور تعداد اشعار حسب ذیل ہے:۔

جناب احسان علی خاں صاحب احسان شاہجہانپوری شاگرد جناب جلال لکھنوی

ناخوش مرے تڑپنے سے اے تند خو نہ ہو — کیوں کر قرار آئے جو پہلو میں تو نہ ہو

احسان کیا ستم ہے کہ جھنجلا کے وہ کہیں — ہاں ہاں رقیب ہو مری محفل میں تو نہ ہو

تعداد اشعار (۱۱) ہے

---

[1] دیکھئے "اردو ادب" شمارہ ۲ بابت ۱۹۶۲ء ص ۲۴-۲۵۔

جناب منشی اشرف علی صاحب اشرف لکھنوی شاگرد جناب نسیم دہلوی مغفور

دم بھر جدا کبھی وہ بتِ ماہ رو نہ ہو / یہ چرخ فتنہ ساز مرا گر عدو نہ ہو

اُن جاہلوں کی بزم میں جانے سے فائدہ / اشرف دُرِ سخن کی جہاں آبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب شیخ فیض الدین صاحب اثر شاہجہانپوری شاگرد جناب احسان شاہجہانپوری

میں خاک اُڑاؤں دشت کی پرساں ابھی تو نہ ہو / برباد یوں غریب کوئی کو بہ کو نہ ہو

تنگ آگیا ہوں رنجِ رقابت سے اے اثر / اب یہ دعا ہے کوئی کسی کا عدو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب میر محمد ذکی صاحب الم لکھنوی شاگرد جناب مونس مغفور لکھنوی

دشمن ہو کل جہان اگر دوست تو نہ ہو / اے دوست تو ہو دوست تو کوئی عدو نہ ہو

یارب الم کی طرح بتوں کی تلاش میں / رسوا ذلیل و خوار کوئی کو بہ کو نہ ہو

تعداد اشعار (۸) ہے

جناب منشی محمد علاؤالدین خاں صاحب اختر شکوہ آبادی شاگرد جناب رسا

عشقِ رسولِ پاک کی کم آرزو نہ ہو / جز کوئے مصطفےٰ مجھے کچھ جستجو نہ ہو

پھر جائے بعد مرگ بھی آکر نہ وہ صنم / سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب حافظ محمد ابرار عالم صاحب ابرار فتحپوری شاگرد جناب مسیر فرخ آبادی

پیرِ مغاں سے سلسلہ ملنا محال ہے / جب تک نصیبِ بیعتِ دستِ سبو نہ ہو

بدنام ہوں گے آپ زمانہ کہے گا کیا؟ / دامن تو دیکھیے کہیں میرا لہو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب مرزا قاسم علی بیگ صاحب آخگر بہادر شاگرد جناب جولاں از حیدرآباد

آئیں جو تیرے کوچۂ رشکِ بہشت میں / جنت کی زاہدوں کو کبھی آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب احمد حسین خاں صاحب احمد از جھالاواڑ شاگرد جناب جاوید رامپوری

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو تری جستجو نہ ہو / تڑپے وہ دل کہ جس میں تری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید امیر علی صاحب اثر عرائض نویس تحصیل شکوہ آباد

کچھ ایسا تیرے روضۂ انور کا شوق ہے — جنت بھی گر ملے تو مجھے آرزو نہ ہو
ہے التجا اثر کی شب و روز اے رسولؐ — تیرے سوا کسی کی مجھے آرزو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب شیو پرشاد صاحب اسیر نائب رجسٹرار قانون گو تحصیل مصرکھ

ارمان دل کے دل میں رہے اپنے کیا عجب — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید اظہر حسین صاحب اظہر ساکن چھپرہ ضلع سارن

اظہر ہمیشہ کرتا ہے تو مدحِ پنجتن — شہرہ ترے کلام کا کیوں چار سو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد اسد اللہ خاں صاحب اسد شاگرد جناب رسا از شکوہ آباد

شرمندہ آج مجھ سے مری آرزو نہ ہو — کوئے صنم کو جاتا ہوں یارب عدو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیخ اولاد حسین صاحب اول فتحپوری شاگرد جناب عاشق چھپروی

زیرِ نقاب جو رخِ خورشید رو نہ ہو — آئینہ کیا ہے ماہ کبھی روبرو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیخ محمد امداد علی صاحب امداد داروغہ ساکن غیرت گنج علاقہ بھوپال

امداد دی ہے جانِ حزیں ہجرِ یار میں — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب بیتاب متوطن ضلع شاہجہانپور شاگرد جناب داغ

یارب کوئی زباں پہ مری گفتگو نہ ہو — جز عشقِ مصطفےٰ کے کوئی آرزو نہ ہو
وہ جان و دل کوئے کے بیٹھے ہیں کنارہ کش — ایسا جو مال جائے تو کیوں جستجو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب منشی سید عابد حسین صاحب بیدلؔ ساکن نہٹور ضلع بجنور مقیم جودھپور

جل جائے دل وہ شعلۂ نارِ جحیم سے ۔۔۔ عشقِ رسولِ پاک کی جس دل میں بو نہ ہو

مانع حیا ہے سامنے آنے سے جو تمہیں ۔۔۔ پردے سے کچھ کلام ہو گر دو بدو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب بابو بختاور سنگھ صاحب بختؔ خزانچی ہمراہی بونڈری کمیشن افغانستان

اپنی جفا پہ کاش نہ ہوتے وہ منفعل ۔۔۔ شاید کہ اب نظر بھی کبھی روبرو نہ ہو

برباد جیسا بختؔ کمیشن کے ساتھ ہے ۔۔۔ آوارہ اس طرح سے کوئی کو بہ کو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب سید حشمت علی صاحب بیکسؔ ساکن ضلع مرادآباد مقیم نظامت مانگرول

محشر بپا ہے گورِ غریباں میں چار سو ۔۔۔ سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

اتھوں اچھل رہا ہے کلیجہ فراق میں ۔۔۔ پہلو میں اس کے آج ہمارا عدو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب عبدالرزاق صاحب بہارؔ حکیم آبادی ضلع چھپرہ

آتی ہے کس کے نالہ و فریاد کی صدا ۔۔۔ سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد یوسف خاں صاحب تشنہؔ بلند شہری شاگرد جناب ذوقؔ مرحوم

وہ چیرتے ہیں دل کو مرے اس گمان پہ ۔۔۔ اس میں بھرا ہوا کہیں رشکِ عدو نہ ہو

تنہا کبھی نہ اٹھوں گا میں ان کی بزم سے ۔۔۔ جب تک ہجوم یاس مرے چار سو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب سید عبدالعلی معروف بہ نواب عبداللہ صاحب تسکینؔ ہاپوڑی از بچھراؤں

پابندِ زلف اے دلِ پر آرزو نہ ہو ۔۔۔ ظالم خدا کے واسطے دیوانہ تو نہ ہو

زلفِ پری رُخاں کا عبث ہے تجھے خیال ۔۔۔ تسکینؔ دیکھ اس میں گرفتار تو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب منشی سری نواس صاحب تمیزؔ زمیندار جلاسنی ضلع ایٹہ

ذلت نہ ہو اٹھاؤں نہ جور و ستم کبھی ۔۔۔ پہلو میں میرے اے دلِ ناداں جو تو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی تفضل حسین صاحب تفضل ناظر کلکٹری مین پوری

چھیڑا گئی ہے آج بہت گرد باد میں | تربت پہ خاک اڑاتی مری آرزو نہ ہو
ہم کو بھی تم سے ملنے کی خواہش نہیں رہی | اچھا نہیں ہے تم میں وفا کی جو خو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب حکیم میر ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

تصویر تیری سامنے ہو اور تو نہ ہو | پھر ہم سے کیوں اشاروں میں کچھ گفتگو نہ ہو
ناصح سا دوست عشق بتاں میں کہاں جلال | یعنی عدو بنانے سے بھی جو عدو نہ ہو

تعداد اشعار (۱۵) ہے

جناب محمد عمر صاحب جنوں ابن مولوی محمود میاں صاحب وکیل عدالت منگلور

کیوں خفتگان خاک میں اک شور ہے بپا | سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو
کوٹھے پہ تم چڑھو تو خجالت سے چاند بھی | چھپ جائے زیر ابر کبھی روبرو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب مشتاق مجتبیٰ صاحب جنوں امروہوی شاگرد جناب شاعر

شہرہ جوان کے حسن و ادا کا ہے جا بجا | چرچا ہمارے عشق کا کیوں کو بہ کو نہ ہو
کس کا گلا جنوں یہ مقدر کا ہے لکھا | پہنچے عدو تو بزم میں اور حیف تو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب بابو سید محمد علی صاحب جوش کلرک محکمۂ انجینیری ریاست جھالاواڑ

کہتے ہیں جس کو عشق وہ جلوہ ہے حسن کا | گر یہ نہ ہو تو اس کی کہیں جستجو نہ ہو
جس حسن دلفریب کا عالم میں شور ہے | رو پوش دل میں جوش وہی خوبرو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب شاہزادہ صاحب عالم مرزا رحیم الدین صاحب حیا دہلوی

الفت نہ ہو بتوں کی کوئی آرزو نہ ہو | پہلو میں گر مرے دل بیتاب تو نہ ہو
لطف شب وصال تو جب ہے کہ اے حیا | معشوق زود رنج نہ ہو تند خو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب منشی میر ولایت حسین صاحب حقیر ردولوی شاگرد جناب فائز

اک حشر اور حشر میں ہو جائے گا بپا	بہتر ہے وہ کسی کے اگر رو برو نہ ہو
سینہ ورکا ہے خلق کو جس پر گماں حقیر	قاتل کے سر چڑھا یہ کسی کا لہو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب مولوی حافظ سید ندمالرحمٰن صاحب حفیظ عظیم آبادی

انسان کو کسی کی اگر جستجو نہ ہو	آوارہ اسے حفیظ وہ پھر کو بہ کو نہ ہو
دیکھے یہ چاند سا ترا چہرہ جو ماہتاب	پھر حشر تک یقیں ہے ترے رو برو نہ ہو

تعداد اشعار (۲) ہے

جناب منشی اولاد علی صاحب حسرت خیرآبادی اہلمد ڈاک گڈھی انباپانی

گر چشم و دل میں یار رہے تو ہی جلوہ گر	امید کچھ نہ ہو مجھے کچھ آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیودیال صاحب خادم خلف جناب بیہوش وکیل لکھنؤ

معشوق کیا کہ حسن ہی ہو نیک خو نہ ہو	گل کیا کہ جس میں رنگ ہی ہو اور بو نہ ہو
گردش میں مہر و مہ ہیں مری طرح روز و شب	ان کو بھی یار تیری کہیں جستجو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی

محشر میں اور ان سے مرے دو بدو نہ ہو	کہنے کی بات ہے جو کوئی گفتگو نہ ہو
اے داغ آ کے پھر گئے وہ اس کو کیا کریں	پوری جو نامراد تری آرزو نہ ہو

تعداد اشعار (۱۲) ہے

جناب حکیم احمد حسین صاحب دانش شاگرد جناب احسان شاہجہانپوری

وعدے کی شب بھی مہندی لگانے کا عذر ہے	معشوق تیری طرح کوئی حیلہ جو نہ ہو
اچھا نہیں ہے دیدۂ تر سے مقابلہ	اے ابر میرے سامنے بے آبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب نواب مہدی حسن خاں صاحب رفعت لکھنوی شاگرد جناب جلال لکھنوی

راحت ہوائے فلک جو مرے سر پہ تو نہ ہو	پھر دوست کے سوا کوئی میرا عدو نہ ہو

رفعت کو تم نے بوسہ دیا آگے غیر کے — کاٹو تو مارے شرم کے اس میں لہو نہ ہو

تعداد اشعار (۹) ہے

جناب بھگوان سہائے صاحب روح ساکن قصبہ کوٹل

تسکین کس طرح ہو دلِ بے قرار کی — جب تک کوئی حسین مرے روبرو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد حیات بخش صاحب رسا اہلکار مصطفےٰ آباد شاگرد جناب داغ

جس میں برائے نام بھی الفت کی بو نہ ہو — وہ بہشت ہو تو مجھے آرزو نہ ہو

تجھ پہ رسا بتوں نے ہزاروں ستم کیے — افسوس ہے کہ پھر بھی خبردار تو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب محمد اکبر خاں صاحب رہبر محرر جنگی قصبہ نربدابن

اے قبر پاسِ خاطرِ مہماں ضرور ہے — اس درجہ دیکھ میرے لیے تنگ تو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عبدالرزاق صاحب راجی میر مدرس مدرسۂ مینپور

امیدیں دل کی ساری ہوئیں یاس سے بدل — اب آرزو یہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب بندہ علی خاں صاحب زیبا لکھنوی شاگرد نواب محمد حسن خاں صاحب شیدا

دل بھی نہ ہو کسی کی اگر آرزو نہ ہو — کس کام کا وہ گل ہے کہ جس گل میں بو نہ ہو

کس ناز سے وہ کہتے ہیں آئینہ توڑ کر — زیبا یہی ترا دلِ پُر آرزو نہ ہو

تعداد اشعار (۱۰) ہے

جناب منشی سید یعقوب علی صاحب سید گرداور قانون گوئے غیرت گنج بھوپال

واعظ وہ بزم تم کو مبارک رہے جہاں — ساقی نہ ہو، شراب نہ ہو اور سبو نہ ہو

دھوکا ہوا یہی مجھے آوازِ صور پر — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد محسن صاحب سحر خلف منشی محمد مبارک علی صاحب تحصیلدار پروہ

عاشق کو راہِ عشق میں حسنِ طلب ہے شرط — بے سود وہ نماز ہے جو باوضو نہ ہو

اب کے بہار آئے تو اے پنجۂ جنوں — جامہ دری ہوا یسی کہ ممکن رفو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب مالک رام صاحب سالک محافظ دفتر مجالا ادشاگرد جناب جاوید

دل بلبلوں کا کھینچ سکیں کیا مجال ہے — جب تک گلوں میں تیرے پسینے کی بو نہ ہو

کہنے کو یوں تو آپ کے لاکھوں ہیں سرفروش — لیں امتحاں حضور تو اک سرخرو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب رحمت حسین خاں صاحب ستم محرر صدر دفتر عبرت پور

اک زلزلہ ہے قبر میں میری یہ کیا سبب — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیخ سرفراز علی صاحب سرفراز شاگرد جناب ہمت لکھنوی

پوشیدہ گر گلوں میں محبت کی بو نہ ہو — وصلت کی بلبلوں کو کبھی آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید ولایت احمد صاحب شمیم سب انسپکٹر کلوا شاگرد جناب امیر لکھنوی

پھوٹے وہ آنکھ جس میں کہ اے یار تو نہ ہو — ٹوٹے وہ دل کہ جس کو تری آرزو نہ ہو

اللہ رے نخوت اس بت یکتا کی اے شمیم — قد غن ہے آئینہ بھی مرے روبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۹) ہے

جناب منشی محمد امیر الحق صاحب شمیم متوطن مضافات دہلی از گڈھی آبنا پانی

غارت وہ دل ہو درد کی جس دل میں خو نہ ہو — پھوٹے وہ آنکھ جس کے کوئی روبرو نہ ہو

ٹوٹے ہوئے وہ تیغ دو دم پھر رہا ہے آج — میری ہی ہائے اس کو کہیں جستجو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب خواجہ محمد باقر صاحب شیدا لکھنوی

غم کا مشیر کار جو اے درد تو نہ ہو — گھٹ گھٹ کے یوں کسی کا کلیجا لہو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید کاظم حسین صاحب شگفتہ ساکن کنتور از اطراف لکھنؤ مقیم حیدرآباد

وحشت میں اے جنوں کہیں طوق گلو نہ ہو — پڑ جائے ہو اس طرح کہ گریباں رفو نہ ہو

یہ خون شیفتہ بے دیکھا ہے کا اپنا رنگ   لے ترک شوخ اور کسی کا لہو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب مرزا محمود شاہ صاحب شاکر گورگانی مدرس مدرسہ دہلی

حسب مراد کام ہزاروں بنیں مرے   گر یار تجھ میں ایک بگڑنے کی خو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی مادھولال صاحب شوخ از گورکھ پور

ارماں اگر جہاں کے بھرے ہوں تو کچھ نہیں   دل میں وصال یار کی گر آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب لالہ گنپت رائے صاحب شعلہ رئیس شکوہ آباد

ہے اشتباہ دست حنائی کو دیکھ کر   اس میں کسی شہید جفا کا لہو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب بابو محمد حسین صاحب شائق ڈیسپیچنگ ایکٹر دکلرک ڈاکخانہ سفری انبالہ

اتنا کہاں دماغ جو ناصح سمجھ سکے   سینے میں جب کہ دل ہو تو کیوں آرزو نہ ہو

اے جان آپ کے لب جاں بخش کا مریض   مرجائے پر مسیح سے بھی چارہ جو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد عمر صاحب شفا رئیس اعظم مچھلی شہر

کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو   انساں نہیں وہ جس کو تری جستجو نہ ہو

چاروں طرف ہے ایک ترے دم کی روشنی   اندھیر ہے جو بزم میں اے شمع تو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب اکھوری پربھو نرائن صاحب صادق مختار رانچی

کہتے ہیں شورِ حشر ہے. پر مجھ کو ہے گماں   سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

دیکھو تو بوسے لیتے ہیں جھک جھک کے کس کے وہ   تصویر اُن کی آئینہ میں روبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب صولت حسین صاحب صولت خلف و شاگرد جناب نوازش مونگیری

دامن پہ آسماں کے یہ رنگ شفق نہیں   صولت یہ حسرتوں کا کسی کی لہو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب نواب محمد سجاد علی خاں صاحب ضبط لکھنوی شاگرد جناب جلال لکھنوی

یارب عزیز خلق کوئی خوب رو نہ ہو — اور ہو تو اس کی دل میں مرے آرزو نہ ہو
اے ضبط دل کو تھام کے آنسو کو روک لو — آئے ہو بزم غیر میں بے آبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب سید مظہر حسین صاحب ضو طالب علم کالج جھالراپٹن

کیسی یہ آرہی ہے صدا دیکھنا ذرا — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب عابد حسین صاحب عابد سہسوانی پیشکار عیسیٰ گڑھ ملک گوالیار شاگرد امیر

بسمل ترا کسی سے کبھی چارہ جو نہ ہو — قاتل لگا وہ زخم کہ فکر رفو نہ ہو
عابد کچھ اپنے نام کا بھی پاس چاہیے — پڑھتے رہو نماز نہیں ہے وضو نہ ہو

تعداد اشعار (۱۱) ہے

جناب شیخ فدا علی عرف اچھے صاحب عیش لکھنوی

وہ سر پھرے کہ جس میں سر جستجو نہ ہو — وہ دل رہے خراب کہ جس دل میں تو نہ ہو
کہتی ہے مجھ سے آہ مجھے کھینچیے تو آپ — پھر دیکھیے تو یہ فلکِ کینہ جو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب کنور عنایت سنگھ صاحب عنایت رئیس بریلی

آئی کہاں سے گریہ و زاری کی یہ صدا — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو
کچھ علم و فضل کی ہے عنایت وہیں بہار — عالم میں بے نشان کبھی لکھنؤ نہ ہو

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب احمد علی صاحب عشرت ساکن ضلع گیا شاگرد جناب نوح رامپوری

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو تری جستجو نہ ہو — وہ دل ہو خاک جس میں تری آرزو نہ ہو
اللہ رے ضد وہ سنتے ہیں عشرت کے جب پیام — کہتے ہیں میرے سامنے یہ گفتگو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب حافظ محمد عبدالغفور صاحب عاشق نمبردار چتورا

عبدالغفور شیفتہ اس دل پہ تو نہ ہو — جس میں وفا کا رنگ محبت کی بو نہ ہو

عاشق میں ہی ہوں والیِ اقلیم نظم و نثر شہرت مرے کلام کی کیوں چار سو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب محمد یحییٰ علی صاحب عاصی کاکوروی اہلکار مفتی نگینہ

نکلی نہ ایک بھی کبھی اس دل کی آرزو یہ آرزو ہے اب کہ کوئی آرزو نہ ہو

سارا مزا وصال میں ہے چھیڑ چھاڑ کا معشوق کیا ہے وہ جو ذرا تند خو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب منشی راجندر صاحب عیش نائب فوجدار جھالاواڑ شاگرد جناب جاوید

دشمن کو آبِ تیغ پلاتے ہیں آج وہ کس طرح میرا رشک سے پانی لہو نہ ہو

اس شرط پہ اجازت اظہار حال ہے ایما نہ ہو اشارہ نہ ہو گفتگو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد عبدالرؤف خاں صاحب عیاش رامپوری از جھالاواڑ

خط اس کا لے کے آیا بلانے کو نامہ بر لیکن یہ خوف ہے کہ فریبِ عدو نہ ہو

ہرگز نہیں کسی کے فرشتوں کو بھی خبر مضطر ہمارے آنے سے اے جان تو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب محمد عبدالعزیز صاحب عزیز برادر گوہر دہلوی

آئے نہ بہر فاتحہ وہ اس خیال سے سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

کہنے لگا بگڑ کے وہ سنتے ہی میرا نام ہرگز کسی کا ذکر مرے رو برو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب ریاض علی صاحب عاشق منشی پیشی روبکاری بلقیس جہاں بیگم صاحبہ بھوپال

شب کو اگر بغل میں مری یار تو نہ ہو کیوں کر نہ مرگ کی مجھے پھر آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد خاں صاحب غریب اہلمد پیشی صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر بہار نپور

سر میں بھری ہوئی جو تری جستجو نہ ہو آوارۂ تلاش کوئی کو بہ کو نہ ہو

میں ہی نہیں ہوں تنگ زمانہ سے اے غریب یہ کس کا آشنا ہے جو میرا عدو نہ ہو

تعداد اشعار (۶) ہے

جناب مولوی غلام امام صاحب غنی متوطن قصبہ مصطفیٰ آباد

کیوں کر قرار آئے دلِ بے قرار کو ہے زندگی خراب جو تو روبرو نہ ہو
جو اک نظر ترے رخِ زیبا کو دیکھ لے تا حشر دوسرے کی اسے جستجو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب سالار مسعود صاحب غازی پنشن خوار باہویں پلٹن بنگلور

آنے تو دو بہار۔ گریبانِ شیخ کے پرزے اڑاؤں ایسے کہ جائے رفو نہ ہو
شیطان کا بہشت بریں میں ہے کام کیا لازم ہے یہ کہ گھر میں تمھارے عدو نہ ہو

صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب محمد عبد الغفور خاں صاحب غفور شاگرد جناب رسا از شکوہ آباد

کیوں لے چلا ہے دل مجھے قاتل کے سامنے گردن پہ اس کی مفت میں میرا لہو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید عباس حسن صاحب فصاحت لکھنوی خلف امانت مرحوم

اے ابرِ تر جہان میں سیلِ آبرو نہ ہو ہمسر ہمارے دیدۂ گریاں سے تو نہ ہو
کہتی ہے روز باغ میں یہ عندلیب زار میں پھول میں ضرور سماؤں جو بو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب سید حسن صاحب فوق رام پوری شاگرد جناب داغ دہلوی

گران میں روٹھنے کی بگڑنے کی خو نہ ہو دل پائمالِ کشمکشِ آرزو نہ ہو
ہم تو ہزار بار کہیں تجھ سے حالِ دل پہ کیا کریں کہ ہم سے مخاطب ہی تو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب شیخ فدا حسین صاحب فدا ساکن قصبہ سکیٹ ضلع ایٹہ

وہ شمع کیا کہ جس کو لگی ہو نہ لو تری وہ بزم کیا ہے جس میں تری گفتگو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی محمد احمد صاحب فریاد خیر آبادی شاگرد جناب مضطر

کس طرح ہم کو عشقِ بتِ ماہرو نہ ہو جب دل دیا خدا نے تو کیوں آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب ہرگوبند صاحب فوق انچارج انسپکٹر جنگل علاقہ [illegible] ریاں
حسرت نہ ہو ملال نہ ہو آرزو نہ ہو   کچھ بھی نہ ہو جو اے دل کم بخت تو نہ ہو
صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد رکن الدین صاحب فرق طالب علم سکاچ مشن سکول سیالکوٹ
سب خواہش وصال مری دور ہو گئی   یہ آرزو ہے یار کوئی آرزو نہ ہو
صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب بالکرشن صاحب قمر لکھنوی شاگرد جناب آسیر لکھنوی
جنت میں چاہے حور رہے یا پری رہے   کیا واسطہ مجھے جو مرا ماہ رو نہ ہو
اے چشم و دل سنبھالے رہو اشک و آہ کو   الفت کا میری ذکر کہیں کو بہ کو نہ ہو
صرف یہی دو اشعار درج ہیں

جناب سید یوسف حسین صاحب قیاس خلف اکبر جناب یاس شاگرد جلال
پھوٹے وہ آنکھ جس میں کہ ہر وقت تو نہ ہو   وہ دل لہو ہو جس میں تری آرزو نہ ہو
بے وجہ آج دل کا تڑپنا نہیں قیاس   پہلو میں یار کے کہیں میرا عدو نہ ہو
تعداد اشعار (۶) ہے

جناب محمد شاہ خاں صاحب کاوش رام پوری شاگرد جناب جلال
اس کا مضائقہ نہیں گر دل میں تو نہ ہو   ہاں یہ ستم ہے یار تری آرزو نہ ہو
آباد خاک ہوگا وہ دل جس میں ایک بھی   حسرت نہ ہو، امید نہ ہو، آرزو نہ ہو
تعداد اشعار (۹) ہے

جناب پی۔ بی۔ موہن صاحب کیفی دہلوی
یہ کون رو رہا ہے ذرا دیکھ بے کسی   سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ
کیفی یہ لال لال جو ڈورے نمود ہیں   آنکھوں میں جم گیا یہ جگر کا لہو نہ ہو
تعداد اشعار (۳) ہے

جناب فتح الدین صاحب لاغر پھلوری مدرس اسکول ٹبالہ
پھیلا ہے جس کا فیض زباں اک جہان میں   شاید وہ سرزمین سخن لکھنؤ نہ ہو
صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عبداللطیف خاں صاحب لطیف رئیس مصطفیٰ آباد

اس دل کی بے قراریوں سے مجھ کو خوف ہے — رسوا یہ بدنصیب کہیں کو بہ کو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب سید محمد مہدی صاحب مہدی خلف الصدق جناب جلال لکھنوی

اے دل کچھ آہیں کھینچ جو نالے کی خو نہ ہو — چپ یوں کسی کی یاد میں کم بخت تو نہ ہو

مہدی سنا ہے جلوہ گر یار سے کوئی — مایوس گھر پھرا کہیں شاید وہ تو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب مولوی ممتاز احمد صاحب ممتاز تھانوی شاگرد جناب داغ دہلوی

حسرت نہ ہو ملال نہ ہو، آرزو نہ ہو — جھگڑا ہی یہ نہ ہو دل شیدا جو تو نہ ہو

الفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا — یارب مری طرح کوئی اپنا عدو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب نواب تصدق حسین عرف چھوٹے صاحب ماہر رئیس لکھنؤ

بلبل نہیں ہے وہ جسے الفت کی خو نہ ہو — گل ہے وہ خار جس میں محبت کی بو نہ ہو

ماہر کرو تو شیوۂ خاموشی اختیار — ممکن نہیں کہ بند زبانِ عدو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب منشی محمد عبدالمجید صاحب مجید کیر تیوری ملازم فوجداری ضلع علی گڑھ

کافر ہو آنکھ بھر کے جو دیکھے کبھی اسے — حورِ بہشت میں جو تمھاری سی خو نہ ہو

میں اس کی آرزو میں دل و جاں فدا کروں — افسوس ہے کہ اس کو مری آرزو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد منظور احمد صاحب منظور بدایونی مختار شکوہ آباد شاگرد داغ

جلوہ نما جب آنکھوں میں وہ شمع رو نہ ہو — موسیٰ کی طرح طور کی کیوں جستجو نہ ہو

کیا تاب ماہ کی جو کرے تجھ سے ہمسری — خورشید جب فلک پہ ترے روبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب محمد ممتاز حسین صاحب ممتاز میرٹھی شاگرد جناب عشیر لکھنوی

ممتاز منھ کفن سے ذرا کھول! دیکھ تو — سر پیٹتی لحد پہ تری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب مرزا محمود بیگ صاحب ممتاز از کلب کوئٹہ

آنکھوں سے اپنی روضۂ احمد جو دیکھ لوں باغ جناں کی دل میں کبھی آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی

ہر وقت سر بسجدہ ہیں اک بت کی یاد میں ہم وہ نماز پڑھتے ہیں جس میں وضو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیخ مظہر علی صاحب مظہر لکھنوی شاگرد جناب ہمت لکھنوی

بوسہ جو میں نے مانگا تو جھنجھلا کے یہ کہا خاموش ایسی بار دگر گفتگو نہ ہو

صرف ایک شعر درج ہے

جناب محمد اسحاق خاں صاحب مائل از قصبہ برلا

جس سے کہ میرا آج معطر دماغ ہے اے دل کسی کی زلف معنبر کی بو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب عبدالقادر صاحب متین حکیم آبادی ضلع چھپرہ

یہ کس کے نور کی ہے تجلی جہان میں کوٹھے پہ بے نقاب مرا ماہرو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب محمد عبدالکریم صاحب مضطر ہیڈ کلرک ڈاکخانہ سنگری لاہو

ٹوٹیں وہ پاؤں جن کو تری جستجو نہ ہو غارت وہ دل ہو جس میں تری آرزو نہ ہو

مضطر بتوں کے کوچے میں پھرنے سے باز آ رسوا خدا کے واسطے تو کو بہ کو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب جگیشر پرشاد صاحب مقتول شاعر راجہ صاحب بہادر سنگرولی

دیکھو کدھر سے آتی ہے ماتم کی یہ صدا سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

حضور پُر نور نواب محمد کلب علی خاں صاحب بہادر نواب فرمانروائے[1] رامپور

گر تم سے خونبہا کی کوئی گفتگو نہ ہو — کیا ذکر موت کا بھی مری کو بہ کو نہ ہو
نواب اسی سے چاہتے ہو بے حجابیاں — بندہ تو کیا خدا کے بھی جو روبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

جناب محمد علی حسین خاں صاحب نشاط رامپوری شاگرد جناب جلال لکھنوی

وہ آنکھ کیا کہ جس کو تری آرزو نہ ہو — پتھر وہ دل ہے جس میں تری آرزو نہ ہو
ہر دل عزیز کیوں نہیں ان کی گلی کے لوگ — کیوں ان کی خاک چھاننے کی آبرو نہ ہو

تعداد اشعار (۵) ہے

جناب مرزا آغا حسن صاحب ناظم لکھنوی

قاتل اسے حنا کی طرح مل لے ہاتھ میں — پامال گر کے خاک پہ میرا لہو نہ ہو
یہ کون رونے والا ہے بیکس کا بعد مرگ — سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو[2] نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب محمد شفیع صاحب ناظم سب اورسیر بھوگاؤں

جب کوستا ہوں میں کہ الٰہی عدو نہ ہو — وہ کہتے ہیں یہ مجھ سے بگڑ کر کہ تو نہ ہو
بیٹھے شراب پی رہے ہیں جس سے شیخ جی — ناظم بغور دیکھ یہ ظرف وضو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب بابو منگل سین صاحب نہال کلرک ڈاکخانہ سفری لاہور

ان حسرتوں نے مجھ کو ملایا ہے خاک میں — اب آرزو یہی ہے کوئی آرزو نہ ہو
ہر وقت اب تو رہتی ہے یہ آرزو نہال — پہلو میں کاش دل نہ ہو یا آرزو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

---

[1] غالباً فرمانروائے کی جگہ یہ لفظ کتابت کی غلطی ہے۔
[2] یہاں آرزو کی جگہ جستجو ہوگا۔ چوں کہ دونوں مصرعوں میں آرزو کا ہونا غیر مناسب ہے۔ غالباً پہلے مصرع [illegible] آرزو" کتابت کی غلطی ہے۔
[3] شعر پیام یار کے صفحہ ۲۰ پر درج ہے اور صفحہ نمبر ۲۰ کے دو کالم ہیں۔

جناب سید نوازش حسین صاحب نوازش مونگیری

آنکھیں نکال ڈالیں نہ ہوں شوقِ دید اگر　　ٹکڑے کریں دل کے اگر اس میں تو نہ ہو
اقرارِ وصل آج نوازش وہ کرتے ہیں　　سنتا کہیں اے فلکِ کینہ جو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب عبدالغفار خاں صاحب ناطق ساکن مئو قائم گنج

وہ امتحان خنجرِ ابرو کی کاٹ کا　　غیروں پہ جب کریں جو ہمارا گلو نہ ہو
ہر کب بلائے عشق سے مجھ کو ملی اماں　　ناطق پسند کیوں دلِ بے آرزو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب پنڈت سکھ دیو پرشاد صاحب نور انوپ شہری ماسٹر اسکول

میں مرمٹا ہوں بارِ تمنا سے وصل میں　　سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو
سجدہ کریں گے ابروئے خمدار کا....　　کیوں ہم کو آبِ تیغ سے لازم وضو نہ ہو

صرف یہی دو شعر درج ہیں

جناب شیخ فتح محمد صاحب نادر بٹالوی شاگرد امیر

آوازِ آہ و نالہ جو آتی ہے قبر میں　　سر پیٹتی لحد پہ مری آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب پنڈت بھوانی شنکر صاحب ناگر انوپ شہری

گر خواب میں بھی دیکھ لیں اس حور کا مکاں　　جنت کی شیخ جی کو کبھی آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب منشی محمد نظیر صاحب نظیر وکیل فتح پور

رخسار پھول سے جو ترے دیکھے عندلیب　　دیدارِ گل کی پھر تو اسے آرزو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب شیخ حیدر صاحب ناداں مہتمم کمیٹی اتفاق احباب

شمشیر تیری خون بھری اس کی ہے گواہ　　منکر تو میرے قتل سے او تند خو نہ ہو

صرف یہی ایک شعر درج ہے

جناب مرزا مرتضیٰ حسین وصال لکھنوی شاگرد جناب جلال لکھنوی

پہلو میں میرے یار اگر ایک تو نہ ہو — حسرت نہ ہو، امید نہ ہو، آرزو نہ ہو
ہے موتیوں سے تو نے کا یا را اے وصال — گر ہنستے ہنستے اس میں بگڑنے کی خو نہ ہو

تعداد اشعار (۳) ہے

جناب سید ذاکر حسین صاحب یاس لکھنوی شاگرد جلال

تڑپا گیا جو چھپ کے مرے دل کو تو نہ ہو — بسمل جو ہو گئی وہ تری آرزو نہ ہو
دیکھا ادھر حسینوں کو پھر آشنا نہ تھا — کوئی ہمارے دل سا بھی بیگانہ خو نہ ہو

تعداد اشعار (۷) ہے

مندرجہ بالا آخری شعر کے ساتھ ہی "پیام یار" کا انتخاب ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شمارہ بھی علاوہ ٹائٹل ۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ مناسب اور طباعت و کتابت بھی خاصی اچھی ہے۔ ٹائٹل پیج کا آخری ورق غائب ہے۔ اس لیے اس کی تفصیل دینے سے قاصر ہوں۔

اُردو ادب

کا

شمارہ ۴ (تخلیق نمبر)

—— ۱۹۶۵ء ——

اس شمارے میں مندرجۂ ذیل شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں

نظم و غزل :-

اختر الایمان، منیب الرحمٰن، جگناتھ آزاد، خلیل الرحمٰن اعظمی، وحید اختر، باقر مہدی، شاذ تمکنت، قیصر قلندر، سید فضل المتین، سلام مچھلی شہری، اختر انصاری، عمیق حنفی، معین احسن جذبی، مسعود علی ذوقی، آل احمد سرور، مدوش صدیقی، نشور واحدی، سلیمان اریب، راہی معصوم رضا، بشیر بدر، شہریار۔

افسانے :-

راجندر سنگھ بیدی، کوثر چاند پوری، رام لعل۔

ڈرامہ :-

آنند نراین مُلا۔

انشائیہ :-

احمد جمال پاشا

اور

مشاہیر کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط

ضخامت :- ۱۲۰ صفحات :- قیمت :- ۲ روپے [illegible]

انصار اللہ نظر

نواب امین الدولہ مہر

نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے میں علم و ادب کا جو رجحان تھا وہ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے لگا سبب یہ ہوا کہ ان کے ورثا میں شعرا کی طرف وہ رغبت نہیں تھی جو ان کے یہاں تھی، نواب غازی الدین حیدر نے جب بادشاہت کا اعلان کیا تو انھیں دربار کی زینت کے لیے ضرور یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی شاعر ان کی مدح میں بھی قصیدہ کہے لیکن بطور مجموعی ان کی طبیعت کا میلان مذہب کی طرف تھا، ان کے جانشین نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم کی طبیعت عیش و عشرت کی طرف مائل تھی بقول شرر ان میں "زنانہ مزاجی" تھی۔ ان کے بعد محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے یہ دونوں بھی مذہبی خیال کے لوگ تھے، ظاہر ہے کہ اس دور میں شعرا کی قدر دانی جیسی کہ چاہیے تھی نہیں ہوئی، بات کچھ شعرا ہی تک محدود نہ تھی بلکہ علم و ادب کی تمام ہی شاخوں اور شعبوں کے لیے بیکس مپرسی کا دور تھا۔ میرزا رجب علی بیگ سرور نے غازی الدین حیدر کے عہد میں فسانۂ عجائب لکھا، نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں قصیدہ وغیرہ لکھ کر چاہا کہ قدر دانی سے شرف پائیں مگر محرومی ہاتھ آئی۔ محمد علی شاہ کے عہد میں بھی نہ کیا رکھا رہا البتہ امجد علی شاہ کے زمانہ میں ولی عہد بہادر واجد علی شاہ المعروف بہ "جان عالم" کا نام فسانہ میں ڈال کر پھر قسمت آزمائی کی۔ غالباً ولی عہد ہی کی قدر دانی سے سرور

ل فسانۂ عجائب عہد امجد علی شاہ میں چھپا اس کے ثبوت میں کرامت علی اظہر کی تاریخ پیش کی جا سکتی ہے:

این کتاب جان عالم چوں حسن فرمود طبع — معنی نور علی نور از سے آمد در ظہور

خامۂ اظہر پے تاریخ وقت انطباع — زد رقم از طبع باشد جان عالم پر سرور

۱۲۵۹ھ

(طبقات شعرا ص ۴۲۹)

۱۲۵۸ھ میں امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے اور مرزا واجد علی (جان عالم) ولی عہد ہوئے۔ اغلب ہے کہ ولی عہد کی سفارش سے کتاب چھپ سکی اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرور نے اپنے ہیرو کا نام واجد علی شاہ ہی کی رعایت سے رکھا تھا یہ تطابق اتفاقیہ ہے۔

شیخ امام بخش ناسخ کی شاعری کا شباب تھا نواب نے ان کی قدر زیادہ فرمائی اور ان سے [illegible]
(آب بقا [illegible])

[illegible] میں مرزا رجب علی بیگ سرور کانپور گئے، انھیں وہاں کے حالات سے سخت [illegible]
"اتفاق مجبور کردہ کان پور میں ہوا بسکہ یہ بستی پوچ اور لچر ہے اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں
احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشین عزلت گزیں، مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی" (فسانۂ عجائب [illegible])

یہ حالات بہت جلد بدل گئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانہ میں سرور یہ سطور قلمبند کر رہے تھے اس وقت
ان پور میں علم وادب کا چراغ روشن کیا جا رہا تھا نواب معتمد الدولہ بہادر کے ساتھ رفتہ رفتہ شعرا لکھنؤ سے کان پور
کی طرف منتقل ہونے لگے تھے۔ ناسخ جب بھی کان پور گئے انھیں کے یہاں مقیم ہوئے۔ دوسرے شعرا کا حال
آگے آتا ہے۔

نواب معتمد الدولہ بہادر کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے نواب سید آغا علی خاں امین الدولہ
کے خطاب سے مسند نشین ہوئے، بڑا شاندار جشن ہوا۔ رشک نے قطعۂ تاریخ کہا:

۱؎ مرزا رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے لیے مشہور ہے کہ یہ ۱۲۴۰ھ میں لکھا گیا حالاں کہ سرور کے یہ الفاظ کہ "سن بارہ سے چالیس تھے" خود اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ تحریر اس کے بعد کی ہے۔ فسانۂ عجائب میں نہ صرف نصیر الدین حیدر کی مدح میں اشعار موجود ہیں بلکہ ان کے عہد کا تذکرہ اصل فسانہ میں ہے مثلاً ایک موقع پر عطر کے سلسلے میں لکھا ہے "خاص ایجاد نصیر الدین حیدری"۔ نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ بادشاہ کے عیش ونشاط کا تذکرہ سرور نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"ماشاءاللہ یہ عجیب شاہ عجاہ اریکہ نشین ہوا کہ ... عیش ونشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کنجڑا ہفت ہزاریوں سے اعلیٰ بنائی ... خواصوں کو صاحب نوبت کیا چنڈول سکھپال میں چڑھایا ... قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی معاً رفعت وشان فلک ہفتم پر پہنچائی" (فسانۂ عجائب ص۲۵)

قدسیہ محل کا عقد بادشاہ کی تخت نشینی کے تقریباً دو سال بعد ہوا، اغلب ہے کہ "خواصوں" سے ان کی طرف اور "کنجڑوں" سے ملکہ زمانیہ کی طرف اشارہ ہو کیوں کہ ملکہ زمانیہ فی الاصل کسی "کوری" کی لڑکی تھیں (بیگمات اودھ ص۱۰۲) قیاس کیا جاتا ہے کہ ان دونوں کے حالات ان کے زوال بلکہ انتقال کے بعد لکھے ہوں کیوں کہ ان کے عروج واقبال میں اس طور پر اشارہ کرنا بھی قرین قیاس کم تھا۔ ملکہ زمانیہ کا انتقال دسمبر ۱۸۳۲ء (مطابق ۱۲۴۸ھ؟) میں اور قدسیہ محل کا ۱۲۴۸ھ میں ہوا اس طرح بھی ان تحریروں کا زمانہ امجد علی شاہ کی بادشاہت اور "جان عالم" کی ولی عہدی کا معلوم ہوتا ہے۔ فسانۂ عجائب کے کچھ اور مندرجات سے بھی یہ بات ثابت ہے لیکن یہاں اس پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں مثلاً مرزا محمد رضا خاں برق کے مشاعرہ کا تذکرہ ہے جو تقریباً ۱۲۵۰ھ یا اس کے کچھ بعد کی بات ہے وغیرہ۔

از ثروت نواب امین الدولہ | شاد و خرم شدند جملہ کہ ومہ
از ناخن جود و کرم خود بکشود | ہر کس کہ بدل داشت ز افلاس گرہ
از تیغ حوادث ہمہ تن محفوظ ہیم | فیض و ہمش کرد بما کار زرہ
اے رشک نوشتیم ز تاریخ جلوس | ذیحجہ و یوم اول سہ شنبہ

۱۲۴۷ھ

نواب آغا علی خاں کے سال ولادت کا تعین نہیں ہوسکا، ان کی والدہ مسماۃ بی جان نواب معتمد الدولہ [...]و محل تھیں۔ ان کے بھی خاندانی حالات نہیں معلوم ہوسکے البتہ اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ یہ فرقۂ خاص سے [...]ں (سوانحات ۲/ص۱۹ بحوالہ طوفان) نواب معتمد الدولہ بہادر نے نواب آغا علی خاں کی شادی کے لیے نواب [...]میر خاں کی صاحبزادی نواب بی بی عرف بنّی بیگم کا انتخاب کیا۔ نواب شاہ میر خاں بوجوہ اس کے لیے تیار نہ تھے [...]ں یہ زمانہ نواب معتمد الدولہ کے اقتدار کا تھا مجبور ہو کر شاہ میر خاں کلکتے ہو کر لندن کی طرف روانہ ہوئے [...]ں زندگی نے وفا نہ کی، نواب غازی الدین حیدر بادشاہ نے نواب بنّی بیگم کو جو لکھنؤ میں رہ گئی تھیں نواب [...]ک محل بیگم کے سپرد کیا کہ اس کو اپنی بیٹی سمجھ کر اس کی شادی معتمد الدولہ کے بیٹے کے ساتھ کردو چناں چہ [...]ک محل نے حسن باغ میں بہت دھوم دھام سے شادی کردی۔" (بیگمات اودھ ص۴۲)

نواب آغا علی خاں کو خطاب امین الدولہ کس نے عطا کیا اس کا پتا نہیں چل سکا البتہ تذکرۂ ابن طوفان سے [...]م ہوتا ہے کہ یہ خطاب ۱۲۵۰ھ سے پہلے مل چکا تھا اغلب ہے کہ ۱۲۴۷ھ میں بہ وقت مسند نشینی عطا ہوا۔ نواب [...]شا تھی کہ ان کو بھی وزارت کا منصب عطا ہو چناں چہ انھوں نے ایک طویل غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

دم پھڑکتا ہے مرا ہر دم برائے لکھنؤ | لکھنؤ مجھ کو دکھا دے اے خدائے لکھنؤ

34064

اسی میں کہتے ہیں:

یا الٰہ العالمیں جلدی کسی دن پھر بہ بر | مہر سلطان جہاں ہو رہنمائے لکھنؤ

ایک دوسری غزل میں کھل کر عرض مدعا کیا ہے:

حیدر آباد اور دلی کی حقیقت کون سی | وسعت ملک صفاہاں ہے نثار لکھنؤ
مجھ کو میرا کار آبائی ملے پھر اے خدا | پھر بلائے شاہ گردوں اقتدار لکھنؤ

685

[...]ارک محل عیسائی تھیں ۱۸۱۸ء میں مسلمان ہو کر غازی الدین حیدر کے عقد میں آئیں ان کا اسلامی نام عزت النسا بیگم تھا مہد علیا [...]محل خطاب عطا ہوا تھا ان کا اہتمام نواب مرزا حاجی کے سپرد تھا حکیم بندہ مہدی ان کے طبیب خاص تھے۔

نواب امین الدولہ بھی اپنے والد کے ہمراہ کانپور پہنچے۔ ان کے انتقال کے بعد کانپور رہ کر مرتے رہے لکھنؤ کی وہ لاک اس وقت ... ہو چکی تھی، میر علی اوسط رشک ان کے ہمراہ تھے، اکثر اس سلسلے سے رشک بھی لکھنؤ جاتے رہتے تھے۔ نواب خود اگرچہ کانپور میں مقیم تھے لیکن لکھنؤ کی یاد میں ہمیشہ تڑپتے رہے جہاں میں کئی غزلیں اسی سلسلے کی موجود ہیں۔

غیرت صحرائے ایمن لکھنؤ ہو جائے گا 　　مہر کے جانے سے روشن لکھنؤ ہو جائے گا

ہم کو شہا دیس نکالا ملا 　　تا بہ گدا دیس نکالا ملا

بے جرم و بے گناہ غریب الوطن کیا 　　ہم کو وطن سے شاہ غریب الوطن کیا

کئی غزلیں "شاہ گردوں اقتدار لکھنؤ" کی مدح میں لکھیں مثلاً

خدا کے فضل سے آقا مراوہ شاہ شاہاں ہے 　　کہ جس کا ہر ملازم (کذا) رتبے میں فغفور و خاقاں ہے

شاہ ایسا ہے زمانے میں نہ ایسی خلقت 　　کہتے ہیں شاہ و گدا لکھنؤ آباد رہے

لکھنؤ چھوٹنے کی تاریخ بھی ایک مقطع میں کہی:

فرقتِ لکھنؤ کی ہے تاریخ 　　مہر سچ ہے ہوں مبتلائے فراق

۱۲۴۸ھ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب کو لکھنؤ سے کتنی محبت اور عقیدت تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچ سکا کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور انھیں کارنیابت حاصل ہوا۔ نواب حیدر علی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ موجودہ پریاگ نراین کا شوالہ اس زمانہ میں خورد محل تھا خیال کیا جا سکتا ہے کہ نواب امین الدولہ کی سکونت اسی محل میں رہی ہوگی۔ نواب کی اولاد کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے البتہ جس قدر حال دریافت ہوا درج کیا جاتا ہے:

ایک لڑکا ۲۷ جمادی الاول ۱۲۵۰ھ کو پیدا ہوا رشک نے ایک قطعۂ تاریخی میں اس کے کئی تاریخی نام تجویز کیے مثلاً میر معصوم علی خاں، فضل الدولہ نواب بہادر وغیرہ لیکن تعجب ہے کہ ان میں سے کسی نام کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا البتہ "نادر آغا" نامی ایک صاحبزادے کے ختنہ کی تاریخ رشک نے کہی:

"ہمایوں باشد ایں شادی ختنہ"

لہ مبارک محل عیسائی تھیں ۱۸۳۱ء میں مسلمان ہو کر غازی الدین حیدر کے عقد میں آئیں ان کا اسلامی نام عزت النسا بیگم تھا مہد علیا مبارک محل خطاب عطا ہوا تھا، ان کا اہتمام نواب مرزا حاجی کے سپرد تھا حکیم بندہ مہدی ان کے طبیب خاص تھے۔

اس مادہ سے ۱۲۶۶ھ سال ختنہ معلوم ہوتا ہے، "نادر آغا" سے ۱۲۵۰ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں ممکن ہے کہ ان ہی کے تاریخی نام رشک نے تلاش کیے ہوں۔ اس بچہ کی ولادت پر بڑی خوشی منائی گئی، زیادہ اہم واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر نواب معتمد الدولہ مرحوم کی دونوں بیگمات میں جو شکر رنجی چلی آتی تھی دور ہوئی۔ اس سے خوشیوں میں مزید اضافہ ہوا۔

اس سے پہلے ایک لڑکا ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوا تھا اس کی تاریخ ناسخ نے کہی تھی:

صبح طالع شد برآمد آفتاب

۱۲۴۵ھ

۱۲۵۴ھ میں نواب کی کسی لڑکی کا انتقال ہوا اس کا بہت رنج ہوا، ایک فارسی غزل میں خود اس غم کا بیان کیا ہے،

امروز سیاہ است جہاں در نظر ما ۔۔۔ مدفن شدہ پر نور ز نور نظر ما
چوں چرخ بہ کوکب شدہ ۔۔۔ انداغ دریں رنج دل ما جگر ما
بربست چو رخت سفر اے تہز دنیا ۔۔۔ ایں دختر ما راحت شام و سحر ما

بود اے فلک از شہر صفر لیل دہم حیف
شد مصرع تاریخ غروب قمر ما

۱۲۵۴ھ

اس دختر کی ولادت کا سال معلوم نہیں ہو سکا۔ اشعارِ مذکورہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچی کمسن تھی۔ تاریخ اودھ کے مصنف نے ایک صاحبزادے نواب احمد آغا صاحب کا ذکر کیا ہے (ص ۹۱/۲) ان کے علاوہ نواب سید حیدر علی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ نواب امین الدولہ کے تین لڑکے تھے۔

نواب تقی علی خاں بہادر
نواب سجاد علی خاں بہادر
نواب بڈھن

ان میں سے اول الذکر دو عراق چلے گئے تھے، آخر الذکر نے لکھنو میں سکونت اختیار کی۔ نواب صاحب نے ایک غزل میں اپنے کسی بچہ کی رسم "بسم اللہ" کا تذکرہ کیا ہے:

سارے عالم کو مبارک ہو تری بسم اللہ ۔۔۔ لوح پر لکھے قلم آج بھی بسم اللہ
حرف ان پہ ہے نہ ہوں آج جو مشغول طرب ۔۔۔ اس طرح کی نہیں دیکھی کبھی بسم اللہ

ہے دعا مہر کی آئے تجھے لکھنا پڑھنا
یہ مبارک کریں اللہ وتبی بسم اللہ

نواب امین الدولہ بہادر کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے جس قدر بہم پہنچے قلمبند کیے جاتے ہیں۔ نواب کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا، یہ خصوصیت اس خاندان کے افراد کے یہاں آج بھی پائی جاتی ہے۔ نواب نے دریا کی سیر کے لیے ایک خاص کشتی بنوائی، رشک نے تاریخ کہی:

اب کیا کشتی بنی ہے ماشا اللہ

۱۲۴۹ھ

غالباً اسی کشتی پر سوار ہو کر نواب صاحب سیر و تفریح کے لیے نکلتے تھے، کان پور میں گنگا کے گھاٹوں میں بٹھور کا گھاٹ زیادہ مشہور ہے اس گھاٹ کو عقیدے کے بموجب زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہاں ہر سال ایک خاص پوجا ہوتی تھی جس کا نام نواب نے "چرخ پوجا" بتایا ہے، اس مخصوص موقع پر زبردست میلہ لگتا ہے اور بڑی رونق ہوتی ہے۔ نواب اسی میلے کو دیکھنے اکثر جاتے تھے اور وہاں بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اس سے متعلق انھوں نے کئی غزلیں کہی ہیں:

اس ماہوش نے مجھ سے یہ تاریخ میں کہا اے مہر لو پری ہے یہ میلہ بٹھور کا
۱۲۴۹ھ

تاریخ عیسوی میں یہ مصرع ہوا ہے مہر کیا ہی پسند آیا ہے تیرت بٹھور کا
۱۸۳۳ء

تیرا جلوہ بٹھور میں دیکھا[1] کیا کہیں کیا بٹھور میں دیکھا

---

[1] پوری غزل اس طرح ہے:

تیرا جلوہ بٹھور میں دیکھا کیا کہیں کیا بٹھور میں دیکھا
چاند شرمندہ جس سے ہے ایسا ماہ سیما بٹھور میں دیکھا
جب اٹھانا چنے کو وہ خوش قد حشر برپا بٹھور میں دیکھا
پشتے اے تیغ ناز کشتوں کے تھے گھاٹ تیرا بٹھور میں دیکھا
ان بتوں سے خدائے عالم کا کارخانہ بٹھور میں دیکھا
جس سے بازار مصر شرمائے ایسا میلا بٹھور میں دیکھا

(بقیہ صفحہ ۴۵)

خود محل کے تھوڑے ہی فاصلے پر گنگا بہتی تھی "شب مہ" میں عموماً اس کی سیر سے لطف اٹھاتے تھے۔ ایک
دل میں کہتے ہیں:

تہر کی تاریخ سیرِ گنگ و بزمِ عیش ہے جام مے، مطرب، شب مہ، دلبر و دریائے گنگ

سیرِ دریا کا شوق آخر عمر تک برقرار رہا، عراق تشریف لے جاتے ہوئے بمبئی میں قیام پذیر ہوئے وہاں
بندرگاہ سمندر کی سیر کے لیے تشریف لے گئے، اس سلسلے کے قطعات تاریخ بھی ملتے ہیں۔

نواب امین الدولہ مذہبی اصول کے پابند تھے انھوں نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد مقبرے کو
امام باڑے کی حیثیت دی، پھر ۱۲۵۱ھ میں ایک مسجد تعمیر کرائی جس کی تاریخ تعمیر کا سال اس مصرع سے برآمد ہوتا ہے۔

محل نماز است و تعقیب گاہ

۱۲۵۱ھ

مقبرہ گوا لٹولی کے متصل ایک مسجد موجود ہے نواب سید حیدر علی صاحب کے ارشاد کے بموجب یہ نواب
خود محل صاحبہ کی تعمیر کرائی ہوئی ہے، اس کے امکانات ہیں کہ نواب امین الدولہ نے جو مسجد تعمیر کرائی ہو وہ اپنی
والدہ کے نام سے منسوب کر دی ہو، یا ممکن ہے کہ نواب مرحوم نے کوئی دوسری مسجد تعمیر کرائی ہو جس کا اب پتا نہیں چل سکا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴)

مجھ کو سمجھا وہ آشنائے بتاں جس نے بجرا بٹھور میں دیکھا
دورِ مے، وصل یار، آب رواں سب مہیا بٹھور میں دیکھا
جھک گئے آسمان تیرے حضور چرخ پوجا بٹھور میں دیکھا
تہر نے ایک ماہ کامل کو
جلوہ فرما بٹھور میں دیکھا

اردو شاعری پر غیر ملکی یا بدیسی کا بہتان تراشنے والے تعجب ہے کہ اساتذۂ اردو کے اس قسم کے اشعار نظر انداز کر دیتے ہیں، ناسخ اور
تلامذۂ ناسخ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جن مقامات پر وہ خود گئے ہوں ان کے ذکر کو اپنے اشعار کا موضوع
بھی بنائیں، اسی کوشش کا نتیجہ نواب امین الدولہ تہر کی یہ غزلیں بھی ہیں۔

کارتک کے مہینے کے آخری ایام میں جب چاند پورا ہوتا ہے بٹھور میں ایک خاص میلا لگتا ہے بٹھور کا اصل نام برہماورت ہے
عقیدہ ہے کہ یہیں برہما درت کی کھونٹی ہے جس پر یہ زمین قائم ہے میلے کے موقع پر مخصوص پوجا ہوتی ہے اس کی سب سے اہم تقریب یہ ہے کہ اس کھونٹی
پر دودھ چڑھاتے ہیں اس کی طرف نواب نے آخری شعر میں اشارہ کیا ہے، اس میلے میں نواب کی شرکت بلاشبہ اس کے فروغ کا سبب بنی ہوگی ایسے کتنے ہی
میلے، رسم و رواج ہیں جن کو ان خاص وعام نے فروغ دیا افسوس ہے کہ زمانے نے ان کو فراموش کر دیا اب کون کہے اور کس سے کہے؟

نواب معتمد الدولہ بہادر کی دو بیگمات میں کسی قدر رنجش کا پتہ چلتا ہے البتہ اسباب نہیں معلوم ہیں بعض
لوگوں نے ان اولادوں میں بھی تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن ۱۲۵۱ھ میں دونوں بھائیوں میں تعلقات
بحد مصالحت ہوگئی، اس موقع پہ جشن منایا گیا تاریخ کا مصرع یہ ہوا:

مبارک باشد ایں باہم ملاقات

دوسرے بھائی کا تخلص بقول رشک آہ تھا، ممکن ہے کہ نھنے نواب یا نواب محسن الدولہ کا یہ تخلص ہو۔
نواب امین الدولہ ۱۲۶۷ھ میں کربلائے معلی کے لیے روانہ ہوئے، ان کے کارکن و استاد میر علی اوسط رشک
بھی ساتھ ہی گئے۔ راستہ میں آگرہ اور بمبئی وغیرہ مقامات پر قیام کیا، بمبئی میں صاحب گورنر سے ملاقات کی اور
۱۲۶۷ھ میں کربلائے معلی پہنچے، ۱۲۶۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ہندوستان خبر آئی تو مختلف شعرا نے
تاریخیں کہیں منغیر شاگرد رشک و مصاحب حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ کا قطعہ درج ذیل ہے:

چلا جو ہند سے ابن وزیر شاہ اودھ   جنازہ صحنِ رواقِ حسین میں آیا
کہی منغیر نے تاریخ جب سنی یہ خبر   پیام عہد اجل کاظمین میں آیا

نواب معتمد الدولہ کی حسن خدمات کے سبب بادشاہ نے ان کے لیے وثیقہ مقرر فرمادیا تھا اس کی تفصیل اس
طرح ہے:

"بموجب عہد نامہ یکم محرم ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ اگست ۱۸۲۵ء معتمد الدولہ کے لیے ۲۵ ہزار روپیہ
ماہوار وثیقہ مقرر ہوا جس میں سے بیس ہزار روپیہ ماہوار خاص معتمد الدولہ کے نام پر تھا، دو ہزار
ان کی بیگم کی تنخواہ ہوئی اور ایک ہزار ان کی بیٹی عالیہ بیگم کی تنخواہ کی گئی اور دو ہزار ان کے بیٹے
امین الدولہ کی تنخواہ قرار پائی۔" (تاریخ اودھ ۴/۲۰۱)

نہیں کہا جا سکتا کہ عہد نامہ مذکور کے بعد پھر بادشاہ نے کوئی مزید وثیقہ عطا کیا یا نہیں۔
نواب امین الدولہ اغلب ہے کہ اپنی والدہ کو بھی ساتھ لے گئے ان کے متعلق نجم الغنی نے اطلاع
دی ہے کہ:

"دوسرا محل نواب (معتمد الدولہ) خرد محل جس طرح فرقۂ خاص سے تھیں ظاہر ہے امین الدولہ
آغا علی خاں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ روانہ عتبات عالیات ہوئیں مدت حیات تک
مجاور رہیں اور غربائے مومنین کے ساتھ سلوک کرتی رہیں وقت مرگ لاکھ روپیہ بالیوز بغداد
کو صفائی نہر حسین دے کر مرگئیں۔ روضۂ مقدسہ میں دفن ہوئیں، متروکہ دونوں اپنے پوتوں آغا علی
خاں کے بیٹوں احمد آغا وغیرہ کو دے گئیں نیک نام ہوئیں۔" (تاریخ اودھ [illegible])

تعجب ہے کہ نواب بڑھن لکھنؤ میں کس طرح رہ گئے شاید اپنے چچا کے ساتھ رہے ہوں[1]۔
نواب امین الدولہ کو شعر و سخن کا مذاق ورثہ میں ملا تھا، خود بھی شعر کہتے تھے، شیخ امام بخش ناسخ ان کے والد کی سرکار کے متوسلین میں تھے، ان ہی سے اصلاح لینے لگے، دیوان میں جا بجا اپنے استاد کا ذکر عقیدتمندانہ کرتے ہیں:-

پوچھتے ہو مجھ سے کیا اے مہر آہ نام تھا ناسخ مرے استاد کا

کیوں نہ آنکھوں سے لگائے مصرع ناسخ کو مہر چشم جاناں اور ہے چشم غزالاں اور ہے

اپنے والد کے وقت کی طرح نواب امین الدولہ بھی ناسخ کی بہر طور قدردانی فرماتے رہے۔ چنانچہ ناسخ جب بھی کانپور جاتے ان کے یہاں قیام فرماتے منیر شکوہ آبادی جن دنوں نواب نظام الدولہ بہادر کی ملازمت و مصاحبت میں تھے ناسخ بھی کانپور پہنچے، نواب امین الدولہ کے یہاں مقیم ہوئے منیر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ناسخ سے کسب فیض کیا، واپسی میں ناسخ منیر کو رشک کے حوالے کر گئے اس واقعہ کا ذکر منیر نے خود کیا ہے:-

"در کانپور بہ استانہ بوس حضرت مجتہد الشعرا مغفور مبرور کہ بہ تقریبی مہمان مرحوم نواب امین الدولہ بہادر مہر بودند از جواہر انواع استفادہ جیب تمنا مالامال کردم و بعد معاودت حضرت پیر و مرشد ممدوح الصدر بگلستاں ہمیشہ بہار لکھنؤ صانہ اللہ عن کل سوء حسب اشارت فیض بشارت جناب شان دست ارادت بدامان استاد المحققین ملاذ المتبحرین سیدی و مولائی جناب میر علی اوسط رشک

---

[1] نواب امین الدولہ کے دوسرے بھائی نواب محمد علی عرف ننھے نواب تھے، جو غدر کے زمانے میں انگریزوں کے مقابل نبرد آزما ہوئے، انگریزی عملداری کے قیام کے بعد گرفتاری کے احکامات صادر ہوئے مگر نواب موصوف عراق ہجرت کر گئے، ساتھ میں صرف ایک بکس زیورات وغیرہ کا لے جا سکے تھے، کہتے ہیں کہ گھوڑ دوڑ کا بہت شوق تھا چنانچہ آخر عمر میں ہر سال اسی غرض سے بمبئی تشریف لاتے تھے، دوسرے محل نواب خاص محل بیگم کے دو صاحبزادے تھے نواب نظام الدولہ سید علی خاں بہادر متخلص بہ سید اور نواب معین الدولہ سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ، یہ دونوں غدر کے زمانے میں بہت پریشان ہوئے لیکن استقلال کے ساتھ یہیں رہے بعد میں نواب نظام الدولہ لکھنؤ منتقل ہو گئے اور نواب معین الدولہ کانپور ہی میں سکونت پذیر رہے۔ نواب نظام الدولہ کی اولاد میں سے بعض عراق چلے گئے لیکن نواب معین الدولہ کی اولاد نے وطن نہیں چھوڑا۔ نواب سید حیدر علی صاحب جن سے راقم سطور نے نواب معتمد الدولہ اور نواب امین الدولہ کے حالات زبانی سننے کا شرف اٹھایا کانپور کے رؤسا میں ہیں، نواب معتمد الدولہ بہادر کے متروکہ کے متولی اور صاحب اقتدار بزرگ ہیں۔

دامت افاداتہٗ زدہ " (منتخب العالم ص۳)

[illegible] قسم کے معاصرین کے دوسرے بیانات بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ناسخ کا قیام نواب
[illegible] بہادر کے دولت کدہ پر ہی رہتا تھا۔ ناسخ کی وجہ سے اکثر شعرا یہاں حاضر رہنے لگے تھے چنانچہ
حسن علی عشق اپنے تذکرہ سراپا سخن کے اسباب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جس زمانے میں شیر بیشۂ سخنوری ہنر بنیستان معانی استاد راسخ جناب امام بخش ناسخ مغفور وارد کان پور تھے یہ غزل ارشاد فرمائی :۔

جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں

میں نے عرض کیا کہ اکثر غزلیں آپ نے اسی طور پر فرمائی ہیں اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب پائے کچھ جواب ارشاد نہ ہوا مگر دوسرے روز اس غزل سے محظوظ فرمایا :۔

کیا نسیم صبح لائی ہے مرا دم ناک میں

اسی طور پر اکثر غزلیں اور بھی فرمائیں۔ (سراپا سخن ص۶)

راقم سطور نے نواب سید حیدر علی صاحب کے پاس بزرگوں کی یادگار جو کتب ہیں ان کی فہرست مرتب
ہے، ان میں فارسی کا ایک قلمی تذکرہ بطور "سراپا" بھی نگاہ سے گزرا جو اسی عہد کی یادگار ہے خیال ہے کہ
[illegible]ن کی نگاہ سے وہ تذکرہ گزرا ہوگا اسی خیال نے اسے ناسخ سے اس قسم کی غزلیں لکھنے کی فرمائش پر
[illegible]ل کیا، ناسخ استاد وقت تھے جو وہ کہتے تھے تمام شعرا اسی کو اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ تلامذۂ ناسخ کے
[illegible]ں اعضا بدن سے متعلق غزلیں کی غزلیں ملیں گی۔

شعر گوئی کے لیے ناسخ نے قواعد و عروض وغیرہ کی پابندی لازم قرار دی تھی، نئے مضامین کی تلاش
[illegible] ایک ایک چیز کے نئے سے نئے رخ اور تلاش کیے جاتے تھے، ناسخ کی طرح نواب امین الدولہ نے بھی
[illegible]ر لغات" کو بہت اہمیت دی ہے۔ خود کہتے ہیں کہ :۔

خدا کے فضل سے شوق لغت ہے مہر کو اتنا
دھرے رہتے ہیں پہروں نسخۂ فرہنگ سینہ پر

یہ محض شاعری نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ نواب کو لغات سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ اب تک ان کے
[illegible]ندان کے افراد کے پاس مختلف لغات محفوظ ہیں درحقیقت لغات ہی کے سہارے نئے مضامین حاصل کیے جاتے
[illegible]، رعایت لفظی اور الفاظ کی صناعی اور بازی گری کے لیے اس سے بہتر ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا

نواب مہر اشعار میں قافیہ پیمائی کو بھی بہت اہم جانتے تھے، نئے نئے قوافی نئے نئے پہلوؤں سے نظم کر دینا
بلندیٔ فکر اور قوت مشق کی دلیل تھی، اتنا ہی نہیں بلکہ غزل کے اشعار میں مقفّی فقرے اور بھی زیادہ پسند کیے جاتے
، نواب خود کہتے ہیں :-

اے مہر اب غزل ہیں اشعار ہوں مقفّیٰ — کچھ سامعوں کو ہم نے محوِ سخن نہ دیکھا
غزل سنائی جو تو نے ہم کو اسے بھی اے مہر کر مقفّیٰ — ابھی تو اچھی طرح شگفتہ گل ریاضِ سخن نہ دیکھا

مشکل سے مشکل ردیف، قافیہ اور زمین میں شعر کہنے کی کوشش کی جاتی تھی مثلاً :-

اس بات میں حواس بشر پانچوں ایک ہیں — احمد سے تا شبیر و شبر پانچوں ایک ہیں
طرب و ساقی و مے مہر و چمن شاہد و مہر — اے خدا فرق نہ آئے کبھی ان ساتوں میں

ایک ہی ردیف اور قافیہ کو بار بار مختلف پہلوؤں سے نظم کرکے اپنی قدرت کلام اور مشاقی کا ثبوت
ہم پہنچاتے ہیں :-

دکھاؤں مہر میں اب زور طبع رواں — ردیف و قافیہ باندھوں حباب دریا میں

اساتذۂ فارسی میں انوری بندش الفاظ، صنائع بدائع، تشبیہ و استعارہ وغیرہ کے لیے بہت مشہور ہے
اب اس کی "بندش" سے بہت متاثر ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ خوبی اپنے کلام میں بھی بیش از بیش پیدا کر دیں۔

خالی نہ کوئی شعر ہو بندش کے نور سے — اے مہر عالمِ غزلِ انوری رہے

حافظ شیراز کے کلام سے ناسخ بھی بہت متاثر ہیں، نواب ان کے علاوہ سعدی کے الفاظ کے
حسن انتخاب کے بھی گرویدہ ہیں۔ ایک فارسی غزل میں دونوں استادوں سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

من شاعر سعدی وشم، مانندِ حافظ سرخوشم — اے مہر ہر دم میکشم جام مے شیراز را

ایک موقع پر یہ بھی کہتے ہیں :-

مہر طرز نو یہ ہے موزوں ہوا یسی اک غزل — ترجمہ ظاہر ہو قولِ ایزد وہاب کا

زبان کی صفائی، شستگی اور شایستگی کو شاعری کے لیے بنیادی لوازمات میں شمار کرتے تھے کہ اس کے
بغیر کلام میں فصاحت پیدا نہیں ہو سکتی، اپنی فصاحت کے لیے اس طرح دلیل لاتے ہیں :-

کیوں نہ اے مہر فصاحت ہو میری باتوں میں — کہ زبانوں میں ہے اردوئے معلیٰ سے غرض

اردوئے معلیٰ دہلی کے گہوارے میں پلی لیکن لکھنؤ میں اس میں وسعت اور شستگی پیدا ہوئی۔ چناں چہ کہتے ہیں :-

روز کہتے ہیں یہ اردوئے معلیٰ والے — لطف دہلی تو گیا لکھنؤ آباد رہے

محبت کے مضامین لکھنوی شاعری کا خاصہ ہیں، نواب مہر کو بھی ان سے ہی دلچسپی ہے :-

مہر پہ ختم ہیں مضمون محبت انگیز یوں تو اشعار میں کیا کیا شعرا الجھے ہیں

شاعری کے متعلق عام رائے یہ تھی کہ یہ غلط، ناممکن الوجود معاملات اور واقعات کا بیان ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہوا تھا کہ ہمارے شعرا بن دیکھی بہاروں پر نازاں تھے گلگشت مصلیٰ اور آب رکنا باد کی کیفیت، نرگس و سوسن، یاسمن اور سنبل کی لطافتوں کے ذکر سے دواوین بھرے ہوئے گل و بلبل کے عشق کی داستانیں عام تھیں لیکن بیشتر شعرا نے ان کا خود مطالعہ نہیں کیا تھا اور اکثر سامعین ان کی نیرنگیوں سے ناآشنا تھے، بیان کرنے والے زور تخیل سے مضامین نظم کرتے تھے اور سامعین بھی انھیں خیالی باتیں سمجھ کر ہی داد دیتے تھے، عشق کے معاملات بھی بیشتر روایتی اور خیالی تھے، خیالی عاشق ایک موہوم محبوب کی یاد میں ایسا ناتواں ہو جاتا تھا کہ کبھی چیونٹی اس کی لاش اٹھالے جاتی کبھی وہ بستر کی شکن بن کر رہ جاتا روایتی محبوب کا بھی ایسا ہی کچھ حال تھا، اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر مرجانے کے بعد بھی شاعر محبوب سے اظہار عشق کے علاوہ شکووں کا دفتر باز کرتا تھا، غرض شاعری اور جھوٹ تقریباً مترادف ہو کر رہ گئے تھے، ناسخ اور تلامذۂ ناسخ نے اپنے یہاں کے مقامات اپنے یہاں کی اشیا، رسم و رواج اور اپنے یہاں کی بہاروں، سیر و تفریح وغیرہ کو شاعری کا موضوع بنایا وہ جس معشوق سے محبت کرتے تھے اس سے جو جو اور جیسے جیسے معاملات گزرتے تھے ان ہی کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے تھے، انھوں نے شاعری پر سے "جھوٹ" کا "لیبل" ہٹانے کے لیے کافی جرأت سے کام لیا پچھلے لوگ جن واقعات کا اعتراف کرتے ہوئے جھجکتے یا شرماتے تھے یہ کھل کر ان کا اقبال کرتے تھے نواب امین اللہ مہر بھی کہتے ہیں :-

نہیں ہے طرح کا یہ جھوٹ مصرع تاریخ ہوا ہے مہر کو سچ عشق مہوشاں پیدا

۱۲۵۰ھ

بلا شبہ جھوٹ کو "سچ" میں بدلنے کی اس کوشش میں ان شعرا نے حدود سے بھی تجاوز کیا ہے اکثر فحش تک پہنچ گئے ہیں لیکن بہر حال ان کا "جھوٹ" سے انحراف ایک اہم کارنامہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان کی شاعری کا دامن "جھوٹ" سے بالکل پاک ہے روایات کا یک لخت ترک کرنا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن، چناں چہ ان کے کلام میں بھی قدیم روایات کا وجود مل جاتا ہے، البتہ انھوں نے ترقی کا ایک قدم آگے بڑھایا تھا جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

نواب امین الدولہ کا مطبوعہ دیوان ہماری نگاہ سے گزرا ہے اور اسی سے سطور بالا میں اشعار نقل کیے گئے ہیں محقق فاضل قاضی عبدالودود صاحب مدظلہ کا خیال ہے کہ ان کا ایک دیوان اور تھا جس کے شایع ہونے کی نوبت نہیں آئی، اس کے متعلق ہم کوئی رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہیں، مطبوعہ دیوان میں صرف ناسخ کا ذکر ہے اور جتنا

تاریخی غزلیں درج ہیں بیشتر ۱۲۴۹ھ اور ۱۲۵۰ھ کی ہیں، یہ کہنا مشکل ہے کہ نواب کس زمانے میں میر علی اوسط رشک کے شاگرد ہوئے البتہ تذکرۂ ابن طوفان میں جو ۱۲۵۰ھ کی تالیف ہے ان کو رشک ہی کا شاگرد لکھا ہے (ص۵۱) اس سے پتا چلتا ہے کہ نواب اس سے پہلے ہی رشک کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو چکے تھے چنانچہ موجودہ دیوان میں رشک کا اصلاحی کلام بھی ہونا یقینی ہے۔

میر علی اوسط رشک نے ناسخ کے اصولوں پر جس قدر سختی سے عمل کیا وہ مشہور و معلوم ہے، حالت یہ تھی کہ ناسخ خود اپنے تلامذہ کو اصلاح کے لیے ان کے حوالے کر دیتے تھے جیسا کہ منیر کے بیان سے بھی ظاہر ہے، اغلب ہے کہ نواب امین الدولہ مہر نے بھی ناسخ ہی کے مشورہ سے رشک کی طرف رجوع کیا تھا۔ رشک کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ "تاریخ گوئی کا ٹھیکہ" قدرت نے انھیں دے رکھا تھا، غالباً انھیں کی جدت تھی کہ مقطعوں میں غزلوں کی تاریخ کہی جانے لگی، نواب مہر کے دیوان میں متعدد غزلیں تاریخی ہیں[۱] چند مقطعے مثالاً نقل کرتا ہوں۔

طبیعت آ گئی ہے کیا بتاؤں پیار کا باعث
ہے مہر اب عیسوی تاریخ طرح و یار کی خاطر
۱۸۳۴ء

اپنا عدو کہیں نہیں گا ہے سوائے چرخ
تاریخ طرح دیکھ روی چرخ کی ہے مہر
۱۲۵۰ھ

مہر مہ پیکر وہ میرا سب کو آیا خواب میں
خواب وصل یار کی یہ عیسوی تاریخ ہے
۱۸۳۳ء

بس محبت ہے گل و غنچہ دہن سے ہم کو
یہ ہوئی طرح کی اے مہر مسیحی تاریخ
۱۸۳۵ء

دل میں بس آفتاب روشن ہے
یہ ہے تاریخ داغ و طرح اے مہر
۱۲۵۱ھ

شب یک شنبہ اب انیسویں ماہِ محرم ہے
تجھے اس شب جو دیکھا خواب میں تاریخ یہ لکھی
۱۲۴۹ھ

---

[۱] ایک لطیفہ اس موقع پر نقل کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جس وقت راقم سطور دیوان مہر کا مطالعہ کر رہا تھا عہد حاضر کے نامور شاعر جناب نشور واحدی تشریف رکھتے تھے، ان تاریخوں کو دیکھ کر موصوف نے بے ساختہ فرمایا "کتنے باشعور یہ شعرا تھے" میں نے وجہ دریافت کی فرمایا کہ "ان کے دواوین سے اُس عہد کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے" یہ حقیقت ہے کہ ان شعرا کے دواوین کو واقعات کی دریافت کے لیے ایک اہم ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے زمانے میں دستور ہے کہ شاعر اپنے دیوان میں غزل کا سال بھی لکھ دیتا ہے۔ زمانے کے تعین سے دو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں وہ سب مذکورہ طرز کے مقطعوں سے بھی حاصل ہیں اس کے علاوہ ان مقطعوں سے شاعری کی قدامت کلام، اور تاریخ گوئی کی مہارت کا بھی ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ بسا اوقات ان سے غزل کے پس منظر کا اندازہ ہوتا ہے اور بعض واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں جو تنقیدی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

غزل مسلسل کا رواج متقدمین کے یہاں تھا، جرأت اور نظیر وغیرہ کے یہاں بھی اس کی خاص مثالیں ملتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ غزل کی یہ صورت کم وبیش متروک ہو چلی تھی، نواب مہر نے غزل مسلسل کی طرف توجہ کی اور بیشتر کسی مخصوص واقعہ کا بیان یا کسی خاص مقصد کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر دو غزلیں نقل کی جا چکی ہیں جن کا ایک ایک مصرع پھر درج کرتا ہوں:-

(۱) امروز سیاہ است جہاں در نظر ما

(۲) سارے عالم کو مبارک ہو تری بسم اللہ

بعض غزلیں ایک مخصوص پس منظر میں کہی گئی ہیں، مثال کے طور پر ایک غزل کے چند شعر نقل کرتا ہوں۔

ہم کو شہا دیس نکالا ملا تا بہ گدا دیس نکالا ملا

لکھنؤ تھا جسم تو ہم جان تھے آئی قضا دیس نکالا ملا

شاہ ہم اس حکم کے دیوانے ہیں بے سر و پا دیس نکالا ملا

ظلم ہے شیطاں بنی آدم ہیں ہم

مہر بجا دیس نکالا ملا

اس قسم کی غزلوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ غزل میں طرز بیان اور مضامین کے لحاظ سے "ناہمواری" پائی جاتی ہے حقیقت سے بعید ہے، یہ شعرا قافیہ بندی کو اپنا کمال فن ضرور جانتے تھے لیکن چوں کہ ایک نشست میں عموماً غزل پوری کر لیتے تھے یا ایک مخصوص خیال کے تحت غزل کہتے تھے اس لیے ان کے اشعار میں ربط ملتا تھا، ہاں طرحی غزلیں جو مشاعروں میں زور بیان اور مشاقی و قادر الکلامی کے اظہار کے لیے کہی جاتی تھیں ان کا معاملہ مختلف ہو سکتا تھا۔ غزلوں میں واقعات، حادثات اور تاثرات کے اس طرح نظم کرنے سے اس صنف سخن میں وسعت پیدا ہوئی، چونکہ غزل اردو شاعری میں سب سے زیادہ مقبول صنف سخن تھی اس لیے غزل کی وسعت نے مجموعی طور پر اردو شاعری کو بھی وسعت عطا کی چناں چہ بہت جلد اردو شاعری میں "مقصدیت" کی رو دوڑ گئی نئے نئے تجربات کیے گئے اور مختلف انداز کی کامیاب ترین تخلیقات سامنے آئیں۔ مقصدی شاعری کے لیے ان اساتذہ کا کلام ابتدائی "نقوش" کی حیثیت رکھتا ہے لیکن عام طور پر ان کی شاعری کے اس تعمیری پہلو کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے

ناسخ اور تلامذہ ناسخ کے یہاں "حسنات" کی تلاش کا عجیب شوق معلوم ہوتا ہے، ہر شخص "طرز نو" کے ایجاد کی فکر میں منہمک معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر بڑے اور چھوٹے کے معقول مشوروں کو قبول کرتے تھے، چناں چہ محسن نے جو رشک شاگرد ناسخ کے شاگرد تھے استاد الاستاد ناسخ کو ایک مشورہ دیا اور انھوں نے اسے قبول کیا جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔
نواب امین الدولہ مہر کی طبیعت میں بھی اختراع اور ایجاد کا مادہ بہت تھا، ناسخ اور رشک کے علاوہ کتنے ہی دوسرے شعرا ان کے وابستگان دولت میں تھے، نواب کی فرمایش پر انھوں نے متعدد غزلیں کہی ہوں گی، رشک اگرچہ نواب کے استاد تھے کھل کر نواب کے فیض کی صحبتوں کا اعتراف کرتے ہیں:۔

غزل کا ہر شعر گرم تر ہے کلام رشک آتش و تر ہے یہ صحبت مہر کا اثر ہے کہ سر د اس کا سخن نہ دیکھا

نواب کے حالات اور کلام کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے اثرات اس عہد کے پورے شاعرانہ ماحول پر مرتب ہو رہے تھے۔ لکھنؤ اگرچہ دار السلطنت تھا لیکن شعرا جو قدر دانی کے "بھوکے" تھے یکے بعد دیگرے کان پور آتے رہے، رفتہ رفتہ کان پور میں شاعری کا ایک ماحول پیدا ہو گیا تھا، مثلاً شیخ امام بخش ناسخ کے تلامذہ میں پنڈت سندر لال بسمل، ولی، امیر، سیفی، تجلی، نواب سید علی حسین خاں تمنا وغیرہ، میر علی اوسط رشک کے شاگردوں میں مرزا اکبر علی ساحل، مرزا محمد علی آرزو، سید محسن علی محسن، نواب نظام الدولہ بہادر سید، میر محمود جان اوج، میر رضی رضا، میر عبد اللہ توقیر، شیخ الٰہی بخش عشق، ہادی حسن محرور، شیخ ابو محمد عیش، غنی احمد غنی، منشی احمد حسن خاں عروج، محمد باقر فکر، سعادت خاں سعادت، خوشوقت علی خاں خوشوقت اور منیر شکوہ آبادی کے تربیت یافتگان میں پنڈت سندر لال فہم وغیرہ وغیرہ کا حال تذکروں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ خود نواب کے خاندان کے اکثر و بیشتر افراد شعر کہتے تھے، ان اکثر کے یہاں الگ الگ محفلیں سجتی تھیں مثلاً نواب نظام الدولہ، نواب معین الدولہ، نواب دولھا وغیرہ کے یہاں شعرا کے جمگھٹ رہتے تھے، مقابلے کے مشاعرے ہوتے تھے، خود اہل شہر کو شعر و ادب کا اتنا شوق پیدا ہو گیا کہ یہ اپنے گھروں پر بھی مشاعرے کرتے رہتے تھے، عروج کے یہاں منیر شکوہ آبادی بھی کچھ عرصہ رہے ہیں، یوں بھی عروج اور تجلی کے مشاعروں کی داستانیں کان پور کے شعرا سے سنی جا سکتی ہیں غرض یہ کہ کان پور میں عجیب شعری دلچسپیاں پیدا ہو گئی تھیں، لکھنؤ کے شاہی دربار میں کچھ عرصے کے لیے شعر و سخن کا مذاق تعطل میں پڑ گیا تھا یوں بھی وہاں ناسخ کے علاوہ دوسرے شعرا کے اثرات موجود تھے لیکن کان پور میں ناسخ اور ان کے بعد رشک کے طرز کی عام طور پر تقلید کی گئی تھی، رشک اگرچہ لکھنوی مشہور رہیں لیکن ان کے صحیح اثرات معلوم کرنے کے لیے کان پور کے شعرا کے کلام کا مطالعہ ضروری ہے، کان پور کو مجموعی طور پر "دبستان رشک" کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہیں اور رشک کے اقتدار اور اعزاز میں نواب امین الدولہ مہر کی قدر دانی کو پورا پورا دخل ہے۔ رشک خود ایک موقع پر کہتے ہیں:۔

جناب مہر، رشک بے نوا کو لوگ کہتے ہیں سخنداں ہو تو ایسا ہو، سخنور ہو تو ایسا ہو

نواب امین الدولہ مہر اپنے استاد رشک کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے بڑی انسیت رکھتے تھے
۔ کا بھی یہ حال تھا کہ لکھنؤ سے نواب آئے تو یہ بھی چلے آئے اور ان پر سے عراق کے لیے یہ بھی نواب کے ہمراہ ہو گئے
انتقال ہو گیا تو رشک واپس نہیں آئے بلکہ جس بہ کلد کے نمک خوار تھے آخر تک اسی سے وابستہ رہے۔ انتقال مہر کا بعد
داداری کا رشک نے بھی اچھا نمونہ پیش کیا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ نوابین اپنے شعراء سے موقع بہ موقع اشعار کی فرمایش کرتے تھے
نتیجہ یہ تھا کہ شعرا اکثر بیدلی سے بے تکے اشعار کہنے پر بھی مجبور ہوتے تھے، لیکن رشک کو اعتراف ہے کہ نواب نے
کسی تقریب پر بھی ان کو شعر کہنے کی تکلیف نہیں دی۔

نوکر بھی ہوں اس کا کہ جو تقریب ہو کوئی   تکلیف نہ دے قطعہ کی اللہ رے اخلاق

ہر ایہ عجیب بات ہے لیکن اس سے نواب کی متانت طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ نواب ہر
یب پر استاد کو خلعت سے نوازتے رہتے تھے، رشک ہی کا قول ہے:

"کوئی تقریب ہو، ہوا خلعت"

اعر نوازی کا یہ انداز کم امرا کے یہاں ملے گا۔

نواب امین الدولہ مہر لکھنؤ کے پہلے وزیر اعظم کے فرزند اکبر تھے، ان کے حالات گویا اس دور کے تاریخی واقعات ہیں، خود
اعر تھے، ناسخ اور رشک کے شاگرد تھے، انھوں نے استادوں کے اصولوں پر عمل کیا اور ذاتی اجتہاد سے ان کی "قدیمی"
آگے بڑھایا، لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسے مقام پر جہاں بقول رجب علی بیگ سرور "اشراف
نقا صفت ناپید" تھے جہاں شعر و سخن کا کوئی تذکرہ نہیں تھا اردو شاعری کا ماحول پیدا کیا، نہ صرف ماحول پیدا کیا بلکہ ایک
مخصوص طرز و زبان کو بھی رائج کیا جسے ہم نے سطور بالا میں "دبستان رشک" کہا ہے۔ یہ دبستان اسی طرح پروان چڑھ سکتا
تھا جس طرح لکھنؤ میں ایک مخصوص طرز شاعری رائج ہوا لیکن نواب مہر کے ساتھ رشک کی ہجرت کے علاوہ لکھنؤ میں جہاں عالم
واجد علی شاہ کی شعرا پروری نے اس دبستان کو بہت جلد ختم کر دیا، تمام شعرا کان پور سے پھر لکھنؤ منتقل ہو گئے اور کان پور
میں پھر شاعری کا ماحول سرد پڑ گیا، اگر حالات نے اس طرح کروٹ نہ لی ہوتی تو یقیناً نواب مہر کا اردو شاعری میں
ایک امتیازی مقام ہوتا، پھر بھی ان کے کارنامے قابل احترام ہیں اور انھیں فراموش کر دینا انصاف سے بعید ہے۔

---

[1] یہ بات قرین قیاس نہیں کہ عراق چلے جانے کے بعد نواب امین الدولہ مہر اور رشک وغیرہ نے شاعری یک لخت ترک کر دی قیاس کہتا ہے کہ
وہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں ضرور جمتی ہوں گی، البتہ انداز بدل سکتا ہے مثلاً یہاں محبت کے مضامین باندھتے تھے وہاں شاعری منقبت اور مرثیہ کی
شکل اختیار کر سکتی تھی یا یہاں پر اردو میں شعر کہتے تھے کبھی کبھی فارسی میں بھی کہہ لیتے تھے وہاں فارسی کی طرف رجحان زیادہ ہو گیا ہو وغیرہ وغیرہ
ہو وہاں کی شعری نشستوں کا حال بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتا۔ راقم سطور کو ایک نواب صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ رشک
وہاں بھی اردو میں غزلیں کہتے ہیں لیکن مذہبی مضامین نظم کرتے تھے۔

شہاب سرمدی

اردو رسم الخط - ایک اپیل

انسانی تہذیب کی ارتقائی تواریخ میں لکھنے کے تین طریقے ملتے ہیں۔ ایک مصر کا، دوسرا عراق قدیم (سُمیر) کا اور تیسرا چین کا۔ ان سب کی ابتدا کسی ایک طریقے سے ہوئی ہو یہ بھی ممکن ہے، لیکن ابھی تک یہ تین طریقے الگ الگ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں مصری طریقۂ تحریر، یونانیوں کے زیر اثر جلد ترقی کر گیا اور مقابلۃً زیادہ وقیع قرار پایا۔ مصری مسودات آج سے چھ ہزار سال پہلے کے بھی پائے جا چکے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کا طرز تحریر اس وقت تک بھی کافی ترقی کر گیا تھا۔ یہ طرز موجودہ اصلاح کی رو سے مصمتوں پر قائم تھا، مصوتے لکھنے میں نہیں آتے تھے پڑھتے وقت قرائن سے جوڑ دیے جاتے تھے۔

اہل مصر اپنے کو فن تحریر کا موجد سمجھتے ہیں۔ ویسے ایک عرصے سے قیاس بھی یہی کیا جا رہا ہے کہ یورپ کے حروف تہجی مصری علامات کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ فنیقیوں نے یہ فن مصریوں سے سیکھا اور سمندری علاقوں پر حکمراں ہونے کے ناتے آس پاس پھیلایا۔ یہ سامی طرز تحریر تھا۔ اس کا انداز دائیں سے بائیں لکھنے کا تھا۔ یونانی طرز تحریر پر اس کا بڑا اثر پڑا، یونانی دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں دونوں طرح لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کچھ حروف اُلٹے ملتے ہیں۔

یونانیوں نے سامی طرز تحریر کے حرفی ارکان کی جگہ مفرد حروف وضع کیے اور مصمتوں (Consonants) کے ساتھ مصوتوں (Vowels) کو بھی حروف گردانا۔ ان حروف کے لیے انھوں نے علامات بھی وضع کیں۔ اور انھیں الگ سے نام دیے۔ اسی لیے سامی اور یونانی میں مصمتوں کے نام تو کہیں کہیں ایک سے ہیں، مصوتوں کے نہیں۔ سامی میں دوسرا حرف beta (ب) یونانی میں [illegible] ہے۔ تیسرا حرف [illegible] gimel یونانی Gamma [illegible] الف (بیل)، یونانی میں alpha ہو گیا۔ لیکن سامی زبان میں [illegible]

اور ... مخفف ہو کے 'a' بن گیا۔ اسی طرح یونانی 'e' اور 'o' بھی مصمتوں سے ترقی کرکے مصوتے ہوئے ہیں۔ 'i' کی علامت بھی یونانیوں نے مصوتے کے روپ میں اختیار کی۔ رسم الخط کی تاریخ میں مصوتوں کا اضافہ یونانیوں ہی کا کارنامہ ہے۔ سامی قوموں نے مصوتوں کے استعمال کو سدا غیر ضروری سمجھا۔ یہاں تک کہ آج بھی عربی داں طبقے میں اعراب لگانا دوسرے کو ذلیل کرنا سمجھا جاتا ہے۔[۵]

سامی اور آریائی (یونانی) طرز تحریر کا یہ بنیادی فرق نظر میں رکھنے کی بات ہے۔ اس لیے کہ اردو رسم الخط جیسے فارسی نستعلیق کا ورثہ دار سمجھا جاتا ہے عربی علامات ہی پر قائم ہے۔ یہ علامات جنھیں "حروف ہجا" بولتے ہیں یہ ہیں:

حروف علت: ا، و، ی = ۳ حروف

حروف صحیح: ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ء = ۲۶ حروف

ان حروف کے علاوہ جب عربی ایران پہنچی تو فارسی کے 'الفباء' میں اس کی مخصوص آوازیں پ، چ، ژ، گ بھی شامل کرلی گئیں، اور انھیں بائے فارسی، جیم پارسی، زائے پارسی اور کاف پارسی کہا گیا۔ اسی طرح جب یہ فارسی ہندوستان میں پھیلی تو جن آوازوں کی زیادہ ضرورت پڑی ان کے لیے فوراً جگہ پیدا کرلی گئی اور انھیں فارسی حروف تہجی میں ان ناموں سے داخل کرلیا گیا۔

(۱) ट = ٹ ۔ تائے ہندی

(۲) ड = ڈ ۔ دال ہندی

(۳) ड़ = ڑ ۔ رائے ہندی

وضع و اختیار کا یہ سلسلہ رکا تو نہیں لیکن حروف علت کو حروف صحیح مان کر ان کی جملہ حرکات وسکنات کے لیے نہ نئی علامات اختیار کی جاسکیں اور نہ پرانی علامتوں میں اتنی گنجایش پیدا کی گئی کہ جس لفظ کو جس طرح بولیں لکھ سکیں اور جو لکھیں وہی پڑھا بھی جاسکے۔ سچ پوچھیے تو یہ احساس ایک آریائی زبان کی حیثیت سے فارسی کو ہی ہو جانا چاہیے تھا، خاص کر ایسی حالت میں کہ اُسے 'واؤ' معروف کے ساتھ 'واؤ' مجہول اور 'واؤ' معدول؛ اور 'یائے' معروف کے ساتھ 'یائے' مجہول کی آوازوں کے لیے انتظام کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ ہو نہ سکا اور اردو نے فارسی کے قدم بہ قدم اعراب ہی پر اکتفا کی حالاں کہ اُسے اپنی "ریختگی" کے حق میں

---

۵ یہ ایک مسلمہ ہے کہ عربی کلمات پہ حرکات وسکنات یعنی اعراب کا اضافہ حجاج بن یوسف ثقفی کی ایما سے ہوا، پھر بھی اہل زبان اب بھی اسے غیر ضروری جانتے ہیں۔

فارسی سیکھیں یا دوسرے شاعر پڑھیں کر کے اس کمی کا بروقت ازالہ کر لیا تھا۔

جدید فارسی نے تو واؤ اور یے کی مجہول آوازوں کو ختم کر کے اپنی مشکل بہت کچھ آسان کر لی، حالاں کہ واو معدولہ پھر بھی رہ گیا۔ اس کے علاوہ آمدہ لکھنا اور آمدے جیسا پڑھنا اب بھی باقی ہے۔ اردو کے لیے اپنی مجہول آوازوں کو ختم کر دینا ممکن نہیں بلکہ اُسے اُن سے بھی زیادہ ملائم آوازوں کے لیے صورت نکالنی ہے اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ بڑی چھوٹی آوازوں میں فرق قائم کیا جا سکے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی ، اور

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو

میں لفظ کوئی، دیوناگری ہو یا اُردو ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے، اسی طرح

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں، اور

..... ترے تیر نیم کش کو

ایک جیسا لکھتے ہیں (بلکہ دیوناگری میں تو تیرے اور ترے میں بھی فرق ممکن نہیں) لیکن پڑھتے الگ الگ ہیں۔ یہ حروف کو گرا دبا کر اور کھینچ کر پڑھنے ہی کا سوال نہیں اپنی لکھاوٹ کو اپنی زبان کے بڑھتے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے کافی و وافی بنانے کا اور ہو سکے تو دوسری زبانوں کے لغات کو سمو سکنے کا مسئلہ ہے۔ عربی اور سنسکرت جیسی کلاسیکی زبانوں میں ہر حرف بلکہ اس کی ہر حرکت و سکنت کو بھی ایک خاص انداز سے ظاہر کرنا لسانی فریضہ تھا۔ چھاندس زبان میں اُدات، اَنُدات کا انداز اور عربی سنسکرت میں شُدھ اچارن اور صحیح قرأت پر زور اس پر دال ہیں۔ عربی میں شدّ و مدّ کے اصول، حروف کو ایک الف سے لے کر سات الف تک کھینچ کر ادا کرنے کے طریقے اسی طرح سنسکرت میں سَندھی کے ضابطے اور کہیں کہیں پلوت کی حد تک آوازوں کو طول دینے کی شرط اسی رُخ کا پتہ دیتی ہے۔ براہمی اور نسخ نے لازماً اسی رخ کو اختیار کیا۔ ان کے سامنے ایک الف سے کم والی آوازیں تھیں ہی نہیں اس لیے ان کا کوئی سوال نہ اٹھا۔ پھر جب دیوناگری نے براہمی کی جگہ لی تو وقت کے ساتھ اس میں بہت سی تبدیلیاں آتی گئیں لیکن نسخ نستعلیق بنا تو وقت کے ساتھ نہ چل سکا۔ اردو نے اسی رسم الخط کو اپنایا اور اُسے جوں کا توں لے لیا، حالاں کہ جو زبان روزمرہ پر قائم ہوئی تھی اُسے اپنے مجموعی لہجے کی خاطر الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور آواز کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کو وہی اہمیت دینی چاہیے تھی جو خود روزمرہ کو زندہ رکھنے کے لیے دی گئی۔

اردو طرزِ تحریر کی اس کمی کو پچھلے سو سالوں سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس صدی کے اوائل سے اصلاحوں اور اصلاحی تجویزوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ مصباح القواعد سنہ ۱۹۰۲ء میں دوبارہ چھپی تو انجمن ترقی اردو

کے ارکین کے علاوہ علامہ شبلی، مولوی نذیر احمد، مولوی علی حیدر طباطبائی، مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی ذکاء اللہ اور شیخ (ڈاکٹر) محمد اقبال وغیرہ نے اسے "اضافہ، ترمیم اور اصلاح" کے بعد مکمل و معتبر ہونے کی سند دی۔ صاحب مصباح نے اردو حروفِ تہجی کی فہرست دیتے ہوئے ایسے حروف جن میں 'ہ' کی آواز بالکل پیوستہ ہو یعنی

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ، مھ، نھ

کو علی الترتیب بھے، پھے، تھے، ٹھے، جھا، چھے، دھا، ڈھا، رھے، ڑھے، کھے، گھے، لھا، مھا، نھا، نام دیے تھے اور یہ سفارش کی تھی کہ انھیں مفرد حروف مان لیا جائے۔ یہ چیز اب رواج پا چکی ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدائی درسی کتابوں میں یہ سارے حروف داخل کیے جائیں اور انھیں ناموں سے انھیں پہچنوایا پڑھایا بھی جائے۔

دیوناگری لپی کے بھی آخری تین حروف क्ष، त्र اور ज्ञ مرکب سے مفرد بنائے گئے ہیں:۔

क्ष - क + ष تھا؛ چناں چہ कष لکھنے کی مثالیں موجود ہیں۔

त्र - त + र تھا؛ یہ 'ر' (= र) پر ایک ٹیڑھی لکیر دے کر بنا ہے۔

ज्ञ - ज + ञ تھا؛ یہ لکھا ज + ञ جاتا ہے لیکن پڑھا الٹا۔

ان حروف کے علاوہ بھی کچھ مرکب آوازیں ہیں جن کے صحیح املا کے بارے میں آج کل بھی غور کیا جا رہا ہے، مثلاً

(۱) وہ حروف جن کے آخر میں کھڑی پائی ہوتی ہے جیسے स، न، म؛
(۲) " " " ادھورا انکس ہوتا ہے جیسے फ، झ، क؛
(۳) " " جو ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں، جیسے द، ढ، ड، ठ، ट؛
(۴) اور ह۔

اس سلسلے میں ایک سے زیادہ تجویزیں زیرِ غور ہیں، لیکن 'र' کے معاملے میں کافی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ اس لیے کہ 'र' جب کسی حرفِ صحیح کے پہلے آتا ہے تو اڑ کر اس کے سر پر بیٹھ جاتا ہے، جیسے '[illegible]' میں۔ جب بعد میں آتا ہے تو کہیں ایک چھوٹی سی لکیر کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جیسے 'प्र' میں۔ کہیں حرف کے نچلے حصے میں ایک پیکانی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے 'ट्र' میں۔ 'र' کی یہ من مانی ختم کرنے کے لیے کچھ ماہرین کی رائے ہے کہ مراٹھی 'र' کی یہ " ʼ " علامت اڑاتے ہوئے 'र' کے لیے اختیار کر لی

جائے، اگر [illegible] یا [illegible] لکھنا ہو تو اسے [illegible] اور [illegible] لکھا جائے، لیکن بقیہ حالات میں [illegible] کو دوسرے حروف کے ساتھ ملا کر لکھنا ہو تو تجویز یہ ہے کہ اسے پورا لکھا جائے، جیسے [illegible] کو [illegible]، اور [illegible] کو [illegible] وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح کچھ اور اصلاحیں بھی ہیں جو دیوناگری کو ایک اور زیادہ ترقی یافتہ رسم الخط بنانے کے لیے زیرِ نظر ہیں۔ مقصد یہ کہ اردو نے ہکاری آوازوں سے مرکب حروف کو مفرد مان لیا تو کوئی نئی بات نہ کی۔ اسی طرح وہ دوسری مفرد صفت مرکب آوازوں کے لیے اگر کوئی نئی صورت نکالے یا کوئی نئی علامت اختیار کرے تو وہ بھی کوئی نئی بات نہ ہوگی، خاص کر ایسی حالت میں کہ اس کے سامنے بھی وہی مصلحت ہے جو دیوناگری کے، یعنی مرکب حروف کا صحیح املا کیا ہونا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اردو نستعلیق اس معاملے میں چنداں سہولت سے ہے اس لیے کہ حروف کو ملا کر لکھنا اور صحیح لکھنا اس کے لیے مقابلتہً زیادہ آسان ہے۔ مثلاً انھیں حروف کو لیجیے جنھیں ملا کر لکھنا دیوناگری میں دشواری پیدا کر رہا ہے یا کر چکا ہے۔

(۱) [illegible] اور [illegible] = ان کو ملا کر لکھنے کے لیے صلاح دی گئی تھی کہ [illegible] کی پائی گرا کر '[illegible]' لکھا جائے۔ اسی طرح '[illegible]' اور '[illegible]' وغیرہ لکھے جائیں۔

(۲) [illegible] اور [illegible] = ان کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ '[illegible]' میں آنکس کا نچلا حصہ کاٹ کر [illegible] لکھا جائے، الخ

(۳) [illegible] اور [illegible] = اس معاملے میں اختلاف آرا اب بھی قائم ہے، لیکن ہل انت دے کر لکھنے (‌[illegible]، [illegible]، [illegible] وغیرہ وغیرہ کا رواج اب عام ہو چلا ہے۔

(۴) '[illegible]' کے متعلق اوپر عرض کیا جا چکا۔

اردو میں اکثر ایسے حروف ملا کر ہی لکھے جاتے ہیں۔ چناں چہ میانہ قد، فلسفۂ نیائے، سیانا آدمی، کیا کیا؟، کیاری، پیالہ، پیارا، گیارہ، خیالیہ (خیال گائک) چیونٹی، تیاگ، تیوری، ٹھیاگ راجہ، دھیان، نیاریہ، نیاؤ، نیوتا، بیاج، بیوہار، بیاہ، کتربیونت، بیوتہ، ویاکرن، ویاس، شیام، سیار، ہیاؤ (ہمت)، وغیرہ،

اسی طرح ایسے الفاظ بھی بہ کثرت ہیں جن میں "ر" ([illegible]) کا حرف کسی دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر مرکب بولا جاتا ہے اور ویسا ہی لکھا پڑھا بھی جاتا ہے، جیسے بریک، ترپ، ٹرام، ٹرین، ٹرنک، پریس، پراگندہ، متری، فری، خرشچوف، کریم، گرنتھ، گرام، چھتری، چتر، تراہ، ترپتا (ایک جگہ)، برہما، اپ بھرنش، وغیرہ، [1]

---

[1] اردو میں یہ الفاظ دوسری زبانوں سے زیادہ تر آئے ہیں۔ اب بولے سمجھے جاتے ہیں اس لیے اردو کے بھی ہیں۔

ان کے علاوہ وہ الفاظ ہیں جو املا کرکے تو نہیں جاتے، لیکن پڑھے زیادہ تر منفرد آواز سے جاتے ہیں۔ مثلاً
دھام، ڈھنگ، ڈھکوسلا، دیال باغ، دھراوڑ، دروپدی، دھرتا چاری، دھکم پیل، دھار وغیرہ وغیرہ۔

ان الفاظ کے لکھنے اور صحیح پڑھنے میں اردو والوں کو اس لیے آسانی ہے کہ یہ عام بول چال کے الفاظ ہیں پڑھنے والے نے ذرا سا اشارہ پایا اور پڑھ لیا، لیکن اتنا ہی کافی نہیں۔ اردو ادب میں اب وہ الفاظ بھی داخل ہو رہے ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیے جو علمی اور ادبی حلقوں میں بولے جاتے ہیں مگر غیر مانوس ہیں یا اہم علوم و ادب کی کتابوں سے لیے جا رہے ہیں اور ان کی ضرورت ہے۔ ان میں آریائی زبانوں، خاص کر سنسکرت کے اکثر و بیشتر الفاظ یا ان کی ترکیبی صورت میں ایسے حروف جا بجا ملتے ہیں جو مخلوط الصوت ہوتے ہیں، مثلاً۔

پرتھم، پرکاش، پرتین، پرورتی، پرت، پرکیت، درشٹ، وکیت، کشرت، ایشٹپت، شرون، چھاتر، پاتر، گرہن، سوروپ، پرپاس، ترپت، پرشن، ودیھا، جوالا، پرتیک، کاویہ، سوریہ، کریا، بھرم، ساہتیہ، باہیہ، سبھیتا، کرت، پرگت، ستیہ وغیرہ وغیرہ؛

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کچھ الفاظ مثلاً گرہن (گہن) سوروپ (سروپ) سوریہ (سورج) بھرم (بھرم) اردو میں روزمرّہ کے وسیلے سے پہلے ہی سے موجود ہیں اور یہ بھی بجا ہے کہ اِندر کو (اِنّدر) اور کرشن کو کشن یا کرِشنا بنا کر بولنا لکھنا اس کے مزاج کے بالکل مطابق ہے۔ یہ بھی درست کہ ساکنین کے علاوہ (جو کسی لفظ کے آخر ہی میں آسکتے ہیں) دو یا دو سے زیادہ حروف کو ایک ساتھ ایک ہی حرکت یا سکنت کے ساتھ ادا کرنا اردو کا نجی لہجہ نہیں لیکن جہاں یہ سب ہے وہاں یہ بھی ہے کہ اسے جس سماج میں رہ کر زندہ رہنا ہے اور ترقی کرنا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ سے روز بروز سابقہ بڑھتا جائے گا، اور یہ نہ سہی تو کم سے کم تنقید و تبصرہ، تذکرہ و تاریخ اور تقابلی مطالعے کے سلسلے میں سنسکرت علم و ادب اور فلسفہ و حکمت سے، ساتھ ہی ساتھ ان زبانوں کے نظم و نثر سے بھی واسطہ ضرور پڑے گا جو سنسکرت سے متاثر ہیں یا جن سے خود سنسکرت متاثر ہوئی ہے۔ اس بنا پر اردو رسم الخط میں ایسے الفاظ کو جتنا اب تک لکھنا پڑا ہے اس سے کہیں زیادہ اور ان کے صحیح ہجّے کو برقرار رکھتے ہوئے لکھنا ہوگا۔ اور جب یہ ہونا ہی ہے تو ایک علامت بھی متعین کرنا پڑے گا۔ اردو میں پیکانی علامت (^) کافی رواج پا چکی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کہیں وہ جزم کے بدلے

لہ اردو میں یہ الفاظ دوسری زبانوں سے زیادہ تر آئے ہیں۔ یہاں ایک بات کہنے کی ہے وہ یہ کہ ایسے الفاظ کا صحیح تلفظ اور املا اردو میں اگر کم الجھا نہیں تو اتنا ہی الجھا ہے جتنا دیوناگری میں۔

تبدیل ہونے کی ہے کہیں diphthong کے لیے۔ میری سفارش ہے کہ اگر اس سے موزوں تر علامت مل سکے تو انجمن اسی کو مستند قرار دے دے۔ ویسے بھی سنسکرت کے شُنگیت ورنٹ، ایک قسم کے diphthong ہی ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو لکھاوٹ، خاص کر 'رٖ' (ऋ) کے معاملے میں دیوناگری سے زیادہ ہموار ہوگی، مثلاً۔

اردو	دیوناگری	
کرٖشن	कृष्ण ،	कृष्ण
ورٖنداون	वृन्दावन ،	वृंदावन
برٖہما	ब्रह्मा	
براہمن	ब्राह्मण ،	ब्राह्मण
سورٖیہ	सूर्य	
شرٖنگار	शृंगार	
شرٖدّھا	श्रद्धा	
شلکشن	श्लक्ष्ण	(مہین، نرم وغیرہ)

کلاسیکی سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانوں، خاص کر دکنی زبانوں، میں ایک آواز "انان" (ण) کی بھی ہے۔ اردو میں اس کے لیے کوئی حرف نہیں۔ اب بڑھانا ہوگا۔ میری تجویز ہے کہ یہ آواز چوں کہ 'न' (ن) کی پیش رو ہے، اس لیے ہم اسے نون ہندی کی صورت میں ٹ، ڈ اور ڑ کی طرح ݨ لکھ سکتے ہیں[1]۔ اس ایک اضافے سے اردو نگاری، آوازوں پر قادر ہوجائے گی، اور چوں کہ خ، ز، ژ، غ، ف اور ق اس کے الفبا میں شروع سے شامل ہیں اس لیے اسے کسی اور نئے حرف کی ضرورت نہیں پڑے گی[2]

---

[1] کبیر، میرا، جائسی وغیرہ کے کلام میں بھی یہ آواز جابجا ملتی ہے۔ لیکن بعد میں برج بھاشا اور اودھی بولیوں میں یہ 'न' (ن) کی آواز سے بدلتی گئی۔ پراݨ پران اور گݨ گن ہوگیا۔ پہلے 'ٹ' کو بھی ٹ لکھا جاتا تھا۔ بعد میں نقطے غائب ہوگئے اسی طرح 'ݨ' کو بے نون کے پیٹ میں نقطہ دیئے ݨ بھی لکھ سکتے ہیں۔

[2] میں انھیں حروف میں 'ہائے مختفی' کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔ اصطلاحاً یہ 'ہ' صرف اپنے پہلے آنے والے حرف کی حرکت کو ظاہر کرتی ہے، جیسے دانہ، افسانہ میں، لیکن اردو میں زیادہ تر 'الف' کی طرح پڑھی جاتی ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ اسے اپنی اصلی حالت پر قائم رکھا جائے۔ الف بناکر پڑھے جانے کو ضرورت شعری پر محمول کیا جائے۔ اس سے چند در چند آسانیاں بہم پہنچیں گی۔

اب رہا مسئلہ حروفِ علت اور صحیح اعراب کا۔ ہماری دانست میں اردو کو اس باب میں [illegible] ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ قرآنی اعراب کے زبر، زیر، پیش، جزم، مد اور تشدید تو اردو میں بھی ہیں، ایک اور ابھی اتنے رائج نہیں۔ انھیں بھی باضافہ اختیار کر لینے کے بعد جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اتنا ہی اور رہ جاتا ہے کہ انھیں اردو کے لسانی مزاج کے مطابق رواج دیا جا سکے۔ یہ عمل بھی [illegible] ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں جتنی بھی معقول تجویزیں انجمن ترقی اردو کے پاس ہوں ایک بورڈ کے سامنے رکھ دیا جائے جو اپنا متفقہ فیصلہ دے دے اور پھر اس فیصلے کا عمل درآمد ہو جائے۔

اس باب میں یہ واضح کر دینا ہے کہ اردو زبان کے مزاج و کردار کو دیکھتے ہوئے جس طرح قرآنی اعراب اپنی ضرورت بھر اختیار کر لینا اس کے لیے بالکل فطری عمل ہوگا، اسی طرح ٹھیٹھ ہندوستانی یا ننے پیسے ہوئے الفاظ کے لیے ایک آدھ نئی علامتوں کو اپنا لینا بھی قدرتی ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لازمی ہوگا کہ اردو اپنے مخصوص لہجے کی مناسبت سے حروفِ علت پر اعراب کے عمل کا پھر سے جائزہ لے اور ہر آواز کو اسی حد تک متحرک اور ساکن ظاہر کر سکے جتنا اُسے ہونا چاہیے۔ اس کا عینی اندازہ متعلقہ علامات و اصطلاحات کو سامنے رکھ کر ہو سکے گا۔

زبر۔ انسانی آواز کی بنیادی حرکت۔ ایک الف تک کھچی ہوئی۔ اس سے زیادہ کھینچ کر ادا کی جائے تو مد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اَب، آب وغیرہ۔

زیر۔ اردو میں اس حرکت کی تین صورتیں ہیں۔ ایک باریک زیر جسے 'خِفی' کہہ سکتے ہیں، اِن، بِن، جِس، تِس وغیرہ،

دوسرا موٹا زیر جسے 'خفی' کہہ سکتے ہیں جیسے مرے، ترے، اک، وغیرہ

تیسرا کھنچا ہوا زیر جیسے بفضلہٖ، بنفسہٖ، وغیرہ، ممدودہ صورت میں۔

پیش۔ اس کی بھی تین صورتیں ہیں:۔

ایک معروف، پوری آواز کے ساتھ جیسے پُن، پُرانا، بُناوٹ وغیرہ

دوسری مجہول ملائم آواز سے جیسے قرآن، مصوّر، محبت وغیرہ۔

تیسری ممدودہ۔ کھنچی ہوئی حرکت کے ساتھ، جیسے اردو، ہئو۔ بھئو، وغیرہ

جزم۔ اسے سکون بھی کہتے ہیں۔ جیسے رَبْ، سَبَبْ وغیرہ۔ میں آخری حرف پر کوئی حرکت نہیں ملال کہ اُن سے پہلے کے حروف پر ہے۔

وقف۔ کسی ساکن حرف کے بعد کسی اور غیر متحرک حرف کے واقع ہونے کو کہتے ہیں، اس کی کوئی علامت نہیں

ہوں گے حرف کی خالی چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے دوست، شُست وغیرہ میں۔

تشدید۔ جو حرف پہلے ساکن اور پھر متحرک ہو تو اس سکون اور حرکت کی صورت کو تشدید کہتے ہیں، جیسے اَبّا، دُلّو، تشدّی وغیرہ میں بؔ، لؔ اور دالؔ پر تشدید ہے۔

غنّہ۔ ویسے تو اس غیر متحرک نونؔ کو کہتے ہیں جو ناک میں آواز دے اور بالکل ظاہر نہ پڑھا جائے چاہے وہ حرفِ علت کے بعد آئے چاہے حرفِ صحیح کے، لیکن میرے نزدیک اسے ایک مخصوص آواز کے بجائے ایک حرکت قرار دینا زیادہ درست ہوگا۔ اس لیے کہ حرکت و سکون کی طرح یہ بھی ایک صورت ہے جو کسی حرف کے کردار کو بدل سکتی ہے۔ سنبھالنا دراصل سنْبھالنا ہے۔ بہرحال، ان عام حرکات و سکنات میں صرف تین ایسی ہیں جن کے لیے اردو میں اب تک کوئی علامات نہیں اور ہیں بھی تو رواج نہیں پا سکیں:۔

زیرِ خفی۔ اردو تلفظ میں یہ آواز اب اتنی جگہ کر چکی ہے کہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی علامت ضرور ہو گئی ہے۔ عربی میں زیر کی یہ آواز نہ تھی[1]۔ فارسی کو ضرورت پڑی تو بڑی 'ی' (ے) کا اضافہ کرکے کام چل گیا۔ اردو نے بھی فارسی کے دیکھا دیکھی 'ے' (یائے مجہول) سے اب تک کام چلایا لیکن اب ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اُسے آگے بڑھنا ہے۔ یوں تو میرے اور تیرے کو مرتے اور ترتے بھی بولتے ہیں اور بغیر کسی علامت کے صحیح پڑھ بھی لیتے ہیں لیکن اب بڑی کثرت سے وہ الفاظ آ چکے ہیں اور آتے جا رہے ہیں جن کے لیے ایک مستقل اشارہ ضروری ہو گیا ہے۔

پیم، نیہہ، اور پہلے جیسے مانوس الفاظ کو تو یوں بھی ٹھیک پڑھا جائے گا لیکن ایسے نامانوس الفاظ جیسے پریت بہ معنی عشق اور پریت (بھوت پریت) یا ریت اور ریت (بالو کی ریت) کو کیوں کر لکھا جا سکتا ہے کہ الجھن نہ ہو۔ پھر ایسے الفاظ، جیسے کیل (کھیل)، پاءِ (پاؤں)، تِ (تو)؛ کاءِ (کاہیکو)، دکھاءِ (دکھاؤ)، ترّیچ (ٹیڑھا پیچ دار ہیں)، بغیرِ (بغیر)، نِچھاور (نچھاور)؛ دِہ (دیہات)، لیجانے (لے جانے)، پیچانیا (پہچانا)، پریم (پریم۔ محبت)، پیسنا (داخل ہونا)؛ چوپھیر (چوپھیر، چاروں طرف)، دیہہ (جسم)، رے (رے = رہے)، سلیے (اسلیے)، شیرزا (شیر کا بچہ)؛ کیرا (کیرا = کا، کی، کے)، کِنا (کہنا)، سیتِ (سیتی = سے)، اِتّا (اتنا)؛ جیسے سیکڑوں، ہزاروں

---

[1] عربی زیر کو یائے مجہول جیسی آواز دے کر پڑھنا جیسے اِهدِنَا الصِّرَاطَ میں اِهْ کے صوتی رکن کو ادا کیا ہے، ہندوستانی لہجہ ہے۔

الفاظ ہیں جو ابتدائی اردو کے لغات ہیں اور جنھیں اُن کے تلفظ ہی نہیں انھیں کے لہجے میں پڑھنا بھی ہوگا تاکہ لسانی ارتقا کا صحیح اندازہ ہو سکے اور ایسے الفاظ و تراکیب کو خاص کر نظم میں بہ صحت موزوں پڑھا بھی جا سکے۔ مثال کے لیے وجہی کی یہ صاف سی بیت لیجیے :-

گھر تو مرے یوں لگے جھم کنے
کہ پانی ہو گئے موتی سیپاں منے

دوسرا مصرعہ پہلی کوشش میں شاید ہی موزوں پڑھا جا سکے؛ اس کی ذمہ داری "ہو گئے" کے املا پہ ہے۔ اردو کا موجودہ کھڑا پن مجبور ہے اسے بروزن فاعلن پڑھنے کے لیے درآں حالیکہ پڑھنا چاہیے بروزن فعل یا فعو "ہو گئے" کی جگہ "ہگ ئے" یا "ہگٔ ئے"

ہم زبر کی اس ملائم آواز کے لیے موسیقی (نغمہ بندی) کی علامت ایک پڑی لکیر (-) تجویز کرتے ہیں چاہے یائے مجہول سمیت لکھنا ہو یا اس کے بغیر۔ اگر اس سے بہتر کوئی علامت زیر نظر ہو تو انجمن اسے منظور کرے تاکہ درنگ کو دِرنگ؛ جہہ کو جہہِ؛ سیر کو سیر، شمیر کو شمیر یا کام دھین کہیں، دِہیں، رہیں، لکھا جا سکے[1]

۲- پیش کی مجہول آواز- عربی میں یہ آواز بھی نہیں۔ مُومنین کو واوِ مجہول کے ساتھ ادا کرنا ہندستانی لہجہ ہے، عربی نہیں۔ جدید فارسی نے یائے مجہول کی طرح واو مجہول کی اس آواز کو بھی اپنے لہجے خارج کر دیا ہے۔ اردو یہ نہیں کر سکتی۔ وہ مسافر کی میم کو پیش کی ملائم حرکت سے ادا کرنا ہی فصیح سمجھتی ہے۔ ایسی صورت میں اس آواز کے لیے بھی ایک مخصوص صورت مقرر کرنی ہوگی؛ اس کے لیے بھی ہماری تجویز کومل سُر کی پڑی لکیر ہے، اگر واؤ کے ساتھ ہو جیسے کو شُک، کونگ، کوانا (کھوانا)، اپر توپ، پرتو (غیر کا، یا پڑا ہوا)، تول (جھوکا)، وغیرہ اور پیش کے نیچے پڑی لکیر ہے اگر واؤ نہ لکھا جائے، جیسے :-

دُو (دونوں)، شُ (سو = وہ)، تُ (تب بھی)، جُ (جو)، ہُ (ہو)، ہُر (اور)، کُ (کو)
نہتُسی (نہ ہو سی = نہ ہوگا)، مُٹا (موٹا)، وغیرہ؛
ویسے قرات، زہد، محاکما، مطالبہ، مرصع، معتبر، بعد (دوری)، تہمت، فضلا، شرفا،

---

[1] جب تک اردو داں اور اردو خواں ایسے الفاظ سے بھی اتنے مانوس نہ ہو جائیں کہ اعراب کی مدد کے بغیر بھی ٹھیک پڑھ سکیں۔

قحبہ، نقش، بفرما، ضعف، طغرا، طفیل، عتاب، مقابلہ، جیسے الفاظ بھی ہیں جو اردو میں زیادہ تر پیش کی ملائم آواز سے بولے جاتے ہیں، لیکن مانوس ہونے کی وجہ سے بلا کسی علامت کی مدد کے صحیح پڑھے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو علمی اور ادبی کتابوں میں اعراب کے بغیر ہی لکھا جائے تو ہماری دانست میں کوئی ہرج نہیں، اس لیے کہ یہ اردو کے لسانی مزاج کا یا کم سے کم اس کے رسم الخط کا ایک بنیادی خاصہ ہے۔ اردو میں زبر، زیر، پیش وہیں لگایا جاتا ہے جہاں ضرورت ہو ورنہ نہیں۔ اس کے باوجود اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ زبانِ روزمرہ میں رائج اور مستعمل الفاظ بھی لکھاوٹ میں اپنے لہجے سمیت آسکیں۔ اب تک اس کا لحاظ کم کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب کہ اردو کو گیتوں، خاص کر لوک گیتوں کی بھرپور زبان بھی بننا ہے اُسے نئے اور پُرانے رائج اور کم رائج یہاں تک کہ ٹکسال بیتر اور ٹکسال باہر الفاظ کو بھی زبان روزمرہ کی اسی رعایت سے اپنانا ہے جو اس کا سدا کا سبھاؤ رہا ہے۔

غنہ۔ عربی میں یہ آواز بھی ملفوظ نہیں[1]۔ کلاسیکی فارسی میں ہے، لیکن نون غنہ کی حد تک، جیسے چوں، بروں، ارغنوں وغیرہ۔ جدید پارسی میں وہ بھی نہیں اس لیے کہ وہاں مجہول آوازوں کی طرح نون غنہ کی آواز کو بھی اڑا دیا گیا ہے۔ اب چوں کو چن اور بروں کو برن، کماں کو کمن اور کمانچہ کو کمنچہ بہ اعلانِ نون بولتے ہیں۔ اردو اپنی مخصوص غنائی آواز کو نہیں چھوڑ سکتی، اس لیے تحریر میں اُسے جوں کا توں ادا کر سکنا بہت ضروری ہے۔ پہلے اس صوتی حرکت کو لکھئے تو کھلے ہوئے نون سے تھے جیسے سانس گونگا، دھونس، لیکن پڑھتے غنہ کے ساتھ تھے پھر نون کا شوشہ خالی چھوڑ کر جیسے جھانجھ، لکھا جانے لگا اب اُلٹا کاما (الٹا بند پیش) بھی لگایا جانے لگا، جیسے سانچہ، ڈھانپ، کنواں وغیرہ میں۔

ہماری تجویز ہے کہ ان حروف کے لیے جو الگ الگ غنائی آواز سے ادا کیے جاتے ہیں جیسے سنبھالا، سنپورن وغیرہ، ایک ننھے سے نون کی علامت مقرر کر دی جائے[2]۔ ایسا کرنے سے حروفِ صحیح کے

---

[1] حرف نون کو میم کی طرح پڑھنا اور اس پر غنہ کرنا جیسے اَنْبِئْهُمْ کو اَمْبِئْهُمْ پڑھنا یا تنوین کی حالت میں نون کو میم کی طرح پڑھنا یعنی عَلِيمٌ بِمَا کو عَلِيمُمْ بِمَا پڑھنا عربی کے لیے مخصوص ہے اور اردو غنہ کے لیے مثال نہیں بن سکتا۔

[2] غنائی آواز سے ملتی جلتی آواز کے لیے حروف کے نیچے یا بغل میں ایک چھوٹا نون یا میم لکھنا قرآنی اعراب میں بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: عَلِيمٌ م بِمَا، اور خَيْرًا الْوَصِيَّةُ وغیرہ۔

بیچ بیچ غیر ضروری جوڑ نہ دینا پڑے گا، تحریر سڈول ہو جائے گی اور جو بولا جائے گا وہی لکھا بھی جاسکے گا۔ اس سے ایک اور فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بول چال کے الفاظ خاص کر جو قدما نے باندھے ہیں اپنے صحیح ہجے سمیت لکھے جاسکیں گے اور ناموزوں پڑھنے کی مجبوری جاتی رہے گی۔ اس کا اندازہ ایک آدھی مثال لے کر بہتر ہو سکے گا۔

موجودہ طریقہ		مجوزہ طریقہ
نینہہ دھر ہیں موتی اور موٗنگا	(جائسی)	نَیْنَہَ دَھَرَا موتی اَو مُونْگَا
بھوئیں بیچ جانہہ سمندہ ہلورا	(")	بُھؤئیں بِیچ جَانْہَہ سَمَنْدْ ہِلُورا
سو طوطی منج ایسا ہندستان میں	(وجہی)	سُو طُوطی مُنج ایسا ہِندُستان میں
نہیں مہندی یہ تیرے تلوؤں سیتی آگ لگی	(مرزا مظہرؒ)	نَہِیْں مِہْندی یہ ترے تلوؤں سیتِ آگ لگی

البتہ نون غنہ کی وہ غنائی آواز جو کسی ایک حرف کی خصوصیت بن کر نہ پیدا ہو بلکہ ایک حرف کو دوسرے حرف سے اس طرح ملائے کہ دونوں کا صوتی مزاج بن جائے، جیسے جنگ، رنگت سنگین وغیرہ میں اسے موجودہ طریقہ سے ہی ظاہر کیا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ ان تین باتوں کے علاوہ اردو اعراب کا موجودہ طریقہ سردست کافی ہے۔ اسی طرح حروف علت کے معاملے میں بھی کوئی انقلابی اصلاح ضروری نہیں معلوم ہوتی، اتنا البتہ ضروری ہے کہ اردو کو ایک زندہ زبان (جو وہ ہے) کی طرح ترقی کرنے کی سہولتیں میسر ہوں۔ اور چوں کہ ان سہولتوں میں رسم الخط اور رسم الخط میں حروف علت مقدم ہیں اس لیے ان پر ایک بار اور نظر ڈال لینا لازم ہے۔

(الف) فن تجوید کی رو سے 'الف' پر جب کوئی حرکت زبر، زیر یا پیش کی آئے تو وہ 'ہمزہ' کہلاتا ہے اور ساکن ہو تو 'الف'۔ ہمزہ اردو فارسی میں 'الف' لکھے جانے کی وجہ سے 'الف' کہلاتا ہے، ورنہ متحرک صرف ہمزہ ہی ہو سکتا ہے الف نہیں۔ الف تو دراصل ہمزہ کی ایک مخصوص صورت کا نام ہے۔ چنانچہ ہندوستانی کتابت قرآن میں بھی الف اور ہمزہ کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے[1]

إِذَا جَآءَ، أَرَءَيْتَ، ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ، وَٱلسَّمَآءِ، إِذَا ٱلسَّمَآءُ، يُبْدِئُ، جَزَآؤُهُمْ، يُؤْتِي، نَادِمُوٓءْ صَدَقَةٌ وَغَيْرَهُ، وغیرہ،

---

[1] کتابت قرآن مجید میں الف کے ساتھ ہر جگہ ہمزہ لکھنا ترکستان اور مصر میں اب بھی بدستور ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ لفظ کی ابتدا میں آنے والے ہمزہ کو الف لکھنا (جب کہ ابتدا بالسکون ممکن ہی نہیں) ہندوستانی طرزِ تحریر ہے جسے یہاں عام رواج حاصل ہو چکا ہے، اور چوں کہ اسے برقرار رکھنے میں آگے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی اس لیے ہماری تجویز ہے کہ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے البتہ لفظ کے بیچ اور آخیر میں آنے والے ہمزہ کو ہمزہ ہی لکھا جائے اور اسی طرح الگ سے ظاہر کیا جائے جیسا اوپر دی ہوئی مثالوں سے زبر، زیر، پیش کی حرکت اور سکون کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا فائدہ لکھائی چھپائی اور ٹائپ میں یکساں طور پر ہوگا۔ حرکت وار ایک ایک مثال سامنے رکھ کر اندازہ لگائیے :-

موجودہ طریقہ	مجوزہ طریقہ
تن من جوبن ساجی سب، دیئی چلیائے بھینٹ (جائسی)	تن من جوبن ساجِ سب، دِءِ چَلِ ءِ لے بھینٹ
تو ہمسایہ کوئی کیونکہ سوتا رہے گا (میر)	تو ہمسایہ کوءِ کیونکہ سوتا رہے گا
آنکھوں میں جیو مرا ہے ادھر یار دیکھنا (میر)	آنکھوں میں جءُ مرا ہے ادھر یار دیکھنا
کہ چھپ گئے بھلاں کے تلے پات سب (وجہی)	کہ چھپ گءِ بھلاں کے تلے پات سب

اسی طرح یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ الف مقصورہ یعنی ایک الف کی آواز ہی ہمزہ کی آواز ہے الف ممدود چوں کہ ہمزہ کو کھینچ کر پڑھنے کی صورت ہے اس لیے اسے دو الف بھی لکھا جا سکتا ہے (جیسے صاحب برہان وغیرہ نے لکھا ہے یعنی اا ب (آب)، اا تش (آتش) الخ) اور الف کے اوپر مد کھینچ کر آپ، اور آج کی طرح بھی۔ اس لیے اردو کی درسی کتابوں میں الف زبر (اَ) یعنی ءَ کو بروزن فَع ایک الف کی طرح اور بے، الف زبر آ کو دو الف یعنی الف مد زبر آ کی طرح پڑھانا ہوگا۔[1]

اس کے علاوہ اس کا بھی لحاظ رکھنا ہوگا کہ "ہمزہ" کے ساتھ 'ی' خاص کر یائے مجہول کی مخلوط آواز اکثر و بیشتر فارسی لہجے کی یادگار ہے، ہم لکھتے بھلے بفرمائید اور مگوئید ہوں لیکن پڑھتے بفرماءِ د اور مگوءِ د ہیں۔ اسی طرح نکوئی اور بیمائی ہمارے لہجے میں نکوءِ اور بیماءِ ہیں۔ 'ی' کی ملی جلی آواز ہم نہیں پیدا کرتے۔ نتیجہ یہ مقصود ہے کہ جہاں تک اردو الفاظ کا تعلق ہے ہمیں اپنے لہجے یا مناسبت سے ہی ہمزہ کے ساتھ 'ی' اور 'ے' کو ملا کر لکھنا چاہیے۔ اردو میں 'کوئی' اور 'مسکرائے' کوءِ اور مسکراءِ ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہمزۂ ممدود مکسور کے لیے 'ی' اور 'ے'

---

[1] اسی طرح بے زیر بِ، بے پیش بُ بروزن فَع اور فُع ہونا چاہیے، اور بے چھوٹا زیر بے بروزن کے اور بے چھوٹا پیش بروزن تو، جو سب مقصورہ آوازیں ہیں اور اسی طرح ملفوظ ہونی چاہیے۔

ہی کو علامت مان لیں۔

و (واؤ) پیش کی مقصورہ اور ممدودہ آوازوں کے ساتھ ہلکے پیش کی آواز کے لیے بھی علامت [illegible] کر لینے [illegible]
واؤ کو حرفِ علت کے بجائے اگر حرفِ صحیح سمجھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، یوں بھی [illegible]
بہت سے الفاظ ایسے ہیں جیسے وادی، وعدہ، تواتر وغیرہ جن میں واؤ کو حرفِ صحیح [illegible]
ہوتا ہے۔ پھر بھی ایک تو رواج عام کا سوال ہے دوسرے حروفِ علت میں کمی کر کے کسی زبان کے
لیے مفید نہیں ہوا کرتا، اس لیے ہماری تجویز ہے کہ واؤ کی حسبِ ذیل صورتیں [illegible] تحریر میں [illegible]
رکھی جائیں :-

(۱) ہلکے پیش کے ساتھ۔ جیسے کوّے، کوّس، کوّل وغیرہ میں۔

واضح رہے کہ یہ آواز دو واؤ کے برابر کھینچ کر آتی ہے۔ ایک واؤ کی [illegible]
کٹ ہوگی، اس میں واؤ کی آواز کا کوئی شائبہ نہیں، وہ پیش کی آواز [illegible]

(۲) کھینچے پیش کے ساتھ۔ جیسے دُور، سورج وغیرہ میں۔

(۳) حرفِ صحیح کی صورت میں :

(زبر کے ساتھ) جیسے پَوَن، تَوا، وغیرہ میں؛
(زیر کے ساتھ) جیسے اوِچھل، سَوِتر، پوِتر، تدوِن (تدوین)
وغیرہ میں۔
(پیش کے ساتھ) جیسے وُسعت، وُتقیٰ (عربی) وغیرہ میں۔

(۴) حرفِ مخلوط کی صورت میں۔ جیسے دھوَن، خواب، وغیرہ میں۔ میں خواب اور خواجہ کے
واؤ کو معدولہ نہیں سمجھتا، کم از کم اردو لہجہ واؤ مخلوط کا ہے معدولہ
کا نہیں، پھر سچ پوچھیے تو اردو میں واؤ معدولہ ہے ہی نہیں، یہ
صرف فارسی زبان میں آتا ہے۔ ہم خوش اور خود کو فارسی والوں
کی طرح آدھا ضمہ اور آدھا فتحہ نہیں بولتے۔ اردو میں انھیں سیدھا
سیدھا خُد اور خُش ہونا چاہیے۔

اسی طرح واو زائد جو فارسی تو اور چو میں ہے اردو میں نہیں
اردو میں ایسے الفاظ کو تُے اور چُے لکھا جا سکتا ہے[1]

---

[1] واؤ کی دوسری صورتیں علم معانی سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو ایک مثلاً عطف، حالیہ اردو میں بھی ہیں۔ ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔

'ی' ('ے')

اس حرف کی دونوں قسمیں یعنی معروف اور مجہول اردو میں ہیں، لیکن جیسا کہا جا چکا ہے، ہمزہ کی آواز میں 'ی' یا 'ے' کی ملاوٹ (اشمام) غیر ضروری ہے۔ اردو میں اَئے ضرور ہے جس میں دونوں حروف الگ الگ آواز دیتے ہیں! اسی طرح دِیے، کِیے (ک + ے) بھی ہیں، لیکن

؎ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

میں 'دیکھا جائے' 'دیکھا جاءِ' ملفوظ ہے اور وہی لکھا بھی جانا چاہیے۔ بہر صورت یہاں صرف اتنے ہی پر زور دیا جا سکتا ہے کہ ایسے الفاظ جن میں 'ی' ملفوظ نہیں ہوتی متعلقہ اعراب کے ساتھ لکھے جائیں تو غیر ضروری جوڑ کی بچت ہو سکتی ہے۔ ورنہ یوں تو یہ حرف اردو لکھاوٹ میں اتنا گھل مل گیا ہے کہ اسے ہر جگہ حرف صحیح کی صورت میں لکھنا اور حرف علت کی صورت میں نہ لکھنا نہ ممکن ہے نہ مناسب۔

یہ ہے ہماری اپیل جس میں جو کچھ کہا گیا ہے کسی اعتبار سے بھی قول فیصل نہیں، البتہ اپنی سمجھ میں آیا اور برت میں صحیح اترا کہ اردو اگر دو ایک باتوں میں تھوڑا بہت ردوبدل کر کے قرآنی اعراب کو حسب ضرورت اختیار کر لے۔ زبر، زیر اور پیش کی بنیادی حرکات کو مقصورہ (جیسا کہ انھیں ہونا بھی چاہیے) ادا کرے تو کئی قسم کی آسانیاں پیدا ہو جائیں، اور مقامی بولیوں کے الفاظ خاص کر لوک گیتوں کے بول جو زیادہ تر مقصور (ہرشو) ہوتے ہیں اپنے صحیح لہجے اور اپنی مخصوص لَے سمیت اس میں آ سکیں۔ اس لیے یہ تجویزیں انجمن ترقی اردو کے حضور پیش کی جا رہی ہیں۔ آخر میں دو ضروری باتیں اور کہنی ہیں، لیکن یہ گذارش برسبیل اصلاح نہیں بہ طریق صلاح کار ہے۔

ایک یہ کہ مرکب الفاظ کو ممکن اور مناسب حد تک مفرد بنا کر لکھنا یوں بھی ایک عام رجحان بن چکا ہے اس رجحان کو اور بڑھاوا دینا ہے۔ 'کہینگے' اور 'بیتابی' کو 'کہیں گے' اور 'بے تابی' لکھنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ جہاں تک ہو سکے پورے حرف کو کھپانے کا چلن اختیار کیا جائے، کہیں کہیں اس کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں ہوتا۔ خاص کر گیت کی زبان کے دو حرفی اور سہ حرفی الفاظ کو ان کے مخصوص حرکات و سکنات کے ساتھ لکھتے وقت۔ مثلاً

؎ تُمھ بِیا جِیاں جِنِ ہوءُ کچھُ ، موہی جیا ہوءُ سو ہوءُ ، کو

؎ تُمھ پ ءَ ج ءَ جِنِ ہوءُ کچھُ ، مُ ہِ جِ ءَ ہوءُ سُ ہوءُ

لکھا جائے تو ہر قسم کی سہولت سمجھ میں آتی ہے۔

ہما میرٹھی

آئینۂ حقیقت

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کے سہ ماہی جریدے اردو ادب کے ۱۹۶۵ء کے شمارۂ اول میں صفحہ ۵۲ سے صفحہ ۷۶ تک جناب حکم چند نیر صاحب کا ایک مقالہ "سرور جہان آبادی اور شاکر میرٹھی" شائع ہوا ہے۔

انھیں نیر صاحب نے مجھے مئی ۶۵ء میں ایک خط ارسال فرمایا تھا جو درج ذیل ہے:-

"ڈاکٹر ایچ سی نیر ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔
معرفت جے ہند ہوٹل، صدر بازار۔ آگرہ کینٹ (یو۔پی)
۶ رمئی ۶۵ء

نادیدہ محترم بندہ ہما صاحب

میرے ایک عزیز اردو میں پی۔ ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنا چاہتے ہیں۔ ایم۔ اے میں انھوں نے ایک پرچے کے بدلے میں جدید اردو شاعری پر ایک مختصر مقالہ لکھا تھا۔ اس لیے وہ پی ایچ ڈی کے لیے بھی ایسا موضوع منتخب کرنا چاہتے ہیں جو جدید اردو شاعری سے تعلق رکھتا ہو کہ انھیں اپنی گذشتہ محنت سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔ وہ اقبال پر کام کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے انھیں بتایا کہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مزید گنجائش کم ہے۔ جدید اردو شاعری کے بہت سے شاعر ایسے ہیں جن پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا اور شعرا ایسے ہیں جن پر انفرادی کام کی سخت سخت ضرورت ہے۔ اس سے اردو کی جدید تاریخ کی ترتیب و تدوین میں کافی مدد ملے گی۔ اس لیے میں نے انھیں پیارے لال شاکر میرٹھی پر کام کرنے کے لیے کہا۔ جب وہ آمادہ ہو گئے تو ہمیں یہ فکر ہوئی کہ شاکر مرحوم کے بارے میں اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ ادا ماہنامہ زندگی کے شاکر نمبر کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان کا بہت سا کلام ایسا ہے کہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اسی طرح ان کے ذاتی حالات (سوانح) بھی بہت کچھ پردۂ خفا میں ہیں۔

دہلی میں مقیم کچھ احباب کو خطوط لکھے۔ میرے ایک دوست نے آپ کا نام گرامی اور پتہ لکھا کر شاکر صاحب کے بارے میں جس قدر مواد اور اطلاعات آپ سے حاصل ہوسکتی ہیں وہ کسی اور سے نہ ہوسکیں گی میں نے دو خط مینا لکھاری صاحب کی خدمت میں بھی لکھوائے لیکن انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شاکر جیسے ادیب بے مثال اور شاعر یکتا کا نام اس طرح گمنام ہو جائے گا اگر ان کے عزیز و اقربا اور احباب اس سلسلے میں طالب علموں کی مدد نہ کریں گے تو کون کرے گا۔

اب وقت ہے جب کہ بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے شاکر صاحب کو دیکھا ہے۔ سنا ہے آج کل کو مرحوم کی صورت و سیرت اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چند برسوں کے بعد جب وہ بزرگان قوم راہئ ملکِ عدم ہو جائیں گے تو پھر کیا لکھا جا سکے گا اور اگر کچھ لکھا گیا تو مستند نہ ہوگا۔

شاکر صاحب کے وارث کون ہیں۔ ان کا پتہ کیا ہے۔ ان کا ادبی اثاثہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کس کے قبضہ میں اور کہاں ہے۔ کیا اس سے استفادہ ممکن ہے۔

ماہنامہ زندگی فروری ۱۹۵۶ء کے شاکر نمبر میں ایک صاحب ایم کے ہوش کا مضمون شائع ہوا ہے صاحب مضمون نے لکھا ہے " مرحوم کے قلمی بیاض میں مثنوی۔ غزلیں۔ قطعات۔ مذہبی منظومات اور رباعیات درج ہیں۔ میرے پاس ایک اور غیر مطبوعہ کلام کا ضخیم قلمی مسودہ ہے جو صرف رباعیوں پر مشتمل ہے " میں نے زندگی کے ایڈیٹر میتھوز لائیل صاحب کے نام کئی خطوط لکھے۔ دو خطوط ناٹ نون NOT KNOWN ہو کر واپس آگئے۔ باقی کا علم نہیں۔ اس طرح ایم کے ہوش صاحب کا بھی پتہ معلوم نہ ہوسکا۔ آپ ان میں سے بیشتر اصحاب کو جانتے ہوں گے۔ آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ یہ کار خیر ہے۔ ادب کی خدمت ہر ادیب کا فرض اولیں ہوتا ہے۔ اور خصوصاً جب کہ ایک شاعر کو نئی زندگی ملنے کا سوال ہو تو ہمیں اپنے تمام تر ذرائع اور وسائل سے ادیبوں کو استفادہ کرنے اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آپ کا قیمتی وقت زیادہ نہیں لینا چاہتا۔ آپ کو جو کچھ معلومات اس سلسلے میں فراہم ہوسکیں ارسال فرما کر شکر گزاری کا موقع دیں گے۔

میں بنارس ہندو یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا انچارج ہوں۔ آج کل گرما کی تعطیلات کے سلسلے میں یونی ورسٹی بند ہے۔ میں کل یہاں سے اپنے وطن آگرہ جا رہا ہوں۔ ایک ماہ تک وہاں مقیم رہوں گا۔ پھر دلی اور دوسرے مقامات پر جاؤں گا۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں بنارس لوٹوں گا۔ آپ اس وقت جواب آگرہ کے پتے سے دیں گے۔ فقط۔

ایچ سی۔ نیّر "

مندرجہ بالا خط میں پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا گیا تھا میں نیّر صاحب کے ان جذبات سے کافی متاثر ہوا اور اس کا جواب انھیں بھیج دیا جس خدمت کے میں لائق تھا اس کا ان سے وعدہ بھی کیا۔ اور نیّر صاحب کو ان مہربانوں کے پتے بھیج دیے جن سے وہ شاکر صاحب کے بارے میں مزید واقفیت حاصل کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں اخوت لاہور پاکستان کا یادِ رفتگاں نمبر بھی انھیں بھیج دیا جس میں علاوہ دیگر اردو شعرا کے خود منشی پیارے لال شاکر میرٹھی پر کئی مضامین نظم و نثر موجود تھے۔

میرے اس خط کے جواب میں نیّر صاحب نے مجھے لکھا:-

" معرفت جے ہند ہوٹل۔ صدر بازار۔ آگرہ کینٹ

محبی! تسلیم

والا نامے کے لیے متشکر ہوں۔ شاکر کے سلسلے میں سب سے اہم بات ہے کہ ان کے کلام کے مسودات کس کے پاس ہیں، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں زندگی کے شاکر نمبر میں ایک صاحب ایم کے ہوش صاحب نے لکھا تھا کہ شاکر کے مسودات ان کے پاس ہیں۔ یہ ہوش صاحب کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ شاکر کا کلام رسائل میں منتشر پڑا ہے اور ۱۹۱۵ء کے بعد ان کا کوئی کلام شائع نہیں ہوا۔ جو کچھ شائع ہوا ہے وہ اس سے پہلے کا ہے قدیم رسائل میں منتشر کلام کو نقل کر کے یکجا کرنا جوئے شیر لانا ہے اور پھر اس مختصر مجموعۂ کلام پر مختصر مقالہ لکھا جا سکتا ہے پی ایچ ڈی (Ph.D) کے لیے نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ جب تک تمام مواد جس پر دسترس حاصل کی جا سکتی ہے پیش نظر نہ ہو کام کرنے کا Synopsis نہیں بنایا جا سکتا۔

میں دہلی کے متذکرہ حضرات سے مل کر حالات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اگر کچھ کامیابی کی صورت نظر آئی تو انشاءاللہ اس کام کو بند کیے پر ذکر کروں گا۔ اگر ہوش صاحب کا پتہ مل جائے تو ان تعطیلات میں ان سے ملنے اور مسودات یا ان کی نقول حاصل کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

شاکر صاحب کے فرزند کا نام کیا ہے اور ان کا پتہ کیا ہے؟ اگر معلوم ہو تو ضرور تحریر فرمائیں۔

آپ کے پُرخلوص تعاون کے لیے متشکر ہوں۔ خلوص کیش

ڈاکٹر حکم چند نیّر "

نیّر صاحب کے مندرجہ بالا خط کا جواب بھی میں نے اُسی وقت دے دیا۔ اور انھیں لکھ بھیجا کہ شاکر صاحب نے اپنی حیات میں اپنے فرزند مہندر کمار کا نام مجھے بتایا تھا اور ان صاحبزادۂ شاکر نے خود بھی مجھے ایک بار خط لکھا تھا جس میں ان کا پوتا کا پتہ تحریر ہے۔ پوتا کا پتہ بھی نیّر صاحب کو تحریر کر دیا۔ میرے اس خط کا جواب نیّر صاحب نے آج تک نہیں دیا۔

اب تقریباً نصف سال بعد جب اردو ادب کا ۱۹۶۵ء کا شمارۂ اول نظر نواز ہوا تو اس میں حکم چند نیّر صاحب کا ایک مقالہ "سرور جہان آبادی اور شاکر میرٹھی" بھی نظروں سے گذرا۔ مضمون پڑھ کر جس بے تکلفی سے غلط بیانی سے نیّر صاحب نے دیدہ و دانستہ کام لیا اس پر شدید حیرت ہوئی اور حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا کہ شاکر جیسے بے لوث اور انسانیت پرست ادیب کی موت کے بعد ان پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے جس شاکر کی پاکیزہ طبیعت، ضبط و ایثار، صبر و شکر، معصومیت اور فرشتہ صفتی بطور ضرب المثل استعمال کی جا سکتی ہے اس پر انتہائی رکیک حملے کیے جا رہے ہیں۔

اس مضمون کو پڑھنے کے کچھ دنوں بعد ہی ہماری زبان مورخہ ۲۲ / اکتوبر ۱۹۶۵ء کا شمارہ بھی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس میں صفحہ ۹ پر جناب جگنا تھ صاحب آزاد کا ایک مراسلہ بعنوان "ایک غلطی کا ازالہ" دیکھا۔ اس تحریر میں بھی غریب شاکر صاحب کو پوری طرح ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

مجھے یہ خیال آیا کہ شاکر صاحب کی زندگی کے آخری دنوں میں کچھ لوگ ان کے پیچھے پڑ گئے تھے اور ان کا جینا بھی اجیرن کر دیا تھا اب ان کی موت کے بعد بھی کچھ حضرات خطرناک پروپیگنڈے پر اُتر آئے ہیں۔ نئی نسل کے ادبا اور شعرا پر اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا جانے کیا اثر ہو جائے لہٰذا اس غلط فہمی کے ازالے کی ضرورت درپیش آئی۔

جہاں تک حکم چند نیّر صاحب کی تحریر کا تعلق ہے۔ ان کی بعض دلائل خود ان کے اپنے ہی دعووں کو باطل کر دیتی ہے۔

جناب محمد عسکری صاحب نے رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ کیا ہے جس کے صفحہ ۴۲۸ کا حوالہ نیّر صاحب نے اپنی تحریر میں دیا ہے۔

اب سب سے اول تو میں رام بابو سکسینہ صاحب کے معیار تصنیف و تحقیق کے بارے میں کچھ کہوں گا اب سے کچھ برسوں پہلے میں نے مرحوم مسیحی شعرا کے بارے میں لاہور کے ایک مسیحی جریدۂ 'المایدہ' میں کہکشاں کے نام سے کچھ لکھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں پادری رابرٹ گارڈنر صاحب اسبق حیات تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اسبق صاحب پر بھی ایک مختصر سا مضمون کسی دوسرے جریدے میں لکھوں چناں چہ رام بابو سکسینہ صاحب کی انگریزی تصنیف INDO EUROPEON POETS OF URDU AND PERSIAN سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے پادری رابرٹ گارڈنر صاحب اسبق کے بارے میں ان کے انگریزی مضمون کا ترجمہ کر کے ماہنامہ 'اُخوت' لاہور میں شائع کرا دیا۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر صاحب میرٹھی حیات تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں اس مضمون پر اظہار رائے کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔

کرسچین بستی ۔ دریا گنج ۔ دہلی
۱۲ - ۱۰ - ۴۶

کرمی تسلیم

یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے، اس سے قبل آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ میری غیر حاضری میں آیا ہو اور کسی بچے کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ شوق سے دیوالی کے ایام میں تشریف لائیے مگر ایک کارڈ کے ذریعہ تاریخ سے مطلع فرمائیے گا تاکہ میں اس روز موجود رہوں۔ رام بابو سکسینہ صاحب کی کتاب میرے پاس موجود ہے جو انھوں نے تحفتہً ارسال کی تھی۔ اس کتاب کی تیاری میں مجھ سے کافی مواد انھیں ملا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے شکریہ ادا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ عابد صاحب جہاں تک مجھے معلوم ہے آنریری طور پر بشارت کی مدد کرتے ہیں۔ انھوں نے صادق اور ذاکر سے منظومات کی استدعا کی تھی۔ فقط۔ تسلیم نیازمند
پیارے لال شاکر

اس کے بعد شاکر صاحب نے مجھے ایک اور خط میں بھی سکسینہ صاحب کے بارے میں تحریر فرمایا۔ ملاحظہ۔

"کرسچین بستی ۔ دریا گنج ۔ دہلی
۴ ۔ ۱۲ ۔ ۴۶

کرمی تسلیم۔ یاد فرمائی کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ شاید میرا خط آپ کو ملا نہیں۔ گم ہو گیا۔ بلکہ ایک معنی میں میں اپنے دل میں نادم تھا کہ شاید آپ کا یہ خیال ہو گا کہ میں نے عمداً جواب نہیں دیا۔ شاید میں ایک عزیزہ کی شادی ۱۱ دسمبر کو ہے۔ اس روز تو میں دہلی سے غیر حاضر ہوں گا۔ اور ممکن ہے کہ ۱۲ کو بھی بے وقت دہلی پہنچوں۔ باقی دنوں میں یہیں ہوں گا۔ اگر کسی خاص ضرورت سے کہیں جانا پڑ گیا تو اطلاع دے دوں گا۔ کرایہ نہیں ہے کہ کہیں جاؤں۔ لہذا آپ شوق سے تشریف لائیے۔ جب آئیے گا تو ایک کارڈ ڈال دیجیے گا۔ تاکہ اس روز گھر میں رہوں۔

میں نے ادبی دنیا میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔ خاندان گارڈنر کے اردو شعرا۔ یہ مضمون تین قسطوں میں شائع ہوا۔ سکسینہ صاحب نے اول قسط میں سے جستہ جستہ واقعات اور باقی دو قسطیں سالم ترجمہ کرکے اپنی کتاب میں شامل کر لی ہیں۔ بی گارڈنر اور آر گارڈنر کے سالم حالات اور دانیال گارڈنر کے بیشتر حالات میرے مضامین سے ماخوذ ہیں۔ آپ نے بے کار زحمت کی کہ ابتق صاحب کے حالات کا ترجمہ کیا۔ اب ارادہ کر رہا ہوں کہ اس سلسلے کی آخری قسط بھی لکھ ڈالوں مگر سامان بمبئی میں ہے اس لیے اب تک نہ لکھ سکا خصوصاً الٰین گارڈنر صاحبہ تحو کے حالات و کلام اب تک پبلک کی خدمت میں پیش نہ ہو سکے۔ ان مضامین کی اشاعت

کے بعد مجھے بہت سا کلام محو صاحب کا دستیاب ہوا تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے صرف ایک ہی خود دستیاب ہوا تھا جس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے صرف ایک ہی شعر دستیاب ہوا تھا جس کو جیسے اپنے مضمون میں شامل کر لیا تھا۔ سکینہ صاحب نے بھی اس کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ باقی خیریت ہے فقط تسلیم۔

نیاز مند پیارے لال شاکر

مندرجہ بالا خطوط مکمل پیش کیے گئے ہیں تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ مل سکے کہ خط سے کوئی فقرہ یا لفظ نکال دیا گیا۔ ان دونوں خطوط سے جناب رام بابو سکینہ صاحب کے معیار تحقیق و تصنیف و تالیف پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

بہر حال نیّر صاحب نے رام بابو سکینہ کی تحریر نقل کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ سرور جہان آبادی کا کلام شاکر نے اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ مگر در اصل رام بابو سکینہ صاحب کی تحریر میں بھی شروع سے آخر تک کہیں بھی شاکر صاحب کا نام نامی داخل نہیں ہے بلکہ خود رام بابو سکینہ اپنی تحریر کے آغاز میں لکھتے ہیں: "ان کا (سرور صاحب کا) اکثر کلام ضائع ہو گیا"۔ اگر رام بابو سکینہ صاحب یہ بتانا چاہتے کہ شاکر صاحب نے ان سے (سرور سے) مختلف مضامین پر کچھ نظمیں لکھوائی تھیں اور ان کو اپنے (شاکر صاحب کے) نام سے شائع کرا دیا تو وہ ضرور بجائے الفاظ "کسی صاحب نے" کے "شاکر صاحب نے" کے الفاظ احاطۂ تحریر میں لاتے۔

اسی طرح خمخانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۸۱۳ پر لالہ سری رام صاحب دہلوی کی عبارت میں اور ہندوؤں میں اردو (مصنفہ جناب رفیق مارہروی) کے صفحہ ۲۴۷ پر بھی شاکر صاحب کا نام نامی نہیں لیا گیا۔

آگے چل کر نیّر صاحب نے اپنے فٹ نوٹ میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ شاکر کے علاوہ اور بھی کچھ اصحاب تھے جو سرور کے کلام کو اپنے نام سے شائع کرایا کرتے تھے۔ سرور کے ایک عزیز رگھنندن پرشاد صاحب (ایڈووکیٹ لکھیم پور کھیری) نے جب نیّر صاحب کو "ایک صاحب" کا نام بتایا تو نیّر صاحب نے اس کو صیغۂ راز میں کیوں رکھا۔ آخر یہ بھی تو ممکن ہے کہ نیّر صاحب جن صاحب کا نام لیتے ہوئے گھبرا رہے ہیں محض وہ صاحب ہی سرور صاحب کے کلام کو اپنے نام سے شائع کرواتے رہے ہوں۔ مگر غالباً نیّر صاحب اس کے لیے تیار نہ ہوں کیوں کہ بقول ان کے "تحریری ثبوت کے بغیر کیا کہا جا سکتا ہے" نیّر صاحب کی تیز فہمی نے انھیں اس مغالطہ میں ڈال دیا ہے کہ وہ اپنے دعوؤں کی دلیل میں ایسے تحریری ثبوت پیش کر سکتے ہیں جن سے شاکر صاحب پر الزام عائد ہو سکے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان تحریری ثبوتوں کی حقیقت کیا ہے۔ غالباً نیّر صاحب سب سے بڑا تحریری ثبوت خود اپنی تحریر پیش کرنے کو سمجھتے ہیں۔ چناں چہ یہ آڑ لے کر "طوالت کی وجہ سے مزید اقتباسات پیش نہیں کیے جا رہے" وہ تحریری ثبوت بھی پیش نہیں کرتے۔ وہ خود اپنے مضمون کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں: "سرور مرحوم

کا سب سے زیادہ کلام شاکر صاحب کے نام سے شائع ہوا ہے " اور یہ دے کے ان کا یہی جملہ ان کے پاس تحریری ثبوت ہے۔

سرور کی موت بقول نیّر صاحب ۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء کو ہوئی تھی۔ اب اس زمانے میں شاکر صاحب کی سوانح دیکھیں کہ وہ کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ نیّر صاحب کو تو حالات شاکر کا علم ہے نہیں۔ ہم ان سترہ اٹھارہ ادبی جریدوں کا ذکر بھی کر دیتے ہیں جن میں شاکر صاحب نے سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک کام کیا تھا۔

۱۔ سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک " تحفۂ سرحد " بنّوں کے ایڈیٹر رہے۔
۲۔ سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک " زمانہ " کان پور کے سب ایڈیٹر رہے۔
۳۔ سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک " مخزن مسیحی " کے سب ایڈیٹر رہے۔
۴۔ سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک " ادیب " کے ایڈیٹر رہے۔
۵۔ سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۷ء تک " تفریح " لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔
۶۔ سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک " العصر " لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔
۷۔ سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک " زندگی " لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔
۸۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں " ستارۂ ہند " لکھنؤ کے سب ایڈیٹر رہے۔
۹۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں " استقلال " کان پور کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۰۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں " حریت " کان پور کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۱۔ سنہ ۱۹۲۳ء سے سنہ ۱۹۲۴ء تک " سردار " لاہور کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۲۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں " الفرقان " لاہور کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۳۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک " خوشباش " دہلی کے ایڈیٹر رہے۔
۱۴۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک " ریاست " دہلی کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۵۔ سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک " تیج " دہلی کے سب ایڈیٹر رہے۔
۱۶۔ سنہ ۱۹۳۲ء سے سنہ ۱۹۳۷ء تک " بچوں کی دنیا " الہ آباد کے ایڈیٹر رہے۔
۱۷۔ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک " کوکب ہند " لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔
۱۸۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں " زندگی " لکھنؤ کے ایڈیٹر رہے۔

بہر حال اس اعتبار سے جب سرور صاحب کی موت واقع ہوئی تو شاکر صاحب " مخزن مسیحی " کے سب ایڈیٹر تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء و سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ " ادیب " کے ایڈیٹر تھے اور سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک " العصر " کے ایڈیٹر رہے

۱۹۱۸ء میں شاکر صاحب "ادیب" کی ایڈیٹری چھوڑ چکے تھے۔ حیرت یہ ہے کہ دیا نرائن نگم صاحب ۱۹۱۷ء تک خاموش رہتے ہیں۔ گویا ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۷ء تک نگم صاحب یہ بات صیغۂ راز ہی میں رکھتے ہیں کہ شاکر صاحب نے مہاکوی کالی داس کی موسمی نظموں رتو سنگھار کا اردو منظوم ترجمہ ۱۹۱۳ء میں کیا۔ شاکر صاحب کو مرے ہوئے پورے تین برس بیت چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ شاکر صاحب کوئی پلانچیٹیر (PLANCHETEER) تو تھے نہیں جو سرور مرحوم کی روح کو پلانچیٹ کی طشتری پر بلا کر اس سے رتو سنگھار کا اردو منظوم ترجمہ کروا لیتے ہوں۔ شاکر صاحب نے ۱۹۱۳ء میں رتو سنگھار کا ترجمہ کیا اور اسی برس اسے شائع بھی کروا دیا۔ اس منظوم ترجمے کی کچھ نظمیں ایک دیوالگیر کلنڈر کے کئی ورقوں پر تصنیف ہوئیں جو ۱۹۱۳ء کا ہے۔ انھیں اوراق پر شاکر صاحب نے منظوم ترجمہ کا خاکہ بنایا۔ اسے نظم کا قالب دیا۔ اس پر خود اصلاح کی اور بعد میں شوکت میرٹھی اور نادر شاہجہانپوری سے اصلاح لی۔ منشی پریم چند نے اس پر جو دیباچہ لکھا وہ اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے منشی پریم چند جی شاکر صاحب کے ہمسایہ بھی تھے، ساتھ اٹھتے بیٹھتے بھی تھے اور بارہا ایسا اتفاق بھی ہوا ہے کہ وہ اس وقت شاکر صاحب کے پاس موجود تھے جب شاکر صاحب اس رتو سنگھار کو اردو نظم کا قالب پہنا رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ منشی پریم چند نے بیس پچیس صفحات کا مقدمہ لکھ کر شاکر صاحب کو پیش کر دیا۔ اگر یہ تصنیف شاکر صاحب کی نہ ہوتی تو منشی پریم چند جو دن رات ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے ضرور اس بات کو تاڑ لیتے اور اتنا طویل مقدمہ نہ لکھتے۔ مولانا شوکت میرٹھی نے اس مسودہ کی اصلاح کی اور اس پر لکھا کہ "لاجواب ہے۔ دوسرے کا یہ حوصلہ نہیں۔ اس کو سہل ممتنع کہنا بجا ہے" منشی پریم چند لکھتے ہیں:-

"حق یہ ہے کہ کالی داس کے خیالات اردو میں نظم کرنا بڑی عرق ریزی، کاوش اور فکر کا کام ہے اور حضرت شاکر کو اردو پبلک سے حوصلہ افزا داد ملنی چاہیے۔"

مگر یہ حوصلہ افزا داد شاکر صاحب کے مرنے کے بعد نیر صاحب دے رہے ہیں اور خوب جی کھول کر دے رہے ہیں۔ منشی پریم چند لکھتے ہیں: "اکسیر سخن۔ گو یہ ترجمہ ہے مگر حضرت شاکر نے ترجمہ میں آمد کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ سلاست اس مجموعہ کی بہترین صفت ہے۔ سنسکرت کے پیچیدہ اور عمیق جذبات کو نظم کرنے میں سلاست کو ملحوظ رکھنا اور اس میں کامیاب ہو جانا شاعر کی پختہ مشقی اور قوت نظر کی دلیل ہے ؎

تھے برنگ دیدۂ عشاق جو چشمے پُر آب
اڑ رہی ہے خاک ان میں صورت موج سراب
(آہو) سطح گردوں کو سمجھ کر چشمۂ آب رواں
تک رہے ہیں دیدۂ حسرت سے ہو کر نیم جاں

کتنا سچا اور نیچرل خیال ہے اور کتنی خوبصورتی سے نظم کیا گیا ہے ؎

دھوپ سے ایسے ہیں گھبرائے ہوئے مارِ سیاہ بازوئے طاؤس کے سائے میں لیتے ہیں پناہ

کس قدر جدت آمیز۔ انوکھا اور اچھوتا خیال ہے۔ اختصارِ نظم اس پر قند مکرر! ۔

ٹھنڈ کچھ سوکھے ہوئے آتے ہیں صحرا میں نظر جو پنکھ کھولے جس پہ دم لیتی ہیں چڑیاں بیٹھ کر

کیسی تصویر کھینچ دی ہے! اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کی نگاہ کس قدر جز رس ہے جنگلی جھڑبیریاں اور کروندے کے درخت بھی اس سے نہیں بچے جن کی طرف اردو شاعر کبھی بھول کر بھی آنکھ نہیں اٹھاتا!

عجب انداز سے بیلوں کو ہلاتی ہے نسیم اور کروندے کے درختوں کو نچاتی ہے نسیم

یوں ہر اک پھول پہ ٹیسو کے برستی ہے بہار سرخ جیسے کسی طوطے کی نوکیلی منقار

پھول شاخوں پہ ہیں کھولے ہوئے آغوشِ نشاط بھونرے کنجوں میں ہیں سرمست مئے جوشِ نشاط

ان مثالوں سے ناظرین پر روشن ہو گیا ہو گا کہ حضرتِ شاکر نے کس قدر اختصار سے کام لیا ہے۔ وہ روانی جو کسی اوریجنل نظم میں پائی جاتی ہے یہاں اول سے آخر تک موجود ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

شاکر صاحب سنہ ۱۹۰۱ء میں حضرت شوکت میرٹھی (شارح شرح غالب) (والد حضرت ندرت میرٹھی) کے حلقۂ تلمذ میں آئے تھے اور ان سے اپنی منظومات پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ اس کے علاوہ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے جانشین ابوالخیال جناب نادر شاہجہانپوری کو بھی اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ ابوالخیال نادر صاحب مرحوم کے حق میں میر تقی میر کی جانشینی بطور وراثت آئی تھی۔ شوکت صاحب اور نادر صاحب دونوں ہی نے رتو سنگھار کے منظوم ترجمے اکسیر سخن پر اصلاح دی تھی۔ چناں چہ نادر صاحب اپنے ایک خط محررہ ۲۰ رمارچ سنہ ۱۹۵۹ء میں اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

"جب سے مرحوم شاکر نے زمانہ کان پور سے شائع کیا تھا اس وقت سے وہ برابر اپنے اور دیگر مسیحی شعرا کے کلام پر مجھ سے اصلاح کروا کے شائع کرتے تھے اور یہی تسلیم اور ان کے والد کو بھی ان کا مشورہ تھا"

بہر حال شاکر صاحب خود شاعر تھے اور سرور صاحب سے ملنے سے پہلے اور سرور صاحب کے مرنے کے بعد شعر کہتے رہے۔ ان کے ایک ہجولی جناب پادری امبد مسیح صاحب اپنے ایک مطبوعہ مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"جناب (شاکر صاحب) شہر میرٹھ چھاؤنی کے موضع کنکر کھیڑہ کے متوطن تھے اور جناب کے والد ماجد ابراہیم تھے۔ جو چرچ مشن کے خاص مسیحی تھے۔ (سی ایم ایس یا چرچ مشن مسیحی جماعت کا ایک فرقہ) ابتدائی تعلیم کے لیے میتھوڈسٹ مشن اسکول میرٹھ میں (ایک دوسرا مسیحی فرقہ) جو بیگم کے پل کے پاس بی بی کی کوٹھی میں تھا داخل ہو گئے تھے اس وقت خادم بھی سنہ ۱۸۹۲ء میں جنوری مہینے میں اسی اسکول

میں داخل ہوا تھا صرف دس پندرہ لڑکے بورڈنگ میں تھے چند کے نام خادم کو یاد ہیں۔ ٹامس [illegible] شبہ [illegible] (اندور) ٹامس فرینکلن۔ کریم مسیح۔ [illegible] ہوفلس۔ پیارے لال (شاکر صاحب) [illegible] کیلب [illegible] اور خادم امید مسیح۔ باقی کے نام خادم کو یاد نہیں۔

مسٹر پیارے لال (شاکر) نہایت ذہین، ہنس مکھ اور کھلاڑی تھے جناب کو گانے کا [illegible] تھا۔

جب ہم چارلڑکے چوتھے کلاس میں تھے تو ہمارے اردو کورس میں مراد آباد مشن اسکول کے مولوی عبد الوہاج کی کتاب سراج الوہاج پڑھنے کو ملی جس میں بکم وکاست علم عروض کا بیان تھا۔ اس کے پڑھنے سے خادم کو اور شاکر صاحب کو کچھ کلام کہنے کا شوق ہوا۔ کچھ عرصہ بعد خادم نے اس شوق سے دست برداری حاصل کرلی اور جناب شاکر کی میرٹھ خیر نگر دروازے تھے ایک مولوی صاحب مولانا شوکت میرٹھی سے کچھ جان پہچان ہو گئی ان کی صحبت سے شاکر صاحب نے شاعری کے میدان میں قدم رکھ دیا اور آگے بڑھنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد اسکول سے چلے گئے۔ پنجاب کی طرف رخ کیا۔ وہاں جناب نے ایک ایسی شخصیت کا دامن پکڑ لیا کہ علم عروض کے دریائے بے کنار کو عبور کر گئے۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔

واضح ہو کہ یہ تحریر ان کے ایک ہمجولی کی ہے جو ایک بزرگ پادری ہیں۔ اس تحریر سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی بچپن سے ہی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔

حضرت ابو الخیال نادر شاہجہانپوری کے خط سے بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شاکر صاحب کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ وہ خود شاعر تھے اور کلام پر اصلاح بھی لیتے تھے۔ حضرت شوکت میرٹھی کی سند بھی منشی پریم چند اپنے مقدمے میں پیش کر چکے ہیں۔

شاعر ہونے کے علاوہ شاکر صاحب ایک مصروف ادیب بھی تھے۔ نواب عماد الملک۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ مولانا شبلی۔ مولانا ذکاء اللہ۔ مولانا حالی۔ مولوی نظام الدین حسن۔ منشی پریم چند وغیرہ ان کے اور ان کے کلام کے معترف و مداح تھے۔ ان کی تصانیف، تالیفات۔ تراجم ساٹھ سے زائد ہیں۔ انھوں نے اردو اساتذہ کی تقلید کرتے ہوئے اپنے گرد شاگردوں کا جھنڈ نہیں رکھا۔ کئی نامور شعرا نے ان سے اصلاح لی مگر انھوں نے کبھی اس کی نمائش نہیں کی۔ غالباً سرور صاحب کا کلام بھی وہ دیکھتے رہے تھے۔

ان کے ایک شاگرد پادری ٹامس شیرنگ ذاکر میرٹھی بھی ہوئے ہیں جو شاکر صاحب کے علاوہ فصیح الہند صوفی صدیقی الوارثی میرٹھی اور جناب ابو الخیال نادر شاہجہانپوری سے بھی اصلاح لے چکے ہیں۔ مسیحی شعرا میں یہ کافی مشہور ہیں۔ بہر حال یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ شاکر صاحب خود شعر کہتے تھے اور گاہے ماہے تاریخ بھی نکالتے تھے۔ حضرات نادر و شوکت نے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیتے رہے اور اپنے [illegible]

کو اصلاح بھی دیتے رہے۔ شاکر صاحب نے اپنے ضمیمہ رسالہ "العصر" لکھنؤ ۱۹۱۴ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ بچپن کے زمانے سے ہی ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں حضرت شوکت مدظلہ سے تلمذ اختیار کیا۔ نظمیں لکھنے کا ذوق سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء میں نہ وہ سرور صاحب سے واقف تھے اور نہ سرور صاحب ان سے واقف تھے مگر شاکر صاحب نظمیں لکھتے تھے اور ایسی نظمیں لکھتے تھے بقول نیر صاحب "نومشق کے زمانے میں جس کا شمار مشاہیر شعرا میں ہونے لگا ہو" غرض یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ شاکر صاحب کا شمار سرور صاحب سے متعارف ہونے سے پیشتر ہی مشاہیر شعرا میں ہو چکا تھا اور وہ شعر کہنے کے لیے کسی کے دست نگر یا محتاج نہیں تھے۔

نیر صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ شاکر صاحب شعر کہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس واقعہ (۱۹۱۴ء) کے بعد شاکر صاحب پورے چالیس سال زندہ رہے لیکن اس طویل مدت میں انھوں نے ایک شعر بھی نہ لکھا اور نہ ہی کوئی نظم یا رباعی ان کے نام سے شائع ہوئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ اب شاکر صاحب کو شعر لکھ کر دینے والا کوئی نہ تھا اس لیے وہ شاعری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گئے۔

نیر صاحب نے مجھے اپنے دوسرے خط میں بھی دبی زبان سے اس طرف کچھ اشارہ کیا تھا لیکن میں نے اس کا جواب اسی وقت دے دیا تھا اور خیال تھا کہ وہ اس سے مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ ان سے یہ توقع بھی تھی کہ وہ گوالیار (جو آگرہ کے پاس ہی ہے) آکر مجھ سے زبانی طور پر واقفیت حاصل کر لیں گے یا مجھے آگرہ بلوا کر اس موضوع پر سیر حاصل بحث کر لیں گے مگر ان سب کے برعکس انھوں نے یہ مقالہ لکھ کر شائع کرایا ہے۔

نیر صاحب کو حیرت ہے کہ شاکر صاحب چالیس برس تک کیسے خاموش رہے۔ حالاں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان برسوں میں بھی شاکر صاحب نے تراجم، تالیفات، منظوم تصانیف کی ہیں اور وہ شائع بھی ہوئی ہیں۔ کچھ رسالے جن میں ان کا کلام شائع ہوا ہے یہ ہیں:-

ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف، تنویر الشرق، خیام، شمس بنگال، کمال، ندیم، عالمگیر، زندگی، المایہ، اخوت، نور افشاں، روحانی شعلہ، وغیرہ وغیرہ

اس کے علاوہ ان کی ایک مشہور ادبی و مذہبی تصنیف 'غریب الوطن شہزادہ' بھی لاہور سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ہے۔

نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں :-

نظر آتے ہیں گردوں پہ جو یہ اجرام نورانی　　فروغ دیدہ و دانش ہے ان کی جلوہ افشانی
عیاں صانع کی صنعت کا ہے ان سے راز پنہانی　　نہ یہ یاقوت کے ٹکڑے نہ ہیں یہ لعل رمّانی

چراغِ آرزو ہیں بزمِ قدرت کی شبستاں کے
یہ ہیں روشن نمونے صنعتِ صناعِ دوراں کے

بجائے خود نظر آتا ہے ان میں ہر کرۂ اعظم — یہ مجموعے ہیں وہ۔ آباد ہیں جن میں نئے عالم
کشش کا سلسلہ روزِ ازل سے ان میں ہے باہم — ہمیشہ اپنے محور پہ ہے ان کو گردشِ پیہم
نشاں ہر سو نظر آتے ہیں ان میں اوج و پستی کے
یہ ہیں صورت کدے گویا ہماری بزمِ ہستی کے

کہیں ہیں آبشاریں اور کہیں ہیں وادیاں ان میں — کہیں پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں رواں ان میں
کہیں بادِ نسیمِ صبح ہے عنبر فشاں ان میں — کہیں ہے لالہ و گل کی بہارِ بے خزاں ان میں
مناظر دلربا پیشِ نظر قدرت کے ہیں پیشِ نظر ہر سو
ہوا چلتی ہے سن سن لہلہاتے ہیں شجر ہر سو

نرالی شام ہے ان کی انوکھی ہے سحر ان کی — نہ پوچھو کچھ کہ محفل ہے عجب حیرت اثر ان کی
بظاہر گو ہے ہستی خندۂ موجِ شرر ان کی — حقیقت اہلِ ہیئت سے کوئی پوچھے مگر ان کی
نہاں ہے وسعتِ تکوینِ عالم ان کے داماں میں
مہ کامل ہے دھندلا اک چراغ ان کے شبستاں میں

زمانہ بیش و کم اڈتیس صدیوں کا ہوا ہوگا — سریر آرا تھا اس عالم میں اک شہزادۂ والا
ریاضِ قدس میں تھا جلوہ فرما وہ گلِ رعنا — نظر آتا تھا تاجِ عرش میں اک گوہرِ یکتا
وہ تارا تھا کہ اک شرِ نور تھا عرشِ بریں جس سے
منور آسماں پر تھی فرشتوں کی جبیں جس سے

یہ فرمانا بجا لوکس کا ہے اے خردِ گستر — کہ تھا وہ جاہ و دولت میں سلیماں سے کہیں بڑھ کر
مرصع موتیوں کا خوش نما اک تاج تھا سر پر — چمکتے جس میں تھے بحرِ ازل کے جا بجا گوہر
رخِ روشن پہ نورانی شعاعیں جلوہ افشاں تھیں
یہ وہ کرنیں تھیں جو چشم و چراغِ بزمِ امکاں تھیں

مداوائے غم و اندوہ دردِ جانگزا کیسا — متاعِ دو جہاں ہے ہیچ اس کا خوں بہا کیسا
کیا بندوں کی غمخواری کا اس نے حق ادا کیسا — فنا میں بھی رہا جاندادۂ ذوقِ بقا کیسا؟
سب اپنا کام کر کے جانبِ عرشِ بریں پہنچا
پھر اڑ کر عالمِ بالا پہ وہ گردوں نشیں پہنچا

اُڑ کر پھر فضائے عرش سے وہ آنے والا ہے ہمیں غفلت بھی کو ساتھ پھر لے جانے والا ہے
جمالِ پاک اپنا ہم کو پھر دکھلانے والا ہے دلوں میں شعلہ نورِ ازل چمکانے والا ہے
حجابِ شوقِ حائل گو ابھی شاکرؔ ہے دوری کا
شرف پھر بخشنے والا ہے وہ ہم کو حضوری کا

یہ نظم بیالیس بندوں پر مشتمل ہے اور لاہور سے کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں خالص مسیحی تخیل موجود ہے جو ایک راسخ الاعتقاد مسیحی شاعر کے دماغ کی پیداوار ہے۔ مثلاً بند ۲۳ ؎

کہاں کا تختِ شاہی اور فضائے آسماں کیسی ہوائے حکمرانی خواہشِ تاج و نشاں کیسی
زمیں سے اُٹھ رہی ہے پیہم آوازِ فغاں کیسی ہجومِ غم میں تسکینِ دلِ ناشادماں کیسی
مجھے بہتر ہے اُجڑا جھونپڑا ایوانِ زریں سے
کہ ہے بیلوں کی چرنی خوشنما قصرِ نگاریں سے

یہ نظم ہرگز کسی غیر مسیحی شاعر کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔
علاوہ ازیں منشی پیارے لال شاکرؔ میرٹھی نے کچھ شعری تخلیقات بھی کی ہیں جو انھیں چالیس برسوں میں بس ہوئی ہیں۔ مثلاً مارچ یا اپریل ۱۹۴۲ء میں شاکرؔ نے چار رباعیاں کہی تھیں اور ایک خط میں میرٹھ میں جناب قمر وارثی صاحب کو بھیجی تھیں جو میرٹھ سے ایک پرچہ نکالتے تھے۔ رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

روتا ہوں دوست مجھے رونے دو دامن پہ ہے داغِ معصیت دھونے دو
اب نزع کے عالم میں وصیت کیسی بالیں سے ہٹو۔ غل نہ کرو۔ سونے دو

دنیا سے سفر عدم کا کرنا ہے تجھے ہستی کے منازل سے گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا اس خاک سے منہ لحد کا بھرنا ہے تجھے

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے میعادِ اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے کو ہے قطع سلسلہ ہستی کا جو پاؤں کی بیڑی ہے کٹی جاتی ہے

ہموار نہیں ظاہر و باطن جن کے چنوائے گی ان کو یہ دو رنگی تنکے
گر دل میں نہیں چور تمھارے شاکرؔ کیوں رکھتے ہو ڈر ڈر کے قدم گن گن کے

مارچ یا ایپریل [illegible] میں شاکر صاحب نے ایک غزل بھی کہی تھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں :

بے خودی اور ذوق خود بینی میں بس اتنا ہے فرق　　محوِ نظارہ ہے کوئی ۔ کوئی محوِ ناز ہے
ایک ہی جلوہ دکھا کر ہو گیا روپوش وہ　　شعلہ رو کے حسن کا یہ دل نشیں انداز ہے
چھپ گیا مٹی میں آخر انقلابِ دہر سے　　میرا جسمِ زار بھی گویا کسی کا راز ہے
ہو گیا ہے رفتہ رفتہ یہ اسیری کا مزاج　　تھک گئے ہیں بال و پر اور حسرتِ پرواز ہے
بے دلوں کو پائمالی میں سرافرازی نصیب　　واہ کیا تیرے خرامِ ناز کا انداز ہے
ہوں چمن میں نغمہ سنجِ جلوۂ حسنِ مسیح　　بلبلیں خاموش ہر گل گوش بر آواز ہے
تیرا بیمارِ محبت یوں رہے وقفِ الم　　آزمایش کا بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے
زندہ اک دم میں دلِ مردہ ہزاروں ہو گئے　　اے مسیحا تیری باتیں ہیں کہ یہ اعجاز ہے
حالِ دل سے کوئی راہِ عشق میں واقف نہیں　　میری الفت صورتِ دردِ نہاں ہمراز ہے
قیدِ عصیاں سے چھڑایا آپ نے مخلوق کو　　یعنی خونِ پاک کا بے مثل یہ اعجاز ہے

نام میرا اس کے مداحوں میں شامل ہو گیا
شاکر اپنے بخت پر مجھ کو سراسر ناز ہے

انھیں ایام میں شاکر صاحب نے یہ دو رباعیات بھی کہی تھیں ۔ ملاحظہ ہوں :-

چھلنی ہے خدنگِ غم سے سینا کیسا　　ہر وقت لہو کے گھونٹ پینا کیسا
یہ بھی کوئی لطفِ زندگی ہے شاکر　　مر مر کے جیے بھی تو یہ جینا کیسا

ہشیار ہو شاکر کہ پچھتائے گا　　کیا روز کے غم سے ترے ہاتھ آئے گا
ہنس کھیل کے جس طرح جوانی گذری　　رو رو کے بڑھاپا بھی گزر جائے گا

اسی طرح ستمبر یا اکتوبر ۱۹۲۸ء میں شاکر صاحب نے ایک غزل کہی ۔ ملاحظہ ہو :-

جس کی ہستی راہِ مولا میں فنا ہو جائے گی　　سہل اس کو منزلِ ملکِ بقا ہو جائے گی
درد و غم ، رنج و الم سب سے رہا ہو جائے گی　　روح جس دن خانۂ تن سے جدا ہو جائے گی
جاں مسیحِ پاک پر جس کی فدا ہو جائے گی　　اس کے رہنے کے لیے جنت میں جا ہو جائے گی
نام ہے ستار اس کا وہ ہے غفار و رحیم　　بخش دے گا وہ اگر مجھ سے خطا ہو جائے گی
اے مسیحائے دو عالم آ ، خدا کے واسطے　　ورنہ دنیا تیری فرقت میں فنا ہو جائے گی

تو نے جو چاہا ہوا، چاہے گا جو ہو جائے گا　　تیرا ہر ارشاد خالق کی رضا ہو جائے گی
دُکھ ہو یا تکلیف ہو کرنا پڑے گی وہ قبول　　آپ کے دربار سے جو بھی عطا ہو جائے گی
بادلوں پہ جب دکھائی دے گا وہ آتا ہوا　　اس کے جلوے پہ خدائی پھر فدا ہو جائے گی
ہمدم و مونس نہیں ہے دہر میں کوئی مرا　　پہ توکل ہے کہ امدادِ خدا ہو جائے گی

ایک دن بر آئے گی امید اے شاکر مری
ایک دن مقبول میری التجا ہو جائے گی

مئی ۱۹۴۵ء میں منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی نے تین غزلیں کہی تھیں۔ ملاحظہ ہوں:-

(۱)

کس طرح عرضِ حالتِ دردِ جگر کریں　　ممکن نہیں فسانۂ غم مختصر کریں
رازِ جنونِ غم کا نہیں راز داں کوئی　　ظالم کو اپنے حال کی کیوں کر خبر کریں
اب تک وہ منکرِ اثرِ جذبِ عشق ہیں　　شاید وہ اعتراف ہمیں دیکھ کر کریں
آنکھیں ہیں جن کے جلوۂ رعنا کی منتظر　　آنکھوں کو میرے واسطے ہرگز نہ تر کریں
وہ باخبر نہیں غمِ فرقت کے راز سے　　جو لوگ شامِ غم میں امیدِ سحر کریں
اب بے خودیٔ عشق نے سب کچھ بھلا دیا　　ممکن کہاں کہ آپ کو اپنی خبر کریں
ہے آشیاں کو وجہ تباہی نگاہِ برق　　بہتر یہی ہے اب نہ وہ مجھ پر نظر کریں
تڑپا کیے ہیں صدمۂ فرقت میں رات بھر　　کس آرزو کو وقفِ دعائے سحر کریں

دشوار ہے کہ ہم سے ادا فرضِ عشق ہو
شاکر کسی کا شکر اگر عمر بھر کریں

(۲)

امید سحر شامِ فرقت میں ہے　　الٰہی یہ کیا میری قسمت میں ہے
کہیں وہ نہ ہوں منکرِ جوشِ غم　　یہی غم۔ ہجومِ صداقت میں ہے
کروں کیا شکایت ستم کی ترے　　سنا ہے ستم تیری عادت میں ہے
ہے عرضِ محبت بھی دشوار تر　　یہ احساس بھی اب محبت میں ہے
جو ہے حُسن خود فطرتِ عشق میں　　نہ وہ حُسن سیرت نہ صورت میں ہے
بتلاتے ہیں کیوں وہ محبت کو جرم　　محبت تو انساں کی فطرت میں ہے

عیاں ہے مری زندگی حسن میں مجاز آج رنگِ حقیقت میں ہے
نہ تسکیں نہ صبر اے دلِ مضطرب عجب حال کچھ دردِ فرقت میں ہے
کہوں کس سے شاکر میں اسرارِ غم
مجھے شک خود اس کی صداقت میں ہے

(۳)

ہر اک سطحِ نظر سے ماورا معلوم ہوتا ہے خدا جانے وہ جلوہ مجھ کو کیا معلوم ہوتا ہے
وہ نالہ جو شبِ فرقت رسا معلوم ہوتا ہے دلِ بے مدعا کا آسرا معلوم ہوتا ہے
انھیں دنیائے دوں کی کب طلب ہوتی ہے اے ہمدم جنھیں ہستی کا اپنی مدعا معلوم ہوتا ہے
مذاقِ بندگی پھر لے چلا ہے ان کے کوچے میں ہمارا نارسا بخت اب رسا معلوم ہوتا ہے
وہی ہر ایک جلوے میں نمایاں ہے حقیقت کے وہی ہر ایک پردے میں چھپا معلوم ہوتا ہے
عطا کس نے کیا ہے یہ دلِ بے مدعا مجھ کو یہ کیوں سازِ تمنا بے صدا معلوم ہوتا ہے
یہ ان کا فیضِ عرفاں ہے یہ ان کی قدر دانی ہے دلِ خوں گشتہ دُرِّ بے بہا معلوم ہوتا ہے
کوئی بے درد کیا سمجھے دلِ مضطر کا افسانہ محبت سے محبت کا مزا معلوم ہوتا ہے
وہی آگاہِ لطفِ زندگانی ہے حقیقت میں جسے جینے میں مرنے کا مزا معلوم ہوتا ہے
کروں کیا شکوۂ بے مہریِ اہلِ جہاں شاکر
کہ دل اب آشنائے ہر جفا معلوم ہوتا ہے

اسی طرح مئی یا جون ۱۹۵۳ء میں شاکر صاحب نے ایک اور غزل کہی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

عصیاں سے آب آب ہوں وہ خاکسار ہوں پانی سے دب رہا ہوں وہ مشتِ غبار ہوں
بندہ ہوں وہ ترا کہ نہ کی بندگی تری میرے گناہ بخش دے میں شرمسار ہوں
مجھ کو جمالِ پاک دکھا دے مرے مسیح بیتاب شوقِ دید سے ہوں بے قرار ہوں
رحمت ہے تیری عام۔ ترا نام ہے کریم تیرے کرم کا میں بھی اک امیدوار ہوں
ہے ذات تیری منبعِ لطف و کرم مسیح کر التفات۔ بحرِ معاصی سے پار ہوں
وہ کشتیٔ نجات تو ہے جس کا ناخدا میرے زہے نصیب کہ اس پر سوار ہوں
ہے شکر کی جگہ کہ ہوں خادم مسیح کا
شاکر نگاہِ خلق میں ہر چند خوار ہوں

اسی طرح جولائی یا اگست ۱۹۵۳ء میں صاحب نے ایک نعتیہ غزل کہی تھی۔ ملاحظہ ہو:-

طبیبِ معنی و صوری مسیحا — دوائے دردِ مہجوری مسیحا
منور کر مرے تاریک دل کو — دکھا دے جلوۂ نوری مسیحا
ابد تک تو ہے جبکہ ساتھ میرے — تو کیوں ہوں شکوۂ دوری مسیحا
تو مہرِ صدق ہے میں بھی ہوں ذرہ — نہیں ہے تابِ مستوری مسیحا
مجھے نوزادگی تو نے عطا کی — مری حاجت ہوئی پوری مسیحا
تمنا ہے کروں میں تیری خدمت — عطا ہو اس کی منظوری مسیحا

کرم کر اب بڑھی جاتی ہے حد سے
ترے شاکر کی معذوری مسیحا

اگست یا ستمبر سنہ ۱۹۵۳ء میں شاکر صاحب نے ایک اور غزل کہی تھی وہ بھی ملاحظہ ہو :۔

چاہنے والا تیرا دل سے مسیحا میں ہوں — سب سے بیگانہ ہوں پہ تیرا شناسا میں ہوں
جو ہو خدمت تجھے درکار تو لے مجھ سے مسیح — مجھ پہ قابو نہیں کچھ میرا کہ تیرا میں ہوں
شرع کہتی ہے کہ ملزم تجھے ٹھہراؤں گی — فرض کہتا ہے تیرا بخشنے والا میں ہوں
شمع کافوری ہے تو محفلِ عالم میں مسیح — مثلِ پروانہ نثارِ رُخِ زیبا میں ہوں
تیری نظروں میں اگر ہوں میں بُرا تو ہوں بُرا — تو ہی اچھا مجھے سمجھے تو پھر اچھا میں ہوں
مرگ منزل ہے مگر بہرِ حیاتِ جاوید — مر بھی جاؤں گا تو سمجھوں گا کہ زندہ میں ہوں
دیکھ کر اس کو مرے دل کی لگی بجھ جائے — شربتِ دید کا عیسیٰ کے پیاسا میں ہوں
بزم میں اپنی مجھے جلد بلا لے عیسیٰ — ہمسرِ ماہیٔ بے آب تڑپتا میں ہوں

اپنے شاکر کے گنہ بخش کہ غفار ہے تو
ہو اگر پھر بھی خطا، کان پکڑتا میں ہوں

اپریل یا مئی سنہ ۱۹۵۴ء میں شاکر صاحب نے ایک نظم بھی کہی تھی جس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

آج اور کل

آج کا کام اگر نہ آج کرو — کل کو کیا ہوگا کام پھر کل کا
وہ ہماری بلند اُمیدیں — ہے ستاروں کی طرح جن میں ضیا
آج اگر چھپ گئی ہیں بادل میں — کل نکل آئیں گی غم اس کا کیا

دل وہ جس کی ہیں مسرت سے آج غم کا اگر شکار ہوا
عکس سے کیوں ہوں دل شکستہ ہم یوں کہیں تھا لکھا یہ قسمت کا"
آج کانٹوں سے کام ہے تو کل گل شگفتہ امید کا ہوگا

آج خاموش اگرچہ بیٹھا ہے کل یہ طائر چمن میں چہکے گا
اڑ گئی آج جن گلوں پر اوس رنگ کل ان کا اور ہی ہوگا
کشتی آج اپنی گو ہے خشکی پر ہوگا پانی میں کل گذر اس کا

یہ نظم مقدس بائبل کی ایک کتاب زبور کے ابواب کی چند آیات کا منظوم ترجمہ ہے جس کا مصنف اگر جیسا مسیحی شاعر ہی ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۳ء میں شاکر صاحب نے ایک انگریزی نظم کا ترجمہ بعنوان "شکر نعمت" کیا تھا، اس کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

نکل کر گیا جب کبھی گھر سے باہر نظر آئی مجھ کو غریبوں کی صورت
کروں تو کروں کیا خدا کے لیے میں کہ بخشی مجھے اس نے ہر ایک نعمت
کسی اور سے تو میں اچھا نہیں ہوں خدا نے مگر مجھ کو سب کچھ دیا ہے
مجھے صبح اور شام ملتا ہے کھانا مگر وہ بھی ہیں جن کو فاقہ ہوا ہے
بہت ایسے بدحال و محتاج بھی ہیں جو اک ٹکڑا روٹی کو پھرتے ہیں دردر

یہ اشعار تو بہت کم ہیں۔ شاکر صاحب نے ان چالیس برسوں میں اس سے کہیں زیادہ لکھا ہے لیکن بمصداق ؎

اندکے با تو بگفتم غم دل ترسیدم
تا تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اور پھر شاکر صاحب پر میں کوئی ریسرچ بھی نہیں کر رہا ہوں۔ جو کچھ دیدہ بینا سے نظر آیا پیش کر دیا۔ ریسرچ کا کام تو نیر صاحب کے عزیز انجام دیں گے۔

بہر حال شاکر صاحب ایک باکمال شاعر تھے۔ یہ ایک راز ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے کلام کا کیا ہوا۔ شاید کسی دن یہ راز بھی ظاہر ہو جائے گا۔ شاکر صاحب کی موت جس دردناک طریقے سے ہوئی ہے اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ شاکر صاحب اکثر فرماتے تھے کہ بیوی بچوں کے لیے جو ممتا ان کے دل میں تھی

وہ آسودہ نہ ہوسکی۔ بیوی بچوں کے قریب رہنے کے ارمان یا ان کو اپنے پاس رکھنے کا ارمان تمام عمر حسرت بن کر رہا۔ بیٹیوں کے بے حد حساس تھے اور آج کل کی اولادیں بزرگوں کی پاس خاطر ذرا کم ہے۔ آخری ایام بلکہ زندگی کے پچھلے چالیس برس جس مصیبت اور تنگ حالی میں گذارے ہیں ان کا ثبوت بھی آگے پیش کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود انھوں نے ممتا کی آگ کو بجھانے کے لیے ایک بچی جو پریم لتا تھی سے کرپال کی اور اس کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام بھی کیا۔ بچی کو بے حد پیار کرتے تھے اور اس پر جان چھڑکتے تھے۔ مرنے سے کچھ دن قبل بازار گئے اور حالاں کہ چلنا پھرنا مشکل تھا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی صورت بازار سے پریم لتا کے لیے پاپلین کا کپڑا اس کی فراک وغیرہ کے لیے لائے اور اس ارادے سے ٹرنک میں رکھ دیا کہ جب وہ بورڈنگ سے گھر آئے گی تو اس کی من پسند سلائی کا کپڑا بنوا دیں گے۔ جس دن گذرے صبح سویرے اٹھے۔ پڑوس میں کسی کو دودھ گرم کرنے کو دیا۔ کئی روز سے اڑوس پڑوس کے لوگوں سے کہتے رہے تھے کہ طبیعت بہت گھبرا رہی ہے اور پریم لتا کی اسکول سے چھٹی ہونے پر اس کو لے کر پونا چلے جائیں گے۔ اس دن تقریباً نو بجے ہاتھ منھ دھویا چائے اور ناشتہ کیا۔ بعد میں کمرے کے اندر جو چارپائی تھی اس پر جاکر بیٹھ گئے۔ پاس کوئی نہیں تھا۔ ہی عالم میں شاید دل کا دورہ اٹھا۔ گھبرا کر اسی طرح چارپائی پر لیٹ گئے۔ پاؤں چارپائی سے نیچے مگر زمین سے لگے ہوئے نہیں۔ گردن چارپائی سے نیچے جھکی ہوئی۔ دل کے دورے نے شدت اختیار کی اور شاکر صاحب جاں بحق ہوگئے۔ ایک پڑوسی کسی کام سے ان کے پاس گیا۔ آواز دی۔ بدن کو جنبش دی کہ ان کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ گھر میں کچھ اور نہ ہونے سے وہی پاپلین کا کپڑا جو پریم لتا کے لیے لائے تھے بطور کفن کام آیا۔ بعد میں کوئی مسیحی پادری صاحب آئے۔ ایک صندوق کھولا گیا تو تجہیز و تکفین کے لیے کچھ نقدی، دو گھڑیاں اور کچھ پرانے کاغذات ملے۔ ہفتہ بھر بعد صاحبزادہ شاکر آئے اور کچھ مال و اسباب پونا لے گئے۔ بقیہ کا کیا ہوا یہ اللہ کو ہی بہتر معلوم ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک پاکستانی دوست نے مجھے اور شاکر صاحب کو ایک ساتھ کھڑا کرکے ایک تصویر اپنے کیمرے سے لی تھی۔ غالباً وہ بھی ان کے سامان میں ہی رہی ہوگی۔ شاکر صاحب کے مرنے کے بعد ان کے کچھ غیر مطبوعہ مضامین ماہنامہ زندگی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کے صاحبزادے کے پاس میں نے وہ تصویر بھی دیکھی تھی۔ میں نے پوچھا بھی کہ یہ تصویر انھیں کہاں سے ملی مگر انھوں نے کچھ اطمینان بخش جواب نہیں دیا۔

آئیے اب ان حالات کو بھی دیکھیں جن میں شاکر صاحب نے اپنی زندگی کے آخری دن گذارے تھے۔ انھوں نے اپنی موت سے کوئی ایک ہفتہ قبل مجھے آخری خط لکھا تھا۔ خط کا سلسلہ غالباً سنہ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۴ء

قائم ہوا تھا۔

میرے پاس ان کے کثیر التعداد خطوط موجود ہیں۔ جب میں بھوپال میں حمیدیہ کالج میں ایم اے انگریزی کے لیے داخل ہوا تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا میرے پاس سے ان کے کچھ خطوط چوری چلے گئے بہرحال اب بھی کافی خطوط موجود ہیں۔ ان سے بہت کچھ اندازہ لگ سکے گا کہ غریب شاکر صاحب زندگی کے کتنے مشکل اور آزمادہ [illegible] رہے تھے۔ ایسے روح فرسا اور عبرتناک حالات میں شاکر ہی کیا کوئی بھی ادیب یا شاعر گو[illegible] ہوسکتا ہے۔ لکھنا پڑھنا باقاعدہ طور پر اسی وقت ہوسکتا ہے جب دماغ کو سکون ہو۔ بہرحال کچھ خطوط کے اقتباس ملاحظہ فرمالیجیے اور انصاف سے کہیے کہ جس ادیب و شاعر کی زندگی ایسے حالات سے عبارت ہوکر رہ جائے وہ کس طرح لکھنے پڑھنے کے لیے دماغ کو آمادہ کرسکتا ہے۔ میں صرف چند خطوط کے کچھ جملوں کو پیش کرتا ہوں۔

۲۷ رمئی سنہ ۱۹۴۴ء لکھنؤ

مکرمی تسلیم۔ نوازش نامہ موصول ہوا شکریہ

میں ایک ترجمہ میں مصروف ہوں۔ ۱۰ رجون کے بعد اس سے فراغت ہوگی تب کچھ لکھ سکوں گا۔ آج کل معذور ہوں۔

نیازمند پیارے لال شاکر

کاشانۂ ادب لکھنؤ۔ ۱۶ رفروری سنہ ۱۹۴۴ء

آپ کا خط مل گیا تھا۔ مجھ کو دوسرے ہی دن ایک ضروری کام سے بریلی جانا پڑ گیا۔ کل واپس آیا ہوں میرا سامان ابھی تک بمبئی سے نہیں آیا ہے۔ اس لیے بے سروسامانی کا سامنا ہے۔

نیازمند پیارے لال شاکر

کاشانۂ ادب لکھنؤ۔ ۲۳ رفروری سنہ ۱۹۴۴ء

مکرمی تسلیم

آج کل میں لکھنؤ کے محلہ زنبور خانہ میں مقیم ہوں۔ میرا تعلق کسی اخبار یا رسالے سے نہیں ہے۔ ا[illegible] زندگی کے نام سے نکالتا تھا جو کاغذ کی کمیابی کے باعث بند ہے۔ تصنیف و تالیف میرا شغل ہے۔ بمبئی سے کچھ کام لایا ہوں۔ اسی میں لگا ہوں۔

نیازمند پیارے لال شاکر

کرسچن بستی، دریا گنج دہلی۔ ۴ ردسمبر سنہ ۱۹۴۶ء

مکرمی تسلیم

کرایہ نہیں ہے کہ کہیں جاؤں لہٰذا آپ شوق سے تشریف لائیے۔

نیازمند پیارے لال شاکر

دہلی۔ 18-6-46

مکرمی تسلیم

مسیحی شعرا کے تذکرے کا تمام مواد میرے پاس محفوظ ہے۔ کاغذ کی کمیابی کے باعث اس کی تکمیل کھٹائی میں پڑگئی تاہم اس کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔ بدستور شعرا کے حالات و کلام کی تلاش و فراہمی جاری ہے۔

نیازمند پیارے لال شاکر

دہلی۔ 16-2-48

میری صحت اچھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت پر خط کا جواب نہیں دیا جاتا۔ مجبوری۔ تذکرۃ الشعرا کا مواد بہت فراہم کیا تھا وہ پونہ میں پڑا ہے۔ امید ہے کہ جلد میرے پاس پہنچ جائے گا۔ ایک بکس بند کر کے رکھ آیا ہوں۔ جب کوئی مستقل صورت یہاں کے قیام کی پوری ہو جائے گی تو مال گاڑی سے منگا لوں گا۔ میرے خیال میں اچھا ہوگا کہ آپ اور لائیل صاحب تسلیم مل کر اس کام کو پورا کریں۔

دہلی۔ 28-4-48

گرمی بہت زیادہ پڑنے لگی ہے۔ مجھے فکر دامنگیر ہے کہ کہیں عارضۂ قلب کا دورہ نہ ہو جائے۔ کبھی کبھی طبیعت غیر معمولی طور پر سست ہو جاتی ہے۔

دہلی۔ 17-5-48

اگر ریلیجس بک سوسائٹی RELEGOUS BOOK SOCIETY میں مجھے کوئی جگہ مل سکے تو اس سے بہتر صورت میرے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی مگر میری سفارش کرنے والا کون ہے۔ ویسے بھی ۶۸ برس کے بڈھے کو کون گھاس ڈالتا ہے۔ کوشش میں ہوں کہ ایک ہفتہ کے لیے بمبئی جا سکوں تاکہ وہاں سے کتب و کاغذات وغیرہ لے آؤں۔ جن کے بغیر بہت کچھ نقصان ہو رہا ہے۔ قطعہ کی کوشش کروں گا مطمئن رہیں۔ تین غیر مطبوعہ غزلیں ارسال خدمت ہیں۔ آج میں نے ایک ایک غزل اخوت اور صلیب کو بھی بھیجی ہے۔ المائدہ کو میری کوئی غزل نہ بھیجیے گا۔ ہاں ایک بات اور بتا دوں میں شہرت پسند نہیں ہوں۔

دہلی۔ 4-6-48

اردو صیغہ (ماہنامہ آجکل دہلی) میں متعدد حضرات سے واقفیت تھی۔ لہذا ڈیڑھ دو گھنٹہ وہاں بیٹھا انتظام ہوا ہے کہ وہاں جگہ مل جائے۔ دعا کیجیے کہ خدا مجھ پر رحم کرے۔ اگر کام مل گیا تو میری آدھی بیماری فوراً جاتی رہے گی۔ ۱۰ جون کے بعد شاید انٹرویو کے لیے طلب کیا جاؤں۔ اب تو کام مل جانے کے بعد ہی بمبئی یا پونہ جا سکوں گا۔

دہلی ۔ ۹۴-۶-۹

مکرمی تسلیم

مجھے کام تو مل گیا ہے اور میں خوش بھی ہوں ۔ مگر ڈاکٹر کی نظر کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی ۔ دفتر کی طرف سے مل گیا تھا ۔ کچھ دیکھ بھال کرنے کے بعد آج بلایا ہے ۔ آج بھی گیا ۔ اب کل بلایا ہے ۔ اگر اس امتحان سے بچ جاؤں گا تو زندگی کے بقیہ ایام آرام سے کٹ جائیں گے ۔

نیاز مند پیارے لال شاکر

دہلی ۔ ۸ ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

مکرمی تسلیم

میں بدستور اسی کام پر ہوں ۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی نہ اس کا امکان ہے ۔

نیاز مند پیارے لال شاکر

دہلی ۔ ۱۹ ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

مکرمی تسلیم

دفتر میں میرے قریب ایک جوان کی نشست ہے ۔ خوشباش نام ہے اور بی ۔ اے ہے ۔ قلمی بیویوں سے خط و کتابت کا شوق جنون سے کم نہیں ۔ ہر روز دو چار خط لکھنا معمول ہے ۔ ایک کاغذ میں نے اس سے مانگ لیا ۔ میں نے اپنی تمام عمر میں کبھی فینسی کاغذ خط و کتابت میں استعمال نہیں کیا ۔ یہ حسرت کیوں رہ جائے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے آج ۳۰ ۔ ۳۵ برس قبل تو میرے بھی مراسم تھے جب میں نے ادیب سے قطع تعلق کر کے العصر جاری کیا تو ان سے بارہا مولانا شبلی کے یہاں ملاقات ہوئی ۔ اس وقت یہ لیڈر نہ تھے ۔ اب بہت بڑے آدمی ہیں ۔ جہاں تک میری ذات خاص کا تعلق ہے دہلی میں میرا کوئی واقف نہیں ہے ۔ میں برسوں سے گوشۂ گمنامی میں پڑا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں ۔

میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں ۔ کبھی کبھی طبیعت گر جاتی ہے ۔ پھر کسی کام میں جی نہیں لگتا ۔ یہ بالعموم تکان سے ہوتا ہے ۔ یوں بھی تقاضائے عمر ہے ۔

نیاز مند پیارے لال شاکر

دہلی ۱۹ ر نومبر ۱۹۴۳ء

مکرمی تسلیم

نور افشاں (ایک مسیحی اردو نیم ماہانہ جریدہ) میں اگر تذکرہ کا سلسلہ چھیڑا گیا تو ایک سال میں ایک درجن شعرا کا حال چھپ سکے گا ۔ اب اندازہ کیجیے کتنے برس اس کی تکمیل کے لیے درکار ہوں گے ۔ کچھ جچتی ہوئی بات نہیں ۔

کوشش میں ہوں کہ یہاں کسی اخبار میں چند گھنٹوں کے لیے کام مل جائے۔

نیازمند پیارے لال شاکر

دہلی ۲۳ دسمبر ۱۹۴۸ء

مکرمی تسلیم

کوئی صاحب ایڈورڈ لاسن (EDWARD LAWSON) ہیں۔ ان کی طرف سے آج ایک منی آرڈر دس روپے کا مجھے موصول ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے کوپن پر نظر نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ کوپن میں اپنے نام کے ساتھ انھوں نے اپنا پتہ بھی لکھا ہوگا مگر پڑھنے پر حقیقت خلاف نکلی۔ مگر اس میں آپ کا نام لکھا ہے کہ آپ نے ان سے میرا تذکرہ کیا جس سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔

نیازمند شاکر (میرٹھی)

دہلی 6-1-49

۲۵ و ۲۶ دسمبر کو میری طبیعت غیر معمولی طور پر مضمحل و پژمردہ تھی۔ بچھڑے ہوؤں کی یاد نے رلا دیا۔ تمام ہفتہ بڑی بدمزگی میں گذرا۔ ۲۵ کو تو دورہ کا اندیشہ تھا۔

دہلی ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء

۲۵ و ۲۶ کو میری حالت اچھی نہ تھی۔ اب اچھا ہوں کوئی خاص شکایت نہیں کی۔ کمزوری البتہ زوروں پہ ہے۔

دہلی 16-3-49

اگر آپ ڈاکٹر مودک اور ڈاکٹر جگموہن سنگھ کے نام ایک ایک خط لکھ کر ان کا شکریہ ادا کر دیتے تو بہت اچھا تھا۔ وقت پہ آیندہ بھی ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

دہلی 8-3-49

افسوس ہے کہ میری طبیعت پھر خراب ہوگئی تھی۔ آٹھ روز گھر میں رہا لیکن افاقہ نہ ہوا۔ حد سے زیادہ کمزوری ہے۔ قویٰ مضمحل اور کار رفتہ ہو گئے ہیں۔ چار قدم چلنے میں دم پھول جاتا ہے۔ بہرحال زندہ ہوں ایسی پریشانیاں ہیں جن کے باعث گرامی نامے کا جواب نہ دے سکا۔ نوچندی کی کیا رہی۔

دہلی 22-3-49

میری صحت بدستور ہے۔ کمزوری بڑھ رہی ہے۔ ویسے دو چار دن سے طبیعت صاف ہے۔ دم برابر پھولا رہتا ہے تنفس کی خرابی سے تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اگر نوچندی، ۲۰ مارچ سے شروع ہے تو ممکن ہے کسی روز پہنچ جاؤں۔ نوچندی تو صرف میرٹھ کی عید ہوگی۔ میں اپنے بزرگوں کی قبروں پر آخری بار حاضر ہونا چاہتا ہوں اور دیکھوں گا کہ ان رشتہ داروں میں بھی کوئی زندہ ہے کہ نہیں جن سے میں لڑکپن میں واقف تھا۔

دہلی۔ 29-5-49

کاش میں آپ کی دعوت پر دہرہ دون آسکتا۔ مگر یہ کہاں تھی میری قسمت؟ میں پھر پریشان رہنے لگا ہوں۔ وہ اسامی جس پر میں مامور تھا ابولش ہوگئی۔ یکم مئی سے بے کار ہوں۔ از سر نو کوشش ہو رہی ہے۔ دیکھیے شاید کچھ ہو جائے۔ دنیا بامید قائم ہے۔

دہلی۔ 9-3-50

بڑھاپا خود ایک بیماری ہے۔ بدیں وجہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے۔

دہلی۔ 1-1-51

میری حالت بہت ابتر ہے۔ سردی نے اتنا ستا رکھا ہے کہ تمام چہرہ متورم ہے۔ گذشتہ دس ماہ سے بالکل بے کار ہوں۔ کسی قسم کا سہارا نہیں۔

دہلی۔ 1-5-52

میرے حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ ادھر تو بڑی دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں۔ روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کام کوئی ہے نہیں۔ آمدنی کہاں سے ہو۔ ریاست ہر ہفتہ ایک افسانہ اور کبھی کبھار کوئی مضمون (مقالہ) لے لیتا تھا۔ کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ اب اس نے ایک آدمی مستقل طور پر رکھ لیا ہے۔ اس لیے ہر سے تعلقات منقطع ہوگئے ہیں۔ یوں میری پریشانیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

دہلی۔ 23-6-52

میں نے شاید لکھا تھا کہ اپنے پرانے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ توجہ سے معائنہ کیا اور تین مختلف انجکشنوں کی صلاح دی۔ دواؤں کی قیمت دو دوستوں کی نوازش اور کرم فرمائی کے باعث ہاتھ آگئی۔ اب باقاعدہ علاج ہوگا جب تک یہ دوائیں ملیں گی اس وقت تک تو فکر سے نجات مل گئی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

دہلی۔ 28-7-52

میری طبیعت ازبس زیادہ گر گئی حتیٰ کہ اٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ کمزوری الگ اپنا زور دکھلا رہی ہے۔ بہت پریشان ہوں۔

دہلی، 22-8-52 ۔ مجبور ہوں کہ پریشانیاں اور کمزوری مجھے کچھ نہیں کرنے دیتیں ہیں

صحت گرتی جارہی ہے۔ تاہم زندہ ہوں۔ شکر ہے اس کا۔

دہلی۔ 52-9-12

دس یوم پیچش میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد ایک ہفتہ تک بخار نے ستایا۔ بہت تکلیف اٹھائی۔ اب اچھا تو ہوں مگر کمزوری بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ طبیعت ہر وقت گری گری رہتی ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دن کافی گرمی ہوتی ہے اور رات کو پچھلے پہر سردی ہوتی ہے۔ ستمبر کا مہینہ ہے جو عام طور پر ستمگر کے نام سے مشہور ہے۔

دہلی۔ 52-10-27

جانے کے لیے مبئی، پونا کے سوا دنیا میں میرے لیے کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ اور وہاں جانے کے لیے ایک رقم کی ضرورت ہے جس کا مہیا ہونا بظاہر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ وہی پرانی شکایتیں بدستور قائم اور تکلیف دہ ہیں۔

دہلی۔ 52-11-26

تین چار دن سے میری طبیعت پھر مکدر ہو گئی۔ شاید موسم کا اثر ہے۔ مست قلندر کے یہاں دو بار جا چکا ہوں۔ مگر جناب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس بار سنیچر کو پھر جاؤں گا۔ ایک اور اخبار کے دفتر میں بھی جانے کا ارادہ ہے۔ دو ایک چیزوں کی تیاری میں لگا ہوں کہ پیش کر سکوں۔ اور کسی سے ہنوز ملاقات نہیں ہوسکی۔ دن اتنا چھوٹا ہو گیا ہے کہ بات کی بات میں ختم ہو جاتا ہے اور سب کام دھرے رہ جاتے ہیں۔

دہلی۔ 53-2-20

میری حالت بدستور مخدوش ہے۔ مرض روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ایک سال سے علاج ملتوی ہے۔

دہلی۔ 53-2-4

میرے داہنے ہاتھ میں کلائی پر آپریشن ہوا ہے۔ لکھنے میں تکلیف ہوتی ہے ایک دن دو ڈھائی ڈرام خون ٹیسٹ (TEST) کے لیے نکالا گیا۔ اب پرسوں SKIN FLESH لیا گیا ہے۔ ہاتھ اکڑا ہوا ہے۔ ادھر میری طبیعت بالکل گر گئی ہے۔ ریاست سے جو برائے نام تعلق تھا مجبوراً اس کو بھی قطع کر دیا۔ اب تمام دن گھر میں پڑا رہتا ہوں۔

دہلی۔ 53-6-24

میں بہت سخت تکلیف میں ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ واپس ضرور ادھر ہو کر آئیے گا۔ میں انتظار کروں گا

دہلی۔ 53-6-30

میری صحت مقابلتاً اچھی ہے مگر پریشانیاں بدستور قائم ہیں بلکہ ادھر ان میں اضافہ رہا۔ بارش کا سلسلہ

ہے جس کے باعث میری تکلیف بڑھ گئی ہے۔

دہلی۔ 53-8-12

افسوس ہے کہ میری طبیعت پھر بگڑ گئی ہے جس کے باعث میں آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ اب [illegible] ان ایک دوست نے ایک درجن انجکشن لا دیے تھے۔

دہلی 54-1-11

میرے حالات بدستور ہیں۔ بڑی مشکل سے وقت کٹ رہا ہے۔ بڑا دن اور نیا سال خیریت سے گذر گیا یہی بہت ہے۔ ورنہ مفلسوں کا بڑا دن یا کوئی اور تیوہار کیا۔ آج ہاتھ میں بہت درد ہے اس لیے لکھنے میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ رات میں بہت زیادہ تکلیف تھی۔ چوٹ بہت تو نہیں لگی پنجہ اور کلائی جس طرح مڑ گئی تھی جس نے دونوں میں درد پیدا کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ ہر تکلیف کو سہنے کی طاقت دے دیتا ہے۔

دہلی۔ 54-2-10

میں سوچ رہا ہوں کہ بمبئی، پونا چلا جاؤں۔ مرتا کیا نہ کرتا تکلیفات خاص کر مالی ناقابل برداشت ہو گئی ہیں موسم میں نہایت خوشگوار تبدیلی نمایاں ہو گئی ہے۔ بسنت نے کم از کم مجھ پر تو احسان کیا ہے۔

دہلی۔ ۸ مارچ ۵۴ء

میرے لیے سب سے بہتر صورت ہے یہ کہ دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ آج طبیعت بہت مضمحل ہے۔

دہلی۔ 54-3-16

میرے حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ اب تو نوبت فاقہ تک آ پہنچی ہے۔ بات یہ ہے کہ کوئی مستقل صورت تو ہے نہیں نہ کوئی باقاعدہ امداد کا سلسلہ ہے۔ اپنوں میں کسی کم بخت کو مجھ بدبخت کا خیال نہیں پریشانی یہ ہے کہ اب پریم لتا تین ماہ کی چھٹی میں مارچ کے آخری ہفتہ میں آنے والی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اب کیوں کر گذارہ ہوگا اخوت نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ بھیجتے رہیں گے مگر اسال بڑے دن کے وقت کے دس روپے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا۔ گذشتہ ماہ ایک صاحب نے انبالہ سے تین روپے بھیجے تھے۔ کوئی ترجمہ وغیرہ کا کام بھی آج کل نہیں مل رہا ہے۔ ریاست سے تین روپیہ ہفتہ کا سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اس نے ایک آدمی کو باقاعدہ ملا رکھ لیا ہے۔ ارادہ کر رہا ہوں کہ بشپ پکٹ سے ملاقات کروں۔

دہلی۔ 54-3-29

میں اپنے بارے میں اب کیا لکھوں۔ وہی پرانی باتیں ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ کبھی تکلیف بڑھ جاتی اور کبھی گھٹ جاتی ہے۔ اب میں کام کرنے کے بالکل ناقابل ہوں۔ [illegible] جواب دے

یوں رات کو بڑی خراب حالت ہوگئی تھی۔ کل تمام دن سست اور مضمحل رہا۔ آج قدرے سکون ہے۔

دہلی۔ 17-5-54

میں نے پریم لتا کو ایک مقامی اسکول میں داخل کر دیا ہے۔ بورڈنگ کا خرچ اٹھانا میرے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مقامی ہولی ٹرسٹ چرچ نے جس کا میں ممبر ہوں میری دس روپے ماہوار کی امداد ایک سال کے لیے منظور کی ہے۔ یوں پریم لتا کی فیس اور کتابوں سے تو ایک معنی میں بے فکر ہو گیا ہوں۔ کھانے پینے کی صورت بھی اب خدا کہیں سے پوری کر دے۔ میرا لڑکا سویڈش مشن کا ہندستانی پاسٹر ہے۔ ایم کمار نام ہے۔ سب لوگ اس سے پونا میں واقف ہیں۔ شاید ہی کوئی مسیحی ہو گا جو پادری کمار کے نام اور قیام سے ناواقف ہو۔ صاحبزادے کا ذکر آتے ہی طبیعت خراب ہو گئی۔ دل بھر آیا۔ اب ختم کرتا ہوں۔ باقی پھر سہی۔

دہلی۔ 4-6-54

میں ہر بار اخبارات میں معمہ دیکھتا ہوں۔ کبھی کبھی حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چھ ماہ سے کوئی انٹری بھیجنے کی نوبت نہیں آئی۔ بے زر عشق ٹیں ٹیں۔

میری حالت آج کل ناگفتہ بہ ہے۔ یقین کیجیے گا ایک ہفتہ سے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں۔ بڑی پریشانی ہے۔ خدا بھلا کرے بقال کا کہ روٹی مل جاتی ہے مگر آج کوٹہ ختم ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

دہلی۔ ۱۵ر جولائی ۵۴ء

آج سے تمام مقامی اسکول کھل گئے ہیں۔ کتابیں اب تک نہیں خرید سکا۔ کتابوں اور کاپیوں کے لیے کم از کم دس روپے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ خدا بہت جلد اس کا انتظام کرے گا۔ آج میری طبیعت قدرے مضمحل اور رنجیدہ ہے۔ جیب خالی ہونے پر بالعموم یہی کیفیت ہوتی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ بہت جلد آپ کو ایک خوشخبری اپنے باب میں دے سکوں گا۔

۱۶ر اگست ۱۹۵۴ء

میری حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔ بعض اوقات تین پیسے بھی جیب میں نہیں ہوتے کہ کسی کو ایک پوسٹ کارڈ لکھ سکوں۔

کتابوں کا ہنوز کوئی انتظام نہیں ہوا۔ پانچ روپے کی کتابیں اس روز آگئی تھیں۔ اس کے بعد ایک کتاب اور آٹھ دس کاپیاں بعد کو آئیں۔ خدا کارساز ہے۔ امید ہے کہ اس ماہ کے آخر تک یہ ضرورت بھی رفع ہو جائے گی۔

دہلی۔ 25-8-54

خوشی کی خبر دیتا ہوں کہ میری کوشش کامیاب ہو گئی۔ امید ہے کہ بارہ پندرہ دن ضابطہ کی نذر ہو جائیں گے

ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی منظوری ہوئی ہے۔ خدائے پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے میری مصیبت و پریشانی دور کی۔ سب سے زیادہ فکر پریم لتا کی تھی۔ یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ اب مزے میں اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔

21-9-51

۱۷ کو پہلی مرتبہ روپیہ مل گیا۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔ اگست سے پنشن مقرر ہوئی ہے۔ چنانچہ کافی روپیہ ہو گیا۔ اب ہر ماہ کی چار کو پنشن ملے گی۔ پہلی پنشن چٹ پٹ ختم ہو گئی۔ کافی قرضدار تھے سب قرضہ کو بیباق کر دیا۔ کسی کا دین دار نہیں۔ خدا کا شکر ہے۔

دہلی۔ 30-9-51

ہاں پنشن کی اول قسط وصول ہو گئی تھی۔ اگلے ہفتہ میں ستمبر کی پنشن ملے گی۔ تمام قرضہ جو مجھ پر تھا اتار دیا۔ بہت کم باقی ہے۔ اس رقم کو جب اپنے بھی بیگانے ہو گئے ہرگز کم تصور نہ کرنا چاہیے۔

مجھے خارش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ بڑی تکلیف ہے علاج کر رہا ہوں۔ دن کے بارہ بجنے والے ہیں بارش کی رم جھم جاری ہے۔ کوٹھری کے اندر بیٹھا لکھ رہا ہوں مگر اندھیرے کے باعث درستی سے لکھنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔

دہلی۔ ۸ اکتوبر ۵۱ء

خارش نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ایک ماہ ہو گیا تکلیف اٹھاتے۔ علاج بھی ہو رہا ہے۔ انجکشن بھی لگوا چکا ہوں۔ مگر ابھی تک صحت نہیں ہوئی۔ پیسے کی طرف سے ضرور بے فکر ہو گیا ہوں مگر طبیعت اچاٹ سی رہتی ہے۔

دہلی۔ 12-3-55

المایدہ نے درست لکھا تھا کہ کرسمس ہفتہ میں سردی لگ گئی تھی جس نے دو تین دن میں نمونیہ کی صورت اختیار کر لی۔ خدا کی مہربانی سے لوٹ پوٹ کر درست ہو گیا۔ جنوری میں خفیف ہارٹ اٹیک ہوا مگر اس نے بھی نقاہت اور کمزوری میں اضافہ کر دیا۔ ۲۳ فروری کی صبح کے چار بجے بہت شدید حملہ ہوا۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک زندگی اور موت کی کشمکش ہوتی رہی۔ بستی کا ایک شخص میری آواز سن کر آ گیا تھا۔ اس سے بڑی مدد ملی میری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس شخص کا بھی یہی خیال تھا اس نے دن نکلنے پر دوسروں سے بھی کہا کہ آج میرا خاتمہ ہے۔ مگر خدا نے بدستور رحم کیا اور میں از سر نو جی گیا۔ کمزوری کا آج بھی یہ عالم ہے کہ چار قدم چلنا دوبھر ہے۔ بارہ تیرہ دن باقاعدہ علاج ہوتا رہا۔ انجکشن بھی لگے پینے کو بھی دوا ملی اور لگانے کو بھی۔ ۶۸ روپے کا بل ڈاکٹر نے دیا۔ کچومر نکل گیا۔ اب ڈاکٹر کا حکم ہے کہ میں کہیں اکیلا نہ جاؤں۔ اندیشہ ہے کہ کہیں

ندگی جاتے چھوڑ دے۔ مجبوراً صبح سے شام تک گھر میں بیمار رہتا ہوں۔ جنوری کے حملے کے بعد میں نے
ناکو بورڈنگ میں بھیج دیا تھا۔ اگر میں چل دیتا تو یہ ڈرامہ (رہا کا تصنیف کردہ) ملنا دشوار ہو جاتا۔

۱۹ مارچ۔ اب پہلے سے بہت اچھا ہوں۔ اگرچہ ۱۵ مارچ کو بھی ایک خفیف حملہ مرض کا ہوا گذشتہ
نڈ کا ادا ہو گیا ہے مگر سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مارچ کا بل اپریل کے شروع میں ادا کیا جائے گا۔ آج کل
فتلف دوائیں کھا پی رہا ہوں اور ہفتے میں دو انجکشن لگتے ہیں۔ دوائیں کھاتے کھاتے جی اوب گیا ہے
ں وظیفہ کی میعاد جولائی میں ختم ہو جائے گی۔ ایک سال کے لیے منظور ہوا تھا۔ کوشش ہے کہ ایک سال
یے اور توسیع ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو پونہ منتقل ہو جاؤں گا۔ اس میں کچھ قباحت نہ ہوگی۔ ۲۰ مارچ
ر چندی شروع ہے۔ اس مرتبہ ۱۵ روز تک جاری رہے گی۔ گھر میں پوسٹ کارڈ کے سوا اس وقت اور کچھ
د نہیں تھا۔

۱۵ اپریل ۵۵ء

مرض کے حملے اب تو ایک معمولی بات ہو گئی ہے۔ گذشتہ شب پھر ایک خفیف حملہ ہوا۔ دوائیں
ںا موجود ہیں اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ دہلی میں اور غیر تند خاندان ؟ اور وہ ہماری بستی میں! ایک
نیاں ایسی ضرور ہیں کہ ان کی ہمدردی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمدردی میں کچھ خرچ تو ہوتا نہیں۔ مفت
اشتن کا معاملہ ہے۔

میرا دماغ اب کام نہیں کرتا۔ پڑھنا کئی ماہ سے قطعی بند ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا بمبئی میں ایک مقدمہ میں
یا ہے۔ پرسوں بہو کا خط آیا تھا۔ اس وقت طبیعت سخت الجھن اور پریشانی میں ہے۔ تفصیلات طلب
ں دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔ اسی وقت خط لکھا ہے۔ کل جو مرض کا حملہ ہوا اس کی شاید وجہ یہی ہو۔

۲۵ جولائی ۵۵ء

میری طرح اب وہ بھی مردہ دل ہو گئے ہیں۔ وہ زندگی باقی نہیں رہی جو آج سے ۲۰۔۲۵ سال
ھی۔ یہ آخری مہینہ میری پنشن کا ہے۔ تجدید کے لیے درخواست بھیج دی ہے۔ کافی دن ہو گئے مگر
جواب نہیں آیا۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ کامیابی ہوگی۔

دہلی۔ 19-11-55

ایک ماہ سے بستر علالت پر دراز ہوں۔ پریم لتا کو اسکول سے بلا لیا تھا۔ وہ ۱۲ کو گئی ہے۔ پورے ایک
ر میں رہی۔ میری طبیعت اب کسی قدر بہتر ہے، بالکل ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر گھر میں آکر دیکھ جاتا اور
شن لگا جاتا ہے۔

خوشی کی خبر ہے کہ پہلے تو صرف تین ماہ کی توسیع پنشن کی مدت میں ہو رہی تھی۔ اب اطلاع ملی ہے کہ بقیہ ۹ ماہ کے لیے بھی توسیع منظور ہو گئی۔ امید ہے کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر پیمنٹ آرڈر بھی موصول ہو جائے گا۔ میرا چلنا پھرنا بالکل بند ہے۔ جسم میں سکت بالکل نہیں۔ اب زیادہ دیر تک بیٹھنا ممکن نہیں۔

دہلی۔ ۱۳ر فروری ۱۹۵۶ء

میرے حالات بہت خستہ ہو گئے ہیں۔ سالم تین ماہ ہو گئے کہ صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ خوراک کا یہ حال ہے کہ اشتہا بالکل جاتی رہی بمشکل نصف چپاتی ایک وقت میں کھاتا ہوں۔ بلا سہارے چار قدم چلنا بھی دوبھر ہے۔ آج چھوٹے لڑکے کو تار دیا ہے۔ دیکھیں کیا جواب آتا ہے .....

میں آج کل بہت پریشان اور الجھن میں ہوں۔ دن رات چین نہیں ٹخنے متورم ہو کر پنڈلیاں بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت لکھا نہیں جاتا۔ آج بل پیش کر کے پنشن وصول کرنے کا دن تھا مگر علالت کے باعث جا نہیں سکا۔ صبح اٹھا تو طبیعت بالکل مردہ تھی۔"

الغرض ان کے آخری دس پندرہ برسوں کے حالات ان کے خطوط کے اقتباسات سے ظاہر ہیں ان حالات میں انسان زندگی سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ بھی خاموش ہو گئے تو کون سی غیر فطری بات ہو گئی جیسے کہ پہلے لکھ چکا ہوں میرے پاس ان کے مزید خطوط بھی تھے جو اب گم ہو چکے ہیں۔

بہر حال ان خطوط سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاکر صاحب زندگی سے بیزار ہو چکے ہیں۔ دہلی میں اگر انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ لکھنؤ کے بعد وہ ایک دم روپوش ہو گئے اور مجھے پتہ لگانے کے لیے پنجاب کے نیم ماہانہ اردو جریدے میں انعامی اشتہار دینا پڑا۔ انعامی اشتہار پر شاکر صاحب کے شاگرد جناب ذاکر میرٹھی نے ان کا دہلی کا پتہ بتایا۔

۱۹۱۶ء میں جو شاکر صاحب کے حالات تھے وہ خواجہ سائل حیدری وینائی گوالیاری کی تحریر میں اس طرح ہیں۔ "ایک وہ وقت تھا مشاعرے کی شرکت کے لیے بھی شاکر صاحب ٹائی کالر سے لیس نوک تک سے درست سوٹیڈ بوٹیڈ شکل میں بڑے کروفر کے ساتھ آتے اور روزانہ نئے ملبوس میں نظر آتے تھے۔"

اکسیر سخن میں منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی کی جو عکسی تصویر شایع ہوئی ہے وہ خواجہ سائل صاحب کے اس بیان کی لفظ بہ لفظ تائید کرتی ہے۔

لکھنؤ کے قیام کے دوران میں شاکر صاحب مسلسل مالی پریشانیوں کا شکار رہے جیسا کہ خواجہ سائل صاحب کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ "تو اپنی مسلسل پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاکر صاحب نے کہا کہ مجھے افسوس بھی ہے اور آپ حضرات سے ندامت بھی۔ فی الواقعی مجھ سے مسلسل کافی وعدہ خلافیاں

ہوئیں۔ چند مقدمات دیوانی و فوجداری میرے خلاف جاری ہونے کی وجہ سے میں سخت مجبور رہا لیکن اب امید ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ میں ان مقدمات سے یقیناً مجھے نجات مل جائے گی اور سب سے پہلے میں آپ کا کام کرکے روانہ کردوں گا۔"

لیکن شاکر صاحب ان پریشانیوں سے فارغ نہ ہو سکے۔ اور مالی پریشانیوں نے انھیں اتنا معذور کردیا کہ ان پر لکھنؤ میں اور گوالیار میں علاحدہ علاحدہ دیوانی کے مقدمات چلے۔ اور چوں کہ ان کے پاس قرضہ کی ادائیگی کے لیے اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی لہٰذا انھیں دونوں ہی عدالتوں سے سزا ہوئی۔

گوالیار والے معاملے کا حال خواجہ سائل صاحب کی زبانی سنیے:۔

"سری جارج جیاجی راؤ مہاراجہ گوالیار کیلاش باسی کی ولادت ۲۶ جون ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ جہاں جہاں ولادت کے سلسلے میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ منجانب افتخار الشعرا، اعتبار الملک، خاں بہادر استاذی حضرت مضطر خلد آشیاں خیرآبادی منعقد ہوا۔ اس میں حضرت سائل دہلوی، حضرت وسیم عسکری برادر خورد حضرت ریاض خیرآبادی، مطرب لکھنوی، حضرت شرف جاورہ، جناب متین بھوپالی، حضرت صفدر مرزا پوری، شاہ دلگیر اکبرآبادی، جناب پربھو دیال عاشق سیتاپوری، جناب حمید میرٹھی، حضرت فرحت کانپوری، حضرت بزم اکبرآبادی جناب پیارے لال شاکر میرٹھی وغیرہ نے آکر شرکت کی تھی۔ ریاست گوالیار کے وزرا، سردار، جاگیردار، روسا، امرا، نے بھی بہ ذوق وشوق بہ حیثیت سامعین شریک ہوکر مشاعرہ کو زینت بخشی تھی۔

کل بیرونی مہمان قبلہ مضطر کے دولت کدہ پر سمن لال کی کوٹھی میں ٹھہرائے گئے۔ میں مشاعرے کا سکریٹری ہونے کی رو سے دیگر کاموں کے ساتھ مہمان نوازی کا انتظام بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ فرائض میزبانی کی انجام دہی کے سلسلے میں شبانہ روز میں مہمانوں کی مدارات میں رہا۔

چوں کہ ادب نواز حضرات کے اصرار پر طے پایا تھا کہ یہ مشاعرہ مع روداد کتابی شکل میں شائع کیا جائے چناں چہ اشاعت کے لیے منشی پیارے لال شاکر میرٹھی نے اپنی خدمات کی پیش کش کی اس وقت انتخاب کے لیے حسب ذیل صاحبان کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔

حضرت مضطر خیرآبادی پریزیڈنٹ۔ ممبران مولوی امیر حیدر صاحب منتظم جاگیرداران، مولوی ناصر حبیب صاحب وکیل ناصر، مولوی ریاض احمد صاحب ریاض بدایونی۔ منشی نارائن پرشاد صاحب ورما، مہر گوالیاری، منشی پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی جو اس وقت لکھنؤ میں مقیم تھے اور لکھنؤ سے ایک ماہنامہ "العصر" نکالتے

مولوی امیر حیدر صاحب منتظم جاگیرداران کے دولت کدہ پر جمع ہو ہو کر تین روز میں کل کلام کا انتخاب کرکے شاکر صاحب کے حوالے کیا گیا اور چار سو روپے بھی بطور ایڈوانس ان کو دیے گئے۔ شاکر صاحب نے تین ماہ [illegible] کیا اور دوسرے روز لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

تین ماہ بعد ان کے وعدے کی یاد دہانی کی گئی تو انھوں نے اپنی پریشانیوں کا اظہار کرتے ہوئے تین ماہ کی مزید مہلت چاہی۔ غرض تقاضوں اور مہلتوں میں قریب ایک سال گذر جانے پر سکریٹری کے ناتے بغرض انکوائری ستمبر میں مجھے (سائل صاحب کو) لکھنؤ بھیجا گیا۔

لکھنؤ میں منزوا (MINERVA) پریس کی جستجو میں تمام دن سرگرداں رہا کہیں پتہ نہ چلا تب مطبع نول کشور کے ایک معزز شخص نے علاحدہ میں مجھ سے کہا کہ منزوا پریس لکھنؤ میں کوئی نہیں۔ یہ تو فرضی نام ہے۔ دراصل پیارے لال شاکر اپنا رسالہ العصر اور چھپائی کا دیگر کام ہمارے مطبع نولکشور سے اجرت پر چھپواتے ہیں۔ نظیر آباد کے پورب میں گندے نالے پر ان کا مکان ہے چناں چہ مکان پر شاکر صاحب سے ملا تو اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاکر صاحب نے کہا کہ مجھے افسوس بھی ہے اور آپ حضرات سے ندامت بھی۔ فی الواقعی مجھ سے مسلسل کافی وعدہ خلافیاں ہوئیں چند مقدمات دیوانی و فوجداری میرے خلاف چالو ہونے کی وجہ سے میں سخت مجبور رہا۔ لیکن اب امید ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ میں ان مقدمات سے یقیناً مجھے نجات مل جائے گی اور سب سے پہلے میں آپ کا کام کرکے روانہ کروں گا۔ اب یہ میرا آخری وعدہ ہے اور ایک خط صدر صاحب کمیٹی کے نام لکھ کر مجھے دیا۔ وہ خط لشکر آکر میں نے اپنی تحریری رپورٹ کے ساتھ صدر صاحب کمیٹی کو پیش کر دیا۔ لیکن شاکر صاحب کی جانب سے اس آخری وعدہ کی ایفائی نہ ہونے پر نوٹس دینے کے بعد باضابطہ عدالت مجاز میں شاکر صاحب کے خلاف دعویٰ دائر کردیا۔

شاکر صاحب بسلسلۂ مقدمات لکھنؤ میں سزا ہو چکے تھے چناں چہ عدالت مجاز گوالیار کی طلبی پر سنٹرل جیل لکھنؤ سے پولیس گارڈ کے ساتھ شاکر صاحب پا بجولاں گوالیار آئے اور یہاں کی عدالت سے بھی چھ ماہ کی سزا کا حکم سنا کر ان کو واپس لکھنؤ کیا گیا۔

پولیس گارڈ کی حراست میں جس وقت شاکر صاحب پا بجولاں گوالیار کورٹ میں آئے وہ بڑا ہی عبرتناک سین تھا۔ ان حالات کا قلب پر بہت ہی خصوصی اور کافی گہرا اثر ہوا۔ یعنی ایک وہ وقت تھا کہ مشاعرے کی شرکت کے لیے یہی شاکر صاحب ٹائی کالر سے لیس۔ نوک پلک سے درست سوٹیڈ، بوٹیڈ شکل میں بڑے کروفر کے ساتھ آتے اور روزانہ نئے ملبوس میں نظر آتے تھے اور ایک یہ وقت کہ قیدیوں کا لباس زیب تن تھا۔ باور کیجیے کہ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔

حقیقتاً اس عالم اسباب میں بہت ہی معمولی سی معمولی لغزش پر بھی بعض اوقات ہر تدبیر تلافی بے سود ہو کر انسان کو بڑے سے بڑا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ کسی نے بالکل صحیح کہا ہے۔ مصرعا

کرتو کر ورنہ خدا کے غضب و قہر سے ڈر

خواجہ سائل حیدری مینائی گوالیاری

11-1-44

خواجہ سائل حیدری مینائی گوالیاری (جو بفضلہ ابھی حیات ہیں) کی تحریر سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاکر صاحب کی زندگی میں ان کی مالی پریشانیوں کی وجہ سے روح فرسا مرحلے آئے۔ اور ایک شاعر اور ادیب بہت حساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاکر صاحب کی ضروریات زندگی اور دیگر مجبوریوں نے ان سے وہ پیسہ جو کسی کام کے لیے انھوں نے انھیں ملا تھا خرچ کروا دیا اور ادائیگی کی صورت ناممکن ہونے کی وجہ سے انھیں غریبی کے جرم میں جو ہمارے ملک میں ناقابل معافی جرم ہے سزا بھگتنی پڑی — زندگی نے جو کھیل ان کے ساتھ کھیلا اس کو وہ صبر سے سہتے ضرور رہے لیکن اب وہ مجبوراً دنیا سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی پر آمادہ ہو گئے۔ موت ان کے بس کی چیز نہیں تھی لیکن اس عرصے میں وہ زندگی سے ہر روز بیزار ہوتے رہے۔ غم و آلام میں دماغ مخمس ہو جاتا ہے۔ لہذا انھوں نے بہ حیثیت شاعر بہت کم کہا لیکن جب بھی کہا وہ ان کے ٹوٹے ہوئے دل کی پکار تھی۔

مجھے سرور صاحب کے کلام کے خرد برد ہونے کا اتنا ہی افسوس ہے جتنا کسی بھی اردو ادب کے نام لیوا کا ہو سکتا ہے۔ اگر شاکر صاحب نے سرور صاحب کا کلام چرایا ہوتا تو میں بھی اس بات کی پُرزور مذمت کرتا لیکن جب یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ ایک بہتان اور الزام ہے تو ضروری ہے کہ غریب شاکر صاحب کی بے گناہی اور معصومیت کو ظاہر کر دیا جائے اور حقایق کو آئینہ دکھا دیا جائے۔

جناب حکم چند نیّر سے میری یہی درخواست ہے کہ ؎

اندکے با تو بگفتم غم دل ترسیدم
تا تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

سید خواجہ حسینی

فرہنگ آصفیہ تنقید کے آئینے میں

جدید فن لغت نویسی کے اصولوں کی روشنی میں فرہنگ آصفیہ اردو زبان کی سب سے پہلی جامع
ط اور مستند لغت ہے۔ اس تالیف کی وجہ سے سید احمد دہلوی کا شمار اردو زبان کے محسنین میں ہوتا
ہیے۔ بحیثیت لغت نویس تاریخ اردو میں انھیں وہی اہمیت اور عظمت حاصل ہونی چاہیے جو جانسن
انگریزی زبان میں حاصل ہے۔

فرہنگ آصفیہ پر تنقیدی نظر ڈالنے سے پہلے خود صاحب فرہنگ آصفیہ کے لغت نویسی کے نظریہ کے
تعلق جان لینا زیادہ مناسب ہوگا۔ لغت نویسی میں سب سے پہلے الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہے۔
س معاملے میں صاحب فرہنگ آصفیہ نے بڑی وسعت نظر سے کام لیا ہے اور اپنی لغت میں زبان کے پورے
فظی سرمائے کو جگہ دینے کی تا حد امکان کوشش کی ہے۔ "عام محاورے، خاص محاورے، فقیروں کی صدائیں
سودے والوں کی آوازیں، جواریوں، ٹھگوں، دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں اور مختلف پیشہ وروں[۱]
کے روزمرے اور محاوروں کو بھی اپنی لغت میں جگہ دی ہے۔ اس میں ادبی زبان کے الفاظ بھی شامل ہیں اور
عوام کی بولیوں کے الفاظ بھی۔ "اگر کچھ چھوڑا ہے تو فحش چھوڑا ہے[۲]"

لغت نویس کے لیے دوسرا مرحلہ الفاظ کی ترتیب کا ہے۔ صاحب فرہنگ نے الفاظ کی ترتیب کے
علق سے حروف تہجی کا لحاظ رکھا ہے اور الفاظ کی ترتیب میں صرف لفظ کے پہلے حرف ہی کا لحاظ نہیں
رکھا بلکہ لفظ کے سارے حروف کا ترتیب میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ "لغت اور جو جملے جس لغت سے متعلق ہوں
انھیں اسی کے ساتھ درج کیا ہے۔" اصل لغت شروع میں اور اس کے بعد مشتقات لکھے ہیں اور مثالیں

۱،۲ فرہنگ آصفیہ ص ۲

قلموں اور شروع سطر کے فرق سے ظاہر کی ہیں۔

لغت میں الفاظ کے ماخذ اور گرامر کے تعلق سے مواد مہیا کرنے کے سلسلے میں وہ یوں رقمطراز ہیں کہ "زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتہ اس میں ملتا ہے .... ہندی لغتوں کے مادوں کی تحقیق اکثر پالی اور پراکرت سے لے کر فارسی تک سے کی ہے .... اگر ہندوستان قدیم کا کوئی لفظ آیا ہے[1] تو اسے بھی جتا دیا ہے کہ یہ سنسکرت کے رواج سے پہلے کی نشانی ہے[2]" علم لسانیات کی روشنی میں الفاظ کے ماخذ کی کاوش میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ گرامر کے لحاظ سے لفظ کی نوع بھی لکھ دی ہے اور تذکیر و تانیث اہل دہلی اور اہل لکھنؤ کے موافق اس میں ملتی ہے۔

لغت نویس کا سب سے اہم مقصد الفاظ کے معانی لکھنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بڑی ہشیاری سے کام لیتے ہیں۔ اور لفظ کے مختلف قسم کے جتنے معنی ہوں سبھی کو لغت میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ کا محل استعمال بھی لکھ دیتے ہیں۔ صاحب فرہنگ لفظ کے معنی لکھتے وقت لفظ کے زیادہ سے زیادہ مترادفات لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس دور کے رسم و رواج اور خاص کر عورتوں کے رسموں کی جا بجا صراحت ملتی ہے۔ جو محاورے آئندہ رواج پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔

اپنی لغت کے متعلق تبصرہ انھیں کی زبان میں ملاحظہ کیجیے۔ "اہل زبان کیا کسی زبان داں نے بھی اس طرف (لغت نویسی کی طرف) توجہ نہیں فرمائی غالباً یہ بازی ہمارے ہی نصیب میں لکھی ہے اور خدائے تعالیٰ نے ابتدائے عمر ہی میں خاص اس وجہ سے ہمیں اس کا گرویدہ، شیدا اور عاشق زار بنایا ہے۔ شعرا کو اس سے (فرہنگ آصفیہ) سے مدد ملے گی، محققان زبان کو اس سے فائدہ پہنچے گا، مصنفوں کے حق میں مترادف، ہم معنی، ہم پہلو الفاظ یکجا دکھا کر بار بار عبارت میں ایک قسم کے الفاظ کی بچانے والی یہ لغات ہوگی۔ گویا ذخیرہ جیسے انگریزی میں تھزارس (Thesaurus) اور اردو میں مخزن کہنا موزوں ہوگا۔ اکثر تاریخی واقعات

---

[1] علم لسانیات کے تحت ہند آریائی زبانوں میں چار قسم کے الفاظ ملتے ہیں تتسم وہ الفاظ جو خالص ہند آریائی بولی سے تعلق رکھتے ہوں۔ تدبھاؤ: وہ تتسم الفاظ جو پراکرت میں بگڑی ہوئی شکل میں پائے جائیں۔ دیسی الفاظ وہ ہیں جو آریاؤں کی ہند میں آمد سے قبل کی ہندوستانی بولیوں میں رائج ہوں۔ مزید معلومات کے لیے سنیتی کمار چیٹرجی کی کتاب ہند آریائی اور ہندی دیکھی جا سکتی ہے۔

[2] فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ ؟

اصطلاحی وجہ تسمیہ کا اس سے پتہ چلے گا۔ متروک اور غیر متروک الفاظ کی تمیز اس سے ہوگی۔ فصیح اور غیر فصیح محاورات اور تذکیر و تانیث کا فیصلہ اس سے ہوگا۔ مختلف فرقوں کی خاص خاص اصطلاحیں اس سے معلوم ہوں گی۔ اہل اسلام و ہنود اس سے مستفید ہوں گے۔ بہت سے فقرا اور اولیا ہند کے حالات بترتیب سنین اس سے بہم پہنچیں گے۔ نیز اختراعوں اور ایجادوں کی کیفیت اس سے معلوم ہوگی[1]۔

سید احمد دہلوی سے پہلے بھی اردو میں کئی لغت مدون ہوئے، جن کے نمونے ان کے پیش نظر رہے اس لیے اردو کے قدیم لغت نویسی کے نظریہ پر بھی ان کی نگاہ تھی اور عربی و فارسی لغت نویسی کے نظریوں سے بھی وہ واقف تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی سے اردو زبان کے انگریز لغت نویسوں نے اپنی لغت کی تدوین سے یورپی لغت نویسی کے نظریات سے اہل ہند کو روشناس کرایا خود سید احمد نے ڈاکٹر فیلن کے ساتھ تقریباً سات سال ان کی لغت کی تدوین میں مددگار کی حیثیت سے کام کیا۔ اس لیے انھیں یورپی نظریات سے گہری واقفیت حاصل ہوئی۔ اس لیے جب انھوں نے اپنی لغت کی تدوین کی تو ہمیں ان کی لغت میں جدید نظریات لغت نویسی کارفرما نظر آتے ہیں۔ اس نظریہ کو اس قدر بہتر طریقے سے کسی اور دیسی لغت نویس نے نہیں اپنایا۔ اور یہ سید احمد کی بحیثیت لغت نویس بڑائی کا اہم سبب ہے۔

جدید لغت نویسی کے نظریہ سے اس قدر واقفیت کے باوجود فرہنگ آصفیہ کی پہلی جلد کی تمہید میں وجہ تالیف والا عنوان پڑھنے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں جدید فن لغت نویسی کا نظریہ واضح نہ تھا یا یوں کہیے کہ جدید نظریات پر ان کی نظر گہری نہ تھی اور نہ لغت کے حدود سے وہ مکمل طور پر آگاہ تھے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ لغت انسائیکلوپیڈیا کا مزہ دے گا"[2]۔ ظاہر ہے کہ لغت اور انسائیکلوپیڈیا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لغت کا تعلق الفاظ سے ہے اور انسائیکلوپیڈیا کا علوم سے۔ اس لیے لغت کو انسائیکلوپیڈیا نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی لغت کی ایک اور خوبی انھوں نے یہ بتائی ہے کہ "گویا ایک ذخیرہ ہے جسے انگریزی میں (Thesaurus) اور اردو میں مخزن کہنا موزوں ہوگا"[3]۔ اس میں شک نہیں تھسارس بھی لغت کی ایک قسم ہے جس میں الفاظ بلحاظ موضوع ترتیب دیے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد الفاظ کا مترادف لکھنا نہیں ہے۔ لغت میں الفاظ کے مترادفات بھی لکھے جاتے ہیں مگر اس کا صرف یہی مقصد نہیں کہ لفظ کے سامنے مترادفات لکھ دیے جائیں۔ بلکہ لفظ کے معنی زیادہ آسانی سے سمجھ میں آنے کے لیے اور لفظ کے مختلف قسم کے معانی

---

[1] فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ ۵۱

[2] و [3] فرہنگ آصفیہ جلد اول صفحہ ۴

کے پیشِ نظر حروفات لکھے جاتے ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سید احمد لغت نویسی کے جدید نظریہ سے واقف رہنے کے باوجود اس نظریہ کے تمام اصولوں کو واضح طور پر سمجھ نہ سکے تھے اور اس نظریہ کی گہرائی سے وہ کم واقف تھے ورنہ اپنی فرہنگ کی تمہید میں اس قسم کی الجھی ہوئی باتیں نہ لکھتے۔ اس عمومی بحث کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ انھوں نے فنِ لغت نویسی کے اصولوں کو کس حد تک سلیقے سے اپنے لغت میں برتنے کی کوشش کی ہے۔

سید احمد کے لغت کی تمہید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایسا مبسوط لغت لکھنا چاہتے تھے جو ہر طبقہ کے لیے مفید ہو ماہرین کے لیے بھی اور عوام کے لیے بھی، طلباء کے لیے اور اساتذہ کے لیے بھی۔ ظاہر ہے اس قسم کا لغت کافی ضخیم ہوتا اور کئی جلدوں میں پھیل جاتا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا کیوں کہ ان کا ارادہ اردو زبان کو ایک جامع اور مبسوط لغت دینے کا تھا

اس عظیم مقصد کے پیشِ نظر صاحب فرہنگ آصفیہ کے الفاظ کا دائرہ انتخاب بہت وسیع ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کافی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ زبان کے سارے لفظی سرمائے کو اپنے لغت میں سمیٹ لیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے مختلف پیشوں کی اصطلاحوں، فقیروں کی صداؤں، عورتوں کی بولی، رسم و رواج سبھی کے متعلق معلومات مہیا کیں ہیں۔ اس طرح انھوں نے اس دور کے پیشہ وروں کی اصطلاحوں اور عام بول چال کے سارے لفظی سرمایہ کو اپنی لغت میں جگہ دی ہے۔ ان کی یہ کوشش لائق داد اور قابلِ تحسین ہے۔

اردو زبان کے لغت نویس کو ایک اور مرحلہ بھی طے کرنا پڑتا ہے یعنی زبان پر علاقائی اثرات کیوں کہ اردو دیس کے اتنے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہے کہ اس زبان پر علاقائی اثرات کا کارفرما ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے اردو میں ایک علاقے اور دوسرے علاقے کی بولیوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً شمالی ہندوستان اور دکن کی اردو میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ اور پھر شمالی ہند ہی میں مغربی ہندی کے علاقے اور مشرقی ہندی کے علاقے کی اردو میں بھی کچھ کچھ فرق ہے اور یہی فرق لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں کے ادب کی زبان میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح برصغیر کے شمال مغرب میں چلے جائیں یعنی مغربی پاکستان میں تو اردو پر وہاں کے علاقائی بولیوں کے اثرات ملیں گے۔

موجودہ دکنی پر دراوڑی زبانوں کے اثرات بھی نظر آتے ہیں[۱]۔ اس کے باوجود اردو ہند آریائی زبان ہونے کی وجہ سے دراوڑی زبانوں کے دائرے میں اجنبیت محسوس کرتی رہی۔ اس لیے دکنی اور جنوب کی

---

[۱] اس سلسلے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا مضمون جو اردوئے معلیٰ (دہلی یونیورسٹی) کے لسانیات نمبر میں شائع ہوا ہے ملاحظہ ہو۔

دوسری دراوڑی زبانیں ایک دوسرے کو بہت کم متاثر کرسکیں۔ دکنی میں ہمیں وہ نقوش زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں جو اردوئے قدیم کی خصوصیات ہیں[1]۔ اس لیے اردو لغت کی تدوین میں دکنی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ زبان کی جامع لغت گویا زبان کی تاریخ کا عکس ہوتا ہے یا گراف ہوتا ہے جس میں زبان کے ارتقا کے سلسلے کی مختلف کڑیاں ملنی چاہئیں۔ سید احمد کے دور میں قدیم دکنی ادب کے کارنامے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ اس لیے ان پہ یہ الزام عائد نہیں ہوتا مگر کم سے کم ولی دکنی سے وہ ضرور واقف تھے مگر انھوں نے بڑی حد تک اس کو بھی نظر انداز کر دیا صرف ایک آدھ جگہ ولی کا ذکر ملتا ہے کہ فلاں لفظ ولی نے استعمال کیا ہے اگر مولف دکنی کے لفظی سرمایے کو نظر انداز نہ کرتے تو اردو لغت نویسی میں ایک نئی روایت جنم لیتی۔

شمالی ہندوستان کی زبان کے تعلق سے بھی ان کا دائرۂ انتخاب محدود تھا۔ صاحب فرہنگ دہلی کی زبان کو معیاری سمجھتے تھے اور لکھنؤ کی زبان سے بھی الفاظ و محاورے لے لیتے ہیں۔ البتہ ہندی الفاظ کے تعلق سے بنارس بلکہ الہ آباد تک انھوں نے اپنا دائرہ وسیع کر دیا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اردو زبان کی جامع لغت کی تدوین کے ارادے اور دعوے کے وہ اردو زبان کے سارے لفظی سرمایے کو اپنی لغت میں شامل نہ کر سکے۔ البتہ ہندی الفاظ کو لغت میں جگہ دینے میں بڑی فراخ دلی دکھائی ہے۔

اس کے علاوہ سید احمد نے اس وسیع لفظی سرمائے کو بھی مکمل طور پر اپنے لغت میں جگہ نہ دی جو نظیر نے اپنی شاعری میں استعمال کیا۔ نظیر عوام کا شاعر تھا، عوام کے لیے لکھا اور عوام کی زبان میں لکھا۔ نظیر نے جتنے الفاظ عوامی بول چال کے استعمال کیے آج تک کسی اور اردو شاعر نے اس قسم کی جرأت نہیں کی۔ بہت سے الفاظ جو نظیر نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں فرہنگ آصفیہ میں نہیں ملتے۔ آج نظیر کے کلام میں کئی ایسے لفظ ملتے ہیں جن کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ اگر صاحب فرہنگ آصفیہ اس طرف توجہ فرماتے تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔

مذکورہ بالا خامیوں کے باوجود صاحب فرہنگ آصفیہ کی زبان کے سارے لفظی سرمائے کو سمیٹ لینے کی کوشش قابل ستائش ہے۔ ان کے لغت میں دہلی کی زبان کا سچا عکس اور مکمل نقشہ ہمیں ملتا ہے۔ انھوں نے اس میدان میں اتنی زیادہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے کہ آج تک کسی نے اتنی اور ایسی کوشش نہیں کی۔ مغلوں کے دربار، قلعے کے ملازمین کے نام، وہاں کے رسم و رواج، وہاں کی عورتوں کی بولی، ان کی مخصوص اصطلاحیں، عورتوں کے ٹوٹکے، بچوں کے کھیل، بڑوں کے مشغلوں وغیرہ کی تفصیلات کو اپنے لغت میں محفوظ کر لیا ہے۔ اگر یہ لغت مدون نہ ہوتا تو آج ہم اردو کے کلاسیکی دور کے ادب کی زبان کے

---

[1] پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کا مضمون "دکنی یا اردوئے قدیم" مجلہ عثمانیہ کے دکنی نمبر ۱۹۶۴ء میں ملاحظہ ہو۔

کئی الفاظ کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ۔ سید احمد اس تہذیب کے پروردہ تھے اور اسی تہذیب کی زبان کو محفوظ کر لینے کا سودا سر میں رکھتے تھے ۔ اس لیے کم از کم اس میدان میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ۔

ترتیب الفاظ کے تعلق سے صاحب فرہنگ نے حروف تہجی (alphabetical order) کا لحاظ رکھا ہے ۔ ان کی لغت ترتیب الفاظ کا اچھا نمونہ ہے ۔ پہلے اصل لغت اور اس کے بعد مشتقات وغیرہ لکھے ہیں اور ۲۸ حروف تک ترتیب کا لحاظ رکھا ہے[۱] ۔ اس کے علاوہ لفظ کے معنی لکھتے وقت بھی ترتیب کا لحاظ رکھا ہے پہلے اصل معنی پھر مرادی معنی اور مجازی معنی وغیرہ لکھے ہیں ۔

فرہنگ آصفیہ میں الفاظ کے مآخذ کے تعلق سے جتنا مواد ملتا ہے وہ اردو زبان کی کسی اور لغت میں شاید ہی ملے ۔ اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء کے سلسلہ میں سید احمد کافی جدید ذہن رکھتے تھے ۔ اس دور میں یہ نظریہ عام تھا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ۔ اردو کے کئی محققوں نے یہ بات اتنی مرتبہ دہرائی کہ محمد حسین آزاد نے اس کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھ لیا ۔ آب حیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں " اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی " سید احمد بھی اسی نظریہ کی حامی بھرتے ہیں مگر وہ اشارہ بھی کرتے ہیں کہ اردو برج بھاشا کی بیٹی نہیں ہو سکتی[۲،۳] ان سے پہلے کسی لغت نویس نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آریاؤں سے پہلے ہندوستان میں کون لوگ بستے تھے ۔ ان کی بولیاں کیا تھیں ۔ ان بولیوں نے آریائی بولی پر کیا اثر کیا ۔ کیا جدید آریائی بولیوں میں اس بولی کے اثرات ملتے ہیں ۔ سید احمد نے الفاظ کا ماخذ لکھتے وقت یہ اشارے کیے ہیں کہ فلاں لفظ دیسی ہے یعنی ہند میں آریاؤں کی آمد سے پہلے کی بولیوں کی نشانی ہے ۔ الفاظ کا ماخذ لکھتے وقت وہ لفظ کے تلفظ کی پوری تاریخ لکھ دیتے ہیں ۔ جیسے :

" آنا ۔ ھ ۔ فعل لازم (سنسکرت गमन + आ = आगमन) آگمن = آ + گمن ۔ فارسی آمدن ۔ پرانی ہندی آمنا ۔ گنوار " آونا "

" پہلے آگمن میں " گ " اس طرح گرا دیا جس طرح جگنا دچنا ۔ دگنا میں گرا کر دونا بنا دیا چھگری سے گرا کر چھری لگنا میں سے بیں گرا کر لانا رہ گیا ۔ چناں چہ برج میں آمنا بجائے آنا اب تک بولتے ہیں ۔ چوں کہ میم واؤ کا بدل ہے اور اس کی مثالیں بہت سی موجود ہیں جیسے بھگمان سے بھگوان ۔ جیمنا سے جیونا ۔ سیمنا سے سیونا پس

---

[۱] فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۴

[۲ و ۳] پنجاب میں اردو میں پروفیسر شیرانی نے صاحب فرہنگ کے تعلق سے بھی اقتباس پیش کیا ہے کہ سید احمد بھی اردو کو برج کی بیٹی سمجھتے ہیں مگر قابل محقق نے یہ نظر انداز کر دیا کہ صاحب فرہنگ نے یہ اشارے بھی دیے ہیں کہ اردو برج کی بیٹی نہیں ہو سکتی ۔

اب یہ لفظ تیسری صورت میں بدل کر آونا ہوگیا پھر کثرت استعمال سے جس طرح सरदा سرواسے واو گر کر سدا اور جھونا سے گر کر جھلنا رہ گیا اس طرح آونا کا آنا ہو گیا۔ ہم نے بعض موقعوں پر اس طرح کے ثبوت پیش کیے ہیں تاکہ لوگ صرف حوالہ دیکھ کر حروف کے تغیرات و تمثیلات کو سرسری نظر سے نہ دیکھیں بلکہ ان کا ثبوت اپنے اوپر واجب جانیں اور طبیعت پر زور ڈال کر یا اس کتاب کی مدد سے کر تحقیق زبان کی کوشش میں ہوں "

اس طرح کی سیر حاصل بحث ان سے پہلے بلکہ ان کے بعد بھی جو لغت تدوین کیے گئے اُن میں نہیں ملتی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمد لفظ کے ماخذ کے تعلق سے کتنا جدید ذہن رکھتے تھے۔ مگر اس قسم کی تفصیل میں خرابی یہ ہے کہ ہر لفظ کے ماخذ کو اتنی تفصیل اور اتنی ساری مثالوں سے واضح کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ کوئی بھی لغت اتنی طویل تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی تفصیل کو مختصر طور پر اس طرح بھی پیش کیا جا سکتا تھا جیسے۔ آگمنا ← آمنا ← آونا ← آنا (آگمنا = آ + گمن) (س)۔ لغت نویسی کے فن کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے۔

اس میں شک نہیں وہ بعض اوقات اختصار سے بھی کام لیتے ہیں جیسے

آنکھ۔ مد۔ اسم مونث (अक्षि۔ اکشی۔ از س) پراکرت اچھی۔ پالی۔ اکھی۔ انگریزی (eye) گدھی۔ انکھی۔ گڑھوالی۔ انکھا۔ عربی عین۔ ژند۔ ایومن وغیرہ۔

اس میں آنکھ کے تعلق سے لفظ کا ماخذ بھی بتایا ہے اور مختلف ہند آریائی بولیوں میں اس لفظ کا تلفظ بھی لکھا ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لفظ آنکھ کا انگریزی اور عربی مترادف لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

سید احمد نے اپنے لغت میں کئی دیسی الفاظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ آریاؤں کی آمد سے قبل کی ہندوستانی بولیوں کی نشانی ہے۔ مگر اس معاملے میں ان کی معلومات محدود تھیں۔ وہ لفظ پاگ کو دیسی بتاتے ہیں مگر لفظ ناریل کو ہندی لفظ لکھ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ یہ کھوج نہیں کرتے کہ خود ہندی میں یہ لفظ کہاں سے آیا۔ یہ لفظ آریاؤں کی ہند میں آمد سے قبل کی بولی آسٹرک کی نشانی ہے[1]۔ اسی طرح وہ لفظ گھوڑا کو بھی ہندی لکھتے ہیں اور مزید جستجو نہیں کرتے۔ لفظ گھوڑا دراوڑی زبان کا آریاؤں کو تحفہ ہے (گھوٹ ← گھوٹر ← گھوٹ۔ سنسکرت گھوڈ پراکرت گھوڑا[2]) آج بھی تلگو میں گھوڑا کے لیے لفظ گُرّم (ਗ਼ਰ਼ਮ) استعمال ہوتا ہے اسی طرح اور بہت سے الفاظ جیسے کنول وغیرہ کو ہندی لفظ لکھ دیتے ہیں اور مزید تحقیق سے کام نہیں لیتے۔ ایک عام ملہ

---

[1] سنتی کمار چیٹرجی کی ہند آریائی اور ہندی ملاحظہ ہو۔

[2] سنتی کمار چیٹرجی کی ہند آریائی اور ہندی ملاحظہ ہو اور ڈاکٹر مسعود حسین کی مقدمۂ تاریخ زبان اردو

سید احمد دہلوی پر الزام عائد نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس دور میں علم لسانیات اتنا زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور الفاظ کے ماخذ کی چھان بین کے لیے اصول متعین نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے فرہنگ آصفیہ میں اس قسم کی کوتاہیوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ سید احمد نے اس معاملے میں تحقیق و جستجو کا پورا حق ادا نہیں کیا۔ جہاں تک ان کی معلومات ساتھ دیتیں انھیں حدوں میں رہ کر وہ لفظ کے ماخذ وغیرہ لکھتے ہیں۔ اور کسی لفظ کے ماخذ کے متعلق جتنی معلومات انھیں حاصل ہوتی ہیں انھیں سپرد قلم کر دیتے ہیں اور جہاں کہیں ان کی معلومات محدود ہوں وہ صرف یہ لکھ دیتے ہیں کہ لفظ کس زبان کا ہے جیسے "لکیر"۔ ھ (ہندی) لکھاندھ (ہندی) نزاکت۔ ھ۔ وغیرہ۔

اس تمام بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمد لغت نویسی کے اصول سے واقف ضرور تھے اور انھی احمد صاحب اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ لفظ کا ماخذ لکھیں۔ مگر انھوں نے ہر لفظ کا ماخذ لکھنے کی کوشش بھی نہیں اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی یہ فرہنگ اور زیادہ کار آمد ثابت ہوتی مگر یہ ان کے بس کی بات بھی نہ تھی کیوں کہ اس قسم کا کام ایک فرد کے بس کی بات نہیں اس کے لیے تو ایک ادارہ چاہیے۔ اس لیے سید احمد کی اس قسم کی کوتاہیوں کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔

لغت کی ایک اور خوبی یہ ہوتی ہے کہ لغت زبان کی گرامر کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ فرہنگ آصفیہ میں گرامر کے لحاظ سے لفظ کی صرف نوع لکھ دی گئی ہے۔ آٹھ۔ ھ (ہندی) صفت۔ اُتارنا۔ ھ۔ (ہندی) فعل متعدی۔ آریا۔ ھ (ہندی)۔ اسم وغیرہ۔ گرامر کے لحاظ سے الفاظ کی نوع سید احمد سے پہلے کے لغات میں بھی لکھی جاتی رہی ہے۔ حقیقت میں اس معاملے میں صاحب فرہنگ دوسرے لغت نویسوں سے آگے نہیں ہیں۔ وہ صرف گرامر کے لحاظ سے لفظ کی نوع لکھ دیتے ہیں البتہ اپنے بعد کے عام اثر کی تحت اسم کے متعلق سے یہ لکھنا ضرور ضرورت سمجھتے ہیں کہ لفظ مذکر ہے یا مونث اور اس معاملے میں وہ [illegible] کر دیتے ہیں۔ اگر کسی لفظ کی جنس کے متعلق لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں میں اختلافات ہیں تو [illegible] لفظ کے سابقے اور لاحقوں کے متعلق بھی ان کی لغت میں معلومات کم ملتی ہیں۔ [illegible] یہاں تک کہ وہ اسم یا صفت کی قسم [illegible] سلسلے میں [illegible] [illegible] اردو لغت نویسی [illegible] ثابت ہو جاتی [illegible] صاحب فرہنگ نے اس [illegible]

ین جس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی اسے اردو زبان کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے
اردو زبان کے ساتھ ان کے گہرے لگاؤ اور وسیع معلومات کی وجہ سے جب وہ لفظ کے معنی لکھتے ہیں تو جامع
ضبوط انداز سے مکمل اور مختلف معنی لکھتے ہیں نمونے کے لیے ملاحظہ ہو۔

الٹا۔ ہ۔ صفت۔ سیدھے کا نقیض۔ ٹیڑھا۔ سر کے بل۔ لوٹا یا ہوا۔ منقلب۔ بازگونہ۔ جاڑوں کجرائے۔

بید۔ ت۔ ایک قسم کے درخت کا نام جسے ہندی میں بیت کہتے ہیں۔

بلی۔ ہ۔ اسم مونث۔ گربہ۔ ایک چھوٹا سا جانور جو شیر کے مشابہ ہوتا ہے اور اکثر چوہوں وغیرہ کا شکار
رتا ہے۔ جسے گھر میں اکثر پالتے ہیں۔
(۲) جو کواڑوں کے اندر کنڈی کے بجائے لگاتے ہیں۔

نکیل۔ ہ۔ اسم مونث (۱) وہ لکڑی یا لوہے کی کیل جو اونٹ کی ناک میں ڈال کر اس میں رسی باندھ
تے ہیں۔ مہار۔ اونٹ کی رسی جو لگام کا کام دیتی ہے۔ (۳) رکاب۔ لگام جیسے اس کی نکیل میرے
تھ میں ہے۔

اپیل۔ انگلش۔ Appeal۔ اسم مذکر۔ مرافعہ۔ ایک حاکم کے پاس انصاف نہ ہو تو اسے حاکم اعلیٰ
کے سامنے دعویٰ پیش کرنا۔ (۲) اسم مونث۔ درخواست جیسے امداد کے چندہ کی اپیل۔
انگریزی میں یہ لفظ اور معنوں میں بھی مستعمل ہے مگر صاحب فرہنگ نے صرف وہی معنی لکھے ہیں، جن معنوں میں
یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے۔

اس کے علاوہ سید احمد نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ لفظ کے تمام معنوی پہلو لغت میں لکھے جائیں۔ لفظ
کے معنی لکھتے وقت وہ لفظ کے محاورات اور ان کے معنی لکھتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ آنکھ کے تحت انھوں نے
محاورے درج کیے ہیں۔ مثال کے لیے دیکھیے وہ لفظ "آنا" کے معنی لکھتے ہیں۔

آنا۔ ہ۔ فعل لازم आगमन = आ + गमन۔ آگمن = آ + گمن۔ فارسی آمدن۔ پرانی ہندی آمنا۔
لغوی معنی ہیں اپنی جگہ سے کسی طرف حرکت کرنا۔ بخلاف جانا جس کے معنی ہیں کسی کے پاس
جانا۔ قریب جانا۔ دو شے کا بُعد درمیانی کم ہونا۔
مثلیں۔ آ بلا گلے لگ۔ آ بیل مجھے مار۔ آؤ پیر گھر کا بھی لے جاؤ۔ آ پڑوسن لڑیں۔
(۲) پہنچنا۔ پہنچ جانا۔ آ جانا۔ آن پہنچنا۔ موجود ہونا۔ چلا آنا۔ آ نکلنا۔ گذرنا۔
فقرے۔ دفتر کا وقت آ گیا ہے۔ کھانا تیار ہوا یا نہیں وغیرہ
(۳) تشریف لانا۔ پدھارنا۔ قدم رکھنا۔ قدم رنجہ فرمانا۔

(۴) ملاقات کرنا۔ ملنا۔ ملاقاتی ہونا۔
(۵) چڑھائی کرنا۔ دھاوا کرنا۔ مقابلہ کرنا۔ حملہ کرنا۔ سامنے ہونا۔ سیدھا ہونا۔ لڑنے کو مستعد ہونا۔ مقابل ہونا۔ سدھارنا۔ اس طرح لفظ آنا کے انھوں نے ۵۵ معنی بتائے ہیں۔
لفظ کے معنی لکھتے وقت وہ قاری کو سمجھانے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کبھی لفظ کا ضد لکھتے ہیں۔ جیسے آنا جانا کا ضد وغیرہ بعض اوقات اشیاء کے کیمیائی اور طبی خصوصیات لکھتے ہیں اور اکثر الفاظ کے مترادفات لکھتے ہیں تاکہ لفظ کے معنی ٹھیک ٹھیک سمجھ میں آئیں۔ سید احمد سے پہلے اس طرح کی کوشش اردو لغت نویسی کی تاریخ میں کسی نے نہیں کی۔ اور آج تک بھی وہ اس معاملہ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔
ان تمام خوبیوں کے ساتھ فرہنگ میں بعض خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے عہد میں semantics کے تعلق سے جو نظریات مروج تھے وہ اُن سے واقف ضرور ہوں گے مگر بعض اوقات وہ ان اصولوں کو پس پشت ڈال دیتے ہیں مثلاً ملاحظہ فرمائیے۔
اندھا۔ ۵۔ صفت۔ سنسکرت (अंध اندھ) (۱) نابینا۔ بے بصر۔ کوراعمیٰ۔ (۲) دھندلا۔ تاریک مدھم۔ غیر شفاف (۳) غافل بے خبر۔ ناواقف۔ نادان۔ (۴) جاہل بے پڑھا۔ ناخواندہ۔
ناریل۔ ۵۔ اسم مذکر (۱) دیکھو (نارجیل) مزاجاً اور درجہ میں گرم دوم میں تر و خشک بعض کے نزدیک درجۂ دوم میں خشک۔ جیسے نگرکوٹ درگا کا تھان چڑھیں۔ ناریل ناگریاں (۲) ایک قسم کا حقہ جو ناریل کو خالی کرکے اوپر سے چھیل کر بناتے ہیں۔
لفظ اندھا کے اتنے سارے مترادفات لکھے گئے ہیں مگر خود اندھا لفظ کے معنی اور تعریف نہیں ملتی اسی طرح ناریل کی اتنی خصوصیات پڑھنے کے بعد یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ناریل ہے کیا؟ ناریل کسے کہتے ہیں؟ کیا ہوتا ہے؟ یہ سب کچھ نہیں لکھا گیا۔ ہوسکتا ہے ناریل کی تعریف اس لیے چھوڑ دی ہو کہ یہ ایک مشہور پھل ہے اور سبھی اس سے واقف ہوتے ہیں۔ مگر غیر زبان والوں کے لیے تو ناریل کا لفظ بھی نیا ہوگا۔ اس کے علاوہ بھی لغت نویس کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ ہر لفظ کے معنی لکھے۔
بعض اوقات وہ کچھ بہک جاتے ہیں مثلاً لفظ اولیا کے ضمن میں پورے ۴۳ اولیائے ہند کے مختصر سوانح لکھ ڈالے ہیں جو بڑی تختی کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ لفظ بکاولی پر بکاولی سے متعلق سارا قصہ تفصیل سے دہراتے ہیں۔ اس قسم کی معلومات انسائیکلوپیڈیا کے لیے تو مفید ثابت ہوسکتی ہے مگر لغت میں ان تفصیلات کو جگہ نہیں دی جاسکتی۔
بعض اوقات وہ لفظ کے معنی بھی مکمل طور پر نہیں لکھتے۔ مثلاً بینک کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں:۔

بینک کے جو معنی لکھے گئے ہیں مکمل نہیں ہیں۔ دراصل بینک ایک ایسا ادارہ ہوتا ہے جو دولت بحفاظت رکھنے کا۔ پیسہ قرض دینے کا اور زر مبادلہ کا انتظام کرتا ہے۔ مولف فرہنگ آصفیہ کے زمانے میں بھی بینک یہ سب کاروبار انجام دیتے تھے۔ بینک کا کام صرف رقم جمع رکھنا ہی نہیں ہے۔

بعض اوقات الفاظ کے معنی بھی غلط ملتے ہیں اور خاص طور سے تاریخ اور جغرافیہ کے تعلق سے انھوں نے کافی غلطیاں کی ہیں۔ یہ غلطی اردو لغتوں میں عام طور پر ملتی ہے۔ مثلاً وہ اپنی فرہنگ کے دیباچہ میں اتھنز (Athens) کو شمالی امریکہ کا ایسا شہر بتاتے ہیں جہاں دنیا کے بڑے بڑے عقلمند پیدا ہوئے۔ و آسٹریلیا کے متعلق صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ یہ جنوبی اویشیا کا ایک ملک۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

نجد۔ اسم مذکر۔ بانگر۔ اونچی زمین۔ عرب کے ایک مشہور شہر کا نام جس کی زمین اونچی ہے اور وہاں کے لوگ اکثر فسادی نیز لڑاکو مانے گئے ہیں۔ شہر بابل کی جانب واقع ہے۔[1]

اس کے برخلاف رچرڈسن نے اس لفظ کے جو مختلف معانی دیے ہیں اُن میں یہ نہیں بتایا کہ یہ عرب کے کس شہر کا نام ہے۔

Najd: overcoming, conquering, proving, making on expriment knowing, discerning, High-land. The higher part of Arabia towads Babylone. (The lower part being Timama) carpet cushion, pillow, couches, or such furniture, quick expenditure, expert, ingenious, industrious, Bold. a . imated specially where others dis pared, skilful, (guide) excess grief anguish, a place destitute of trees, A kind of shrub.[2]

سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب فرہنگ نے نجد کو شہر کیسے لکھ دیا یہ تو ایک علاقے کا نام ہے اور اردو عربی اور فارسی زبانوں میں انھیں معنوں میں مستعمل ہے۔ اس کے علاوہ جب بھی کسی شہر کے متعلق اردو لغت میں لکھا جاتا ہے تو شہر کا ٹھیک محل وقوع نہیں لکھا جاتا اور تاریخی معلومات لکھتے وقت روایات پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ غرض فرہنگ آصفیہ اس قسم کی غلطیوں سے پاک نہیں۔

---

[1] فرہنگ آصفیہ جلد چہارم ص ۵۴۱

[2] رچرڈسن فارسی عربی انگریزی لغت ص ۱۵۹۳

اس لغت کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ وہ لغت کے معنی لکھتے وقت جو اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں وہ لغت نویسی کے لیے موزوں نہیں۔ لغت اور لغت دیکھنے والے کے درمیان لغت نویس کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ سید احمد لغت کی تدوین میں متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ جو خطوط اور شخصی انشائیہ (Personal Essays) لکھنے میں ضرور استعمال ہوتا ہے مگر لغت نویسی میں اس سے احتراز ضروری ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ اس دور میں لغت نویسی کے میدان پر برگد کے درخت کی طرح چھائے رہے جس کی چھاؤں میں کوئی پودا اگ سکتا ہے مگر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس کی برابری کا دعوی کرنا تو دور کی بات ہے۔ اس دور کی حد تک ہی نہیں بلکہ اردو تاریخ لغت نویسی میں کوئی اور لغت اس سے بہتر نہیں۔

محمد سخاوت مرزا

عاشقِ چشتیاں حضرت شاہ ندا حیدر آبادی قدس سرہٗ

شاہ ندا حیدر آبادی، تیرہویں صدی ہجری کے ایک محقق صوفی شاعر تھے، جن کی تصنیفات اردو منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ ہم یہاں اسی مثنوی سے ان کے خود نوشتہ حالات پہلے نقل کرتے ہیں:-

شاہ ندا کی کہانی خود ان کی زبانی

ہم نے پچیس تیس سال تئیں ۔۔۔ رہے سرخ و سفید اور رنگیں
خوبرویوں کا سیر دید کیے ۔۔۔ شب کو شبِ قدر، دن کو عید کیے
خوب سے خوب تر خوراک، لباس ۔۔۔ عطر و پھول و عبیر میں خوش باس
خوش گذرتے تھے وہ بھی دن ہر حال ۔۔۔ کیا حق نے نگاہِ فیض، کمال
ہو رجوع، اعتقاد و صدق کے ساتھ ۔۔۔ دیے مرشد کے ہات میں جب ہات
جب سے اس لب کا میں پیا پیالا ۔۔۔ بیخود اب تک ہوں مست متوالا
دن بدن کیف وہ چڑھاؤ پہ ہے ۔۔۔ عشق ہر روز یہ بڑھاؤ پہ ہے
چھوٹا گھر بار لطفِ زن اور مال ۔۔۔ تھا حضوری میں رات دن یک سال
شمع مرشد، وہ میں پتنگ پہ تھا ۔۔۔ بھول سب رنگ ایک رنگ پہ تھا
رہی گھر کی طلب نہ زر کی طلب ۔۔۔ سب طلب پیر تھا، میرا مطلب
وہی تھا جسم، چشم اور دل میں ۔۔۔ باد و آتش میں، آب میں، گل میں
پل بہ پل، دم بہ دم، ہو عشق کو اوج ۔۔۔ مارنے لاگا، جیسے دریا موج

لذت نفس، اور لباس تجا — لانے لاگا، طریق فقرا کا
کثرت خلق سے ہو بیگانہ — لیا دیوانگی کا ویرانہ
شہر اور شہریوں کی الفت چھوڑ — رشتۂ و دوستی قرابت توڑ
کم خوراکی و شب کی بیداری — ترک امید و خوف، یکباری
بوجھ[1] سب اوس پہ ڈال کر بیٹھا — ایک ہی در، سمہال[2] کر بیٹھا
عشق ہو النار، کا اوٹھا بھڑکا — عقل گئی بھاگ ڈال کر بھڑکا
جیوں سمندر، نہ اور کچھ جینا — آگ ہی کھانا، آگ میں رہنا
صابر و قانع، اور متوکل — استقامت کی لے رہا منزل
سوز سینے میں جب بھرا آکر — دل بھبھوکا ہو، دم بھی اک جا کر
لوٹنے لگ گیا کباب کی طرح — ہو جگر پھٹنے ہی شراب کی طرح
چشم کے جام پھر چھلکتے تھے — قطرۂ خون بن، ڈھلکتے تھے
سر سے پا تک اسی اگن میں تھا غرق — گرم آہوں ستی تھی پری میں برق؟
اس پہ پھر شغل سرمدی آغاز — کیا ہر دم یہی ہوا، آواز
و تنزل الوحی کا اسماہئے ندا — بعد کل انبیاء، علی الشعراء
دیا الہام یہ جو ہاتف غیب — لے قلم ہات میں نہیں کچھ عیب
شعر تب کہہ اٹھا میں گوناگوں — یک قلم موزوں، اور ناموزوں
سوز دل یوں، نکالنے لاگا — اس طرح درد، ٹالنے لاگا
گر نہ آتے یہ شعر درمیانے — حال کیا ہوتا پھر خدا جانے
ہوش بر دم، نگاہ رکھ بقدم — "ہے" کی شادی تھی "نا نہیں" کا غم
خلق میں انجمن، میں کرتا تھا — سفر اپنے وطن میں کرتا تھا
صحویت، محویت کا کر کے مقام — جہاں بیٹھا، وہاں تھا یا آرام
سال و مہ، ہفتہ اور لیل و نہار — دست در کار، دل رہا با یار

---

[1] بوجھ ۔ وزن

[2] سمہال = سنبھال ۔

گھر و صحرا تھا مجھ کو گھر آگن — جہاں چاہا وہاں کیا مسکن
نہ امیر و وزیر کی پروا — کام کا ہوئے غیب سے سروا
کہیں تجرید کا کمال غنا — اور توحید کا تمام انا
مجھ کو یکساں تھی وہ فنا و انا — ایسی تھی استقامت، استغنا
گاہ رہتا تھا حال میں مصروف — گاہ تھا قیل و قال میں مصروف
پاکے قابوئے وقت نفس یک شب — ہات دو جوڑ کے ، ز راہِ ادب
کہا، پاشاہ بندگی ہے مری — سات حضرت کے زندگی ہے مری
گرچہ نسبت ہے مجھ کو ہمزادی — ہوں ترے پاس تجھ پہ فریادی
داد خواہ ہوں، مرے سینچی داد — کرکے انصاف و غور دیجئے داد
کیجئے کچھ تو کچھ ، میری تدبیر — میں کہاں چھوڑتا ہوں دامنگیر
خیریت سے قریب ہفت سی سال — یعنی ہے سن شریف خیر مآل
خضرؑ اور نوحؑ سے بھی طول کرے — یہ دعا تیری حق، قبول کرے
خیریت خواہ ہوں نہیں بد خواہ — ترے بد خواہوں کا ہو روے سیاہ
یہاں تلک میں رہا رفاقت میں — رنج و راحت میں عیش و محنت میں
مجھ کو تم نے تھا چاہ سے پالا — کبھی میرا کہا نہیں ٹالا
کھاتے پیتے رہے جو تاسی سال — رکھے خوش بامراد لالم لال
جب سے مرشد کو تم نے ہات دیے — باو اوپر میرے برات سیکے
تب سے میری طرف نہیں وہ نگاہ — کم لگی ہونے دن بدن وہ چاہ
گئے چنیاپٹن کو پیر کے سات — رہے خدمت میں جاگتے دن رات
دن کو، چل کوچ، شب کو بیداری — بارے پہنچے وہاں بدشواری
کئے اسپ سواری وہاں جو فروخت — بس نکل کر میرا ہوا دم، سوخت
بارے اکل و شرب سیتی فراغ — والا جاہ کی طرف لگائے سراغ
نام سے یک قصیدہ کر تحریر — بارے پہنچا دے بصد تدبیر
تھی کچھ ایک اس کے نسل کی تعریف — پن تھی خواجہ کی بھوسنے کی تعریف
اس میں ذکر اپنے پیر کا بھی تھا — تھا عجب کچھ فنونِ سحر لکھا

پڑھتے ہی اس کو لوٹ پوٹ ہوا ‌‌ — عشق خواجہ کا دل پہ جوش ہوا
حضرت سے آ، بشوق کمال ‌‌ — ہوگیا محو دیکھ حسن و جمال
کہا، یہاں آئے، چشتیہ کے پیر ‌‌ — پن نہ آیا کوئی ابتک ایسا سپیر؟
دیکھ، علم و وجود، نور و شہود ‌‌ — صدق سے دل کے بھیجتا ہے درود
بہوت چاہا کہ چند روز رہیں ‌‌ — شمع مجلس ہو دل فروز رہیں
وہ بھی تھا اسمی حبیب اللہ ‌‌ — ان کو دیکھا جو عاشق اللہ
صدق سے کر، تواضع و خدمت ‌‌ — بہوت اعزاز سے کیا رخصت
تب تو مجھ پہ وہ مرشد کامل ‌‌ — ہات میں ہات لے، ہو شاد بدل
پوچھے تیرے بدن میں، میری جا ‌‌ — کس جگہ ہے بتا، اے میرے ندا
تو کہا، سر سے پانوں تک یہ جسم ‌‌ — لے رہا آپ کا، مبارک اسم
دل کو کہتے ہیں لوگ، عرش خدا ‌‌ — ہے نظر میں مرے وہ، آپ کی جا
کئے ارشاد، ہم قبول کئے ‌‌ — اس میں ہم دل کو تیرے ہات دئے
نعمت چشت، جو امانت تھی ‌‌ — ہم ترے دل میں دل تجھے دیدی؟
لاکھ ارشاد کا ہے ایک ارشاد ‌‌ — دولت دل تجھے مبارک باد
دل جو چاہے سو کر، روا ہے تجھے ‌‌ — بس یہی، پیر رہنما ہے تجھے
دھر دیا سر زمیں پہ، تونے وہیں ‌‌ — اٹھا، چھاتی لگا، کہے تحسیں
پھر سے مونہہ میں کا او گال دئے ‌‌ — گار کے تئیں بنا کے لعل دئے
عرش سے فرش تک ہے تجھ کو یاد ‌‌ — تھا، ندا، آفریں مبارک باد
پھرے حضرت جو وہاں سے کرتے سیر ‌‌ — حیدرآباد پہونچے آ، بالخیر
تونے پاکر اجازت و رخصت ‌‌ — رہا پٹن میں خوش بخیریت
تھا بہادر حسینی" شیخ کبار ‌‌ — عارف حق و جامع اسرار
معتقد تھا اونھوں سے والا جاہ ‌‌ — اور سب خاص و عام خلق اللہ
اون سے وابستہ اعتقاد کے ساتھ ‌‌ — بہوت خوش خلق تھے وہ عالی ذات
جز تصوف نہ تھا کلام اون کا ‌‌ — اظہر الشمس وہاں تھا نام اون کا
صاحب خاندان چشتیہ ‌‌ — نفس و دل کا تھا خوب تصفیہ

خلفائے امین الدین علیؒ / اوس عصر میں تھے قطب وہاں ولی
اون کو حضرت سے تھی نہایت راہ / عشق دل سے تیرے تھے خوب آگاہ
تجھ کو حضرت کے وہ فراق میں دیکھ / محو، دیوانہ، اشتیاق میں دیکھ
گاہے، کرتے تھے، راگ میں مشغول / گاہے معقول، گاہے در منقول
لگے بہلانے خوب دل لے کر / یا خلاصہ خوب مل لے کر
اہلِ مطلب انھوں کے پاس جو آئیں / ادنی، عالی جو کوئی ہو، یہاں بھجوائیں
کہیں، حسنات، ان کے کر دیو کار / تم تو ہو دل بیار، دست بکار
بہوت لوگوں کے مشکلات وہاں / مان کے بات، تم نے کئے آساں
اہلِ جاگیر اور منصبدار / اون کا ہونے لگا، برآمد کار
آوے نذر و نیاز، خوانِ طعام / آکے کھاویں بھوکے یہاں سے تمام
عمدۃ الامرا، ابن ذالاجباہ / بس، مسافر پرست، اہل اللہ
شعر میں تھا تخلصِ ممتاز / مغتنم وقت تھا باہلِ مجاز
شاعراں دور سے وہاں تک آ / ہنر و علم و فن سب اپنا بتا
اوس سے پا کر مراد، جاتے تھے / کئی جاتے تھے، اور کئی آتے تھے
اوس نے دو سال رکھا اٹکا / وہاں کچھ تیرا نان نا ٹکا
کیا ترے سے قرار کرتا تھا / شعر پر بھی نثار کرتا تھا
فی البدیہہ کوئی شاعر پر گو / بولتا تھا کوئی ایسا ہو، یا ہو
ویسے کی تو نے کچھ نہ کر پروا / صاف کیچڑ سے جس طرح کودا
اوس کو ناگر خبر اوٹھا یکدم / چل دیا سوے دشت باغ ارم
نے سے جنگل میں او بیرے کئی دن / خدمتی لیتی ہی رہا ساکن
کئی ڈوبوں کے تئیں ترایا تو / کئی ہوئے کام، کئی پھرایا تو
صوبۂ رام ناتھ و شیو گنگا / متھرا، ترچنا پلی کا صوبہ آ
اس سیوائے خاص عام ان اوروں / لگے گذرانے کئی ہزاروں ہوں
وہاں کا قحط شدید، دور کئے / غلہ، غربا او پہ، وفور کئے
تھی ہزاروں ہی آمد و خیرات / بھوکے پیاسوں پہ، رات دن تھا ہا

ایک دن وہاں بھی بامزہ نہ دیے   مجھ کو کہا، سیر کر رضانہ دیے

وہاں سنی بھی وداع ہو جب نکلے   پر پھرے کھا کے ہات دھو نکلے

کچھ بھینے سفر کا محنت و درد   کاٹتے منزلوں کا گرم اور سرد

حیدر آباد آگئے بارے   ملے سب دوست آشنا سارے

میں نے جانا ہے یہ وطن و مقام   خوب دیکھیں گے عیش اور آرام

آتے ہیں گھر کو بہوت دیر تک سے   کھانا پانی ملے گا سیری سے

یہ زمانہ جو ہے تو زر کا ہے   کھانے پینے سے نام گھر کا ہے

یہاں بھی تم مجھ کو زدان کر را کھے   بلکہ جو مبخہ تان کر را کھے

رہے دس سال تک بھی جیوں آزاد   آپ خوش تھے دیے نہ میری داد

وہاں سے جب اوٹھ چلے جریدانہ   سات میں تھا نہ اپنا بیگانہ

چھوڑ سب زرق برق ظاہر کا   لیے شیوہ سدا مسافر کا

اتنے عرصے میں گاہ نا بیگاہ   نکیئے جاہ کی مرے یہ نگاہ

تھا مجھے ہوش، پانوں نا سر کا   سگِ دھوبی، نہ گھاٹ نا گھر کا

سب کے یہاں ترک آنا جانا تمام   کئے موقوف دعوت اور طعام

کوئی لاویں بجہد تو لیویں   دوسرے کو وہیں اوٹھا دیویں

دیکھ میں آپ کا ثبات قدم   رہ گیا چپ، نہ کچھ ہلایا، دم

سمجھا میں ہی یہ عقدہ مشکل کا   تصفیہ، تزکیہ، میرا دل کا

پا گیا تھا مزاج ہو ماہر   رہا ہر حال قانع و صابر

دل صرف تری طرف میں تھا   قاصر بندگی کبھی نیں تھا

ترے انفاس کی برکت سے   ہوا تایب جو غیر حرکت سے

اپنی امارگی سے ہاتھ اوٹھا   ملک لوامہ کے میں جا بیٹھا

ناک گھسنی کیا، وہ استغفار   نکیا او، طرف بدل زنہار

ملہمہ کا مجھے ملا جو مقام   تو ہوا حق سے صاحب الہام

کیا تصنیف، مثنوی، دیواں   اور معنے نکات کئی عنواں

نو مضامین، اصطلاحاتیں   خوب مضمون تازہ ہیں باتیں

ذ جسنتم

علم روحی کو دے کے زینت چشم | اور بنایا لباس کئی کئی قسم
نہیں کرنے کی باتیں بول اوبھا | کئی عقدے، دقیقے، کھول اٹھا
وہاں سے آگے کیا ترقی جب | مطمئنہ، مجھے ملا منصب
ہوئی ملا نبی خاص جمعیت | لے ازل سے ابد کی ایک ولت
ترے انفاس پاک رب العین | افضلٌ من عبادۃ الثقلین
سب طرح خانہ زاد ہوں تیرا | سنیے یک التماس ہے میرا
جاں تلک ہیں نبی ولی خدا | حکم سے مرض کے کیئے ہیں دوا
یعنی حق طرف کا یہی مہماں | خوش ہے مہماں نواز سے سبحاں

(ورق ۴۵ الف ۴۶ مثنویات اور قلمی)

شاہ ندا، کو نزول الماء اور ضیق النفس کی شکایت تھی جس سے وہ سخت پریشان رہتے تھے۔ ایک حکایت تمثیلاً استعمال دوا کی لکھی ہے ۔ حضرت رسول اللہ صلعم بیمار ہوئے۔ حکما نے دوائیں بنا کر لائیں۔ آپ نے دواؤں سے پوچھا کہ کیا تمھارے کھانے سے مرض دور ہو جائے گا، تو دواؤں نے زبان حال سے کہا کہ "کل امر مرہون باوقاتہا" آپ نے دوائیں اٹھا کر طاق پر رکھوا دیں، حضرت جبرئیل آئے اور فرمان حق سنایا کہ میرے حبیبؐ تم دوا کھاؤ تو شفا دینا تو اللہ کے ہات ہے، شاہ ندا نے بھی دوا کھانا چھوڑ دیا تھا فرماتے ہیں:۔

حق سے لایا یہ حکم اور صلواۃ | کھا دوا تو شفا ہے میرے ہات
ان کی تبع، توا بعین تمام | درد کیتئیں دوا کیے ہیں تمام
پر تمھیں کیا ہوا ندا صاحب | کیوں نہیں درد کی دوا صاحب
یک تو ہے آنکھ میں نزول ماد | دوسرا ضیق یوں ہلاک کیا
کسی دارو دوا پہ نہیں مرضی | اور کسی کی قبول نئیں عرضی
مارتا ہے تو اپنے ہات سے مار | ین مرا جی ہے ضیق سے بیزار
حق تجھے بھی دیا شفا دستی | خوب ایسی بھی نئیں ہے وارستی
خاک کو چاہے کیمیا کر دے | قلب مس، صورت طلا کر دے
حق کہا کہ لا یکلف اللہ | نفساً الا وسعہا باللہ
من عرف نفسہ حدیث شریف | دے رہا ضیق مفت میں تکلیف

تو تغافل کرے روا نہیں ہے — کہ وہ تیرے ہات میں دوا نہیں ہے
میں کہا تب اے مونس محرم — تو رفیق طریق ہو ہمدم
جان بوجھ ایسی کیوں کرے باتیں — سُن میں کہتا ہوں وہ حکایتیں

اور تمثیلاً حضرت خلیل اللہ پر آگ گلزار ہونے کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا ؎

کہا سن جس نے حق پہ ڈالا بوجھ — اوس کے سر پہ سے حق نکالا بوجھ
غیرت عاشقاں سے ہے یہ بعید — اودھر اودھر سے ادھر کو کرتا دید

پھر دوسرا واقعہ مالک دینارؒ اور حضرت رابعہ بصری کا بیان کیا حضرت مالک دینارؒ رابعہ بصری کے پاس گئے دیکھی گھر ٹوٹا ہوا ہے، ایک ہی برتن وہ بھی ٹوٹا پھوٹا پڑا ہوا ہے نہ مصلا اور نہ ظروف وضو ہیں۔ آپ نے فرمایا اگر اشارہ ہو تو گھر اور ظروف تازہ مہیا کردوں تو بی بی رابعہؓ نے فرمایا ؎

کہی سُن کردہ صاحب عصمت — ہے یہی رنگ عشق کی دولت
دیکھ کیا آنکھ میں ہے میرے پڑا — تنکا نکلا ہے یک وجب کا بڑا
کبھی بی بی ہو آنکھ تو تاریک — بولی بابا تو آنکھ کو مت جھیک
ہفت دوزخ کی آگ کوئی اگر — بھرے آنکھوں میں نا مجھے ہو ضرر
کس کو ہے گھر ظروف کی پروا — کیوں کہوں میں کہ تم کرو سودا
کاملانِ سلف کا سن یوں حال — ہر نگہ میرے آگے ایسی مثال
ماسلف کا بیاں سنا اب تو سن — تیری حالت تجھے بتاتا ہوں
لڑکائی سے تا سن سی سال — توجو چاہا کیا اے میرے لعل
تو ہی کرتا تھا سب یہ کاروبار — کیا حاضر جو چیز تھی درکار
کھایا تونے غذا بہینؔ بہیں — پہنا کپڑے نہیت مہیں مہیں
نہیں کرنے کے تھے کیا سو کام — نہیں سمجھا تو کچھ حلال وحرام
کیسی کیسی بلا تو لا ڈالا — حق ہی تھا جو اونھیں ملا ڈالا
جان و مال آبرو کی نا پروا — جو تھا عشق مجاز میں سودا
تونے بھولا یہ ہے مجھے سب یاد — مفت عمر عزیز گئی برباد
پہونچی جب انتہا کو عشق مجاز — تب حقیقی کہیں ہوا آغاز
چھوڑ میں تجکو، ترے منہیات — دیا مرشد کے ہاتھ میں جبہات
وہ پڑھایا سہ بار استغفار — نور ہی نور تھا گیا اندھکار

ؔ بہتر سے بہتر

ہوا افسردہ دم تو شرمندہ | دل پڑا مردہ تھا ہوا زندہ
کمر ہمت سے کھینچ باندھ ضمیر | استقامت کی لے سپر شمشیر
مجھ کو بولا کہ میں ہوں تیرا وکیل | یہاں احسن ہے لے فقیر جمیل
اوس نگہ آفتاب کے آگے | نور حق بے حجاب کے آگے
ویسا ہی آئینہ تھا جو وہ ٹھیرا | او تجلی کے رو برو ٹھیرا
وہاں اشارے میں مستقیم رہا | بدر ثابت، جہاں دو نیم ہوا
یعنی منظور ہو گیا آخر | نور علیٰ نور ہو گیا آخر
یوں لیا ربط دنیوی نے نکال | صاف مسکے سے جیوں نکالیں بال
سب سر رشتہ تعلقی توڑا | لا تجرد کے صحن میں چھوڑا
دیا آئینہ ہات میں لا ایک | کہا نت دید کر اسی کو دیکھ
جب میں اس شغل بیچ آ ٹھیرا | لگ گیا عشق دید کا گھیرا
پانچو دریا کو دید کر سی سیر | سرمدی بحر بیچ نکلا تیر
پروا کچھ اپنے کی نہ غیر کی تھی | لگ گئی لو وہ سیر وطیر کی تھی
شب کو آرام تھا نہ دن کو چین | آئینہ خود بنے تھے میرے نین
بیٹھا تجرید کا پکڑ گوشہ | رہ و رہبر تھا میں میرا توشہ
دید ہی دید کا لیا آئین | گئے گذر ہشت سال ملئے یوہیں
شخص عکس، آئینہ پہ یک صورت | آگئے جستجو و محو میں حیرت
بارے حیرت محل میں جب لاگا | ایک آئینہ چھین لے بھاگا
دیکھا تب، میں ہوں نا وہ آئینہ | آہ! کے سات پھٹ گیا سینہ
لے وہ آئینہ بھاگ جاتا تھا | سات میں دوڑتا و گاہ گاتا تھا
آہ و نالہ تھا اور زاری تھی | حد سے بیحد وہ بیقراری تھی
طے ہوا بارے پردہ ظلمات | خضر سا پہونچا جا بآب حیات
تھک گیا تھا میں ہوش کھو بارے | دیکھتا کیا ہوں کر نظر بارنی ؟
نہ بارے
ایک مدت رہے آفتاب نپٹ | گئی بصیرت کو وہاں بصر تے چھٹ
بس ہشیار ہوا ب تو بھول سب تگ و دو | محو بیٹھا لگا بصر کو رو

جب بصر اوس کی بسر آیا — نقطۂ نور یک نظر آیا

مدت ایک جا خراب کے مانند — کھورتے کھولتی ہے نظریں بند

کھل گیا تب وہ نقطۂ اسرار — خواب سے جیسے ہوگیا بیدار

اوہی صورت نظر پڑی وہ جمال — جس کے پیچھے ہوا تھا وہ کچھ حال

یاد کی اور بصر نثار ہوا — تھا الٰی الٰی آ، اے ندا

ایسی جا پہ جو کوئی جاتا ہے — پھر کہاں کس کو ہاتھ آتا ہے

سن تو اے نفس ہے میرا یہ حال — تھا ترا اختیار تا سی سال

دل ترے ہاتھ سے نہ چھین سکا — تو رہا جب عمل ہوا اوس کا

اوس نے مجھ ساتھ کھینچ راحت و رنج — نہ کیا کوئی بات میں شش و پنج

خوب سے خوب دوستی جوڑا — مجھ کو اپنی مثال کر چھوڑا

اسم اعظم کے ایک خاتم تھے — مہر سے مہر وہ عنایت کیئے

مور کو آئی عجب سلیمانی — تسخت کرنے لگا ہوا باقی ؟

پھر روح محیط ایک بار — ہوئے جیوں گرد نقطہ دایرہ دار

دہر گماں میں جو بیگماں دیکھا — دہر کے چلے میں گرشش پھینکا

لاگتے ہیں ہدف یہ حالا ریب — کشف اسرار میں ہوا میں غیب الخ

.. ..

روح و دل ایک خوب ہو گئے تھے — نیں خبر وہ تھے یا کہو کوئی تھے

قطرہ دریا سے تھا جدا جو ملا — پھر کہاں قطرہ ہے، وہی دریا

اوہی ہوں اب میں سر سے لے تا پاؤں — جس کو دریا کہیں وہ میرا ناؤں

سال ہفتم ہے اس خیال میں ہوں — نور میں نور، روح پیرا ہوں

روح ہوئی نور، میں ہوں دریائی — نوح سا آدے کوئی تما سائی

کشتیٔ عشق بیچہ ہو کے سوار — دیکھے موجوں کا وہ چڑھاؤ اتار

دور سے دیکھتے جو سنتے ہیں — زاہد عارف ہے پڑھتے گنتے ہیں

تو جو یہ دیکھتا ہے ضیق کا ادج — اوسی دریا کی ہووے شاید موج

اوس پہ گر تیرے دل میں ہو وسواس — جا دوا کر کوئی طبیب کے پاس

۱۴۹

نفس نے سر زمیں پہ دھر چھوڑا — ہو مودب دو ہات کو جوڑا

کہا مدت سے لو تھی میرے تئیں — پاؤں ارساد تجھ سے ہو تلقیں

مجھے ہے عاقبت کا یہ توشہ — میں بھی بیٹھوں گا اب پکڑ گوشہ

ہوا میں بندۂ ندا شاہی — دوسرے کو کہاں یہ آگاہی

جمع خاطر ہوا میں پا کے مراد — دوسرے کو کہاں ہے یہ ارشاد

میں کہا دوسرے کے معنی کیا — اس جگہ دوسرا کدھر ہے بتا

بے شبہ کچھ تو کچھ ہے اس میں مگر — تب تو گھبرا کے موں زمیں پہ دھر

کہا جاں بخشی، عفو ہو تقصیر — حکم ہوا وس کی بھی کروں تقریر

دیا رخصت میں، بن گیا وہ کلیم — کہا ایک میرا آشنا ہے قدیم

بحث و تقریر صاف کرتا ہے — علم پہ اپنے لاف کرتا ہے

حکم ہو حاضر اوس کو کرتا ہوں — پن سبب ایک ہے جو ڈرتا ہوں

آنے پہ اوس سے کیا سدھرتا ہے — خیر و شر کیسے بات کرتا ہے

گر سخن اس کا کامیاب نہ ہو — بندگی مصدرِ عتاب نہ ہو

میں کہا جس کی بات اوس کے ساتھ — جمع خاطر تو اوس لے آ ساتھ

آیا بارے بڑے مشیخت سے — زاہد اور عالموں کی صورت سے

عصا، تسبیح، عمامہ شملہ دراز — قیمتی پہن بدن میں جبہ جا ماز

آستیں ہے بڑی بڑی داڑھی — یک حمائل گلے میں ہے آڑی

امرداں پانچ چار خادم طور — ہیں کتاباں بغل میں بحر اور؟

آ، لبِ فرش پہ سلام کیا — میں اشارے میں آؤ بیٹھو کہا

بیٹھا، آیا ادب سے پوچھا نام — کہا مسکین ہے، شغل کیا اور کام

کون اہل و عیال کیا ہے معاش — علم کاں تک ہے اور کیا ہے تلاش

جب خلاصہ مری زباں سے سنا — بلبلِ گلشنِ کلام بنا

کہا حضرت فدائے عالمیاں — صد صحیفے بھی، چارِ قرآں

امر اور نہی اور قصص توحید — اور عبادت کی بیشتر تاکید

رحمتی لعنتی کا وہ دستور — اور جمال و جلال کا مذکور

دن الست کے بھی دو ہوئے تقسیم   سعید و اشقیا بخیل و کریم
دینا ہے سخن مومنیں کے تئیں   اور جنت ہے کافریں کے تئیں
واں جنت کا داروغہ رضواں   یہاں کی جنت کا داروغہ شیطاں
مشرق و مغرب و جنوب و شمال   شش جہت ہیچ اوس کا رفتہ جال
زر، زمیں، زن ہو اوس دانہ و دام   صید ہیں عالم آدم اوس میں تمام
مرد گیراں ہیں ایک ران ہے زن   رات ہے اوس کی طاق جفت کلاں
ایک شب میں ہے پانچ سو فرزند   اس میں کچھ کم زیادہ ہیں ہر چند
مسجد و خانقاہ مدرسوں میں   بحر و بر دشت اور شہروں میں
کر تعینات بھیجتا ہے مدام   ہیں معمور امر صبح و شام
صبح سے شام تک کے جو اخبار   روز پہنچا دیں ہم کیے یہ کار
بہوت مصحف میں ذکر ان کا ہے   اوس کو بھی مکر و فن میں چسکا ہے
طامع علماں بھی حریص و فقیر   مقر اوس کے ہیں سب امیر و کبیر
واعظاں، زاہداں، ریاکاراں   اوس کے نایب ہیں اور علمداراں
بادشاہ و وزیر ظلم اندیش   ہیں قریبہ قرابتاں اور خویش

شاہ غلام محمد ندا حیدرآبادیؒ

شاہ ندا کا مختصر اشارہ تذکرہ مجموعہ نغز مولفہ حکیم قدرت اللہ قاسم دہلوی میں اس طرح ہے "ندا تخلص سخن گوئے است از دیار دکن کہ ایں دو بیت از قصیدہ اش رسیدہ بمن ؎

صبح ہاتف آج میرے دل کے کانوں میں پکار   یوں کہا دیوانے کیا سوتا ہے اوٹھ ہو ہوشیار
واشد دل مدعا ہے گر، تو کر سیر چمن   دیکھ آنکھیں کھول کیسی دھوم ڈالے ہے بہار

شاہ قاسم کا ماخذ خزینۂ سخن مولفۂ تجلی علی شاہ حیدرآبادی معلوم ہوتا جس میں ندا کا یہ قصیدہ بھی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی کلام درج ہے۔

شاہ تجلی علی حیدرآباد کے مشہور مورخ، صوفی اور خطاط و مصور تھے اور نواب ارسطو جاہ وزیر حیدرآباد المتوفی (   ) کے معاصر تھے۔ اس کے سوا ان کا حال کسی اور تذکرہ میں نہیں ملتا، کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب "برات الایمان" مصنفہ شاہ خاموشؒ خلیفہ شاہ حیدر بیدری (   )

۱۱۹۹ھ مخطوطا ہیں جس کے خاتمہ پر ندا صاحب نے اپنی سکونت "دبیر پورہ، تکیہ ندا نہال" لکھی ہے۔

یہ ہیں:۔

البتہ شاہ ندا نے خود اپنی آپ بیتی اپنی ایک اردو مثنوی "جذبات محمدی" میں ایک خاص باب میں لکھی جس کا اقتباس ہم سطور بالا میں درج کر چکے ہیں، یہاں اس کا ملخص ہدیۂ قارئین کرتے ہیں جس سے ندا کے ابتدائی حالات اور کمالات باطنی اور سیر و سیاحت کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے:۔

شاہ ندا کا نام "غلام محمد" تھا جس کو انھوں نے اپنے روحانی کمالات اور محویت کے ضمن میں بطور معمہ ن کیا ہے، مثلاً ؎

ہے غلام محمد اسم اوس کا اپنے بستر پہ شاد بیٹھا تھا
کچھ نہ کہتا ہے اور سنتا ہے مست بیخود پڑا بغیر رز ہے
یک بیک کیا ہوا نہیں معلوم بن گیا شکل نقطۂ موہوم

.. ..

بہور ہو گئی کھلا معما سب کام پر لگ گئے سب اہل ب
نام ابیات میں کیا مرقوم کہا ہاتف نے "نقطۂ موہوم" الخ

مکرمی ابو محمد عمر الیافعی کے پاس ان کے دیوان کا ایک مخطوطہ ہے۔ صاحب موصوف کا بیان ہے کہ ان کا نام یم اللہ حسینی ہے۔ چوں کہ موصوف کئی سال سے سخت بیمار اور فریش ہیں۔ کتب خانہ منتشر حالت میں ہے اس لیے اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ صاحب موصوف نے بہت سی نادر اور کمیاب کتابوں کے ملخص رتب کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے صحیح نام کا پتہ چلا ہو۔

چوں کہ شاہ ندا، مرشد سے بیعت اور کسب کمالات روحانی کے بعد مرشد ہی کے ہمراہ آرکاٹ مدراس اب عمدۃ الامرا ($\frac{1210}{1219}$) کے پاس گئے تھے۔ اور وہ یہ فرماتے ہیں کہ میری عمر کے تیس سال نہایت عیش آرام اور رنگ رلیوں میں گزرے، اچھے سے اچھا لباس پہنتا تھا اور بہترین غذا کھاتا تھا۔ اور زندگی جبینوں کے نظارہ میں گزارتا تھا۔ دفعتاً میرا دل دنیا سے سرد ہو گیا، اور میں نے ایک صاحب کمال رگ کے ہاتھ پر توبہ کی۔ اور آٹھ سال میں مراتب سلوک طے کیے اور آرکاٹ بزمانۂ عمدۃ الامرا گیا تھا۔ گویا شاہ ناہ بعہد عمدۃ الامرا المتوفی سنہ ۱۲۱۶ھ سے قبل، آرکاٹ گئے تھے، اس وقت ان کی عمر تقریباً چالیس سال تھی اس اعتبار سے ان کا زمانۂ ولادت تقریباً ۱۱۷۶ھ ربع اول عشرۂ ہشتم بارہویں صدی ہجری قرار پاتا ہے۔

علوم ظاہری کے متعلق کوئی حال نہیں معلوم ہوا، مگر اس مثنوی کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ

شاہ ندا کو علم ظاہری پر کافی عبور تھا، ان کی مثنوی میں تصوف کی اعلیٰ معیار کی کتابوں مثلاً گلشن راز مصنفہ محمود شبستری، عشقیہ مصنفہ حمید الدین ناگوری قدس سرہٗ۔ جواہر التفسیر۔ بحر المعانی۔ مثنوی مولانا روم، لمعات عراقی، جام جہاں نما۔ اقوال محققین مثلاً حضرت شیخ محی الدین عربی۔ حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی وغیرہ قدس اسرارہم۔

بیعت :۔ شاہ ندا سید علی اصغر یا اصغر علی حسینی، شاہ چندن حسینی ابن شاہ قطبی حسینی معاصر عالمگیر از اولاد حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ کے مرید و خلیفہ تھے، چناں چہ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اپنا شجرۂ خلافت اپنی اس مثنوی میں بعنوان "فضیلت عشق" بیان کیا ہے۔ ہم یہاں اس کا اقتباس درج ذیل کرتے ہیں:۔

عشق بولا کہ خواجہ صدر الدین ہے گا محبوب جملہ محبوبین
عشق حق سے ہوئے قبول اللہ شہ ید اللہ لقب حبیب اللہ
عشق سے شہ من اللہ صاحب دم عشق مرشد میں نت ثبات قدم
عشق سے بوالحسن ہیں ناصر الدین عشق سے ہے علی معین الدین
عشق کے بحر تھے فصیح اللہ قطب ثانی، امین دین اللہ
عشق سے شاہ محمد عالی شان عشق سے بوالحسن امین امان
عشق سے سید محمد ہیں جن کو طہمہ و شاہ کلاں کہیں
عشق جس کو کہا کہ عشق اللہ پیر سالک، علی حبیب اللہ
عشق آیا سمت داعی عصر شاہ محمد ہوئے یگانۂ دہر
عشق سے شاہ علی اسد اللہ ہوئے فانی بحق بقا باللہ
عشق سے شاہ قطب الدین کو لقب خاندان کے سراج ملہم اب
عشق حق کے امیں ہیں شاہ چندن عرش تا فرش جن کا گھر آنگن
عشق سے مو بمو تھا ذاکر حق ہوئے معشوق جن کا حق عاشق
عشق سے سید علی اصغر قطب چندن کے خاص نور بصر
عشق حق کر ندا کے تیئں تلقیں گئے تشریف لے، بعلییٔں
عشق سے کر مجھے فنا فی اللہ ہوئے آسودہ خود بقا باللہ الخ

غرض شاہ غلام محمد ندا، خلیفہ تھے سید علی اصغر حسینی کے اور وہ شاہ چندن[1] حسینی کے اور وہ شاہ

---

[1] سید شاہ چندن حسینی خلیفہ شاہ قطب الدین عرف شاہ قطبی قدس سرہٗ۔ خلفا میں شاہ علی شاہ اللہ بہت مشہور تھے یہاں تضاد ہے۔ ممکن ہے قطبی حسینی ان کے والد سے بھی خلافت ہو۔ (صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳ تاریخ محمدیہ مطبوعہ)

قطب الدین[1] حسینیؒ کے اور وہ شاہ علی[2] اسد اللہ حسینیؒ کے اور وہ شاہ محمد[3] حسینیؒ کے اور وہ شاہ علی[4] حبیب اللہؒ کے اور وہ شاہ محمد[5] کلاں کے اور وہ ابوالحسن کے اور وہ شاہ محمد کے اور وہ شاہ[6] فصیح اللہ حسینی کے اور وہ شاہ علی قطب[7] ثانیؒ کے اور وہ شاہ محمد[8]ؒ کے اور وہ شاہ علی معین الدینؒ کے اور وہ شاہ ناصر الدین ابوالحسنؒ کے اور وہ شاہ ابوالفیض من اللہ حسینیؒ اور وہ شاہ ید اللہ الملقب بہ شاہ قبول اللہ حسینیؒ کے اور وہ خواجہ صدر الدین ابوالفتح خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز قدس سرہٗ اور وہ حضرت خواجہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ العزیز کے الخ

ان کے مرشد کا صحیح نام سید اصغر حسینیؒ تھا بڑے عارف کامل بزرگ تھے، ان کا خاندانی و خلافتی سلسلہ حضرت شاہ ابوالفیض بیدری نبیرہ خواجہ بندہ نواز قدس سرہٗ سے ملتا ہے۔ علوم ظاہری و باطنی میں مکمل اور شاعر بھی تھے۔ چناں چہ شاہ ندا نے لکھا ہے۔ آپ حیدر آباد سے آرکاٹ گئے۔ اپنی سواری کا گھوڑا فروخت کر دیا، جو راہ خدا میں اور کچھ اپنے صرفہ میں ختم ہو گئے۔ بڑی تنگی محسوس ہونے لگی تو آپ نے ایک قصیدہ نواب[9] عمدۃ الامرا کی مدح میں لکھا اور کسی ڈھب سے اس کو نواب کے ملاحظہ میں پیش کر دیا۔ نواب مرحوم

---

[1] شاہ قطب الدین حسینی معاصر عالمگیر، جن کو عالمگیر نے ۱۱۰۰ھ میں تولیت روضہ بزرگ علحدہ کر دیا تھا بڑے مستغنی الاوصاف بزرگ تھے۔ عالمگیر نے ملنا چاہا، مگر آپ نے انکار کر دیا بوجہ ناراضگی تولیت سے ہٹا دیا۔ مگر مدد و معاش جاری کی مواضعات کمسی۔ نیلواڑہ۔ آلور۔ بڑگہ (ضلع گلبرگہ) آپ کی جاگیر مدد معاش تھی، آپ کے خلفاء میں شاہد علی شاہ الندی بڑے مشہور تھے (صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳ تاریخ محمدیہ)

[2] شاہ علی اسد اللہ حسینی ابن سید محمد حبیب ثانی عرف محمد کرسی نشین متولی مزار روضۂ بزرگ المتوفی ۱۰۷۱ھ (ص ۱۴۲ تاریخ محمدیہ)

[3] شاہ سید محمد حبیب ثانی عرف محمد کرسی نشین۔ المتوفی ۱۰۴۵ھ مزار گلبرگہ شریف۔

[4] سید شاہ علی حبیب اللہ المتوفی ۱۰۲۱ھ متولی مزار نزد گنبد والا بزرگوار خود شاہ محمد "چوکی نشین" متصل گنبد پنجہ اصغر حسینی (روضہ بزرگ گلبرگہ شریف)

[5] شاہ محمد حسینی المعروف بہ چوکی نشین۔ پیر کے معذور تھے المتوفی ۹۸۱ھ (ص ۱۴۶ تاریخ محمدیہ) یا شاہ محمد حسینی کلاں ابن شاہ ناصح الدین ابن حیدر ثانی؟ معاصر عبد اللہ قطبی

[6] شاہ معین الدین ابوالحسن (سجادگی ۱۱۷۲ھ) بیدری شاہ فصیح اللہ نبیرہ شاہ ابوالفیض من اللہ حسینی بیدری المتوفی ۸۷۹ھ نبیرۂ حضرت بندہ نواز قدس سرہٗ کا صحیح نام ولقب شاہ ناصح الدین ابوالحسن ابن شاہ کلیم اللہؒ ہے۔ (ص ۱۵۵ تاریخ محمدیہ)

[7] شاہ علی قطب ثانی داماد عادل شاہ بیجاپور جن کی اولاد کوہیر ضلع بیدر میں ہے۔

[8] شاہ محمد خلیفہ شاہ علی قطب ثانی (امین الدین؟) خلیفہ ناصح الدین فصیح اللہ ابن حکیم اللہ ابن ابوالفیض بیدریؒ (ص ۱۴۳ تاریخ محمدیہ مطبوعہ)

[9] تزک والاجاہی (قلمی آصفیہ) مولفہ برہان خاں ہاندی۔

نے آپ کے اجداد والا شان حضرت خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ کا نام سن کر بڑی عزت و احترام کیا اور بیعت ہو گئے اور
۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ حیدرآباد واپس ہو گئے یا شاید اپنے وطن گلبرگہ شریف، مگر شاہ ندا کو وہیں چھوڑ دیا۔ نواب
عمدۃ الامراء ($\frac{۱۲۱۰}{۱۲۱۶}$ ھ) شعراء اور فقراء کے قدرداں اور عزت کرتے تھے، شاہ ندا کی بڑی دلجوئی اور احترام ملحوظ
رکھا مگر ان کا دل وہاں نہ لگا۔ عمدۃ الامراء کے پیر حضرت سید شاہ بہادر حسینیؒ سے شاہ ندا کی ملاقات ہو گئی اور شاہ
صاحب نے ندا کو مسائل علم تصوف و معقول و منقول کے مباحثہ اور سماع کی مجلسوں میں مشغول رکھ کر دل بہلایا
شاہ ندا کے نواب عمدۃ الامراء کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اکثر حاجتمند اور ذی عزت اشخاص کی طلب آرہی
تھی کی جن میں جاگیردار اور منصب دار شامل تھے۔ اور وہ بھی زمانہ ہے جب کہ فضل علی ممتاز تلمیذ سودا بھی آرکاٹ
آیا تھا اور عمدۃ الامراء سے شعر و سخن کی گفتگو رہا کرتی تھی۔ غرض شاہ ندا کو عمدۃ الامراء نے دو سال تک وطن
واپس جانے نہ دیا۔ اور معلوم ہوتا ہے ندا کے وجدانی اشعار سن کر نواب سر دھنا کرتے تھے، فرماتے ہیں ؎

کیا ترے سے قرار کرتا تھا شعر پہ جی نثار کرتا تھا

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ شہزادۂ دہلی علی بخت اظفری بھی وہاں موجود تھے۔

غرض شاہ ندا جیسے عارف باللہ کا وہاں دل نہ لگا، کہتے ہیں کہ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا۔ اور بلا اطلاع
کے جنگل میں نکل گئے، یہاں بھی عمدۃ الامراء نے ان کا پتہ لگایا، اور ان کی خدمت سے خالی نہ رہے۔ اور
سیر و سیاحت کرتے ہوئے شاہ ندا صوبہ رام ناتھ شیو گنگا ضلع (گوداوری)، مدھرہ، ترچناپلی پہنچے۔ یہاں اس
زمانے میں سخت قحط پڑ گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ عمدۃ الامراء مرحوم یہاں بھی پہنچے، جس کی تصدیق ایک اور اردو شاعر
نادر تخلص، مصنف مثنوی رشک قمر و مہ جبیں سے ہوتی ہے۔ غرض شاہ ندا کا بیان ہے کہ نواب عمدۃ الامراء
نے لوگوں کی پریشانی اور قحط کے ازالہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، خزانہ کا منہ کھول دیا، ہزارہا ہون (اشرفیاں)
غرباء کو تقسیم کیں اور غلہ تقسیم کیا، بھوکوں کو رات دن کھانا کھلایا۔ غرض شاہ ندا چھ ماہ تک سفر کے مصائب
اٹھاتے ہوئے حیدرآباد پہنچے، اور پیر و مرشد کے آستانہ پہ حاضری دی۔ مگر یہاں بھی مرشد کی داد و دہش اور
بذل و جود کی وجہ سے شاہ ندا کو آرام نصیب نہ ہوا۔ مرشد سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ؎

یہاں بھی تم مجھ کو ران کر رکھے بلکہ جو مبجھ تان کر رکھے

بات یہ ہے کہ جو شخص ابتدا سے ناز و نعمت میں پلا ہو۔ اس کو سختی اور تنگدستی، فاقہ مستی کیا خوش
آ سکتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا حال تو ایسا ہو گیا جیسے دھوبی کا گدھا گھر کا نا گھاٹ کا۔ غرض پیر نے کوئی توجہ
نہ کی، بلکہ اس سے حضرت کا منشا ان کا تزکیہ نفس و تصفیہ قلب تھا۔ بقول "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"
اور نہایت صبر و قناعت سے کام لیا۔ غرض شاہ ندا فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی پاک انفاس کی برکت سے

مدارج روحانی حاصل کیے اور میر انفس امارہ ملہمہ و مطمئنہ کے درجے پر پہنچا۔ اور مرشد نے فرط محبت سے "عاشق چشتیاں" خطاب عطا فرمایا۔

معاصرین:۔ حیدرآباد میں آپ کے معاصرین جن کا شاہ ندا نے ذکر کیا ہے وہ ایک بزرگ حافظ شاہ محمد علی خلیفہ شیخ رفیع الدین قندھاری (دکن) قاضیان قندھار فاروقی۔[1]

دوسرے بزرگ سید شاہ علی از اولاد سید شاہ یوسف المعروف بہ راجو قتال گولکنڈوی ہیں جن سے شاہ صاحب کے تعلقات تھے۔ سید شاہ تجلی علی[2] (۱۲۱۸ھ) نے ان کا کلام اپنے مجموعۂ خزانۂ فصاحت میں درج کیا ہے۔ شاہ معین تجلی[3] یعنی تجلی علی شاہ کے مرشد بھی ان کے معاصر ہیں جن کو اسی خاندان حضرت بندہ نوازؒ کے ایک بزرگ سید عبداللہ حسینیؒ سے ارادت حاصل تھی۔

ویلور مدراس کی سیاحت کے ضمن میں آپ نے ایک مسن ضعیف الجثہ بزرگ نور خاں ٹھیکری مجذوب کا قصہ بیان کیا ہے، کہ اتفاق سے مجذوب صاحبؒ قلعہ ویلور (علاقہ مدراس) کے خندق میں گر پڑے وہاں چھوٹے بڑے بہت سے مگرمچھ تھے، مگر کوئی تکلیف نہ پہنچی خود ہی چند گھنٹے کے بعد سطح آب پر آ گئے، اور لگے مگرمچھ کی سواری کرنے، ایک مگرمچھ کی سواری سے طبیعت سیر ہوئی تو دوسرے مگرمچھ پر سوار ہو گئے آپ کی ایک کرامت یہ تھی کہ ٹھیکری پر کچھ پڑھ کر اڑتی ہوئی چیل کی طرف پھینکتے تو وہ نیچے اتر آتی اور لڑکوں کا ایک ہجوم ہو جاتا جو خوب شور مچاتے۔ اس کو شاہ ندا نے غالباً کشف و کرامات کی عدم اہمیت کے متعلق تمثیلاً پیش کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ فقیری ایک عطیہ الٰہی ہے جو کوئی اور چیز ہے۔[4]

وجہ معاش:۔ شاہ ندا نے اپنے اردو قصیدہ مدحیہ[5] ارسطوجاہ تالیف ۱۲۱۱ھ میں یہ اشارہ کیا ہے کہ میں نے بارہ سال خانہ نشینی کی اس کے بعد ایک قصیدہ نواب مذکور کی مدح میں لکھ کر بھیجا تھا تاکہ اس کا کچھ صلہ حاصل ہو جائے۔ ممکن ہے کہ شاہ ندا کے نام کوئی منصب یا یومیہ اجرا رہا ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر ۱۲۱۱ھ میں کافی تھی۔

---

[1] انوار القندھار قلمی آصفیہ مولفہ شاہ رفیع الدین قدس سرہٗ (خلیفہ خواجہ رحمت اللہ مجددی نیلوری۔ مدراس)

[2] تاریخ گلزار آصفیہ مولفہ خان زماں خاں۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

[3] تاریخ سکندری قلمی۔

[4] مثنوی شاہ ندا (قلمی آصفیہ)

[5] خزانۂ فصاحت مولفہ تجلی علی شاہ (قلمی)

وفات:۔ تاریخ وفات معلوم نہیں، البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ندا ربع سوم تیرھویں صدی ہجری تک بقید حیات تھے۔ اور حضرت علیہ الرحمۃ نے نواب آصف جاہ ثانی میر نظام علی خاں (۱۱۷۵ھ/۱۲۱۸ھ) سکندر جاہ (۱۲۱۸ھ/۱۲۴۴ھ) اور نواب ناصر الدولہ بہادر (۱۲۴۴/۱۲۷۳ھ) (آصف جاہ چہارم) اور نواب ارسطو جاہ المتوفی (۱۲۱۹ھ) اور نواب عمدۃ الامراء والی آرکاٹ کی مدح میں قصائد کہے ہیں۔ ان کے خاص دوست مولوی محمد علی تھے جو شاہ رفیع الدین قندھاری متوفی (۱۲ ھ) کے خلیفہ تھے۔ اس لحاظ سے شاہ نداؔ ۱۲۴۲ھ بقید حیات تھے۔ شاہ نداؔ کے ایک اور معاصر قربان علی شاہؒ تھے جو غالباً شاہ حمید اللہ (المتوفی تقریباً ۱۱۷۵ھ مدفن گنبد جلیل جی خدا نما) داماد سید علی ابن طہ سے شاہ حسینی کے مرید تھے، جن کا ذکر قربان علی شاہ نے اپنے مجموعہ نظم ونثر (۱۲۶۲ھ) میں اس طرح کیا ہے ؎

تھے حمید اللہ شاہ، شاہ زمن تھے میرے سالار اور سلطان من

شاہ جمال الدین ابن شاہ درویش شاہ حمید اللہ کی تجہیز وتکفین میں شریک تھے۔ غرض یہ مثنوی قربان علی شاہ کے مطالعہ میں رہی ہے جس پر ان کی مہر ثبت ہے۔ (مخطوطہ آصفیہ)

تصنیفات:۔ شاہ نداؔ کی تصنیفات میں اُن کا ایک دیوان اردو تقریباً پانچ چھ جزو کا میری نظر سے گزرا تھا مگر بوجہ قلت وقت کوئی استفادہ نہ کر سکا۔ جو اس وقت مکرمی ابو محمد عمر الیافعی صاحب حیدر آباد کے نایاب کتب خانہ میں محفوظ ہے مگر بابائے اردو کے پاس اس کے مخطوطات ہیں۔ دوسری ایک مختصر نظم "بھو کرامی بھو" الموسوم بہ رمزۃ العاشقین ہے جس کے جملہ اشعار تقریباً ۲۳۸ ہیں۔ جو کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں محفوظ ہے۔ فہرست توضیحی کتب خانہ سالار جنگ میں اس کے مصنف کا نام "اصغر علی" لکھا ہے جو صحیح نہیں، حالاں کہ اس میں مصنف کا تخلص ندا موجود ہے۔ چوں کہ ندا نے اپنے خاص دوست مولانا محمد علی اور اپنے مرشد اصغر علیؒ کا اشارہ کیا ہے اس لیے یہ نظم شاہ ندا کی تصنیف ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ دراصل اصغر علی ان کے مرشد کا نام تھا۔ کیوں کہ شاہ ندا نے اپنے مرشد کا نام کہیں تو علی اصغر لکھا ہے کہیں اصغر علی دراصل مرشد کا نام اصغر حسینی ہے، جو شاہ چندان حسینی کے فرزند تھے، جس کی تصدیق شجرۂ خاندانی شاہ چندان حسینیؒ جو حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کی اولاد سے تھے ہوتی ہے۔ (تاریخ محمدیہ مطبوعہ)

۱ آغاز :۔ ابتدا اس کی ہو جمع بسم اللہ بول کر لا الہ اللہ

خاتمہ :۔ اس کا رمزت العاشقین ہے نام قصہ کوتہ طلارییوں کو سلام

ترقیمہ :۔ تمت تمام رمزت العاشقین بہ بست ونہم رمضان المبارک ۱۲۴۹ھ دورانی پٹھہ شدہ

آپ کی تیسری تصنیف مثنوی زیر بحث ہے۔ جس کے نام کے متعلق خود مصنف نے اس طرح اشارہ

کیا ہے ~~ حق~~ سے ہے یہ محمدی جذبات"۔ اور فاضل مرتب فہرست انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اس کا نام "جذبات محمدی" لکھا ہے مگر دراصل اس مثنوی کا نام بلحاظ مادۂ تاریخ "غیب اللسان" معلوم ہوتا ہے جس کا خود مصنف نے اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

فارغ از نقطہ جیسے دایرا داد ہے یہ غیب اللسان الٰہی داد"

صرف "غیب اللسان الٰہی داد" کے اعداد ۱۲۴۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اور اگر الفاظ "ہے یہ" کے ۳۰ اعداد شامل کر دیے جائیں تو اس کا سنہ ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس کا صحیح سنہ تصنیف نہ تو ۱۲۴۰ھ ہی ہے اور نہ ۱۲۷۰ھ اس لیے کہ جامعۂ عثمانیہ میں بھی اس کا ایک نسخۂ قلمی موجود ہے جس کا سنہ کتابت ۲۷ شعبان ۱۲۲۹ھ ہے۔ اس لیے اس کی تصنیف کا زمانہ قبل ۱۲۲۹ھ قرار پاتا ہے اور اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ ندا ۱۲۱۶ھ سے قبل مرید ہوئے تھے اور دس بارہ سال مراتب سلوک طے کرنے میں گزارے۔ بعد تکمیل مراتب سلوک ہی اس کی تدوین کا بہترین زمانہ ہوسکتا ہے اور تقریباً ۱۲۲۹ھ اس کا زمانۂ تصنیف قرین قیاس ہے۔ اور فاضل مرتب فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے الفاظ "تصنیف غالباً ۱۲۴۰ھ ہے" زمانہ کا صحیح تعین ہوجاتا ہے کہ دراصل یہ ۱۲۴۰ھ ہی اس کا صحیح سنہ تصنیف نہیں ہے بلکہ قبل ۱۲۲۹ھ ہے۔ غرض دکن کی یہ طویل مثنوی آج سے تقریباً ایک سو پچاس سال قبل کی تصنیف ہے۔

مصنف نے اسی اپنی مثنوی میں اپنی تصنیفات اور زمانۂ تصنیف کا مجملاً اشارہ حسب ذیل اشعار میں کیا ہے ؎

ملہمہ کا مجھے ملا جو مقام تو ہوا حق سے صاحب الہام
کیا تصنیف مثنوی، دیوان اور معمے نکات کئی عنوان
نو مضامین اصطلاحاتیں خوب مضمون تازہ ہیں باتیں
علم روحی کو دے کے زینت چشم اور بنایا لباس کئی کئی قسم
نہیں کرنے کی باتیں بول اڈھا کئی عقدے دقیقے کھول اٹھا

یعنی ان کی تصانیف میں ایک یہ مثنوی، دوسرے دیوان، اور شاید معموں میں کوئی کتاب ہو مگر بعض معمے اسی مثنوی میں موجود ہیں۔ مگر تیسری تصنیف جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے "نظم" چھوٹی سی ہے۔ جس کا نام "رمزۃ العاشقین" ہے جس کے اعداد بحساب جمل ۱۲۰۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ شاید یہ ان کی پہلی تصنیف ہو۔ انجمن ترقی اردو کے نسخہ ۱۵۲ پر سرورق ایک مہر غلام محمد قادری کی ثبت ہے سنہ صاف پڑھا نہیں

وفات:۔ تاریخ وفات معلوم نہیں، البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ ندا ربع سوم تیرھویں صدی ہجری تک بقید حیات تھے۔ اور حضرت علیہ الرحمۃ نے نواب آصف جاہ ثانی میر نظام علی خاں (۱۱۷۵ھ/۱۲۱۸ھ) نواب سکندر جاہ (۱۲۱۸ھ/۱۲۴۴ھ) اور نواب ناصر الدولہ بہادر (۱۲۴۴ھ/۱۲۷۳ھ) (آصف جاہ چہارم) اور نواب ارسطو جاہ المتوفی (۱۲۱۹ھ) اور نواب عمدۃ الامرا والی آرکاٹ کی مدح میں قصائد کہے ہیں۔ ان کے خاص دوست مولوی محمد علی تھے جو شاہ رفیع الدین قندھاری متوفی (۱۲ ھ) کے خلیفہ تھے۔ اس لحاظ سے شاہ ندا ۱۲۴۲ھ بقید حیات تھے۔ شاہ ندا کے ایک اور معاصر قربان علی شاہ تھے جو غالباً شاہ حمید اللہ (المتوفی تقریباً ۱۱۷۵ھ مدفن گنبد میراں جی خدانما) داماد سید علی ابن بڑے شاہ حسینی کے مرید تھے، جن کا ذکر قربان علی شاہ نے اپنے مجموعہ نظم دفتر (۱۲۶۲ھ) میں اس طرح کیا ہے ؎

تھے حمید اللہ شاہ، شاہ زمن　　　تھے میرے سالار او سلطان من

شاہ جمال الدین ابن شاہ درویش شاہ حمید اللہ کی تجہیز و تکفین میں شریک تھے۔ غرض یہ مثنوی قربان علی شاہ کے مطالعہ میں رہی ہے۔ جس پر ان کی مہر ثبت ہے۔ (مخطوطہ آصفیہ)

تصنیفات:۔ شاہ ندا کی تصنیفات میں اُن کا ایک دیوان اردو تقریباً پانچ چھ جزو کا میری نظر سے گزرا تھا مگر بوجہ قلت وقت کوئی استفادہ نہ کر سکا۔ جو اس وقت مکرمی ابو محمد عمر الیافعی صاحب حیدر آباد کے نایاب کتب خانہ میں محفوظ ہے مگر بابائے اردو کے پاس اس کے مخطوطات ہیں۔ دوسری ایک مختصر نظم "پیو کرامی پیو" الموسوم بہ رمزۃ العاشقین ہے جس کے جملہ اشعار تقریباً ۲۳۸ ہیں۔ جو کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر میں محفوظ ہے۔ فہرست توضیحی کتب خانہ سالار جنگ میں اس کے مصنف کا نام "اصغر علی" لکھا ہے جو صحیح نہیں، حالاں کہ اس میں مصنف کا تخلص ندا موجود ہے۔ چوں کہ ندا نے اپنے خاص دوست مولانا محمد علی اور اپنے مرشد اصغر علیؒ کا اشارہ کیا ہے اس لیے یہ نظم شاہ ندا کی تصنیف ہونے کی تصدیق کرتی ہے۔ دراصل اصغر علی ان کے مرشد کا نام تھا۔ کیوں کہ شاہ ندا نے اپنے مرشد کا نام کہیں تو علی اصغر لکھا ہے کہیں اصغر علی دراصل مرشد کا نام اصغر حسینی ہے، جو شاہ حیدان حسینی کے فرزند تھے، جس کی تصدیق شجرۂ خاندانی شاہ حیدان حسینیؒ جو حضرت خواجہ سید محمد گیسو دراز کی اولاد سے تھے ہوتی ہے۔ (تاریخ محمدیہ مطبوعہ)

آغاز:۔　　ابتدا اوس کی ہو جمع بسم اللہ　　بول کر لا الہ اللہ

خاتمہ:۔　　اس کا رمزت العاشقین ہے نام　　قصہ کو نہ ٹلا ٹیوں کو سلام

ترقیمہ:۔　　تمت تمام رمزت العاشقین بہ بست و نہم رمضان المبارک ۱۲۴۹ھ دو بانی نوشتہ شد۔

آپ کی تیسری تصنیف مثنوی زیر بحث ہے۔ جس کے نام کے متعلق خود مصنف نے اس طرح اشارہ

کیا ہے ...حق سے ہے "یہ محمدی جذبات"۔ اور فاضل مرتب فہرست انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اس کا نام "جذبات محمدی" لکھا ہے مگر دراصل اس مثنوی کا نام بلحاظ مادۂ تاریخ "غیب اللسان" معلوم ہوتا ہے جس کا خود مصنف نے اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

فارغ از نقطہ جیسے دایرا داد — ہے "یہ غیب اللسان الٰہی داد"

صرف "غیب اللسان الٰہی داد" کے اعداد ۱۲۴۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اور اگر الفاظ "ہے یہ" کے ۳۰ اعداد شامل کر دیے جائیں تو اس کا سنہ ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ مگر ہماری رائے میں اس کا صحیح سنہ تصنیف نہ تو ۱۲۴۰ھ ہی ہے اور نہ ۱۲۷۰ھ اس لیے کہ جامعۂ عثمانیہ میں بھی اس کا ایک نسخۂ قلمی موجود ہے جس کا سنہ کتابت ۲۷ شعبان ۱۲۲۹ھ ہے۔ اس سبب اس کی تصنیف کا زمانہ قبل ۱۲۲۹ھ قرار پاتا ہے اور اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ ندا ۱۲۱۶ھ سے قبل مرید ہوئے تھے اور دس بارہ سال مراتب سلوک طے کرنے میں گزارے۔ بعد تکمیل مراتب سلوک ہی اس کی تدوین کا بہترین زمانہ ہوسکتا ہے اور تقریباً ۱۲۲۹ھ اس کا زمانۂ تصنیف قرین قیاس ہے۔ اور فاضل مرتب فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے الفاظ "تصنیف غالباً ۱۲۴۰ھ ہے" زمانہ کا صحیح تعین ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ ۱۲۴۰ھ ہی اس کا صحیح سنہ تصنیف نہیں ہے بلکہ قبل ۱۲۲۹ھ ہے۔ غرض دکن کی یہ طویل مثنوی آج سے تقریباً ایک سو پچاس سال قبل کی تصنیف ہے۔

مصنف نے اسی اپنی مثنوی میں اپنی تصنیفات اور زمانۂ تصنیف کا مجملاً اشارہ حسب ذیل اشعار میں کیا ہے ؎

ملہمہ کا مجھے ملا جو مقام — تو ہوا حق سے صاحب الہام
کیا تصنیف مثنوی، دیوان — اور معمے نکات کئی عنوان
نو مضامین اصطلاحاتیں — خوب مضمون تازہ ہیں باتیں
علم روحی کو دے کے زینت چشم — اور بنایا لباس کئی کئی قسم
نہیں کرنے کی باتیں بول اٹھا — کئی عقدے دقیقے کھول اٹھا

یعنی ان کی تصانیف میں ایک یہ مثنوی، دوسرے دیوان، اور شاید معموں میں کوئی کتاب ہو مگر بعض معمے اسی مثنوی میں موجود ہیں۔ مگر تیسری تصنیف جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے نظم "چھوکڑی چھوٹ" ہے۔ جس کا نام "زمرۃ العاشقین" ہے جس کے اعداد بحساب جمل ۱۲۰۹ھ برآمد ہوتے ہیں۔ شاید یہ ان کی پہلی تصنیف ہو۔ انجمن ترقی اردو کے نسخہ ۱۵۲ پر سر ورق ایک مہر غلام محمد قادری کی ثبت ہے سنہ صاف پڑھا نہیں

جاتا ہے غالباً ۱۲۰۹ھ ہے اور خاتمہ پر ایک مہر ثبت (رفیع بن محمد علی / ز رحمت اوست ۱۲۰۹) جو شاید ان کے خاص دوست حاجی محمد علی کے
کے فرزند ہیں۔ سنہ کتابت ۱۲۰۹ھ بھی مشکوک ہے۔ دوسرا نسخہ ناقص الطرفین ہے۔

متفرقات:۔ خزینۂ سخن مجموعہ قصائد مدحیہ نواب ارسطو جاہ المتوفی (۱۲۱۹ھ) مولفہ شاہ تجلی علی حیدرآبادی
المتوفی (   ) میں ندا کے دو قصیدے ایک فارسی (۱۹ ابیات) اور دوسرا اردو (۷۰ بیت) اور ایک قطعہ
تاریخ وزارت ارسطو جاہ مرحوم موجود ہے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

قصیدہ فارسی۔ آغاز۔ فلک شد ساقی بزم طربناک   صراحی مست گشت و جام مخمور

خاتمہ:۔ ندا از پردۂ دل داد فرمود   "ارسطو جاہ شد نورٌ علی نور" (۱۲۱۱ھ)

قصیدہ اردو۔ آغاز۔ صبح ہاتف آج میرے دل کے کانوں میں پکار   یوں کہا دیوانے کیا سوتا ہے اٹھ ہو ہوشیار

خاتمہ:۔ اے ندا دل سے دعائے خیر کہہ اور ختم کر   "تا ابد آباد خانہ، عمر و دولت پایدار"

اسی قصیدے کے بعض اشعار قدرت اللہ قاسم دہلوی نے اپنے تذکرہ مجموعۂ نغز میں درج کیے ہیں۔

قطعہ تاریخ:۔

چو آمد اعظم الامرا بہادر   بفضل مہر مولائے معظم
عیاں است از نگین خاتم او   ندا آمد "جلوس اسم اعظم"

۱۲۱۱ھ

مثنوی شاہ ندآ۔ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد کا ایک کمیاب مخطوطہ ہے جس کا ذکر اب تک اردو ادب
کی تاریخ میں نہیں آیا ہے مجلد اوراق ۲۴۰ یا ۴۸۰ صفحات، سطر ۱۳-۱۴ ابیات کاغذ بادامی، مہر سر ورق محمد قربان علی
۱۲۷۲ھ۔ ابیات (۶۱۷۰) (چھ ہزار ایک سو ستر بیت) غالباً یہ وہ قربان علی شاہ ہیں جن کی ایک اردو
کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ جملہ ابواب و عنوانات مثنوی ۱۹۱۔ جس کی تفصیل درج ذیل
ہے تاکہ یہ محفوظ ہو جائے۔

ابتداء:۔ حمد حق بس یہی ہے کھول زباں   بسم اللہ رحیم ہے رحماں

۱	حمد	۱۹	ابیات
۲	نعت	۲۸	〃
۳	سبب تالیف	۷۷	〃
۴	در بیان نقطۂ توحید	۵۹	〃
۵	در بیان بنائے ظہور کائنات و احوال ازل و ابد	۶۹	〃
۶	در بیان احوال روز میثاق کہ سہ صف ارواح شدہ بود	۱۲	〃

نمبر	عنوان	تعداد
۳۲	احوال شہادت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۴۹ ابیات
۳۳	احوال پیران فنونی، در حکایت [illegible] کہ بہ حیدرآباد آمدہ بود	۸۱ "
۳۴	احوال پیران فنونی و نقل شخصے کہ بفریب شیطان بکعبہ در شش روز میرفت	۵۵ "
۳۵	دربیان احوال پیران جد فروش کہ خود بے پیر و مریدی کنند و خود را پیر مینمایند	۱۷ "
۳۶	احوال پیر جد فروش گوید	۱۴ "
۳۷	دربیان احوال خاموشاں و فقیران گانجہ کش	۶۶ "
۳۸	دربیان پیران حق پرست و طریق آنہا	۱۶ "
۳۹	دربیان طریق پیر	۲۷ "
۴۰	نقل مرد صالح کہ حقیر را پیر خود نمودہ و از اعتقاد درجۂ اعلیٰ یافت (عہد محبوب الٰہی)	۴۶ "
۴۱	بر نقل تمثیل بادشاہ زن مرید کہ از عقل زناں دغا خوردہ	۴۰ "
۴۲	نامہ نوشتن بادشاہ حریف بپادشاہ زن مرید	۱۱ "
۴۳	درجواب نامہ بادشاہ رقم کرد	۵۰ "
۴۴	نقل حضرت آدم علیہ السلام بر تمثیل	۱۷ "
۴۵	دربیان نقطۂ توحید در عالم ازل و ابد بموجب سوال حضرت بہلول دانا	۳۷ "
۴۶	دربیانت طالب الدنیا	۱۰ "
۴۷	نقل خواجہ سہل تستری در ترک صحبت دنیا	۵ "
۴۸	نقل حضرت بایزید بسطامی در ترک اہل دنیا	۲۸ "
۴۹	نقل حضرت شیخ فرید شکر گنج زبدۃ الانبیا در حال فقیری	۲۹ "
۵۰	دربیان چہار مقام طریقت	۱۴ "
۵۱	دربیان احوال چہار مقام سالکان	۷ "
۵۲	احوال طریق سالکان و ریاضت	۱۷ "
۵۳	دربیان طریق درویشی	۱۷ "
۵۴	دربیان احوال صفائی چہار ابرو، و طریق درویشی	۴۲ "
۵۵	در دریافت احوال صفائی چہار ابرو کہ اول از کدام بزرگ رواج یافت	۱۱ "
۵۶	سوال نمودن شخصے از بہلول دانا کہ اول از کے رواج صفائی یافت	۲ "

۱۰۷	تتمہ نقل صدر و نصیحت ابلیس لعین	۸۴ ابیات
۱۰۸	نقل درویشے کہ موسیٰؑ پرورش نمودہ و ندمحل بجا آوری حکم	۷۳ "
۱۰۹	دربیان احوال مجذوب ظلمانی	۳۲ "
۱۱۰	احوال مجذوب جمالی درنقل درویشی کہ علم مولوی صرف نمودند	۷۸ "
۱۱۱	احوال برزخ (اقوال ابن عربی۔ پیران پیر، جواہر التفسیر وغیرہ)	۴۶ "
۱۱۲	احوال جنت ودوزخ در دنیا بموجب قول حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ	۶۳ "
۱۱۳	آغاز احوال تجدد امثال کہ شخصے سوال کردہ ارشاہ نداؒ	۶۵ "
۱۱۴	نقل ریاضت خواجہ بندہ نواز قدس سرہٗ درحال تجدد امثال	۱۰ "
۱۱۵	دربیان احوال خواجہ بندہ نواز قدس سرہٗ کہ بزیارت جناب زہدالانبیا رفتہ بودند	۹ "
۱۱۶	احوال نماز خواندن حضرت خواجہ بندہ نواز برجنازہ خود پیش از قضا	۸ "
۱۱۷	احوال تجدّد امثال اضطراری و بیان نقل بوم صحرائی	۲۶ "
۱۱۸	نقل مرید حضرت سید الطائفہ کہ دریک ساعت ہفت سال گذشتہ	۱۳۶ "
۱۱۹	حکایت ... (خواجہ سید علی عرف شاہ علی از اولاد شاہ راجو دوست شاہ نداؒ)	۲۲ "
۱۲۰	ماہیت خواب وخیال	۲۲ "
۱۲۱	نقل پوستی مرد بر تمثیل	۳۰ "
۱۲۲	احوال فضیلت شب	۱۲ "
۱۲۳	نقل خواجہ اویس قرنیؓ بارگاہ رسول در فضیلت شب	۲۶ "
۱۲۴	شرح احوال روح جاری و روح مقیمی	۲۱ "
۱۲۵	بیان نمودن شاہ ندا احوال خود بے کم وکاست	۱۵۲ "
۱۲۶	نقل بر تمثیل	۱۸ "
۱۲۷	حکایت خلیل اللہ بر تمثیل	۹ "
۱۲۸	نقل بر تمثیل حضرت رابعہ بصریؒ	۱۲۰ "
۱۲۹	نقل واعظ کہ در وقت موسیٰ پیغمبر بود بہ ریاکاری مردود شد	۲۰ "
۱۳۰	نقل واعظ ریائی امت سید الکائنات ونجات یافتن آں	۷۸ "
۱۳۱	نقل بادشاہے ملاقات نمودن از درویش بر تمثیل تجدد امثال	۸۲ "

۱۸	سوال نمودن شخصے کہ در قرآن نام عشق نیست و جواب دادن بآں	۵۸ ابیات
۱۸	دربیان سجدہ کہ غیر حق جائز نیست پس درو نشی را بچہ طور باشد	۳۷ "
۱۸	نقل بادشاہے برشکل جسم احمدی علیہ السلام	۸۸ "
۱۸	نقل در بوالہوسی	۳۸ "
۱۸	معمہ (نہ مخنث نہ مونث نہ رجال)	۱۰۶ "
۱۸	معمہ	۷۸ "
۱۸	درعقائد مریدی مستورات	۲۶ "
۱۸	دربیان شمار مراتبات ولایت موافق احوال سلف	۳۰ "
۱۸	درباب ماہیت رنگ انسان کہ باوجود یک نسل مختلف بچہ طور است	۴۸ "
۱۹	تلقین کلمہ طیب آدم علیہ السلام از جناب باری	۸۳ "
۱۹	احوال اخراج آدمؑ از بہشت و کیفیت خناس	۴۸ "
۱۹	درتمہید اہتمام کتاب احوال شاہ ندا مصنف کتاب	۱۳ "
۱۹۲	حکایت حضرت موسیٰ بر تمثیل موجودات باری	۲۰ "
		۶۱۷۰ ابیات

شاہ ندا کی زبان :۔

نقطہ کی توجیہ :۔

نہیں ہے کلمہ میں نام نقطے کا — عین میں کیا ہے کام نقطے کا

ہے زیر زبر کی بسم اللہ کی زیر ایک نقطے میں — کیوں ہے دو دو پھیر نقطے میں؟

نقطہ داں جو یہ راز پاتے ہیں — کھول زیر و زبر بتاتے ہیں

جو نہیں پائے نقطہ، ہیں وہ ہیچ — ہر غلط بک رہے ہیں کچھ کا کچھ

نقطہ پایا تھا خوب کچھ بہلول — بھید میں بھید کہہ ندا مت کھول

قصہ بیان حضرت خلیل علیہ السلام

کہا حق نے تمھیں مبارکباد — کرو کعبہ کی یہاں تم اب بنیاد

کیے حضرت خلیل علیہ السلام — وہاں کعبے کی ابتدا، انتمام

ہوئی کعبے کی جب تمامیت　　مجھے کہنا ہے اور کیفیت
رہے حضرت خلیل شب کے شب　　حاضرہ پاس با خوشی و طرب　　ہاجرہؓ
صبح کو ہو وداع ، وہ آئے گھر　　بیٹھی سارا تھی رہ پہ آنکھاں دھر
اوتہے حضرت خلیل اوٹھ سے جب　　پوچھی سارا کہاں تھے آج کی شب

.. ..　　.. .. ..

پھر مگر حاضرہ کو پائے ہو　　رات وہاں رکھ کے صبح آئے ہو
بول اٹھتی ہیں بے حجاب آنکھاں　　کہیں چھپتی ہیں نیم خواب آنکھاں
تم بغل میں اسے لیے ہو گے　　بوسے لب میں لب دیے ہو گے
پاوں پر پاوں ہات میں ہاتیں　　سر بزانو و درسمسی باتیں
کیسے ہو گئے تم اس کے سات وطی　　رہی جلتی میں جیسے شمع بتی
بھول گئے اپنے سارے عہد و قرار　　میں نہ چھوڑوں گی اب تمھیں زنہار
اب تم اپنی وفا کرو پیماں　　نیں تو دیتی ہوں اب میں اپنی جاں
تب وہ فرمائے صاحب صدیق　　جو کہ تو مجھ سے اب ہوئی تحقیق
ہو غضبناک سخت تر ، سارا　　ہات میں جنبیہ لے دو دھارا
جلائے کرنے کو بند بند جدا　　آیا جبریل لے کے حکم خدا
ہاں خبردار ! دیکھ اے خاتون　　مجھ کو بھیجا ہے قادر بیچون
اس کے اعضا کو تو زیاں مت کر　　ہے خلیل اللہؑ خوں فشاں مت کر
گر خطا اوس کی تو کریں گی معاف　　کروں دونوں کا واجبی انصاف
ہے یہ غصہ حرام دل سے نکال　　عوض سر لے اوس کے سر کے بال
لے عوض میں لبوں کے موئے لب　　دست و پا کے عوض لے ناخن سب
بانہوں کے عوض لے موئے بغل　　عوض بینی اوس کے بال لے چل
پھر تو کیا بولتی ہے بول ابھی　　بر ہا تو تمیں کر بتاؤں سبھی ؟
کہی سارا نے تب اے جبریل　　مجھ میں اور رب میں تو ہوا ہے وکیل
امر حق جو ہے میں قبول کری　　پر غصہ کو میں خاک دھول کری
پہ نہ چھوڑوں گی سب کری ہو معاف　　ذکر اون کا کروں گی بیخ سے صاف ؟

حکم حق یوں ہوا کروں خطنہ صلح باہم ہو، اب گیا فتنہ
یعنی حق کے خلیل پیغمبر چوک گئے گھر کی زن سے وعدہ کر
ویسے پاکوں پر ایسی ہوئی تعزیر دیکھ انہی تو یہ نظر تقصیر

در بیان احوال خود نمائی کہ در ہر مقام بیک آئین رسب (۱۲ بیت)

ایک درویش رند صاحب راز بندۂ بندگان بندہ نواز
مئے وحدت کی چشم میں مستی نیستی اپنی دوست کی ہستی
اپنی تجرید سے فنا گویاں سر توحید سے انا گویاں
یک بیک آئی جب سے وہم خیال کئی ہستی ہے یہ عجوب سوال
ہر کوئی ایک نہج بولے ہیں کئی معمہ کو سہج کھولے ہیں
تم بھی رکھتے ہو ہر سخن جادو کہو بارے یہ کیا ہے میں اور تو
گرچہ کہہ گئے ہیں بعضے اہل سلف دُر مقصد ہمیں ملا نہ صدف
تم سے ہم کو ہے بیش تر امید خوب کھولو گے میں و تو کا بھید
وہیں ہاتف نے دی ندا فی الفور چار منزل میں اس کے چار ہیں طور
جس کو ناسوت کا کہیں میداں میں سو ہے نفس، تو سو ہے شیطاں
یہاں کے میں تو کا سخت رگڑا ہے خود نمائی ہے سخت جھگڑا ہے
یعنی یک نقل اس کے باب میں ہے یہ مثل آپ کے جواب میں ہے

"حکایت بیان خود نمائی منزل ناسوت وامتحان نمودن بادشاہے مشائخ وعالماں را" (۵۹ بیت)

جدو کد بحث سخت ہوئی ایسے ہوئے لٹ پٹ پھر اوس سے ہو کیسے
علم سب دب گیا رہا میں تو لگا بٹنے کو جوتیوں میں گو
او ٹھے پھر اون سے یک مقتا پیر کیے منبر پہ چڑھنے کی تدبیر
قدم یک دو نہ گئے کہ پکڑا آں دوسرے عالم نے کھینچ کر داماں
کہے منبر کے تم نہ لائق ہو علم میں کیا مرے سے فائق ہو
خیر چاہو، چپ آن کر بیٹھو اپنی منزل پچھان کر بیٹھو
کچھ حدیث و دلیل کی تھی نہ بات تھا جہالت کا داڑیوں پہ ہات الخ

.. ..

دسترخوان علماء کا چنا گیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ان علماء کے ہاتھ پہنچے سے بازو تک باندھ دو ؎

بند پہنچے سے لے کے تا بازو — کمرنیاں باندھو ان کے ہاتھوں کو
لئے لقمہ پہ منھ کو آتا نہیں — دونوں ہاتھوں بھی کھلے جاتا نہیں

علماء نے بادشاہ کو بے نقط گالیاں سنائیں۔ اب شاعر ملکوتیوں کا کچھ حال سناتا ہے ؎

چھوڑ نا صوفیوں کا جنگ و ڈھنگ — اب تو ملکوتیوں کا بتلا رنگ

عنوان :۔ امتحان نمودن بادشاہ محفل صوفیاں را از خود نمائی

اَلفُقَراءُ کَنَفسٍ واحد ہے — ان میں نا اختلاف نا ضد ہے
آئی اودھر سے اب ایدھر کو بات — شغل کرنے لگے نفی اثبات
لگے کہنے کہ کیا بیاں کریں — کیوں دراز اپنی ہم زباں کریں
فکر و حیرت کا بارے پردہ توڑ — ہو دو زانو ادب سے ہاتیں جوڑ
کرو ہم نا قصوں کے دل کو شاد — چڑھ کے منبر پہ کچھ کرو ارشاد
وہ لگے کہنے انکسار کے ساتھ — مجھ کو کیا علم حق کے معلومات
میں کثیف و نحیف مشتِ خاک — آگے پاکوں کے کیا مرے ادراک

. . . .

ایک سے یک انکسار کرتے تھے — سر قدم پہ نثار کرتے تھے
کوئی انا کا سخن نہیں بولے — جز عجز کوئی زباں نہیں کھولے

. . . .

ستر خوان بچھا تو بادشاہ نے ان کے بھی اسی طرح ہات باندھ دیے، اور حکم دیا کہ بسم اللہ کھانا شروع فرمایئے :۔

کہے تم کو رضا ہے کھانے طعام — بول بسم اللہ صوفیوں نے تمام
یک کے یک روبرو مقابل ہو — متفق شاد ہو کے یک دل ہو
کُلُّ مومن اخوۃٌ کا بیاں — کیے مجلس میں صوفیوں نے عیاں
تھے دونوں طرف بناتے تھے — یک کو یک ہاتھ سے کھلاتے تھے
بخوشی یک سے یک لگے لینے — بادشہ کو بدل دعا دینے
دیکھ کر شہ نے اون کا یہ سنجوگ — کہا بے شک ہیں یہ خدا کے لوگ
"میں" "یہا" "دل" "ہے" "تو" "سو ہے عرفاں — ملہمہ نفس کا ہے یہ میداں الخ

پھر بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ حضرت زاہدیں باہم ضد اور اختلاف کیوں ہے تو ایک صوفی کامل نے منبر پر چڑھ کر فرمایا ؎

صحیح حضرت رسول کی ہے حدیث — شک جو کوئی لاوے بے عیب ہے خبیث
نیکیاں زاہدوں کی خاطر خواہ — عارفوں پاس ہے وہ عین گناہ
اس سبب ان میں اختلافی ہے — اون میں ضد ان میں سینہ صافی ہے الخ

حکایت (۶۳) قاضی عین القضاۃ و پوست کشیدن علما راز حد شرع اوشاں را (۱۰۰ ابیت)

سب آمنا صدقنا بول اوٹھے — علم پر اپنے سر کو تول اوٹھے

واقعات شہادت عین القضاۃ کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

ہمدان کے بادشاہ کا لڑکا مرگیا تھا، اوس نے حکم دیا کہ تم وارث انبیا ہو کرامت دکھلاؤ ورنہ قتل کرتا ہوں، مہلت ملی، سب علما، مل کر جنگل گئے، عمامے اتار کر گریہ وزاری کی، اس اثنا میں حضرت عین القضاۃ بھی اتفاق سے یہاں پہنچ گئے، اون سے وجہ اجتماع اور واقعات بیان کیے گئے۔ آپ نے فرمایا تم علماء ظاہری ہو اور صوفیا کرام کے دشمن ہو اون کو برا بھلا کہتے ہو، میں کیا کر سکتا ہوں، بہر حال باہمی قول و قرار کے بعد آپ کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ آپ لڑکے کی لاش کے قریب تشریف لائے اور "قم باذنی یعنی " اوٹھ جا میرے حکم سے" لڑکا زندہ ہوگیا۔ الفاظ یہ ہیں :۔

پہنچے دربار شاہ کے خوش حال — بادشاہ ان کا کر کے استقبال
لے گیا جاں پڑا تھا پوت اس کا — راحت جان دل کا قوت اس کا
عین القضات پیش قدمی کر — مونھ سے مردے کے دور کر چادر
قم باذنی کے یک سخن کے سات — جی پھر سو اوٹھا پکڑ کر ہات
اوس کو باہر لے آ پھرا چھوٹے — ڈوبی ہوئی ناؤ کو ترا چھوٹے
دے کے اوس شاہ کو مبارکباد — چاہے علما سے ہونے کو آزاد الخ

یعنی آپ جانے کی اجازت چاہتے تھے تو ایک عالم فاضل بدفال کہہ اٹھا ؎

کہ دوہائی خدا رسول کی ہے — کہا شہ سے اوسے نہ جانے دے
قم باذنی مگر یہ کیوں بولا — کہ زباں غیر شرع کیوں کھولا
جس کیتئیں تھا خطاب روح اللہ — کہی ویسے نے قم باذن اللہ
"قم باذنی" یہ کیوں کیا تقریر — ہم کو لازم ہے اس کو دیں تعزیر

بھول عالم سب اپنا عہد و قرار   اوٹھے بلوائے عام کر یکبار

بازپرس کی گئی تو عین القضاۃ نے فرمایا ؎

تم بازئی کا مجھ میں کیا امکاں   جو ہلا کر زبان بخشوں جاں

جس نے بولا وہی کیا زندہ   میں بھی اوس کا ہوں کمترین بندہ

مجھ پہ ناحق کیے رکھ کے تم تقصیر   کیا چہتے ہو قتل کی تعزیر

ہے جو فرمودۂ خدا و رسول   ہم نے اوس کو کیے بجان قبول

شرع احمد پہ سر کیے ہیں نثار   پوست کھنچواؤ یا چڑھاؤ دار

کیے تیار عالماں محضر   لائے میداں میں ظالماں محضر

بادشاہ دیکھ یہ سوال و جواب   ہوا حیرت کے بحر میں غرقاب

دو طرف بھی کہوں تو مشکل ہے   یک طرف شیشہ، یک طرف سِل ہے

بادشاہ نے غرض حکم تعزیر جاری کر دیا۔ کھال کھینچنے کے لیے نشتر زور سے مارا مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا غرض ان واقعات کو شاہ ندا نے خوبی سے بیان کیا ہے ؎

کیے نشتر زنی بزور خشم   نہ کٹا اون کے پوست کا یک پشم

جو مذکر ہیں طالب مولے   اون کو کب جسم و پوست کی پروا

حضرت عین القضاۃ نے خود ہی فرمایا ؎

کہے، انگشت پاسے کھینچو پوست   لیے ہم سر پہ اپنے حکم دوست

کھینچی تب سر سے پاؤں تک کا کھال   کیے مثلِ حسینؓ خوں میں لال

پوست میں بھوس بھر کے مارے حد   یہ قبول اوس کے تئیں کیے نیں رد

عالموں کے جو ایسے ہیں حسنات   سیات المقربیں سیات

عالماں جو کیے شریعت ہے   عین القضاۃ کے طریقت ہے

ان کے اور اون کے اختلاف ہے یہ   حب اور بغض صاف صاف ہے یہ

ایک حکایت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی پر محمد تغلق کے ظلم کے لکھی ہے کہ آپ کو اس نے اپنے تخت کے روبرو لٹکا دیا تھا مگر تاریخ میں اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ فرماتے ہیں ؎

اون کی ہنسلی کا استخواں چھیدا   تخت کے روبرو دیا لٹکا

یک بیک تیغ چشت پہونچی آن   لگی کھانے کو چرخ ہوے عیاں

تخت کے آس پاس پھر پھر کر　　　چھتی شہ کو تھی دو کرے یکسر
خواجہ اس وقت دیکھ وہ شمشیر　　　شہ کو بولی ادیدھر تو آ رے چیر
نہیں تو یہ جفت کی جو تیغ ہے تیز　　　پل میں کرتی ہے اب ترا خوں ریز
سنتے ہی گرہ بڑا کے آیا شاہ　　　اوس کی تقصیر پر نہ رکھ کے نگاہ
آستیں کے اوسے پناہ میں لے　　　عیوض خون آستیں کو دے
جان پہ اپنی لے خفا و جفا　　　کیے دشمن سے بھی سلوک وفا

لکھا ہے کہ حضرت چراغ دہلوی نے فیروز تغلق کو تخت پر بٹھلایا تھا مگر سلطان فیروز کی شرطیں یہ تھیں کہ رعیت اور سپاہ کو مجھ سے ایذا نہ پہنچے، قحط اور امساک باراں سے ملک پاک رہے، قہر الٰہی نازل نہ ہو، آپ نے فرمایا کہ تیری دعا قبول ہوئی۔ پھر شیخ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت نشین کیا۔

کلیات ندا:۔ کتب خانہ بابائے اردو صدر انجمن ترقی اردو کراچی اس کے دو مخطوطات ہیں، دوسرا نسخہ مکمل ہے اس لیے کہ　　　اس میں مخمسات وغیرہ بھی ہیں۔ کلیات بلحاظ حروف تہجی مرتب ہوا ہے اس میں حسبِ ذیل غزلیں و مخمسات وغیرہ موجود ہیں:۔

ردیف		تعداد		ردیف		تعداد	
ردیف	الف	۶۶	غزلیں	ردیف	ص	۳	غزلیں
"	ب	۱۳	"	"	ض	۵	"
"	ت	۱۰	"	"	ط	۳	"
"	ث	۶	"	"	ظ	۳	"
"	ج	۸	"	"	ع	۲	"
"	چ	۵	"	"	غ	۲	"
"	ح	۵	"	"	ف	۹	"
"	خ	۳	"	"	ق	۶	"
"	د	۷	"	"	ک	۴	"
"	ذ	۱	"	"	ل	۱۱	"
"	ر	۱۵	"	"	م	۱۱	"
"	ز	۶	"	"	ن	۴۷	"
"	س	۳	"	"	و	۱۶	"
"	ش	۵	"	"	ھ	۱۱	"
				"	ی	۹۸	"
						۳۸۹	

مشمول: مخمسات ۵ - مسدسات ۸ - ترجیع بند ۲ - مرثیہ ۱ - ارگجا ردیف ۱ - پھول ردیف ۱ - جو زیادہ تر مناقب امام حسین اور خواجہ گیسو دراز پر مشتمل ہیں جس کے تقریباً تین ہزار اشعار ہیں - مخطوطہ کے صفحات ۳۵۲ اور سطر ۸ یا ۹ بیت ہے -

آغاز: مطلع ؎ حمد میں حق کے، میں مقدور زبان دیکھ لیا   نطق یاں گنگ ہے انسان [illegible] دیکھ لیا

مقطع ؎ سید اصغر علی خواجہ کا جو فرزند ہے خاص   اوس کے سائے میں ندا اھل [illegible] داماں دیکھ لیا

خاتمہ: ؎ فقر و فاقہ سکوت ہے ہم کو   ملک و دولت زر و زرینہ ہے

صفحہ اول و درمیانی و آخر میں مہر سید غلام محی الدین ۱۳۱۲ھ ثبت ہے -

انتخاب کلام شاہ ندا :-

جب سے تو میرے بسا جانِ جہاں جاں میں آ   نور علی نور بنا صورت انسان میں آ
منزلیں کاٹتے جاتے ہیں میرے لختِ جگر   دل سے آنکھوں سے، گریبان سے داماں میں آ

کیا کُن تھا جس میں یہ گُن تھے ہے کفر کہیں اسلام کہیں   اوس ایک سخن کا آج تلک طومار ملا افسانہ ہوا
اس دل کی میں کیا انگیز کہوں سو چاک ہو غم کے ارے   زلفوں کی گرہ پیچوں میں الجھ کھول عقدے سارے شانہ ہوا

تیرا تو ہی حجاب ہے پھر ڈھونڈتا ہے کیا   ذرہ میں آفتاب ہے پھر ڈھونڈتا ہے کیا
یک میم پردہ دار ہے اس رنگ محل کے بیچ   بنیا داب نقاب ہے پھر ڈھونڈتا ہے کیا
نقطہ لگا الف کو تو ہی کر دیا ہے دس   لاکھوں ہی کا حساب ہے پھر ڈھونڈتا ہے کیا

ہم ہیں قائم طریق پر اپنے   کوئی ادھر کوئی ادھر ہوا تو کیا
نہ زمیں آسماں سے ہے مطلب   زیر یہ، وہ زبر ہوا تو کیا

لاکھوں کروڑ نوع سے صنعت گری کی دھج   تو نے کیا ہے دیو و دد، انس و پری کی دھج
کیا کچھ لکھا طلسم ہے حفت القلم ستی   چہرے کو صاف، زلف میں کل ابتری کی دھج
یک نے سے لک نور ہے نمودار اے ندا   یک بات سے زباں کے گئی شاعری کی دھج

راگ پُر سوز کچھ ایسا تو سنا دے مطرب آگ باروت کے کوٹھے کو لگا دے مطرب
وجد میں آئے خودی چھوڑ ہر یک حال کے بیچ یاد مستوں کو سرود آج دلا دے مطرب
زاہداں جسم کی کرتے ہیں زیارت بحرم روح کی دھوم ضیافت تو مچا دے مطرب

(۳۹ الف)

تمام راتوں میں شب رات تھی، میں دیکھا ہوں زمیں تھی تخت، فلک چہرہ سر پہ مہ کا تاج

کیا سبب آنکھیں مری اُمڈی ہیں پیمانے کی طرح ٹوٹتا ہے دل جدا، سینہ میں مستانے کی طرح
کوئی خبر دیتا نہیں میری پری پیکر کی لا روز و شب اس جستجو میں گم ہوں دیوانے کی طرح

ہیں راز سیں مجھ دل کے محرم یہ قلم کاغذ رہتے ہیں اگر ظاہر ہمدم یہ قلم کاغذ
نقطے سیں سیاسی سے یہ نامہ سہ حرفی لکھ بھیجا ہے قاصد کو پیہم یہ قلم کاغذ
جب چاہ پڑی ہم کو نقطہ کی شہادت کی در ہم ہو گئے تب سے برہم یہ قلم کاغذ
قاصد مرا درپن سا خود بینی سے ہم زانو میں اس لیے رکھتا ہوں کم کم یہ قلم کاغذ
ناداں سے مجھے اِن سے ہے کام ندا دل میں ہے شیخ و برہمن کو اکرم یہ قلم کاغذ

جس کو شوق کمال ہے خالص اوس کا سب حال قال ہے خالص
زلف کا ہے جلال پیچا پیچ سادہ رو کا جمال ہے خالص

آئینہ گل کے آب ہو، سیماب بہہ چلے گر اوس کے رو برو، دم اللہ ہو کروں
مارا ہوا جمال کا آیا جلال میں کس طرح ایک دل ستی میں فکر دو کروں

گھڑی ہوئی تجھے جلتی تمام رات گئی اے شمع صبح ہوئی اب تو انجمن سے نکل
گرہ کشائی بہوت کی اُلک کے پیچوں میں تو شانہ وار بس اب زلف کی شکن سے نکل
زمیں کے فرش سے تا عرش سیر گاہ سمجھ وطن میں رہ کے نظر کی طرح نین سے نکل

مثنویہ :- سُنتے ہم کوئی جسم جاں بیچتے ہیں کدھر بیچتے ہیں کہاں بیچتے ہیں
نہ مکاں، نہ جنس دو کا نداری یہ دلال تالی زباں بیچتے ہیں
عجب بوالفضولاں ہیں باتوں ہی باتوں ہوا ہر زمیں آسماں بیچتے ہیں
نہ جانے مقام اور سمجھے نہ منزل مشیخت فلاں بن فلاں بیچتے ہیں
بساط بھر بھو کے کی ہے دم شہ جہاں کا سو ہستی کی ساری دوکاں بیچتے ہیں
چھٹا مغز چٹ کر گئے پختہ مغزاں یہ ناقص، تہی استخواں بیچتے ہیں
ندا بے بہا لعل پائے ہیں جو دل نہ یاں بیچتے ہیں نہ وہاں بیچتے ہیں

چمن سے نکہت گل لے صبا کی یاد آتی ہے مجھے بوئے عرق اوس گلبدن کی یاد و آتی ہے
لپٹ پہونچی تھی اوس زلف مشکیں کی غزالوں کو ختن سے دیکھئے کل آج کیا فریاد آتی ہے
ہوا کیا محتسب مسدود راہیں کر کے تکتا ہے کھلے بندوں یہاں بنت العنب آزاد آتی ہے
ندا آزادیوں کو دیکھ میرے صحنِ گلشن میں ہر اک کہنی ہوئی قمری مبارکباد آتی ہے

یہ گندم نما، جو فروشاں ہیں پکے دغل باز، عیار، جھوٹے اُچکے
نہیں اعتبار اون کے عہد و قسم کا نہ چھوڑیں خدی اپنی گرجائے سکے
عجب خیرہ باطن ہیں ظاہر پرستاں . درونہ سیہ اور موںھ پر جھلکے
حرم دیر میں، شیخ و برہمن ہیں قیدی لطافت وہاں سے جو نکلیں بھٹک گئے
جو غواص دریائے توحید حق ہیں یہ یہ و برو ہیں سب دیکھیں کے نمکے
کبھی ابر جوں اشک باراں ہیں عاشق کبھی بول اوٹھیں جیسے بجلی کڑکے
ندا دیکھ منصور سے کیا کیے ہیں نہ سن ناحق ان زاہدوں کے دھڑکے

مسدس :- ہے شریعت جوں پوست ظاہر کار اور طریقت ہے گوشت در اخبار
(۳۶ بند) یہ حقیقت ہے استخواں اے یار معرفت مغز ہے سُن اہل کمال

در شریعت ہر آنچہ ہست حلال
در طریقت ہمہ بود مردار

نہ سخاوت کی خو امیروں میں نہ قناعت کی بو فقیروں میں
نہ کرامت کشش ہے پیروں میں ورنہ یہاں دم ہلائے کس کی مجال

در شریعت ہر آنچہ ہست حلال الخ

ہیں بہتر فریق ایک کلام اس پہ لڑتے ہیں، ہوں ہیں خاص تو عام
غصہ کھاتے ہیں حق کہا، جو حرام من میں سب مکر و پیچ او چلا چال

در شریعت ہر آنچہ ہست حلال الخ

یہ شہادت کا سخت میداں ہے سر عاشق کو گوئے چوگاں ہے
سے لے چاروں طرف سے، ہاں ہاں ہے دم قدم اپنا ئے رہے، جی سنبھال

در شریعت ہر آنچہ ہست حلال
در طریقت ہمہ بود مردار

مسدس:-

کوئی عاشق اوس کے رو کا ہے کوئی زلف کے بستہ مو کا ہے
کوئی شمع پہ خود کو جھوکا ہے کوئی بلبل گل کی بو کا ہے

یہ سارا غفلت دھوکا ہے
کیا تنکا دریا روکا ہے

کوئی سات کہیں، کوئی پانچ کہیں کوئی جھوٹ کہیں کوئی سانچ کہیں
کوئی آگ کہیں کوئی آنچ کہیں کوئی ہانچہ کہیں کوئی نانچہ کہیں

یہ سارا غفلت دھوکا ہے

کوئی مرید اور کوئی پیر ہوا کوئی گدا ہوا کوئی میر ہوا
کوئی قوس ہوا کوئی تیر ہوا کوئی شاد، کوئی دلگیر ہوا

یہ سارا غفلت الخ

کوئی ڈھونڈنے جا کر کھوئے گیا کوئی کالک مونہ کی دھوئے گیا
کوئی کانٹے رہ میں بوئے گیا کوئی پھول چنا، خوش ہوئے گیا

یہ سارا غفلت الخ

کوئی نیا ہو بیت اللہ گیا کوئی بت خانے کی راہ گیا

کوئی غم سے کرتا آہ گیا　　کوئی قصہ کر، کوتاہ گیا

یہ سارا غفلت الخ

کوئی آتے ہیں کوئی جاتے ہیں　　کوئی کھوتے ہیں، کوئی پاتے ہیں
کوئی بھوکے ہیں کوئی کھاتے ہیں　　کوئی روئیں کوئی سمجھاتے ہیں

یہ سارا غفلت الخ

کوئی نفس جاہل توڑا ہے　　کوئی کامل اوس کو جوڑا ہے
کوئی اپنا کر کر چھوڑا ہے　　کوئی اوس کو بنایا گھوڑا ہے

یہ سارا غفلت الخ

کوئی دم پہ دم اللہ کریں　　کوئی دو دم میں یک راہ کریں
کوئی سرِّ خفی کی چاہ کریں　　کوئی ذکر جلی دلخواہ کریں

یہ سارا غفلت الخ

کوئی اُلٹے دیے پھیرے ہے　　کوئی حبس میں دل کو گھیرے ہے
کوئی کسب میں دل کو ہیرے ہے　　کوئی شغل کرے بھو تیرے ہے

یہ سارا غفلت الخ

کوئی تاگا کر زنار بندھے　　کوئی تسبیح میں دو تار بندھے
کوئی گوند کے گجرے ہار بندھے　　کوئی مخفی کوئی اظہار بندھے

یہ سارا غفلت الخ

کوئی کتاب پڑتے گنتے ہیں　　کوئی پتھی راگا سنتے ہیں
کوئی کھڑے ہوئے سر دھنتے ہیں　　کوئی بن میں تنکے چنتے ہیں

یہ سارا غفلت الخ

کوئی اُلٹے لٹک کر جیتے ہیں　　کوئی گوشے میں جا چھپتے ہیں
کوئی آسن ہو بھو کوں تپتے ہیں　　کوئی بحر و بر میں کھپتے ہیں

یہ سارا غفلت الخ

کوئی قائم مذہب ملت پہ　　کوئی ثابت اپنی طاعت پہ
کوئی نازاں حسن صورت پہ　　کوئی بیخود دنیا دولت پہ

یہ سارا غفلت الخ

کوئی دنیا تج درویش ہوئے کوئی بت کے جا درویش ہوئے
کوئی غیر کہے، کوئی خویش ہوئے کوئی عاشق کوئی دلریش ہوئے
یہ سارا غفلت الخ

کوئی حاکم ہو دربار کریں کوئی بنیے ہو بیوپار کریں
کوئی شوق زن گھر دار کریں کوئی زجوں میں تروار کریں
یہ سارا غفلت الخ

کوئی انبا اعظم شان کہیں کوئی جھبہ میں رحمان کہیں
کوئی مجھ پہ کھولا عرفان کہیں کوئی جان کوئی انجان کہیں
یہ سارا غفلت الخ

کوئی ندا بناکر بات کہیں کوئی نثر کوئی ابیات کہیں
کوئی نفی کوئی اثبات کہیں کوئی حاصل علم ذات کہیں

یہ سارا غفلت دھوکا ہے
کیا تنکا دریا روکا ہے

مرثیوں میں ندا کا صرف ایک مرثیہ، دوسرا ارگجہ، تیسرا پھول ہے۔ اور بس۔ آخرالذکر ایک جھوٹی معلوم ہوتی ہے ؎

ارگجا۔ پاک نیت صاف عقیدت کو ملا کر ارگجا اے محب لیتے چلو دھر اپنے سر پہ ارگجا
ہیں محرم کے دہے اب عرس ہے حسنین کا لیو گل تسلیم جن طبقوں سے اور پھر ارگجا
آہ کی شیرانی اور تانی فغاں کے دھوم سے پڑھتے مولود اور درودوں معطر ارگجا
ہو مدینہ اور نجف مشہد، عدن سیتی اور لے چلو تم کربلا کو یہ معتبر ارگجا
تربت انور پہ رو رو کر چھڑا شبیر کے باادب آہستہ یہ پھولوں کی چادر ارگجا
مانگ لیو اپنی مرادیں، جیوں ندا اس سیم میں لیو تبرک وہاں سیتیں خاک شفا اور ارگجا

عود پھول ؎

ہیں آج کربلا کے مسافر کے عود پھول شاہ شہیدا بے سر کے عود پھول
تشنہ رہیں غریب وطن، بے دفن کفن مظلوم رن دکشنہ و خنجر کے عود پھول
لوح و قلم و کرسی و عرش بریں لے لوگ کہتے ہیں آج جان پیمبر کے عود پھول

حضرت نبی علی وحسن فاطمہ کی رُوح آتے چڑھاتے قبر پو دلبر کے عود پھول
یا مومن و ہنود علم کرکے ایستاد نذر حسین جاتے ہیں لے کرکے عود پھول
جس جا ظہور امام کا ہو وہ زمیں توہیں جاتے ہیں لے کے شوق میں گھر گھر کے عود پھول
سینہ کو کر طبق اے ندا، دل کو عود سوز جا کربلا چڑھا دے ادب کرکے عود پھول

مسدس، در مدح منقبت خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ (۱۱ بند)

روز و شب ماہ و سال یا خواجہ تجھ سے ہے عرض حال یا خواجہ
اپنا بتلا جمال یا خواجہ فکر دل سے نکال یا خواجہ
ہے مرا یہ سوال یا خواجہ

زندگی کا نیٹ بکھیڑا ہے فکر کا دل پو سخت بیڑا ہے
جس کو دیکھوں تو مجھ سے ٹیڑا ہے ہیں تمارے بجز نبیڑا ہے
ہم کو لینا سنبھال یا خواجہ

ہے فلک سخت ادا مجھ سے بغض رکھتا ہے بوفا مجھ سے
کیا چھپتا ہے وہ دغا مجھ سے پھر گئے دوست آشنا مجھ سے
تو یہ آفت کو ٹال یا خواجہ

وارث تخت شاہ علی اصغر معرفت کا ہے جس کے سر افسر
تیری اولاد خاص کا سرور دین و دنیا کا بے شبہ رہبر
سالک بےمثل ہے یا خواجہ

اے ندا یہ جو پیر میرا ہے خواجہ دستگیر میرا ہے
بندہ میں وہ امیر میرا ہے مرشد بے نظیر میرا ہے
عمر اوس کی ہو طال یا خواجہ

چومصرعہ: ولہ، دکنی ترکیب یہ لطف ہے ؎

تم کو کوئی نوری کہتے سید حسینی شاہ باز
ہیں حق سے کچھ دوری کہتے سید حسینی شاہ باز
تو رب میں، تجھ میں رب کہتے تو سب میں، تجھ میں سب کہتے
عارف کوئی صاحب کہتے سید حسینی شاہ باز

کوئی نور حق ذاتی کہتے۔ احمد کا کوئی نامی کہتے
آخر کا کوئی ساقی کہتے سید حسینی شاہ باز
کوئی ولی اکبر کہتے اوسط محمد کر کہتے
کوئی قطب کا اختر کہتے سید حسینی شاہ باز
محشر کا کوئی حامی کہتے کوثر کا کوئی جامی کہتے
کوئی اولیا نامی کہتے سید حسینی شاہ باز
سب اولیا خواجہ کہتے سب اصفیا راجہ کہتے
فایق ترا درجہ کہتے سید حسینی شاہ باز
دست ید اللہی کہتے سب اس پہ آگاہی کہتے
چاہے تو دے شاہی کہتے سید حسینی شاہ باز
مشکل کے دن یاور کہتے کوئی مفلساں پرور کہتے
کوئی دوست زور آور کہتے سید حسینی شاہ باز
عالی تیری درگہ کہتے کوئی عرش گلبرگہ کہتے
قبلہ کوئی کعبہ کہتے سید حسینی شاہ باز

ماخذ

برھاخاں ہانڈی، تزک والاجاہی (قلمی کتب خانہ آصفیہ)
تجلی علی شاہ، خزینۂ سخن (مجموعۂ فصاحت) قلمی (آصفیہ کتب خانہ۔ حیدرآباد، دکن)
جہاں نما علی شاہ: تاریخ محمدیہ، حالات خاندان خواجہ سید محمد گیسو دراز قدس سرہٗ
حکیم قدرت اللہ قاسم: مجموعۂ نغز مطبوعہ
غلام محمد ندا: مثنوی جذبات محمدی، مخطوطات، کتب خانہ آصفیہ، جامعہ عثمانیہ و انجمن ترقی اردو ہند
کلیات و دیوان شاہ ندا: (کتب خانہ انجمن ترقی اردو، کراچی
نصیر الدین ہاشمی سید: فہرست توضیحی کتب خانہ سالار جنگ بہادر مطبوعہ
رسالہ تاریخ ماہ ستمبر و دسمبر ۱۹۳۱ء: مرتبہ حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم حیدرآبادی

عابد رضا بیدار

دیوان تسکین کا غلط نامہ

دیوان تسکین (میر حسین تسکین) جو "اردو ادب" کے ۱۹۶۵ء کے تیسرے شمارے میں شائع ہوا ہے اس میں بعض اہم بعض غیر اہم اغلاط رہ گئے ہیں۔ اغلاط میں موٹی غلطیوں کے علاوہ نقطے، لفظوں کے درمیان فاصلہ، مد وغیرہ بھی شامل ہیں پورے پورے شعر درج کیے دے رہا ہوں اور غلطی کے اوپر لکیر کھینچ دی ہے۔ اس مضمون کے قارئین براہ کرم تصحیح فرما لیں اصل اہمیت اسی لکیر والے لفظ کی ہے۔

۱۔ بدحواسی ہجر کی شب کی ہے چہرے پر عیاں — کیا ارادہ ہے خدا جانے ترے مہجور کا

۲۔ بات کرنے میں ہے ہر دم جو حجاب آئینہ — دیکھتا کیا ہے، مجھے بھی تو، خود آرا، دکھلا

۴۔ دیکھیں کیا میری طرف، یاد ہیں ان کو اپنی — چشمکیں غیر سے کرنیں، مجھے دکھلا دکھلا

۱۱۔ ہجر کی شب میں نہ آئے گی تو کیا ہوئے گا — کام ہم سے بھی کبھی، تجھ کو قضا، ہوئے گا

۱۲ اب جدائی میں جاں گئی اپنی — عشق ناساز گار تھا کیسا

۱۳۔ مر جائیں گے ہم اور کسی طرح شب ہجر — گر موت کا کچھ تجھ سے سرانجام نہ ہوگا

۱۴۔ ربط اپنے دکھانے کو مجھے غیر — نام سے آپ کے بلا لایا

۱۵۔ دیا دل کس کی قامت پر کسے سرو رواں باندھا — یہ بہتاں تونے مجھ پہ بگینہ اے بدگماں باندھا

۱۶۔ زلف پُر خم سے کہو اس کی یہ پیچش ہے عبث — اس کے بل کھانے سے پہلے مجھ کو سودا ہو چکا

۱۷۔ رحم کس کو دم فریاد آیا — مجھ کو نالے کا اثر یاد آیا

۱۸۔ بھول جائیں گے وہ اغیار کو ہیں — مر گئے پر بھی اگر یاد آیا

۳۶۔ گیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو — فضائے کوچۂ لیلیٰ کو اس نے تنگ ٹھہرایا

۵۱۔ سب ہیں حاضر، آؤ دم کو، جو پسند آئے سو تو — جان و دل، صبر و تحمل، دین دامیاں دیکھ کر

۵۔ ہے دل بھی کیا متاع کہ لینے کے واسطے — گلشن نے عندلیب کو کیا کیا دکھائے گل

۵۹۔ اس گل کی اے صبا ہمیں لا دے ابھی خبر — جاتے ہیں ورنہ خاک اڑاتے چمن میں ہم

۵۔ بھولے ہیں اپنے آپ کو فکر سخن میں ہم — عزت سخن سے پائیں نہ کیوں انجمن میں ہم

۶۔ ہر خار گو، ہے دشت میں، نشتر سے کم نہیں — ہوتا جنوں کا جوش مرے سر سے کم نہیں

۶۔ کر بحر و بر کی ہستی موہوم پر نظر — تھوڑی سی خاک ڈال دے چشم پر آب میں

۶۱۔ ایسی ہے غیر کی خاطر کہ مرے حال کو سن   دل میں روتے ہیں یہ ظاہر میں ہنسے دیتے ہیں

۸۰۔ روتی ہے مجھ کو دیکھ کر چشم تر کو کیا کہوں   وہ بھی آتا تھا پسند اپنی نظر کو کیا کروں

۸۵۔ دھوم ہے میری سخت جانی کی   تیز کر لو تم اپنے خنجر کو

۸۶۔ اے چشم اشکبار ذرا دیکھنے تو دے   ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

۸۶۔ یہ آرزو ہے جائے ذرا تجھ سے پہلے جان   کہتا ہے کون، وصل کی شب میں سحر نہ ہو

۸۷۔ طرح طرح سے بُرا اس کو کہتے ہیں واعظ   سنگھاؤں گا کبھی حضرت کو میں شراب کی بو

۸۸۔ پھر مزے یاد کر کے روؤں گا   کیوں مجھے تم ہنسائے جاتے ہو

۹۰۔ اک اک سے کہہ چکا ہوں ستم اس کے قہر ہیں   اس پر بھی اس کی غیر کو الفت ہوئی تو ہو

۹۲۔ وہم آتا ہے مٹا کر خط پیشانی ہائے   اس میں لکھا نہ ہو اس در کی جبیں سائی کو

۹۳۔ مجھ بیگنہ کے قتل پہ گر ہے خوشیٔ غیر   ظالم تو میرے واسطے اندوہ گیں نہ ہو

۹۹۔ خط بھیجنے کا قصد کوئی واں اگر کرے   تو پہلے چارۂ نظر نامہ بر کرے

۱۱۰۔ تسکین مجھے اس سرکی قسم کچھ نہیں معلوم   کیا کرتے ہیں الفت کے لیے کیا نہیں کرتے

۱۱۳۔ مزے یہ دیکھے ہیں آغاز عشق میں تسکین   کہ سوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

۱۱۴۔ تمھیں اغیار ہیں، دیکھو تو کیسا بے وفا سمجھے   مجھے کہتے ہیں کیا دیکھا جو اس کو آشنا سمجھے

۱۱۵۔ ناز سے کہتے ہیں وہ مجھ سے یہ تسکین بتلا   آئینہ کیوں مری جانب نگراں رہتا ہے

۱۱۶۔ بادہ خواری نے کیا ہے مرا وہ حال خراب   کہ مغاں بھی ہیں مجھے دیکھ کے توبہ کرتے

۱۱۸۔ آزردہ ان کو دیکھتے ہی جاں نکل گئی   وہ دیکھ مجھ کو رہ گئے تلوار کھینچے

۱۱۹۔ انصاف کر خراب نہ پھرتا میں در بدر   ملتی جو تیرے گوشۂ خاطر میں جا مجھے

۱۲۶۔ خونچکاں ہیں ترے دیواں کے مضامیں تسکین   رشتۂ جان عدو چاہیے مسطر کے لیے

۱۳۲۔ وہاں پہ ٹھہری ہے کہ ملیے عاشق دلگیر سے   بوالہوس یوں ہی خوشی ہے آہ بے تاثیر سے

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اُردو ادب

اڈیٹر
پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

۱۹۶۶ء

شمارہ (۲)

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ دس روپے
قیمت فی پرچہ دو روپے ۵۰ پیسے

کتابت ابو طاہر زیدی

سید ضیاء علی پرنٹر و پبلشر نے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر علی گڑھ سے شائع کیا

اردو ادب

فہرست مضامین

راجیندر نرائن بسمل

جگر بریلوی کی غزل

غزل سے اے جگر اندازہ کر میری طبیعت کا
غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہے

شاعری کی تعریف میں اکثر لوگ بعض حکیموں اور مفکروں کے اقوال پیش کیا کرتے ہیں۔ میں اس طرح اس مضمون کی ابتدا کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ سب اپنی اپنی سی کہتے ہیں۔ شاذ ہی کہیں متفق ہوں۔ دوسرے یہ کہ تمام اہل ذوق فی الجملہ جانتے ہیں کہ شاعری کیا ہے اور شاعر کیا۔ جگر صاحب شاعر بھی ہیں۔ مفکر بھی اور نقاد بھی انھوں نے شاعری کا جو مفہوم سمجھا ہے یہاں اسی کا پیش کرنا مناسب مقام ہے۔ ان کا نظریہ ایک شعر اور ایک جملے میں منضبط ہے ؎

شعر ہے ایک جذبۂ موزوں　　　شاعری دل کی ترجمانی ہے

کلام جوؔیا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-
"شاعری مصوری اور موسیقی کا لطیف مجموعہ ہے۔"

میرے خیال سے ایک شعر اور ایک جملے میں وہ کچھ کہہ دیا گیا ہے جو شاعری کی تمام تعریفوں اور بڑے بڑے تبصروں پر حاوی ہے۔ سنہ ۲۳ء میں انھوں نے رسالہ "زمانہ" میں ایک مضمون "فلسفۂ غزل" سپرد قلم کیا تھا۔ اس میں شاعری کی مفصل تحلیل کے بعد شاعر کے اجزا ترکیبی تین قائم کیے تھے۔ بچوں کی سی معصومیت۔ عاشق کا دل اور فلسفی کا دماغ۔ اوپر کی چند سطروں میں شاعری کا جو خلاصہ پیش کیا گیا کسی کے کلام کی تنقید کے لیے وہ نہایت مکمل نظریات قائم کرتا ہے۔ اصناف شعر

---

[1] میں نے اس مضمون کی تکمیل میں جگر صاحب کی خود نوشت سوانح عمری "حدیث خودی" سے بہت مدد حاصل کی ہے اور بعض نازک پہلوؤں پر خود جگر صاحب سے مفصل مشورے کیے ہیں۔

میدان صرف غزل کے لیے تنگ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کا دائرہ بہت محدود ہے جیسے غالب کہتے ہیں

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

میرا خیال ہے کہ مثنوی کو چھوڑ کر اظہارِ خیالات و تاثرات کے لیے غزل میں بھی بہت وسعت ہے جس کا اردو غزل کا مطالعہ اچھی طرح ثابت بھی کرتا ہے۔ البتہ غزل کی زبان پیدا کرنا مشکل ہے۔ غزل پر کتنے دور گزر چکے ہیں۔ ہر دور کے ممتاز غزل گویوں پر نظر ڈالیے کس قدر متنوع رنگ پیش کرتے ہیں۔ میر، سودا۔ مومن۔ ذوق۔ غالب۔ داغ۔ مصحفی۔ آتش۔ ناسخ۔ جلال۔ امیر۔ نظیر سب علحدہ علحدہ انفرادی طرزوں کے مالک ہیں۔ اگر میر کا سوز وگداز، نرمی اور لوچ اس کے خصوصیات میں داخل ہیں تو مومن کی تاثراتی موشگافیاں۔ غالب کے فلسفیانہ نکات اور اغلاق و ابہام کو بھی اس نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ داغ کے بازاری حسن و عشق کے معاملات اور ناسخ کی خارجیت بھی اسی میں داخل ہے۔ ان کے بعد جو غزل گو آئے وہ بھی اپنے اپنے انداز رکھتے ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور غزل کے تمام دفتر پر نظر ڈالنے سے متحقق و متعین ہوتی ہے وہ یہ کہ صنف حسن و عشق کی کرشمہ سازی کے لیے موزوں ہی نہیں مخصوص بھی ہے جیسا اس کے لغوی معنی کا تقاضا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں "عورتوں سے بات کرنا" حسن و عشق کے معاملات کے اظہار کے لیے اسے مبصروں نے محدود بھی رکھا ہے۔ چوں کہ حسن کی کرشمہ سازیاں لامحدود ہیں۔ یہ دل میں عشق کی چنگاری لگا کر اُسے کہیں شعلہ، کہیں انگارا کہیں بجلی بنا دیتا ہے اس دل کو جس کی وسعت بھی لامحدود ہے۔ اس لیے غزل کا میدان بھی بے انتہا وسیع ہے۔ رواں اناوی مرحوم نے بالکل صحیح فرمایا ہے :-

اللہ اللہ! یہ ہے وسعتِ دامانِ غزل　　ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل
گل و بلبل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل　　پوچھیے حافظ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اس میں

ایک رُخ اردو غزل کی حقیقت کا یہ ہے۔ دوسرا رخ بہت تاریک ہے۔ اس کے سرمایہ کا اکثر و بیشتر حصہ وہی ہے جو ہزار بار دہرایا گیا ہے۔ جس میں سوقیت، ابتذال اور ہوس کارانہ جذبات انگیزی کی بھرمار ہے ایسے مقامات کی بھی کمی نہیں جہاں اخلاق و تہذیب کی آنکھیں بالکل بند ہو جاتی ہیں۔ ایک زمانہ میں غزل کلیتہً ذیل کے شعر کا چربہ بن کر رہ گئی تھی ؎

خواہش کا نام عشق، نمائش کا نام حسن　　اہلِ ہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

چناں چہ حالی نے لکھا ہے ؎

غزل اور قصیدے کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بڑھ کر
اور پروفیسر کلیم الدین نے اسے عہدِ بربریت کی یادگار قرار دیا ہے۔ غزل کے اسی تاریک پہلو کے
باعث ایک اور ایسا اعتراض وارد ہوتا ہے جو اٹھائے نہیں اٹھتا یعنی شریف گھرانے کی مستورات اس کا
مطالعہ نہیں کر سکتیں۔

یہاں ہمیں جگر صاحب کی غزل کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس میں کتنا روشن پہلو ہے اور کتنا
تاریک۔ انھوں نے اپنی مختصر مطبوعہ سوانح عمری "حدیثِ خودی" میں اپنی غزل پر خود تبصرہ کیا ہے۔ اس سے
ان کے کلام کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ اور اس کے پرکھنے میں بہت مدد ملتی ہے لیکن بہت سی
باتیں اس میں محض ضمناً یا مجملاً آئی ہیں اور یہ بہت اہم ہونے کی حیثیت سے وضاحت کی محتاج ہیں۔ اہم
اس اعتبار سے کہ جگر صاحب کے ذہن و فکر کی رسائی اور اُن کے جمالیاتی تصورات کی وسعتوں اور حدود
کا پورا پورا اندازہ ہو سکے۔ اس کے لیے ہمیں انھیں کے تبصرے کو رہنما بنائے بغیر کام نہیں چل سکتا۔
"حدیثِ خودی" میں صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں :-

"کسی کے کلام میں دو باتیں دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ کیا کہا گیا اور کس انداز سے کہا گیا۔ دونوں
نہایت وسیع بحث کی طالب ہیں۔ میں صرف پہلی بات کو لیتا ہوں یعنی میں نے کیا کہا۔ دوسری
بحث ایک جملے میں ختم ہے۔ اگر انداز میں اثر ہے تو سب کچھ ہے۔"

شاعری کی کتنی ہی تعریفیں کی گئی ہوں اب تک سب کا لب لباب یہی ہے یعنی اگر شعر میں اثر ہے
تو اس میں سب کچھ ہے ؎

شعر در اصل ہیں وہی حسرتؔ سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

اسی صفحہ پہ آگے لکھتے ہیں :-

"شاعر[۱] وہی کہتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں ہوتا ہے۔ دو چیزیں انسان میں ہیں ظاہر و باطن

---

[۱] جگر صاحب نے شاعر کا بے نظیر آدرش پیش کیا اور اُسے اپنی ذات سے قائم بھی رکھا ہے۔ اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے
ہم یہاں ان کی نظم "شاعر" پیش کر دینا عین مقتضائے مقام سمجھتے ہیں :-

(شاعر)

یہ کیا بتاؤں کسی کو میں کون ہوں کیا ہوں نظر تو آتا ہوں لیکن سمجھ سے بالا ہوں
ملا ہے حسنِ حقیقت خمیر میں میرے بھرا ہے نورِ تجلی ضمیر میں میرے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

ظاہر باطن کا مظہر ہے باطن ظاہر کا مرکز۔ ظاہر سے مراد کردار یعنی اعمال و افعال جن میں بچپن سے
حالات و واقعاتِ زندگی سے لے کر اٹھنا بیٹھنا۔ کھانا پینا۔ چلنا پھرنا۔ بولنا چپ رہنا۔ رہن سہن
عادات و خصائل۔ وضع قطع سب کچھ شامل ہے ... کردار سے کسی تصنیف کے محاسن و معائب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷)

حریم قدس کی قندیل ہے دماغ مرا — "چراغِ جلوۂ بے رنگ ہے چراغ مرا
ملی ہے دل کی جگہ برق بے قرار مجھے — بنا دیا غمِ عالم کا سوگوار مجھے
جو کوئی روئے تو میں زار زار روتا ہوں — ہنسے جو کوئی تو میں شاد کام ہوتا ہوں
جو شب کو اشک مری آنکھ سے ٹپکتا ہے — سحر کو مہرِ فلک بن کے وہ چمکتا ہے
بلند عرش بریں سے بھی ہے نظر میری — محیط ہر دو سرا فکرِ مختصر میری
مری کتاب ہے تفسیر رازِ فطرت کی — مری حدیث ہے تعبیر رمزِ وحدت کی
بجز حبیب مجھے کچھ نظر نہیں آتا — سوائے حسن پرستی ہنر نہیں آتا
امین رازِ محبت ہوں روزِ اوّل سے — کیے ہوں دہر کو روشن وفا کی مشعل سے
فراق و وصل کا میرے جہاں میں نام نہیں — سوائے سوز مجھے عاشقی سے کام نہیں
شرابِ میکدۂ عشق ہے شباب مرا — غروب ہو نہیں سکتا ہے آفتاب مرا
حریفِ حسن ہے داغِ دلِ حزیں میرا — جمالِ دوست کا آئینہ ہے نگیں میرا
وفورِ حزن سے گو چاک چاک دل ہے مرا — بہ ربِ عشق تمنا سے پاک دل ہے مرا
فرشتے بھی مری معصومیت پہ نازاں ہیں — مرے خیال کے جلوے بنائے ایماں ہیں
ہمیشہ محو خود آرائیوں میں رہتا ہوں — مقامِ دل کو میں آئینہ خانہ کہتا ہوں
وقار کے لیے ممنون ہے بشر میرا — کہ دیر و کعبہ میں جھکتا نہیں ہے سر میرا
نماز و سجدہ کی یہ منتہائے منزل ہے — سرِ نیاز ہے اور آستانۂ دل ہے
نفس نفس ہے مرا صوتِ سرمدی کا ساز — نہاں ہے میرے ترنم میں غیب کی آواز
غم و الم میں مرے نوحے وجہ تسکیں ہیں — وفورِ عیش میں نغمات حسرت آگیں ہیں
مرے سرور سے عالم میں کیف و مستی ہے — مرے نشاط کی محتاج بزمِ ہستی ہے

جگر ہے نام۔ غمِ عشق کا اسیر ہوں میں
جو بے نیاز دو عالم ہے وہ فقیر ہوں میں

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

میں وہ حسن سمجھ میں آجاتے ہیں تصنیف سے کردار کے۔ کتنا ہی کوئی مصنف تصنیف میں اپنے کردار سے کچھ اور نمایاں ہونے کی کوشش کرے پردہ کھل ہی جاتا ہے۔"

کچھ لوگ شاعری کو محض تخیّلی چیز سمجھتے ہیں۔ جگر صاحب نے تخیّل سے تخلیق کا کام نہیں لیا ہے تعمیر کا کام لیا ہے۔ جگر صاحب نے اپنی اس سوانح عمری میں اپنے کردار پر روشنی ڈالی ہے مگر مختصر اور بعض پہلوؤں کی طرف صرف اشارے کرکے چھوڑ دیے ہیں۔ مثلاً اپنی ازدواجی زندگی اور وہ غیر معمولی باتیں جن پر انھوں نے انگریزی میں دو سو صفحات کی کتاب "MYSTERIES OF MY MIND" کے نام سے لکھی ہے "حدیث خودی" میں ان پر چند ہی جملے لکھے ہیں۔ ہمیں اس تمام سرمائے کی روشنی میں جگر صاحب کی غزل کا جائزہ لینا ہے۔ کیوں کہ بقول ان کے (حدیث خودی صفحہ ۱۰۱) "غزل کی بنیاد سرتا سر طبیعت ہے۔"

جگر صاحب کے مزاج اور طبیعت کے عناصر تلاش کرنے سے پہلے اس ماحول کا نقشہ دیکھنا چاہیے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی "حدیث خودی" صفحہ ۳۶، ۳۷:۔

"آمدنی وافر تھی۔ امرا کا سا رہن سہن، ساز و سامان، کارندے، نوکر چاکر، گھوڑے گاڑیاں سبھی کچھ ٹھاٹ کی شان و اہتمام کے ساتھ تقریبیں اور تیوہار منائے جاتے تھے۔"

اس ماحول کے ساتھ ساتھ دولت علم کی بھی کمی نہیں تھی۔ آپ کے دادا انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت میں منتہی تھے اور والد انگریزی اور فارسی کے جیّد عالم۔ جگر صاحب اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں (حدیث خودی صفحہ ۳۹، ۴۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) جس شخص نے اپنی ذات سے شاعر کا یہ آدرش قائم کیا وہ شاعر سے بڑی کوئی ہستی دنیا میں ہرگز تسلیم نہیں کرسکتا۔ جگر صاحب کہتے ہیں:۔

رباعی

شاعر سے بڑی زمیں پہ ہستی ہی نہیں — اس کی سی کہیں نشاط و مستی ہی نہیں
شاعر ہو کر غرض کسی سے رکھنا — ذلّت نہیں، اس سے بڑھ کے پستی ہی نہیں

ایضاً

شاعر شاعر ہے گر تو یکتا ہے وہ — خضر رہ و رسم دین و دنیا ہے وہ
ہے اس کا وقار نفس، گیتی کا وقار — جان و دل کائنات تنہا ہے وہ

یہاں دوسری رباعی کا دوسرا اور چوتھا مصرع جگر صاحب کے اس قول کا ثبوت ہیں ع

محیط ہر دو سرا فکر مختصر میری

"آپ کی طبیعت سادگی، سچائی، خلوص و صفا کی طرف مائل تھی جسے تصوف کا خمیر کہہ سکتے ہیں۔ ہوش سنبھالنے پر صوفیائے کرام کی تصانیف کے مطالعے اور لکھنؤ کے باکمالوں کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ تصوف کا غلبہ بڑھتا گیا تا آنکہ ہر نفس عبادت میں گزرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس مرتبہ و مقام پر پہنچے جسے ولایت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

جگر صاحب اسی باعظمت ہستی کے جگر گوشے ہیں۔ صفحہ ۷۴ پر لکھتے ہیں:-

"میں نے ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج بریلی سے بی۔ اے پاس کیا۔ فارسی، انگریزی اور فلسفے میں علم و ادب کا ذوق بچپن سے تھا۔ دل و دماغ کی نشو و نما والد آنجہانی کے زیر سایہ ہوئی۔ آپ کی زندگی میں جو رفعت و لطافت و پاکیزگی تھی اور زندگی کا جو معیار اس سے قائم تھا اس کا ذکر کیا جا چکا۔ اپنے بچوں کے اوضاع و اطوار اور ادب و آداب کی حفاظت و نگرانی۔ ان کی صحیح تربیت و تہذیب ہر وقت ملحوظ خاطر اقدس رہتی تھی۔ مکان کے پھاٹک کے باہر قدم نہیں رکھنے دیتے تھے۔ حد یہ تھی کہ اپنے کنبے والوں کے یہاں بھی بیاہ برات یا کسی بھی تقریب میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک میں نے یہی نہیں جانا کہ ریل کا سفر کیسا ہوتا ہے۔"

آپ کے والد کی زندگی کا پہلا اصول تھا ؎

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن   کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

یہی اپنے بچوں کے لیے ہدایت تھی۔ دوسرا اصول وقار نفس کا پاس تھا۔ جگر صاحب لکھتے ہیں ح ۔ خ صفحہ ۹۴ "خودداری میں آپ کی نظیر آج تک میری نظر سے نہیں گزری" اپنی غیر مطبوعہ مفصل سوانح عمری "خواب پریشاں" میں اپنے والد کے سلسلے میں جگر صاحب لکھتے ہیں:-

"غرض ہر لمحہ راستبازی، خودداری، تواضع اور نکوکاری کی تعلیم و تلقین رہتی تھی بچپنے سے ایشور بھگتی کی تعلیم دیتے تھے۔ رات کو جب استراحت فرماتے مجھے اور مجھ سے بڑے بھائی صاحب کو ہم دونوں آپ کے پاس ہی لیٹتے تھے، رام نام کا ورد کراتے جب تک ہمیں نیند نہ آجاتی اور نیچے دیے ہوئے جیسے اشعار[1] یاد کراتے ؎

تا ابد یارب ز تو من لطفہا دارم امید   گر ز تو امید ببرم از کجا دارم امید

ارباب حاجتیم زبان سوال نیست   در حضرت کریم تقاضا چہ حاجت است

---

[1] یہ میراث پدر تھی۔ آپ کے والد مرحوم میں ملکۂ شاعری بھی ودیعت تھا۔

اپنی والدہ مرحومہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کے عادات واطوار پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔
یہ تھا وہ ماحول جس میں تربیت ہوئی۔ ایک مبصر نے اس سے کچھ نکالا ہے۔ دوسرے نے بالکل برعکس۔
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "حدیث خودی" کے مقدمہ میں صفحہ ۱۳۰ پر لکھتے ہیں:۔

"اس کڑی نگہداشت سے بچے بُری صحبت سے تو دُور رہے لیکن اس رس سے محروم ہوگئے جو شخصیت کی بھرپور نشو ونما کے لیے ضروری ہے۔ بچے جو فطرتاً چڑیوں کے چہچہوں کی طرح آزاد ہوتے ہیں گھر کی چہار دیواری میں مقید ہوکر رہ گئے۔"

اسی نگہداشت کے متعلق مولانا نیاز فتحپوری "نگار" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں لکھتے ہیں:۔

"جگر بریلوی اس عہد کے انسان ہیں جب زندگی نام تھا چین سے رہنے اور دوسروں کو چین سے رہنے دینے کا۔ اس سے زیادہ چنیں چناں کرنے والوں کو کچھ اور سمجھا جاتا تھا۔ جگر کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی اور اسی ماحول کو وہ اپنی شاعری میں لے گئے۔ سادگی، خلوص، لطف و راحت کی فضا میں وہ پروان چڑھے اور یہی ان کی وضع ہوگئی جسے وہ آج تک نبھا رہے ہیں یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی ان کی اسی فطرت کا آئینہ ہے۔" "انھوں نے جس سادگی سے اپنے حالات لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے مبارک زمانہ میں پیدا ہوئے۔ کتنا اچھا ماحول انھیں ملا اور کتنی اچھی تربیت ذہن و فکر انھیں میسر آئی۔ دنیا انھیں صرف ایک اچھا شاعر جانتی ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اچھے انسان بھی ہیں۔ اتنے اچھے کہ اس زمانے میں اس کا تصور بھی گویا محض تصور خواب ہے۔ خدا انھیں زندہ وسلامت رکھے۔"

ڈاکٹر نارنگ نے بعض جدید مغربی مفکرین کے نظریوں کے مطابق آزادی کو مقدم سمجھ کر اپنی رائے لکھی اور نیاز صاحب نے زندگی کے مشرقی آدرش کے مطابق انسانیت کو مقدم سمجھا۔

اس پدرانہ نگہداشت اور تادیب کے ساتھ ساتھ قدرت نے بھی جگر صاحب کے مزاج کی تہذیب اور پستی اور اس کو مکمل کرنے میں خوب خوب حصہ لیا۔ تمول کی ساری بساط الٹ گئی۔ "حدیث خودی" کے صفحہ ۴۰ پر لکھتے ہیں:۔

"الہ آباد ہائی کورٹ سے آپ کو کامیابی[1] ہوئی۔ پریوی کونسل سے ناکامیابی۔ اب ۱۹۱۶ء تھا مصائب و آلام کا دروازہ کھل گیا۔ غم و اندوہ، تباہی و بربادی کی داستان روح فرسا ہے۔ وہ سیلاب آیا کہ گاؤں گراؤں، مکانات، بنگلے، گھر کا ساز و سامان سب ہی بہالے گیا۔ جب کچھ نہ رہا عزت و آبرو پہ حملے ہونے لگے۔"

---

[1] یہ ایک مقدمہ تھا تمام جائداد کے متعلق جو آپ کے والد اور اُن کے بھائیوں کے درمیان ۱۹۰۹ء سے چل رہا تھا۔

۱۹۰۱ء کے بعد سے جگر صاحب کی زندگی ۱۹۱۱ء تک اسی روح فرسا کشمکش میں گزری۔ اسی دوران میں ایک دیوانی کے مقدمہ کا یہ شاخسانہ نکلا کہ جگر صاحب دیوانی کے چپراسی کو زدوکوب کرنے کے جرم میں کالج سے کچہری سے وارنٹ پر گرفتار کر کے تھانے لائے گئے۔ اس کے متعلق صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں :۔

"اب کنور صاحب[1] گرفتار ہو کر تھانے چلے ... کالج سے کوہاڑ اپیر کی پولیس چوکی کم و بیش دو میل ہوگی۔ آگے آگے کانسٹبل اور پیچھے پیچھے کنور صاحب ملزم بنے ہوئے سر جھکائے قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ بازار سے نکلا تو معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جانب کے دوکاندار مجھ پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی جو حالت تھی اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ہر قدم پر دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں دفن ہو جاؤں۔"

اس کے بعد ۱۹۱۱ء سے نائب تحصیلدار ہو کر سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے۔ جو شخص ایسے باپ کا بیٹا ہو جیسے جگر صاحب کے اور جو ایسے ماحول میں پلا ہو جو جگر صاحب کو میسر آیا۔ عہد برطانیہ کی کیا کوئی بھی ملازمت اُسے کب راس آسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۲ء میں قبل از وقت نائب تحصیلداری ہی سے پنشن لینے پر مجبور ہو گئے "حدیث خودی" صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں :۔

"ملازمت راس نہ آئی۔ ظاہراً اس کے اسباب یہ تھے۔ اول یہ کہ اپنے حقوق کے مطالبہ کرنے میں کسی کی سعی و سفارش تلاش کرنے کا خیال تو دور، خوشامدانہ لب و لہجہ سے بھی مجھے عار رہا۔ ضمیر فروشی ہوئی نہیں۔ آزادانہ رائے کے اظہار میں کبھی باک نہ ہوا۔ اکثر کلکٹروں کے منشا بلکہ علانیہ حکم کے خلاف اپنی رائے کے اظہار پر مجبور ہو گیا۔ ملازمت میرے لیے راحت کا گہوارہ کیوں کر بن سکتی تھی۔ میں اس میں کیا پھل پھول سکتا تھا۔ میرے لیے یہ دور مسلسل آزمایش کا دور تھا۔"

آگے صفحہ ۵۸ پر لکھتے ہیں :۔

"میں ملازمت سے دل برداشتہ ہی نہیں واقعی بیزار تھا۔ یہ مجھ سے کیوں کر موافقت کر سکتی تھی۔ چند ہی سال بعد سے اس کی اذیتوں سے روح گھلنے لگی تھی۔ آخر جب مجھے نور نظر نامی[2] کو اجل آئی اور میرے منہ سے چیخ اور آنکھوں سے آنسو نکلے بے اختیار یہ دعا بھی لب پہ آگئی۔ پروردگار اب مجھے ملازمت کی لعنت سے بھی نجات دے دے۔"

یہ دعا قبول ہوئی اور ان کی صحت ایسی گبڑی کہ پھر ملازمت پر نہ جا سکے۔ پنشن لینا پڑی۔ لیکن جو دو یہ

---

[1] لوگ ان کو اور ان کے بھائیوں کو عام طور سے "کنور صاحب" کہا کرتے تھے اور ان کے والد رائے صاحب کہلاتے تھے اسلیے کہ دادا رائے بہادر تھے۔

[2] جگر صاحب کا انیس سال کا لخت جگر جو ۲۶ دسمبر ۱۹۳۲ء کو دو گھنٹے کی علالت میں دفعتاً انتقال کر گیا۔

آزمائش شروع ہوا تھا ان کے بیٹے کی موت اور ملازمت ختم ہو جانے سے ختم نہیں ہو گیا بلکہ برابر جاری رہا اور ہے "حدیث خودی" صفحہ ۵۹ پر لکھتے ہیں :-

"مختصر یہ جوان بیٹا گیا، ملازمت گئی، پنشن کی آمدنی برائے نام، بچے سب کم عمر، خانہ داری کی بھاری ذمہ داریاں بدستور قائم، ادھر بچوں کے بے پڑھے رہ جانے کے خیال سے میری جان پر صدمہ گزرتا تھا اس پندرہ سالہ زندگی کی گرانی الاماں! دماغ اور قلم پر بھروسہ تھا کہ بعد ملازمت کام آئیں گے سو صحت جسمانی کا یہ حال جیسے برسوں کا مریض ہے

سرگزشتِ دلِ ناشاد جگر کیا کہیے کہنے والی ہے بہت بات مگر کیا کہیے

دس سال سخت پریشانیوں میں گزار کر ۱۹۵۸ء میں بریلی کو الوداع کہہ کر جگر صاحب میرٹھ آگئے۔ یہاں ان کے دو لڑکے کالجوں میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ یہاں بھی ان کو چین نہ ملا۔ ملتا بھی کیسے مشیت ایزدی تو ساتھ تھی۔ "حدیث خودی" صفحہ ۶۰-۶۱ پر لکھتے ہیں :-

"....اب یہ حالات تھے یعنی بنتے بگڑتے، بگڑتے بنتے کچھ آسودگی و راحت کی صورت پیدا ہو چلی تھی۔ بریلی میں دس سال جن سقیم حالات میں گزرے تھے انھیں بھولنے لگا تھا۔ کچھ اطمینان کی سانس لینے لگا تھا کہ ۵ جولائی ۱۹۵۸ء کی شام کو ایک آفت ناگہانی نازل ہوئی بیٹھے بٹھلائے ایک سخت واردات پڑوس میں رونما ہو گئی۔ چھوٹے لڑکے رادھا موہن کا سر پھٹ گیا۔ ایک لڑکے[1] کے ہاتھ سے حفاظت خود اختیاری میں بندوق چل گئی، حملہ آور بائیں گھٹنے میں زخمی ہو کر گر گیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔"

"۵ جولائی کی شام سے کم و بیش تین مہینے تک جس کوفت، ہراس اور دوڑ دھوپ میں ہم لوگوں کے لیل و نہار گزرے ہیں بیان نہیں ہو سکتا۔ گھر میں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی موت ہو گئی ہے میں نے خاندانی ثروت و امارت کی تباہی بھی دیکھی۔ لڑکے کا دلگداز غم بھی اٹھایا۔ معاش کی سخت کشمکش بھی جھیلی مگر جن روح فرسا تردداات میں یہ شب و روز گزرے میں جانتا ہوں یا میرے گھر والے۔ جو جرم (اقدام قتل) لگایا جا رہا تھا اس کی پاداش کا خیال آتا تھا تو روح کانپ اٹھتی تھی۔"

اس سنگین جرم سے برأت کُلّی ہو گئی۔ ان کے چاروں لڑکے ایم۔ اے ہیں اور معزز آسامیوں پر ملازم ہیں۔ سعادت مند بھی ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ دیوی کا سروپ ہیں لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کو پیر ضعیف ہوتے ہوئے بھی اب تک سکون خاطر کبھی نصیب نہ ہوا۔ اپنے حالات میں "رس" میں اس زمانہ کا بھی ذکر کرتے

---

[1] یہ لڑکا انگریزی ادب میں اول ڈویژن پاس ہوا تھا اور میرٹھ کالج میرٹھ میں تین سو روپیہ ماہوار کا پروفیسر تھا۔

ویسے انھوں نے صحیح کہا ہے ؎

کیوں کر کہوں زباں سے کہ تو مہرباں نہیں — لیکن مرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

یہ ہے اس تادیب و تہذیب کا دوسرا رُخ جو جگر صاحب تمام عمر متواتر و مسلسل ملتی رہی۔ اس سخت ترین آزمائش میں ان کے استقلال مزاجی اور ثباتِ فطری کو کہیں ذرا لغزش نہیں ہونے پائی ورنہ بجائے انسان بننے کے حیوان بن جاتے۔ کہتے ہیں ؎

آنے دیا پرستش دل میں کبھی نہ فرق — گو لاکھ بار ہم پہ قیامت گزر گئی

اور ان کا دل وہی دل ہے جس کے متعلق میرؔ نے کہا ہے ع

پیمبر دل ہے۔ قبلہ دل۔ خدا دل

جگر صاحب کہتے ہیں ؎

کعبہ ہو، دیر ہو کہ عرش بریں — سب سے اونچا مقام ہے دل کا
حسن بھی ہے اسی کا جلوہ طراز — عشق ہنگامہ زا ہے جس دل کا
دل ہے مخلوق، دل ہی خالق ہے — ہے یہ جو کچھ ظہور ہے دل کا
بندگی ہیں مری خدائی ہے — ہوں گدا آستانۂ دل کا

دل کو یہ مرتبہ سراپا محبت ہو جانے سے حاصل ہوا ہے ؎

خدا کو بھی نہیں دل مانتا ہے — محبت ہی محبت جانتا ہے

اور محبت کے متعلق کہتے ہیں ؎

محبت ابتدا ہے انتہا ہے — خلاصہ یہ محبت ہی خدا ہے

اس محبت کے شیدائیوں کے متعلق فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

حلّہ ہا سوختہ اند اہلِ بہشت از غیرت — تا شہیدانِ تو خونی کفناں ساختہ اند

اردو کا شاعر کہتا ہے۔ ع

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

اور جگر صاحب نے اپنے رنگ میں بے مثل شعر کہہ دیے ہیں ؎

بنگ شمع غم کی آگ میں ہر لحظہ جلتے ہیں — تمھیں جو چاہتے ہیں نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں

یہ ہے جگر صاحب کی زندگی کا ایک بے نظیر رُخ جن کی غزل کا اندازہ کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ سطور بالا میں جگر صاحب کی فطرت کا ایک خاکہ تو ہمارے سامنے آ گیا مگر مکمل تصور پیش کرنے کے لیے

اس میں رنگ بھرتا ہے۔ حدیث خودی میں جیسا ذکر کیا گیا جگر صاحب نے اپنی غزل کا خود جائزہ لیا ہے۔ اس میں اپنی فطرت کی تحلیل بھی کی ہے اور اپنے عقائد کی توضیح بھی۔ سب سے پہلے چند سطریں اپنی شاعری کے متعلق لکھی ہیں:۔

"اپنے حالات میں لکھ آیا ہوں کہ میں ارادتاً شاعر نہیں ہوا۔ قدرت نے مجھے جبراً شاعر بنا دیا۔ خدا گواہ ہے میں نے شعر نہیں کہا۔ کسی نے بے اختیار کہلایا ہے ؎

تھی کرامت ہوائے صحرا کی ورنہ ہوتا جگر نہ سودائی

روح میں ایک جوش تھا جو ابل نکلا۔ خم میں ایک شراب تھی جو خود بخود چھلک پڑی۔ اسی جوش میں غزل کا نہال اگا بڑھا اور پھولا پھلا۔ اسی شراب سے اس کی آبیاری ہوئی۔ شروع ہی سے قافیہ پیمائی سے مجھے پرہیز رہا۔ غور و فکر کو بہت زحمت دینا پڑتی تھی اس لیے کہ جو معنی اور پیرایۂ بیان متصور و مقصود ہوتے تھے ان کی تشکیل ہو سکے۔ کسی صورت سے کم پہ قناعت نہیں کی۔ آنچ کے مطابق مشق تھی نہیں۔ غور و فکر غوطے پہ غوطے لگاتا تھا کہ طبیعت کی پسند کا موتی نکالے۔ موضوعات میں عقائد و خیالات ہیں اور کیفیات قلب۔ تخیل سے صرف سانچے کا کام لیا گیا ہے۔ کمہار کا کام لیا گیا ہے مٹی کا نہیں۔ کیفیات قلب ایک رو میں ادا ہوئی ہیں جن کے سرچشمے کا مجھے خود پتہ نہیں ؎

تھا حجاب حسن کا یہ اثر، کسی خود پرست کو کیا خبر جو ازل سے سینہ میں جوش تھا وہی بن کے شور فغاں اٹھا
اسی میکدے میں رہا جگر کہ تھا محو خواب میں رات بھر ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اٹھا تو زمزمہ خواں اٹھا

یہ جوش کیا تھا، شراب کیا تھی۔ کچھ سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہاں سب سے پہلی چیز جس کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے حسن ہے۔ میرے حالات بتاتے ہیں کہ کس طرح بچپنے سے حسین مناظر، نغمہ و سرود، دلکش صدا میری روح میں نشاط سے ایک ہیجان پیدا کر دیتے تھے۔ لیکن دل میں ہوک اٹھتی تھی۔ وہی ہوک جو دل کے شکستہ و برشتہ ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے جس کو میر درد بجلی کہتے ہیں ؎

آتش عشق قہر آفت ہے ایک بجلی سی آن گرتی ہے

بالکل یہی کیفیت میری تھی بلکہ کچھ اس سے بھی سوا۔ حسن ایک شعلہ بن کر جان میں اترتا تھا۔ برسات کے موسم میں حسن کی جلوہ سامانیاں بے پناہ ہوتی تھیں معلوم ہوتا تھا کوئی دل کو بالکل مسوس ڈالے گا یا وہ جھلس کر رہ جائے گا۔"

"یہ جذبات مختلف نظموں کی صورتیں اختیار کرتے رہے۔"

اس کے ثبوت میں ایک چھوٹی سی نظم "ننھا جنگلی پھول" ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

"ان چند اشعار سے صاف نمایاں ہے حسن کی جلوہ سامانیوں کا وہ اثر جس نے میری روح میں ہلچل مچا دی تھی۔ غزل حسن کی صورت گری اور منظر نگاری کا مستقل میدان نہیں۔ یہ رخ نظم نے پیش کیا۔ کیفیات قلب

یا جذبات و تاثرات غزل میں آئے۔"

جگر صاحب نے نہیں معلوم کیوں "حدیث خودی" میں حُسن کے ایک ہی رُخ یعنی حسن فطرت کے اثرات کا ذکر کرکے چھوڑ دیا۔ حسن انسانی کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے "حدیث خودی" کے مقدمہ نگار ڈاکٹر تارنگ کو غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف "حدیث خودی" صفحہ ۲۳ و ۲۴ پر لکھتے ہیں:

" یہ دراصل مظاہر فطرت کی دلکشی اور دیدہ زیبی کے کرشمے تھے۔ حسن انسانی کی تجلی تو شباب کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد کوندنا شروع ہوتی ہے لیکن جگر بریلوی کو بچپن ہی سے وضع احتیاط اور "آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری" میں آہستہ سانس لینے کی جو عادت پڑ گئی تھی وہ شعر کی دنیا میں بھی ساتھ رہی اور انھوں نے حسن و عاشقی کے معقول جذبات و احساسات کا کھل کر اظہار کرنا ہمیشہ معیوب سمجھا۔ پھر غم روزگار کے ہاتھوں بھی اتنی فراغت اور فرصت نصیب نہ ہوئی کہ عشق ارضی تصوّر کی کشمکش محسوس کرتے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور ترجمانی کرتے۔

اُن کا محبوب بہت کچھ اصغر کے غیر مرئی محبوب سے ملتا جلتا ہے ؎

بالیدگیٔ روح ہے یا جلوۂ نگار — پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لیے ہوئے

یہ محبوب کا وہ تصور ہے جس کی تعبیر سے خواہ حواس آشنا نہ ہوں لیکن اس کی تصویر سے جمالیاتی سطح پر ذوق و وجدان ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ محبوب کے اس غیر جسمانی تصوّر کی بدولت جگر کی غزل عشق اور عاشقی کی رنگینی اور دلچسپی سے محروم ہوگئی ہے۔"

اس رائے میں دو باتیں خصوصیت سے غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ جگر حُسن انسانی کی تجلی سے ناآشنا رہے دوسری یہ کہ اس باعث ان کی غزل حُسن و عاشقی کی دلچسپی اور رنگینی سے محروم رہ گئی۔ یہ دونوں باتیں حقیقت سے دور ہیں۔ جگر صاحب اپنی مفصل سوانح عمری "خواب پریشاں" میں لکھتے ہیں:۔

" بیوی اور شوہر کا ذکر آگیا ہے تو اپنے متعلق بھی کچھ لکھ دوں۔ وفا پرستی بھی حق پرستی کی طرح زبان اور دل اور عمل میں یکرنگی چاہتی ہے[1] اور بغیر ملامت ضمیر کہہ سکتا ہوں کہ زبان، دل اور عمل سے اس راہ میں ثابت قدم رہنے کی کوشش کی۔ ایک بار ضرور جب میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی پاؤں پھسلنے والا ہی تھا کہ دفعتاً ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ صاف بچ گیا اور ہمیشہ کے لیے۔ شادی ہو جانے کے بعد دوسری عورت کے سائے سے بھی طبیعت بھاگتی رہی مگر حسن کی تاثیر کو کبھی نہ روک سکا۔ دو تین بار یہ تجلی اس بُری طرح سے گری ہے کہ میں کرمیں تڑپ کر رہ گیا ہوں۔ ایک بار ایسا واقعہ ۱۹۱۵ء میں الہ آباد میں پیش آیا۔ جہاں میں امتحان دینے گیا ہوا تھا۔ دوسری بار غالباً ۱۹۲۳ء میں

---

[1] خط میرے کھینچے ہوئے ہیں۔

راؤ ریلوے اسٹیشن پر۔ اس مرتبہ تو حواس بھی رخصت ہونے لگے تھے یعنی ٹکٹ میرے پاس کانپور کا تھا اور قدم مجھے وہاں اٹھا کہیں اور کی ریل کے ایک درجہ میں کہ کسی نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ پلٹا اور سیدھی راہ اختیار کی۔"

حسن سے اس طرح مسحور ہونا اور آلودگی سے بچ جانا صرف غیرت[1] کا ہی کرشمہ نہیں اس سے بالاتر کوئی قوت اس میں کارفرما تھی۔ ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اس کا اندازہ ہوگا۔ ہم لوگوں کو میرٹھ آئے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا پڑوس کی ایک کنواری، جوان اور حسین لڑکی اکثر میرے گھر آیا کرتی تھی کہ میری چھوٹی لڑکی کی سہیلی تھی۔ ایک دن اب یاد نہیں کیا اتفاق ہوا کہ اس کی انگلیاں میری بائیں کلائی سے چھو گئیں۔ بس یہ معلوم ہوا کسی نے سارے جسم پر تیزاب چھڑک دیا۔ بڑی جلن کے ساتھ ایسی تھرتھری آئی کہ میں گھبرا گیا۔ یہ محض غیرت کا فعل نہیں میں خود نہیں سمجھ سکا یہ کون سی قوت ہے۔"

جگر صاحب کے ذیل کے شعر کا تضاد اب سمجھ میں آجاتا ہے ؎

حسن کو چاہیے اور دُور رہے   کوئی ہم سا بھی پارسا ہوگا

اس شعر کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ذیل کے شعر پر غور کیجیے ؎

ہاں جان و دل تو ہو چکے حسن کے بھی ہو چکے   لیکن نہیں کہ ذوقِ تماشا نہیں مجھے

حُسن کے دو رُخ ہیں۔ مرئی اور غیر مرئی۔ مرئی وہ جو آنکھوں سے دکھائی دے۔ اس میں آسمان و زمین کے درمیان جتنے بھی مظاہر ہو سکتے ہیں سب آ گئے۔ اس میں جسمانی رنگ روپ بھی آگیا حسن تو آخر حسن ہے گیسو و رخسار میں نمایاں ہو کہ غنچہ و گل میں، چاند تاروں میں یا ابر بہاراں اور دریا کی موجوں میں۔ غیر مرئی حُسن کے مظاہر رشیوں، منیوں، سنتوں، ولیوں اور انسانوں کے سینے ہیں۔ جگر صاحب کے دل پر حسن کی بجلیاں کوندی ہیں لیکن ان کی غزل میں قریب قریب تمام تر غیر مرئی حسن کی کرشمہ سازیاں ہی نظر آتی ہیں "رس" کے مقدمہ میں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب جگر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"وہ حسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے شعر میں حسن وحدت رنگا رنگی کا باعث ہے۔ لیکن وہ حسن کے ڈھنڈورچی ہیں نہ ان کا تو صل حسین خط و خال تک محدود ہے۔ حسن ان کا اپنا تجربہ ہے۔ حسن اُن کا دل ان کی کائنات ہے۔"

حسن جسمانی کی ادائیں اور کافر ماجرائیاں جو ان کی غزل میں نہیں اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ جگر صاحب کو قدرت نے غیر مرئی حسن پر مٹ جانے کے لیے پیدا کیا۔ ذیل کے شعروں پر پھر غور کیجیے ؎

---

[1] یہ واقعات جگر صاحب نے اپنی غیرت کا ذکر کرتے ہوئے "خواب پریشاں" میں لکھے ہیں۔

ور روح چنگ و رباب ہے، جو تمام حسن و شباب ہے — جسے ہم سے شرم و حجاب ہے اسی جانِ جاں کی تلاش ہے

حجاب حسن کا یہ اثر کسی خود پرست کو کیا خبر — جو ازل سے سینے میں جوش تھا وہی بن کے شور فغاں اٹھا
میکدے میں رہا جگر کہ تھا مست خواب میں رات بھر — ہوئیں کیا بشارتیں صبحدم کہ اٹھا تو زمزمہ خواں اٹھا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ جگر صاحب کے سینے میں کون سی بجلی کوندی۔ جگر صاحب کو کون سی رب پلائی گئی اور یہ کہ انھیں کچھ بشارتوں کے تحت زمزمہ خوانی کرنا ہے یعنی شعر کہنا ہے۔

انھیں بشارتوں کے اعتبار سے انھیں ایسی غیرت دی گئی جس نے مری حسن کی تجلی کے اثرات میں دگی پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کا مزاج آوارگی سے نفور رہا۔ اس رہنمائی کا سرچشمہ ان کی روح میں ا ہے جو نا جنس کے مس سے بھی ان کے جسم میں تیزابی جلن پیدا کر دیتی ہے ؎

بجز محبوب اگر چھو بھی کوئی جائے تو جل اٹھوں — جگر وہ پارسا ہوں۔ پاک ایسا میرا دامن ہے

دوسرا سبب اس شعر سے واضح ہوتا ہے ؎

حسن ہو جائے گا جگر محدود — زلف و رخ کا اگر ہوا مذکور

تیسرا سبب یہ کہ جگر صاحب کی طبیعت عمومیت سے دور رہی۔ غزل کا نوے فی صدی سرمایہ ایسے مضامین سے بھرا پڑا ہے جو ہزاروں بار دہرائے گئے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

کبھی نہ پیروئ خضر راہ کی ہم نے — خلافِ طبع ہمیشہ مذاق عام رہا

آب و گل کی دنیا میں ان کو عشق اپنی اہلیہ محترمہ سے رہا ہے۔ اس میں فطری تقاضے پورا ہونے تھے وہ پورے ہوئے۔ اپنے زن و شوئی تعلقات کو "خواب پریشاں" میں انھوں نے چالیس پچاس صفحات میں لکھا ہے۔ خاتمہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے:-

"ہندو عورت کا پتی دھرم دنیا بھر میں ممتاز ہے۔ صدیوں پہلے شاعر نے کہا تھا ؎

ہمچو ہندو زن کسے در عاشقی مردانہ نیست
سوختن بر شمع کشتہ کار ہر پروانہ نیست (صائب)

پتی دھرم کے معنی ہیں پتی کی سیوا میں آتم تیاگ۔ اس مادہ پرستی کے زمانے میں بھی بھارت کی مقدس سرزمین کے بہت سے کاشانے پتی دھرم کی شمع سے منور ملیں گے۔ میری اہلیہ کے دل میں اسی دھرم کی روشنی تھی۔ صورت کی زیبائی سے مل کر پہلی ہی نگاہ میں میرے دل میں اتر گئی، رگ و ریشہ میں پیوست ہو گئی۔ روح میں گھل مل کر جانِ حیات بن گئی۔ پھر گوناگوں پہلوؤں سے میرے اتقائے دل و دماغ کو متحمل کیا اور سنوارا۔ ان کی

ہستی نے میرے ارمانوں کو وہ سیری بخشی کہ میں اپنی روحانی طلب کی منزل میں نہایت سکون و استقامت کے سا
قدم بڑھاتا رہا ..... "

جگر صاحب کی طبیعت میں حسن غیر مرئی یا ازلی کی جھلک تھی اور ان کی اہلیہ محترمہ کے دل میں بھی۔ ان دو
کی باہمی محبت کا اندازہ مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جگر صاحب کا ذیل کا شعر اب سمجھ میں آتا ہے۔ ۵

محفل میں نور برستا ہے دو شعلوں کے مل جانے سے — یہ راز وہ ہے جو جل جل کر شمع و پروانہ کہتے ہیں

اس محبت کی کچھ داستان "خواب پریشاں" میں ہے۔ غزل میں بھی غور سے مطالعہ کرتے ہیں، تو اس کے متع
دس بیس اشعار مل جاتے ہیں ورنہ غزل کا پیرایہ اس کے لیے انھوں نے نارسا ہی سمجھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

رسوا معاملاتِ وفا ہوں یہ کیا ضرور — کیا ہم اسیر گیسوئے مشکیں نہیں رہے

ڈاکٹر لطیف حسین "رس" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

" البتہ جگر صاحب کے یہاں حسن کا ایک جنسی پہلو بھی ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر کان ک
ہوں۔ ان کی خلوت گہ اندھیری گلیاں، طوائفوں کے کوٹھے، ہوٹلوں کے حمام، سنیماؤں کے ریستاغ نہیں
وہ عورت[1] کی تقدیس پر جان دیتے ہیں۔ وہ عورت کو کائنات کی حسین ترین مخلوق سمجھتے ہیں۔ وہ عور
سر بازار رسوا نہیں کرتے۔ اس کا راز فاش نہیں کرتے، اس کو اپنی عضوی یا ذہنی عیاشی کا محرک و مرکز

۱؎ جگر صاحب کی ایک چھوٹی سی نظم "عورت" ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :-

عورت

تو وہ قوت ہے کہ دنیا میں نہیں جس کی پناہ — رہنما راہ محبت کی ہوئی تیری نگاہ
بزم آرام ہے کاشانۂ ہستی تجھ سے — رشکِ فردوس ہے انسان کی بستی تجھ سے
لعل و گوہر ہوئے پیدا تری تزئین کے لیے — غنچہ و گل تری آرائش رنگیں کے لیے
چارۂ دردِ نہاں حسنِ تبسم تیرا — مرہمِ زخمِ جگر لطفِ تکلم تیرا
گل و گوہر سے فزوں تیری محبت کی نگاہ — عالم یاس میں پہلو ہے ترا جائے پناہ
مرد کی عصمت و ناموس کی ضامن تو ہے — جس نے چاہا نہ صلہ کوئی وہ محسن تو ہے
غمگساری کا تری گر نہ سہارا ہوتا — مرد سے بارِ غم زیست نہ اٹھا ہوتا
روکش آئینۂ مہر ہے عصمت تیری — مظہر نورِ تجلی ہے طبیعت تیری
حسنِ باطن کو ترے جلوۂ ظاہر پہ ناز — عشق صادق کو ترے دردِ محبت پہ ناز

(بقیہ صفحہ ۲۰)

سمجھتے۔ ان کی عورت ان کے دل میں دفن ہے۔ وہ اس پر تاج محل بناتے ہیں۔ "وہ پیام ساوتری" میں فرماتے ہیں۔

اک جلوۂ لایزال تھی وہ   سرتا بقدم جلال تھی وہ

جگر صاحب نے غزل میں عورت کی سربازار رسوائی سمجھی اس لیے اوپر کے شعر میں اشارتاً وہ سب کچھ کہہ دیا جسے ڈاکٹر لطیف حسین نے تشریح کے ساتھ بیان کیا۔ اب ہماری سمجھ میں آگیا کہ حسن جسمانی کی داستان سرائی سے جگر صاحب نے کیوں اجتناب کیا۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ جگر صاحب کی غزل میں عشق و عاشقی کی رنگینی و دلچسپی ہے کہ نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق و عاشقی کی رنگینی و دلچسپی سے جگر صاحب کی غزل مالامال ہے مگر حسن و عشق سے ان کے یہاں مطلب کچھ اور ہے۔ ان کو جگر صاحب نے "نمائش و خواہش سے بہت بالاتر سمجھا ہے۔

میں "حدیث خودی" سے جگر صاحب کے اجزائے طبیعت کا اندازہ کرنے والا تھا لیکن ان کی تشریح سے پہلے جگر صاحب پر حسن کے اثرات کا کچھ ذکر آگیا۔ میں نے بھی اُسے یہاں ضروری سمجھا۔ جگر صاحب کی فطرت کا آئینہ تو سطور بالا سے ہمارے سامنے آگیا لیکن ان کے تخلیقات شعری سمجھنے کے لیے ابھی دو چار خصوصیتیں ہیں اور نمایاں کرنا ہیں۔ "حدیث خودی" صفحہ ۱۱۴ پر لکھتے ہیں :۔

"... اب اپنی فطرت کے بخیے ادھیڑتا ہوں۔ یہاں پہلی چیز غیرت نظر آتی ہے۔ وہی غیرت جس کے متعلق میر کہتا ہے ؎

ہائے غیوری جس کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا   دیکھیے اس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے

محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے   جوشِ حیا[1] سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا

محو دعا تھے اکثر غیرت سے لیک گاہے   آیا نہ نام اس کا میری زباں کے اوپر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹)   لذتِ عیش جہاں تیری وفا کے صدقے   رونق بزمِ طرب تیری حیا کے صدقے

حسن خدمت پہ ترے انجم اور رنگ نثار

تو نہ ہو زینت پہلو تو خدائی بے کار

[1] ایک زمانے میں رسالہ "نیرنگ" دہلی میں اس شعر پر بحث چھڑ گئی تھی۔ حیا کے معنی لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے تھے۔ کوئی اس جگہ جبہہ تجویز کرتا تھا۔ کوئی کچھ اور۔ جب جگر صاحب کا مراسلہ شائع ہوا تو بحث ختم ہوگئی۔

میں اپنی غیرت کے متعلق کیا لکھوں[1]۔ بڑھاپا ہوا۔ لڑکے ہنسیں گے۔ پردہ داری ہی اچھی ہے۔ میرے اشعار سُنیے اور ان پر غور کیجیے ؎

دوست[2] پر بھی گمان غیر ہوا　　اک قیامت ہے عشق و طبع غیور

دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے　　ہائے کیا راز ہے محبت کا"

دونوں شعروں کی جذباتی نزاکت ہر ایک کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ پہلے میں کہتے ہیں کہ میری غیرت میری محبت کا راز دوست پر بھی آشکارا نہیں ہونے دینا چاہتی۔ اس معاملے میں وہ اسے بھی نامحرم سمجھتی ہے۔ دوسرا شعر اس سے آگے بڑھ گیا یعنی میں اس راز کو دل سے بھی نہیں کہہ سکتا ؎

دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے　　ہائے کیا راز ہے محبت کا

اس کے آگے لکھتے ہیں :۔

"آزاد مزاج لوگ کہیں گے کہ غیرت و عشق میں کیا ربط ہے۔ ربط ہے اور بہت گہرا، بہت لطیف و نازک۔ وہی جو حسن و حجاب میں ہے ؎

حجاب اک رسم محبوبی ہے حسنِ جلوہ ساماں میں　　جھلک کر رہ گئیں رنگینیاں گل ہائے خنداں میں

حجاب و حسن کا تعلق اس شعر سے اور واضح و استوار ہو جاتا ہے ؎

تیرا بن کر بیٹھتا ہے اُف یہ انداز حجاب　　توڑے دیتا ہے رگ دل ان کا پردہ اور بھی

پردہ، حجاب، حسن کی کرشمہ سازیوں کو تجلیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہی اعجاز عشق کے ساتھ غیرت کرتی ہے۔ وہ تڑپ پیدا کرتی ہے جیسے آگ لگ جائے۔ حسن و عشق کے معاملات پردہ داری و غیرت مندی میں جو مزا دیتے ہیں بے تکلفی اور بے باکی میں نہیں۔ ایک طرف حجاب کرشمہ و ناز میں چار چاند لگا دیتا ہے دوسری طرف غیرت محبت کو ایک لطیف تجلی بنا دیتی ہے۔ شراب دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ اشتیاق میں وہ نفاست وہ شدت آجاتی ہے جو احساس ہی سے تعلق رکھتی ہے بیان سے باہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرف آرزو زبان پر نہیں آتا۔ محبوب پر آنکھ نہیں اٹھتی۔

---

[1] مگر خواب پریشاں میں اپنی اہلیہ محترمہ کا ذکر کرتے ہوئے سچائی کو نہ چھپا سکے۔ لکھتے ہیں "ڈھائی دن میری اہلیہ کا قیام میرے گھر بریلی رہا... جس بیوی کے متعلق میرے دل میں عجیب وسوسے اور عجیب عجیب خیالات تھے شادی میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ ادھر پردے کی سخت قید اُدھر میری غیر معمولی غیرت، نتیجہ اور کیا ہوتا"

[2] ایک شعر میر کا یہ ہے ؎

سو جس کے لیے اس کو ڈھونڈا کیا　　نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

جوشِ شوقِ غیرت میں گھل مل جاتا ہے۔ مآل محرومی ہوتا ہے۔ اب میر کے اس شعر پر غور کیجیے ؎

جوشِ حیا سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا ۔۔۔ محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے

دوسرے اشعار پر بھی نظر ڈالیے ؎

اک قیامت ہے عشق و طبع غیور ۔۔۔ دوست پر بھی گمان غیر ہوا

ہائے کیا راز ہے محبت کا ۔۔۔ دل سے کہتے بھی دم نکلتا ہے

ذرا ذیل کے شعر پر غور کیا جائے کس قدر نازک و لطیف جذبہ رازداری کا اظہار ہے ؎

زباں پہ نام بھی کیوں اس کا بار بار آئے ۔۔۔ کبھی نہ دل کو ہوئی جس کی محرمی منظور

کیا کہنے ہیں اس شعر کے۔ محبت بار بار نام لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اور غیرت محبوب کو بھی نا محرم قرار دیتی ہے۔ اس کو نام بھی کس طرح لیا جائے۔ کیا کشمکش ہے۔

یہی غیرت میری زبان پر ان جذبات و تاثرات کے اظہار کے لیے مہر بنی رہی جو گوشۂ دوستی، محب و محبوب کے راز و نیاز، ہجر و وصال وغیرہ وغیرہ کی کیفیتوں سے متعلق ہے اور جن سے میں نا آشنا تھی۔

اس کے بعد خلوت پسندی کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

"بچپن میں بھی جس کی طبیعت لہو و لعب سے بھاگے اُسے جوانی میں ہو حق کی صحبتیں کیا پسند آئیں گی۔ یار باشی، یاروں کی ہنگامہ آرائی سے ہمیشہ دور رہا بستی سے باہر پھرنے یا تنہا نشین رہ کر دل کی طرف[۲] محو ہونے میں عجب لطف آتا تھا ؎

ہم کو جنت ہے کنج تنہائی ۔۔۔ کھل گئی دل سے راہ رسم و کلام

صحبت دوست دل کی صحبت میں ۔۔۔ ایک جنت ہے کنج خلوت میں

چھپی ہوئی ہے جو دل کی تہوں میں اک تصویر ۔۔۔ اسی سے رہتے ہیں راز و نیاز آٹھ پہر

یہ نہیں کہ دوستوں کی مجھے تمنا نہ رہی ہو۔ یہ نہیں کہ باوجود غم پسندی اور سنجیدہ مزاجی کبھی ہنستا ہی نہ ہوں۔ ہمیشہ روتا بسورتا رہتا ہوں یا زاہد خشک ہوں۔ دوستوں کے لیے روح میں پیاس تھی، ان کی صحبت میں خوب

---

[۱] ان کے والد صاحب انھیں Stoic (رواقی) کہا کرتے تھے۔

[۲] "خواب پریشاں" میں لکھا ہے کہ ایک بار مکتب میں دل کی محویت میں وہ کیفیت محسوس ہوئی جو پھر کبھی نہ ہوئی۔

ہنستا تھا دل کھول کے ۔ ہاں دوست ایسے مطلوب تھے جن میں ظاہری طمطراق کی بجائے خلوص ہو، پاکیزہ خلقی ہو۔"

سکوت کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"خلوت پسندی کا ایک فیض سکوت سمجھیے ۔ گفتگو خوشگوار نہیں معلوم ہوتی ۔ نہایت ضرورت کے وقت بولنا [illegible] ہے ورنہ نہیں ۔ جو بات منھ سے نکلتی ہے بعض وقت ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کوئی بیان[1] کر رہا ہوں یا اپنے متعلق پیشین گوئی کر رہا ہوں ۔ کوئی بری بات منھ سے نہ نکل جائے کہ الٹی پڑے ، ہنسنے نہ پاؤں کہ غم اٹھانا پڑے [illegible] قول کر ادا کرنا پڑتا ہے ۔ ذرا زبان کو لغزش ہوئی اور[3] افسوس کا سامنا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ گفتگو میں غم نہانی [illegible] بے توقیری محسوس ہوتی ہے ۔ محویت دل کی سبکی اور قوت جاں میں زوال ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کھوئے دے [illegible] رہا ہوں" کہتے ہیں ؎

گفتگو دشمن تحمل ہے سر و سوز دروں نہ ہو جائے[4]

وقار نفس کے تحت لکھتے ہیں :۔

"بچپنے میں بھی مجھے والد آنجہانی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلاتے ہوئے ناگوار ہوتا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کو خفیف کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ کھانے پر بیٹھتا ہوں کوئی چیز نہ رہے تو مانگتے ہوئے اب تک کہ بوڑھا ہوا ہوں سبکی محسوس ہوتی ہے ۔ اہل جاہ و ثروت جنھیں بڑا آدمی کہا جاتا ہے ان سے ملنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں ۔ ملازمت کے زمانے میں حکام سے ملنے سے اجتناب اسی لیے رہا کہ حکومت ، نخوت کا لب و لہجہ برداشت نہ ہوتا تھا ۔ ذرا کسی کے تیور بدلے دیکھے اور میں حاضری سے باز رہا ۔ آٹھ آٹھ مہینے گذر گئے شہر میں ہوں کلکٹر کے سلام کو حاضر نہ ہو سکا جب مجبوراً سامنے آنا پڑا تو اپنی کوتاہی کو آداب کا جواب دینا پڑا ۔ انھیں باتوں نے حکام کی ناز برداریاں ، خوشامد اور تعلق تو دور ، ترقی کی جائز درخواست کو بھی مشکل سے لب پر آنے دیا ۔ جانتا اور مانتا تھا کہ کہاں بندگی بیچارگی کہاں یہ خود پسندی ۔ اس سے اور سود و بہبود سے کیا واسطہ مگر اس روش میں تبدیلی نہ ہو سکی ۔ یہ روش کیوں تھی شاید اس شعر سے سمجھ میں آ جائے ؎

اپنی خود داریوں[5] پہ مرتے ہیں جو ترے تیوروں کے محرم ہیں

---

[1] [2] [3] ان کے متعلق واقعات MYSTERISE OF MY MIND میں درج ہیں ۔

[4] اس راز کو میر یوں بیان کرتے ہیں ؎

بات احتیاط سے کر ۔ ضائع نہ کر نفس کو بالیدگی دل ہے مانند شیشہ دم سے

[5] خودداری کے متعلق ایک بے مثل شعر یہ ہے ؎

شاد کام کیا جانیں عظمتِ حمیت کو ساز و برگِ خودداری فیض تنگ دستی ہے

خودداری کے آگے بھی ایک چیز ہے ؎

زمیں پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبینِ نیاز نشانِ سجدۂ غم دل کو ناگوار نہ ہو

پاس وفا کے تحت لکھتے ہیں :۔

" میں محبت اور وفا میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ جس محبت میں وفا نہیں ہوس کاری ہے۔ نفس پرستی ہے۔

ایمان ہے ؎

ایک ہی بار عشق ممکن ہے کہ جگر ایک زندگانی ہے

درد دل :۔

" کسی کی تکلیف مجھ سے نہیں دیکھی گئی۔ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر بعض اوقات بے اختیار آنسو نکل

نے ہیں ؎

کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے یہی دل چاہتا ہے ہم بھی رو لیں

اُف کسی درد مند کی آواز تیر سا دل کے پار ہوتا ہے

کسی کو دیکھتے کیوں آہ روتے جو بس چلتا تو ہم پیدا نہ ہوتے

کچھ ان کا (والد مرحوم) فیضان تربیت، کچھ اپنی فطرت، دشمن کی آزار رسانی کی تدبیر بھی کبھی نہ سوجھی۔

لبتہ نہیں سکتا کہ جس نے دشمنی برتی اس کے انتقام کا خیال بھی دل میں نہ آیا ہو۔ آیا لیکن سخت اذیت پہنچنے پر

بھی اس خیال نے قابو ہوتے ہوئے بھی عملی صورت اختیار نہ کی "

اسی ذیل میں آگے لکھتے ہیں :۔

" میں اپنے ملازموں سے کام لیتا تھا مگر ہمیشہ یہ خیال دامنگیر رہا کہ وہ بھی آدمی ہیں ان کے دل میں یہ

ں نہ آئے کہ ہم نیچ سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے ایک کام اپنے ملازموں سے کبھی نہیں لیا یعنی ہات پانوں : بوانا۔

ی شخص کو ملازم سے ہات پانوں دبواتے دیکھتا تو دل میں بڑی الجھن ہوتی تھی۔ یہ تماشا نہایت انوکھا اور غیر

ی معلوم ہوتا تھا کہ ایک آدمی پانوں پھیلائے آرام سے پلنگ پر پڑا ہے اور ایک آدمی ہات پانوں داب رہا ہے

نے اپنے ملازموں کے آرام کا بھی بہت خیال رکھا ہے۔ اگر کہیں باہر سے شب کو نا وقت واپس ہوا ہوں ضرورت

ہ پر بھی انھیں نہیں جگایا۔ چپ چاپ مکان کے اندر یوں چلا آیا جیسے کوئی آیا ہی نہیں۔ انھیں جذبات کو

سعت دے دیجیے ؎

گذر رہا ہوں دبے پاؤں میں زمانے سے   کسی کی نیند اچٹ جائے یہ نہیں منظور
ملازم تو ملازم جگر صاحب کا برتاؤ اپنی اولاد کے ساتھ ایسا رہا ہے کہ ان کی بزرگی اور ان کی موجودگی کبھی کسی کو بھی اپنی آزادی میں حائل محسوس نہیں ہوئی۔ نہ کبھی کسی نے کسی طرح کا دباؤ محسوس کیا۔ بچہ بچہ ان کے گھر میں حفظ مراتب کے ساتھ بالکل بے تکلف طریقہ پر رہتا ہے۔

صفائے قلب:-

"کفرست در طریقت ما کینہ داشتن   آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

یہ کہنا ضرور چھوٹا منھ بڑی بات ہے لیکن ایک واقعہ لکھتا ہوں؟

اس واقعہ کو ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ صفائے قلب اس شعر پر ختم ہے

نہیں مجھ کو تمیز دشمن و دوست   وفا کرنا ہے مصروف وفا ہوں

نیت:-

"میری جیسی ملازمت میں بدنیتی خوب پھلتی ہے۔ میں چاہتا تو کافی سرمایہ جمع کر لیتا۔ کم سے کم اتنا ضرور ہو جاتا کہ آخر عمر راحت و اطمینان سے گزر جاتی۔ بچوں کی تعلیم، پرورش، پرداخت بخوبی ہو سکتی مگر جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر نکلا تو بیک بینی و دو گوش۔ ہاتھ بھی خالی اور جیب بھی خالی۔ ناجائز یافت تو بہت دور مجھے کسی کی دعوت قبول کرنے میں بھی تامل ہوتا تھا جیسے کسی کے ٹکڑے کھانا ہوگا۔ اپنا سر نیچا کرنا ہوگا۔ اس احساس کا سرچشمہ کیا بتاؤں کیا تھا

دل نے ازل میں کہہ کے یہ دیوانے لیا   کس سے اٹھیں گے ناز چمن میں بہار کے

اٹھا سکے نہ ہم احسان شادمانی کے   جنوں کا پاس، غم دل کا احترام رہا

علائق دنیا:-

دنیا، کاروبار، راحت و آسائش، سروسامان عز و جاہ میں سے صرف ایک کشش نے مدت تک گرفتار رکھا۔ دولت و ثروت نے کبھی دل کو نہ کھینچا۔ عیش و طرب اجنبی سی چیزیں معلوم ہوئیں، کسی کی طرف کبھی توجہ نہ ہوئی

ہم پہ فریب رونقِ باطل چلے گا کیا   عالم کو جانتے ہیں غبار اس کی راہ میں

ہاں خاندانی وجاہت و وقار میں زمانے کے ہاتھوں جو انحطاط آگیا تھا اسے واپس لانے کی بڑی آرزو رہی اسی آرزو میں نائب تحصیلداری کو دیگر ملازمتوں پر ترجیح دی گئی۔ یہاں کم سے کم ڈپٹی کلکٹری پر پہنچ جانے کی توقع

غیر معمولی توقع نہ تھی۔ ذہنی کلکاری کا عہدہ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ خواب کتنا نشاط انگیز و ولولہ خیز تھا لیکن خواب کی تعبیر کس طرح ہوئی۔ ٹھوکر پہ ٹھوکر لگی۔ تمناؤں کا خون ہوتا گیا۔ طبیعت میں بیزاری پیدا ہوتی گئی جہاں کہیں سکون ہے

حسرتیں شتی رہیں دل پہ بہ پے ٹوٹا کیا ایک تہذیب مسلسل زندگی کا نام ہے

یہ ہیں جگر صاحب کی فطرت کے اجزائے ترکیبی۔ جگر صاحب نے ایک شعر کہا ہے اور "خواب پریشاں" میں اس کی صراحت بھی کی ہے

ستم رہا کہ کرم عام زینہار نہیں جگر کا خاک کے پتلوں میں کچھ شمار نہیں

جگر صاحب کے اجزائے خمیر اسی شعر کی بڑی زبردست دلیل ہیں۔ ان تمام اجزا کا شمار کرم میں ہوتا ہے ستم کے ذیل میں جگر صاحب کی فطری غم آگینی کو لیتے ہیں اگرچہ حقیقتاً یہی وہ چیز تھی جس نے جگر صاحب کو نوکے سانچے میں ڈھالا۔ "حدیث خودی" صفحہ ۶۵ و ۶۶ پر لکھتے ہیں:۔

"بچپنے کی تو یاد نہیں۔ لڑکپن بالکل آئینہ ہے۔ ہوش کی نشوونما کے ساتھ افسردگی کو اپنی طبیعت میں ودیعت پایا۔ ایک پُر اسرار غم کا بوجھ دل کو دبانے لگا۔ بارہ چودہ سال کی عمر سے یہ بات محسوس ہوئی۔ مغموم رہتا تھا بلا کسی ظاہری سبب کے اکثر بے وجہ بے اختیار منھ سے آہ نکل جاتی تھی۔ ماحول دلشکن اور یاس انگیز نظر آنے لگا۔ جب کبھی خوش رنگ کپڑے پہنتا عام لڑکوں کی طرح بجائے خوش ہونے کے اداس ہو جاتا۔ یہ جامہ زیبی کچھ ہیچ سی نظر آتی تھی۔ نمود و نمائش کا سا احساس بھی تکلیف دیتا تھا۔ جیسے کوئی مجھ پہ ہنستا ہو۔ میلوں ٹھیلوں سے بھی عام لڑکوں کی طرح شوق نہ تھا۔ دنیا اور اس کی رنگینیاں موہوم سی معلوم ہوتی تھیں۔ والد آنجہانی مجھے STOIC کہا کرتے تھے۔ عمر کی ترقی کے ساتھ کچھ ایسی کیفیت دل و دماغ پر مسلط رہنے لگی جیسے کسی نامعلوم منزل کی طرف شانوں پر ایک بوجھ لادے ہوئے رواں دواں چلا جا رہا ہوں وہاں اس بوجھ سے سبکسار ہو جاؤں گا۔ نہ کسی کام میں دلی توجہ لگتی تھی نہ کسی کوشش میں استقلال تھا۔ دل سے پژمردگی کا بوجھ کبھی نہ ہٹتا تھا۔ اضطراری آہوں نے مدتوں پیچھا نہ چھوڑا۔ ادھر حالات کچھ ایسے رونما ہوئے کہ خلقی افسردگی اور یاس انگیز رجحانات روز بروز ترقی کرتے گئے ..... ۱۹۰۶ء میں مقدمہ ہار جانے کے بعد جب مصیبتوں کا نزول شروع ہوا تو میرے دل و دماغ پر ہر دم اداسی غالب رہنے لگی۔ میں تنہائی پسند ہو گیا۔ اکثر صبح صبح آبادی سے باہر گھومنے نکل جاتا اور فکروں میں غوطے کھاتا دو دو تین تین میل چلا جاتا۔ میدانوں کی فضا بڑی غمگسار، سکون آور اور دلنواز محسوس ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا چلے نکلو یا یہیں کسی سایہ دار درخت کے تلے بیٹھ رہو۔"

اس غم کی گوناگوں کیفیتوں میں بے پناہ رومانیت ہے اور بڑی لطافت و نزاکت لیے ہوئے ہے۔ اس

پڑے، اتفاقی رنج و الم جس کا سطور بالا میں ذکر آچکا ہے اور جن کو ستم کا دوسرا رخ کہنا چاہیے اور زہر گھولتے رہے۔ لکھتے ہیں:۔

"سال دو سال گردش روزگار رہتی تو شاید کوئی مستقل اثر نہ چھوڑتی۔ یہاں تو مصیبتوں کا سلسلہ ختم ہی ہونے نہ آتا تھا۔ ایسی ایسی صعوبات اور شدائد کا سامنا رہا ایسے ایسے تلخ گھونٹ پینا پڑے کہ روح تلملا تلملا اٹھی۔"

جگر صاحب کی فطرت کے ایک خاص جز و یعنی غم کا بھی ذکر کیا گیا اب دیکھنا ہے کہ ملکۂ شاعری نے ان اجزا سے مل کر ان کی غزل میں کیا گل کھلائے۔ ان کی شاعری کی ابتدا بھی غیر معمولی ڈھنگ کی ہے اس ابتدا سے پہلے ہی ان کی طبیعت حسن فطرت کو شاعرانہ انداز سے اپنے میں جذب کر رہی تھی۔ اس کا کچھ ذکر تو اوراق ماسبق میں انھیں کی زبان سے کیا جا چکا کچھ اور سنیے "حدیث خودی" صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں:۔

"والدہ آنجہانی کے ہمراہ اکثر گانوں کو جایا کرتا تھا۔ بہت تڑکے وہ روانہ ہوتے تھے۔ صبح کا سہانا سماں ہلکی ہلکی دھوپ، لہلہاتے ہوئے ہرے ہرے کھیت، جھیلوں اور تالابوں کا موجیں مارتا ہوا چاندی سا پانی، دھوپ چھاؤں کرتی ہوئی موجیں، ہرے بھرے درختوں پہ پرندوں کی سریلی تانیں ایسی ہی الم انگیز نشاط پیدا کرتی تھیں۔ برسات کا عالم ہی نرالا ہوتا تھا۔ دھواں دھار بادل، سرسبز مناظر، شام و سحر کے آسمان کی رنگینیاں دل میں آگ لگا دیتی تھیں۔ برسات آتی۔ گھر میں ہنڈولا گڑتا، جھولا پڑتا، بہنیں، بھاوجیں رنگ برنگی چنریاں اوڑھے جھولا جھولتیں، کوک کوک کر ساون ملاریں گاتیں۔ میرا دل الم و مسرت کی کیفیتوں میں ڈوبتا اچھلتا نشاط کا طوفان اٹھتا مگر ایک مہجورانہ ہوک کے ساتھ جیسے کوئی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ پاس آ آ کر دور جاتا ہو۔"

یہ بچپن کا زمانہ تھا جب حسن جگر صاحب کے قلب میں اپنی تجلی دوڑا رہا تھا۔ جوانی میں یہ محفل دوسرے انداز سے سجائی گئی۔ "حدیث خودی" صفحہ ۶۴ پر لکھتے ہیں:۔

"اب ایک اور باب کھلتا ہے۔ ادھر ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک چار برس سول لائن میں اپنے بنگلے پر قیام رہا۔ اس بنگلے کے احاطہ میں آم اور دوسرے پھلوں کے وسیع تختے تھے۔ ایک لمبا چوڑا گڑھا تھا جو برسات میں اچھا خاصا تالاب بن جاتا تھا۔ چاروں طرف جنگل کی سی فضا پیدا کر دیتا تھا۔ برسات کا موسم عجیب عالم میں گزرتا تھا۔ رنگا رنگ خوبصورت پرندوں کا چہکنا، چہچہانا، ادھر ادھر شاخ شاخ پر اڑتے پھدکتے پھرنا، تنکے چن چن کر آشیاں سازی میں مصروف ہونا، انڈے دینا، بچے نکالنا، ان بچوں کا چیں چیں کرنا، ماں باپ کے پیچھے پھدکتے ہوئے بھولے پن سے چونچیں پھیلا پھیلا کر دانہ مانگنا فطرت کی یہ وہ ادائیں تھیں جن کی

نشاط انگیزیاں بے پناہ ہیں۔ لیکن میرے دل میں نشاط کے ساتھ عجیب قسم کا درد بھی اٹھتا تھا۔ صبح و شام گھنٹوں ان مناظر میں محو رہتا کبھی کبھی کسی چڑیا کے بچے اس کے آشیانے سے نکال کر دس بیس[1] دن کے لیے پال لیتا۔ پنجرے کو ہری بھری لہلہاتی شاخوں میں لٹکا دیتا۔ خود کسی درخت کے موٹے سے ٹہنے پر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ جب پانی برستا، سبزہ چمکتا، لہلہاتا، کوئل کوکتی پھرتی۔ پپیہا پی کہاں کا نعرہ بلند کرتا۔ توتوں کے جھنڈ میں میں کا شور مچاتے ہوئے آموں کے درختوں پر بے تحاشا گرتے، آم ٹپکتے۔ میں شانے پر لاٹھی[2] رکھے ہوئے متوالوں کی طرح کبھی اس روش پر گھومتا کبھی اس روش پر۔ باغ میں آموں کے رکھوالے پھوس کی منڈیا میں بیٹھے توتوں کو اڑانے کے لیے شور مچاتے۔ ان آوازوں کی گونج دیوانوں کے لیے ہُو کا کام کرتی تھی۔"

جگر صاحب کی طبیعت کا خمیر ہم نے دیکھا، کتنا غیر معمولی تھا۔ کس نرالے ڈھنگ سے ان کی تربیت تہذیب بچپنے، لڑکپن اور جوانی میں ہوئی، کس انوکھے اور چہیتے انداز سے فطرت نے اپنی رنگینیاں ان کے دل و دماغ میں سموئیں! یہ سب اس لیے کہ قدرت جگر صاحب کو بہمہ وجوہ مکمل ایک آدرشی شاعر بنانا چاہتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا شاعر اردو تو کیا، کوئی بھی زبان مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے۔ جگر صاحب کی یہ سب باتیں عجیب و غریب رہیں۔ ان کی شاعری کا جنم بھی اسی ندرت کی ایک کڑی ہے۔ ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکہ شاعری ان میں بالکل خداداد تھا۔ "حدیث خودی" صفحہ ۶۲، ۶۳، ۶۴ پر لکھتے ہیں:۔

"اسکول[3] میں داخل ہو جانے کے بعد بھی مولوی انتظام علی مجھے مکان پر اردو۔ فارسی پڑھاتے رہے۔ ایک دن کچھ پڑھا رہے تھے کہ کوئی موزوں مصرع میری زبان سے نکل گیا۔ والد آنجہانی وہیں ٹہل رہے تھے۔ مولوی صاحب نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا، وہ بھی مسکرا دیے بات آئی گئی ہوگئی ... شعر گوئی کی ابتدا یوں ہوئی۔ جب میں انٹرنس[4] میں تھا میں نے ایک ہم جماعت سید امانت حسین شاد[5] بریلوی کی ترغیب بلکہ اصرار سے پہلی غزل کہی۔ اس کے بعد بھی کچھ کہتا رہا مگر بہت کم۔ یعنی سال میں چار چھ غزلیں رسمی قسم کی۔ ابھی اس شاعری میں خلوص نہیں پیدا ہوا تھا اوپری اوپری سی چیز معلوم ہوتی تھی۔ غم کا عنصر ضرور موجود تھا کہ حالات کا تقاضا تھا ... والد آنجہانی کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ خود تو کہنا ترک کر چکے تھے مگر شعر و سخن کے شیدائی عمر بھر رہے۔ یہ آپ ہی کی علمی و ادبی صحبتوں

[1] دس بیس دن کے لیے یوں کہ شوق پالنے پر مجبور تو کر لیتا تھا مگر چڑیوں کی قید دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جگر

[2] لاٹھی اس لیے کہ باغ میں سانپ بہت کثرت سے تھے اور کچھ دن مجھے سانپ مارنے کا شوق رہا۔ جگر

[3] جگر صاحب ۱۳، ۱۴ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے تھے۔

[4] اس وقت جگر صاحب کی عمر انیس بیس برس کی ہوگی۔

[5] آپ غلام حسین قدر بلگرامی شاگرد غالب کے شاگرد تھے اور عہد شباب میں اپنی عمر کے اعتبار سے بے مثل شعر کہتے تھے۔

کا فیض تھا کہ مجھے بھی رفتہ رفتہ شاعری سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ طبیعت کا ایک مخفی عنصر نشو و نما پانے لگا لیکن شعر کہنے کا خیال مدت تک نہ آیا۔"

اب شاعری کے جنم کا ذکر کرتے ہیں۔ حدیث خودی صفحہ ۶۷، ۶۸ :۔

"یہ تھیں وہ گونا گوں کیفیتیں (جن کا ذکر اوراق ماسبق میں ہو چکا) جو لڑکپن سے طبیعت پر اپنا رنگ چڑھا رہی تھیں۔ جب شادی ہوئی اس رنگ میں نئے عنوان سے شدت پیدا ہو چلی۔ اسی شدت سے دفعۃً شاعری نے جنم لیا۔ یوں سمجھیے کہ جس طرح کسی پہاڑی مقام پر عرصہ تک پانی جمع ہوتا رہے اور دفعتاً آبشار بن کر پھوٹ نکلے۔ بالکل اسی طرح ایک مصرع سے میری شاعری شروع ہوگئی۔ ۱۹۱۵ء میں ایک صبح تڑکے پلنگ پر آنکھ کھلتے ہی بے غور و فکر، بے اختیار یہ مصرع زبان پر آگیا جیسے کوئی پھل پک کر ٹپک پڑے۔ ع

ناوک غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو

میں چونکا، ماتھا ٹھنکا، فال بری نظر آئی مگر کمان سے تیر نکل چکا تھا بہر حال پلنگ پر پڑے ہی پڑے اسے مطلع کر لیا ؎

ناوکِ غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو   اشک کی نذر دل و جان و جگر ہونے دو

اس غزل کے چند ہی دن بعد مجھے ایک نہایت[1] تلخ واقعہ پیش آیا۔ گویا مطلع اس کی فال تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا تھا اس سب کی پہلی فال یہی مطلع تھا۔ اسی مطلع کی طرح میرے بہت سے اشعار[2] آئندہ واقعاتِ زندگی کی فال ثابت ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد کچھ مشق سخن جاری رہی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں۔ فارسی قصیدے کے ایک شعر پر آپ کے والد آنجہانی نے پانچ روپیہ انعام عطا کیا اور اپنے تخلص دل کی مناسبت سے جگر تخلص تجویز فرمایا۔ مشق سخن کے ساتھ ساتھ اردو فارسی ادبیات کا مطالعہ بھی بہت رہا۔ مگر یہ سلسلہ جلد ترک کر دینا پڑا۔ "حدیث خودی" صفحہ ۷۲، ۷۳، ۷۴ پر لکھتے ہیں :۔

"۱۹۱۹ء میں ملازمت کے سلسلے سے جلال آباد ضلع شاہجہاں پور پہنچا وہاں کم و بیش ایک سال قیام رہا۔ اس عرصہ میں نہ کوئی ادبی کتاب دیکھنے کو نصیب ہوئی نہ کوئی متنفس ایسا ملا کہ جس سے گھڑی دو گھڑی شعر و ادب

---

[1] یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے اور جس میں جگر صاحب کالج سے گرفتار کرکے تھانے لائے گئے تھے۔

[2] ان اشعار اور ان سے متعلق واقعات کو اپنی کتاب MYSTRIES OF MY MIND میں جگر صاحب نے بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ چند مثالیں حدیث خودی میں بھی دے دی ہیں۔

ا جہ جا رہتا۔ پھر یہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے گرہ کی کوئی چیز کھوتا چلا جا رہا ہوں۔ طبیعت غیر شاعرانہ ہوگئی۔ شوق
کی چنگاری دب گئی۔ سب سے زیادہ کوفت اس خیال سے۔ تھی کہ اب تو ایسے ہی کورد یہہ مقامات میں بیل و نہار گزر
یں۔ غرض رفتہ رفتہ طبیعت پر ایسی بے دلی مسلط ہوگئی۔ خود کہ مشاغل بالکل ترک ہوگئے۔ تقریباً دو سال تک
یہی کیفیت رہی۔ شعر کہنے کی قطعی نوبت نہ آئی گویا غزل کو کہتے تو ایک غیر فطری رو تھی کہ آئی اور نکل گئی۔ یہ خبر
تھی سہ

رہ رہ کے بدلتی ہے کروٹ یہ جگر کروٹ جو موج دل اٹھتی ہے معدوم نہیں ہوتی

اب جلال آباد سے کہیں اور پہنچا اور گھومتا پھرتا ۱۹۲۱ء کے اوائل میں تحصیل گنور ضلع بدایوں آیا۔ یہاں
منشی محمد یعقوب ضبط بدایونی رجسٹرار قانون گو تھے۔ انھیں علمی شغلوں سے دلچسپی تھی۔ شعر بھی کہتے تھے مگر نعت
یں۔ ان سے شعر و سخن کے چرچے رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ دبی ہوئی چنگاری پھر بھڑکی۔ قدرت نے ذیل کے
قصے کے پردے میں سمند ناز پہ تازیانہ لگایا۔ برسات کا ولولہ انگیز موسم، صبح کا سہانا وقت، ہوا کے سرد جھونکے
چل رہے تھے، کالی کالی بدلیوں اور سرسبز اشجار کے جھومنے کا سماں۔ میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے
کے اونچے چھتنار ہرے بھرے پیپل کی ٹہنی پر بیٹھ کر پپیہے نے "پی کہاں" کا نعرہ بلند کیا "پی کہاں" کی رٹ نے تڑپا دیا
سینہ میں آگ لگا دی۔ ایک دم جوش آیا کہ پپیہے پر کچھ لکھوں۔ ملازمت کے حوصلہ شکن تجربات نے اس جوش کا گلا
گھونٹنا چاہا۔ قلم اٹھانے نہ دیا۔ میں نے اس خیال کو ٹال دیا۔ پپیہا ہے کہ "پی کہاں" کی رٹ لگائے ہے۔ بار بار دل
میں طوفان اٹھتا ہے کہ کچھ لکھوں اور زبردستی دبا دیا جاتا ہے مگر چڑھتے ہوئے سیلاب اور بڑھتے ہوئے طوفان کا
کس کے روکے رکا ہے۔ اسی کشمکش میں ایک مصرع زبان پر آ گیا ع

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آ کے کون

بے اضطراری طور پر لکھ لیا۔ فوراً ہی اس پر قلم تنسیخ پھر گیا۔ وہی اندیشہ حادی و غالب کہ کہاں بندگی، بیچارگی، خانہ
بدوشی اور کہاں شاعری، اس کے علاوہ یہ موضوع بھی ایک بحر ناپیدا کنار معلوم ہوا۔ قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی
کہتا تھا کہ کمبخت چپ ہی نہ ہوتا تھا۔ دل کو برمائے ہی جاتا تھا۔ پپیہا یا فرشتۂ غیب تھا کہ مجھے زبردستی شاعر بنانے
پر تلا تھا۔ غرض عجیب کشمکش میں دو تین بار یہ مصرع لکھا گیا اور قلمزد کیا گیا۔ اسی کشاکش میں تین مصرعے اور ہو گئے اور بیت بھی۔

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آ کے کون دیتا ہے آواز کس کو درد سے چلا کے کون
نالہ کش ہے فرقت دلبر کا صدمہ پا کے کون "پی کہاں" رٹتا ہے تنہائی سے یوں گھبرا کے کون

کون خار دشت وحشت ہے پئے دامان ہوش
کس کی یہ آواز ہے غارت گر سامان ہوش

نئے دور کی نظم کی ابتدا ہوئی حقیقت یہ ہے کہ دل و دماغ پر پپیہا چھا گیا تھا اور ہر روز کچھ نہ کچھ نئی دولت مجھے دیتا تھا صبح شام اس کی آواز برابر آتی تھی۔ رات کو آنکھ کھل جاتی تو اسے بولتے ہوئے پاتا تھا۔ دورے پر جاتا تو میدانوں میں اسے چیختے چلاتے دیکھتا اور سنتا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی غائبانہ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ غرض ہر روز نظم میں ایک نیا اضافہ ہوتا گیا۔ ہوتے ہوتے چھاپے[1] بند ہو گئے۔ شعر گوئی کا سلسلہ پھر چل نکلا۔ ادھر ملازمت کے تلخ تجربات نے جذبات و کیفیات قلب میں گوناگوں تغیرات پیدا کر کے شاعری کی روح کو بیدار کرنا شروع کر دیا

سنہ ۱۹۴۲ء میں اپنے بیٹے گنگا موہن رائے ناحی کی وفات کے سانحہ میں نے سمجھ لیا تھا کہ شاعری کا خاتمہ ہو گیا۔ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں ایک طولانی "مسدس" کا "یستھ درپن" ہوا۔ کچھ رباعیاں کم ہوتی رہیں۔ غزل کے لیے جان باقی نہیں تھی۔ طبیعت میں سناٹا تھا۔

امید سے غم میں بھی گرمی تھی، اب دل کی بستی سونی ہے آہیں وہ راہیں بھول گئیں، اشکوں نے امنڈنا چھوڑ دیا

لیکن قدرت تو جگر صاحب کو ایک نمایاں طرز کا غزل گو بنانا چاہتی تھی۔ آخر ایک مدت یعنی دس سال کے جمود کے بعد" سنہ ۱۹۵۲ء کے جاڑے شروع ہوتے ہی طبیعت میں ایک طوفان آ گیا۔ وہ دریا چڑھا کہ روکے نہ رکا۔ مکان[2] کے سامنے ایک فرانسیسی کی کوٹھی ہے اس کے چمن کے پھولوں نے آگ لگا دی۔ دل کا عالم ہی اور تھا ایک نشہ تھا کہ متوالا کیے دیتا تھا۔ کبھی اس روانی سے شعر نہیں کہے۔ چار پانچ مہینے میں بیس بائیس غزلیں ہو گئیں

اور جگر صاحب کو شاعر بنا دینے والے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پھر یہ سلسلہ برابر چلتا رہا اور اب ان کی غزلوں کی تعداد چار ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔

ہم پر بخوبی روشن ہو گیا کہ کس طرح بچپن، لڑکپن، اور جوانی میں قدرت کے وسیع مکتب میں جگر شاعر کی تعلیم و تربیت ایک خاص نہج پر ہوتی رہی اور ایسی بوقلمونی کے ساتھ کہ آخر یہ تمام اصناف شاعری، مثنوی، رباعی، غزل، نیچرل نظم پر چھا گئے۔ اور مجموعی حیثیت سے اردو ادب میں ایک قسم کی روحانیت یا بقول ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کا اضافہ کر کے ایک خاص اور بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

نقادان سخن اور مبصران سخن نے جی کھول کر ہر صنف میں ان کو داد دی ہے۔ اگرچہ جگر صاحب نے کبھی کسی سے رائے کے بھیک نہیں مانگی۔ اس شیوے کو وہ شاعری کی توہین سمجھتے ہیں۔ ہمیں یہاں غزل سے سروکار ہے جسے سب سے پہلے

---

[1] یہ نظم نیچرل شاعری کا نمونہ ہے اور بقول ڈاکٹر لطیف حسین ایک شاہکار۔

[2] میرٹھ میں۔

ان کے استاد حضرت عزیز لکھنوی مرحوم نے سراہا اور بہت سراہا۔ چار پانچ برس جگر صاحب نے ان سے مشورۂ سخن کیا ہوگا۔ اس عرصہ میں پچاس پچپن غزلیں اور چار پانچ نظمیں مرحوم نے دیکھی ہوں گی۔ شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس کے متعدد اشعار پر صاد نہیں کئی غزلوں پر لکھا ہے "نہایت بلند ہیں"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "چھوٹی بحر میں آپ کے شعر بہت دلآویز ہوتے ہیں"۔ ایک غزل پر لکھا ہے "لاجواب ہے" اس کے ذیل کے شعر پر چار صاد بھی ہیں۔

جس نے تیری نظر کو دیکھ لیا　　اس کو دنیا نظر نہیں آتی

ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ کی طبیعت پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے" اسی طرح ڈاکٹر سعید احمد، جوش ملیح آبادی اصغر گونڈوی، تمکین کاظمی۔ یگانہ چنگیزی، آل احمد سرور، نیاز فتحپوری وغیرہم نے بھی لکھا ہے۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے آپ کا انتخاب غزلیات شائع کیا۔ اس میں سرور صاحب نے لکھا۔

"جگر بریلوی کی نظر فن پر گہری ہے مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے اور صرف واردات قلبی سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں۔ غزل میں ان کا منفرد رنگ ہے اور ملک کے ممتاز اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں"۔ اسی انتخاب پر ریو کرتے ہوئے نیاز فتحپوری "نگار" بابت ماہ ستمبر ۶۰ئہ میں لکھتے ہیں:۔

"جگر بریلوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ بہت معروف مقبول ہیں۔ وہ کلاسیکل رنگ کے شاعر ہیں اور بہت شائستہ صاف اور ستھرے ذوق کے وہ ان چند شاعروں میں سے ہیں جو محض شاعر نہیں بلکہ انسان بھی ہیں اور ان کی یہ خصوصیت ان کے کلام سے ہر جگہ ظاہر ہوتی ہے"۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کی شاعری کا میں بڑا معترف ہوں۔ اس لیے میں کوئی مضمون ایسا چاہتا ہوں جو حقیقتاً آپ کی شاعری کی عظمت کو ظاہر کرے"۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ کی غزل پڑھ کر دل خوش ہوگیا"۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "آپ کی ذات سے اس وقت ہماری کلاسیکل شاعری کی آبرو قائم ہے"۔

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلوی کے خطوط میں نیاز صاحب لکھتے ہیں: "میں جگر بریلوی کی شاعری کا ہر وقت معترف رہا ہوں۔ خوب کہتے ہیں"۔ "جگر بریلوی کے ذوق تغزل کا میں بڑا مداح ہوں اور چاہتا ہوں کہ ان کے تغزل ہی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے"۔

ڈاکٹر ادیب ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے ایک پورا مقالہ آپ کی غزل پر لکھا جو "نگار" بابت ماہ

لہ سلہ ماخوذ از روہیلکھنڈ اخبار مورخہ ۱۳ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۶ئہ

اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ادیب صاحب نے جگرؔ صاحب کے دل و دماغ کی تہوں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "انھوں نے غزل کی بہت بلندی سے نکالی ہے"۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"حقیقت بس اتنی ہے کہ آپ کی شخصیت کی کچھ پہنائیاں، کچھ دلفریبیاں ہیں۔ جن کا اثر غزل کا رنگ وسوز ہے اور جن کے سائے آپ کی مثنوی پر چھا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ "پیام ساوتری" میں وہی الوہیت ہے جو آپ کی غزل کی جان ہے"

حضرت نیاز فتحپوری "حدیث خودی" پر ریویو کرتے ہوئے "نگار" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں جگرؔ صاحب کی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"دنیا انھیں ایک اچھا شاعر جانتی ہے لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اچھے انسان بھی ہیں۔ اتنے اچھے کہ اس زمانے میں اس کا تصور بھی گویا محض تصور خواب ہے۔ خدا انھیں زندہ و سلامت رکھے۔"

ڈاکٹر لطیف حسین نے جگرؔ صاحب کی الوہیت کو جگرؔ صاحب کی غزل کی جان بتایا۔ حضرت نیاز نے ان کی شاعری کو انسانیت کا آئینہ کہا۔ بات ایک ہی ہے اس لئے کہ انسانیت کی تعریف مولانائے روم کے ارشاد کے مطابق یہ ہے ؎

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست   آدمیت جز رضائے دوست نیست

اور یہی الوہیت وہ ممتاز خصوصیت ہے جو جناب جگرؔ بریلوی مدظلہ نے اردو شاعری کو عموماً اور غزل کو خاص طور پر بخشی ہے۔ اس اعتبار سے اردو ادب میں ان کا وہی درجہ ہے جو ہندی ساہتیہ میں سورداس جی اور تلسی داس جی کا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان مہاکویوں کا محبوب وہ حسن لازوالی تھا جس کے اوتاروں کے تصورات انھیں کرشن جی اور رام چندر جی کے نام سے ان کے ذہن میں جلوہ افروز تھیں۔ جگرؔ صاحب کے سامنے اس حسن کا کوئی روپ یا سروپ نہیں تھا ؎

آنکھیں ہیں حسن پرستی ہے، دل ہے کیفیت و مستی ہے   عالم محبوب کی بستی ہے، پیدا اور پنہاں دیکھ لیا

حسن پیدا تو سبھی دیکھتے ہیں حسن پنہاں ژرف نگاہی چاہتا ہے۔ ان تمام حقیقتوں کے پیش نظر جو سطور ماسبق میں بیان کی گئیں متحقق یہ ہوتا ہے کہ جگرؔ صاحب نام ہے دردِ دل، حسن باطن اور طہارت کے رنگین مجسمے کا۔ اس مجسمے کو سامنے رکھ کر ان کی شاعری کا جائزہ لینا ان کے کلام پر صحیح تنقید ہو سکتی ہے۔ ہمیں غزل میں ان تینوں رنگوں کی جلوہ افروزی دیکھنا ہے۔ سب سے پہلے میں دردِ دل کو لیتا ہوں اس میں ان کی غیر معمولی حساسی اور وہ دردِ دل بھی نہیں جس کا ذکر آ چکا ہے اس میں ان کی فطری غم آگینی بھی شامل ہے۔ میں ان کی فطری غم آگینی کی بہ حیثیت مجموعی تحلیل کرنے کی کوشش کروں گا جو ایک مکمل

فلسفۂ[1] غم کی صورت رکھتی ہے اور بہت وضاحت کی محتاج ہے۔ ان کے غم کے دو رُخ ہیں۔ ایک وہ جو واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ان کے خاندان کے تمول و امارت کی تباہی و بربادی، ان کی گرفتاری، ملازمت کی اذیتیں، بیٹے کی جوانمرگی، بعد ملازمت کے سقیم حالات۔ لڑکوں پر اقدام قتل کا مقدمہ بڑے بڑے واقعات سے لے کر چھوٹے چھوٹے حالات بھی شامل ہیں۔ جن کا "حدیثِ خودی" صفحہ ۸۶ پر مجملاً ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"..... دوسری طرف نفسیاتی قوتوں کی کارفرمائی بھی کم حیرت انگیز نہیں رہی۔ جو خواہش دل میں پیدا ہوئی اس کے برعکس ظہور میں آیا۔ دولت و ثروت یا ساز و سامان عشرت کی طرف کبھی خیال بھی نہیں گیا۔ راحت کی تمنا ضرور ہوئی بس انگاروں پر لوٹنے لگا۔ کسی پھول یا پودے کو دیکھ کر خوش ہوا تو جھلس کر رہ گیا۔ خاک میں مل گیا۔ کبھی کوئی ارادہ پورا نہ ہوا۔ امیدوں نے زہر کے گھونٹ حلق سے نیچے اتار دیے۔ سب سے زیادہ تقویت کی امیدیں نامی[2] سے وابستہ تھیں سو سب سے پہلے اسی کو قضا نے چھانٹا اور عنفوان شباب میں۔ اسی طرح خیالات[3] کے نتائج بالکل الٹے نکلے کسی معاملہ میں کوئی تدبیر یا انتظام بن نہ پڑا اگر بن پڑا تو راس نہ آیا۔ اسی قسم کی اور بہت سی خصوصیات ہیں جو باہم دگر نہایت مسلسل و مربوط ہیں۔ میری زندگی انھیں سے عبارت ہے۔ انھیں میں وہ روحانی تڑپ بھی ہے جس نے دنیا اور اسباب دنیا سے بے نیاز بنائے رکھا اور کبھی کبھی اس جھلک سے ہمکنار کر دیا جس کا حظ و انبساط، کیف و سرور بیان سے باہر ہے۔"

اب ان کے غم کا دوسرا اور نہایت عجیب رُخ پیش کرنا ہے یعنی خلقی غم آگینی جس میں غم دنیا برابر زہر گھولتا رہا ؎

میری سرشت ہی میں ہیں رنج پسندیاں بھری ۔۔۔ بڑھتا ہے خود بخود قدم دشت میں خار دیکھ کر

---

[1] پانسات سال ہوئے ان کے فلسفۂ غم پر ایک مضمون لکھ کر رسالہ "نگار" میں اشاعت کے لیے میں نے بھیجا تھا۔ نیاز صاحب مدیر نے رسید دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مضمون شائع ہوگا۔ مگر شائع نہیں کیا اور نہ واپس مانگنے پر واپس ہی کیا۔

[2] و [3] و [4] بعض دوسرے شعرا کے یہاں بھی ایسے محسوسات ملتے ہیں مگر خال خال ؎

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے ۔۔۔ ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے (آتش)

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا ۔۔۔ کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اُجڑ گیا (فانی)

جگر صاحب کے یہاں یہ کیفیتیں ان کی نفسیاتی خصوصیات سے تعلق رکھتی ہیں جن کا مفصل ذکر مع واقعات متعلقہ کے انھوں نے اپنی کتاب MYSTRIES OF MY MIND میں کیا ہے۔

[5] جگر صاحب کے سب سے بڑے بیٹے۔

اور یہ کس بلا کا شعر کہہ دیا ہے ؎

مدت سے میکدہ میں تھا اک جام زہر بھی ہم نے بڑھا کے ہاتھ اسی کو اٹھا لیا

یہ وہی راز ہے جو حافظ شیرازی یوں بیان کرتے ہیں ؎

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

جگر صاحب کہتے ہیں کہ مصائب و آلام سے گھبرا کر لوگ میکدے کی پناہ میں آتے ہیں کہ شراب پی کر سرور و نشاط حاصل کریں۔ ہم نے میکدے میں زہر کا پیالہ اٹھایا جو ازل سے مردِ میدانِ عشق کے لیے محفوظ تھا اور اس طرح مصائب و آلام سے مقابلہ کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

یہ غم کیا تھا اور کیوں؟ یہ سوالات بہت ٹیڑھے ہیں لیکن جگر صاحب نے فقط ان کا جواب عبارت محولہ بالا میں پیش کر دیا یہ کہہ کر کہ "انھیں میں وہ روحانی تڑپ بھی ہے جس نے دنیا اور اسباب دنیا سے بے نیاز بنائے رکھا اور کبھی کبھی اس جھلک سے ہمکنار کر دیا جس کا حظ و انبساط کیف و سرور بیان سے باہر ہے۔"

روحانیت میں یقین رکھنے والوں کے لیے یہ جواب نہایت صاف ہے مطلب یہ ہے کہ یہ غم ان کی روح کی تڑپ تھی اپنی اصل یعنی روحِ مطلق سے واصل ہو جانے کے لیے۔ اسی تڑپ کی تسکین کے لیے وہ تنہائی پسند ہو کر دل کی طرف محو ہوتے اور اسی نے آبادی سے باہر جنگل کی فضا میں گھومنے میں انھیں کیف بخشا۔ اسی وصال کے لیے بیس بائیس سال یعنی اس دن تک جس دن ان کے بیٹے نامی کو اجل آئی انھوں نے شب بیداری کی۔ اس خلقی غم آگینی کے ساتھ دنیوی اندوہ و آلام کا اضافہ لازمی تھا اس لیے کہ ان کے قلب کا سونا تپ تپ کر کندن بنتا چلا جائے۔ بار بار کسوٹی پر کسا جاتا رہے یعنی آزمائش پر آزمائش ہوتی رہے اور عشق ان کی رگ رگ میں رہتا رہتا رہے، اس کی تڑپ میں ثبات و شدت قائم رہے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

سمایا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بن کر یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

"کوئی" اور "کوئی شے" پر غور کیجیے۔ مفہوم یہ ہے کہ غم کے ساتھ ساتھ رگ رگ میں محبوب بھی سمایا جا رہا ہے۔ اس کو غم کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ سامانِ سرور ہی کہا جائے گا۔ عشق کی یہ منزل کس کس طرح دل کا خون ہو جانے پر حاصل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہو ہو کے لہو دل آنکھوں سے بہہ جانے میں مدت لگتی ہے اک عمر گزارے مر مر کے جب کوئی تو جینا آتا ہے

دل کا خون کرنے کے لیے ضبط و صبر زہر ہلاہل کا کام کرتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں جس سوز و گداز کے ساتھ ضبط کی تصویر کھینچ دی ہے کیفیات قلب کی محاکات کا نمونہ ہے ؎

یہ کیسا ضبط ہے سینے میں انگارے سے جلتے ہیں یہی آنسو ہیں کیا وہ اے جگر جو کم نکلتے ہیں

ضبط پر جگر صاحب کو غیر معمولی قدرت رہی ورنہ غم و آلام دنیا کا ہجوم و تواتر انھیں بے راہ رو و آوارہ بنا دیتا۔ شعر ہے ؎

زندگی تلخ و تمنائے اجل ننگ حیات خون سینے میں نہ کیونکر دل انساں ہو جائے

زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر کبھی کبھی آدمی کی زبان پر آجاتا ہے "اس سے تو موت ہی آجاتی" اس سے ب گو نہ تسلی ہو جاتی ہے اور کچھ نہیں لیکن جگر صاحب یہ بھی زبان پر نہیں لا سکتے اس لیے کہ تمنائے مرگ ننگ حیات ہے۔ ایسی شدت غم میں ضبط دل کا خون ہی بہا کر رہے گا۔۱ ایسے غم کے مارے پر ہزار افسوس ؎

حیف وہ جس سے شدت غم میں خواہش مرگ بھی نہیں ہوتی

ڈاکٹر لطیف حسین "رس" کے مقدمے میں لکھتے ہیں :-

"ان کی تمام زندگی ایک تہذیب مسلسل سے عبارت ہے اور یہی تہذیب مسلسل ان کے کلام کے علو اور زمین کا باعث ہے۔ درحقیقت جگر صاحب صاحب علم ہی نہیں صاحب باطن نبرگ بھی ہیں۔ جذب تو خیر ن پر طاری نہ ہو سکا البتہ وہ سلوک کی منزلیں ضرور طے کر چکے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کے علم و فضل نے انھیں مجذوب ہونے سے بچا لیا۔ وہ مصائب و آلام کے گرداب سے کچھ اس طرح نکلے کہ ہر گرداب بلا ان کی نمیر اور ان کی شاعری کے ارتقا کا باعث ہوا۔ خود جگر صاحب اپنی ولایت و قطبیت کے قائل نہ ہوں بہر طرح مجھے ان کے قطب ہونے میں شبہ نہیں ہے۔"

جگر صاحب کو ارتقائے غم کی منزلوں میں پے درپے زہر کے گھونٹ پینا پڑے ہیں ؎

کبھی دل کا ہوا خوں اور کبھی جاں آ گئی لب پر یونہی منزل بہ منزل آئی ہے عمر رواں میری

لیکن ان کے استقلال و ثبات کا کیا کہنا ؎

اگر مشکل ہے تیری راہ تو مشکل سہی۔ کیا ہے چلیں گے ہم بھی گرتے پڑتے جب تک پاؤں چلتے ہیں

بظاہر یہ شعر ناہموار سا ہے لیکن اس کی اکھڑی اکھڑی بندشیں اور لفظ "گرتے پڑتے" نے راہ کے نشیب فراز اور جگر صاحب کے استقلال و ثبات عزم کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ ہر چند جگر صاحب کو ضبط پر قدرت رہی اور نھوں نے زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بھی یہ دعوے کیے ؎

ہم اور وفا سے باز آئیں ایسا تو حضور الزام نہ دیں کیوں موت کو چاہے گا آخر وہ جس کو جینا آتا ہے

---

۱ یہ اسی غزل کا شعر ہے جس کے متعلق نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ کس جمالیاتی شان سے رنگ تغزل ں شعر میں چمک رہا ہے داد نہیں دی جا سکتی ایسے ہی شعروں کے لیے کہا گیا ہے ع وداعت شاعری جزوے است از پیغمبری [illegible]

جو حضور چیں بہ جبیں ہوئے کہا کس نے شورِ فغاں اٹھا　　رہے خیر برق نگاہ کی، کوئی دل جلا نہ دھواں اٹھا

لیکن ان زہر کے گھونٹوں کے ساتھ ان کو آبِ حیات کے گھونٹ بھی ملتے رہے جن سے تازہ دم ہو کر یہ اس مشکل راہ میں برابر قدم بڑھاتے رہے۔ یہ گھونٹ اس جھلک کی شکل میں تھے "جس کا حظ و انبساط، کیف و سرور بیان سے باہر ہے" یہاں ہم پھر انھیں کی زبان سے کچھ بیان کرنا برمحل سمجھتے ہیں۔ حدیثِ خودی صفحہ ۱۲۵ پر "کچھ باطنی کیفیتیں" کے تحت لکھتے ہیں:-

"یہ تھے وہ[1] رنگ جو طبیعت میں ودیعت تھے۔ میں نے ان کی پرستش کی۔ کیوں؟ اب کوئی اسے خبط کہے یا جنوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری زندگی انھیں سے ہے۔ رگ و پے میں یہی تھے۔ دل و دماغ میں یہی۔ جیسے کوئی والہانہ طور پر کسی کی پرستش کرے۔ میں بھی انھیں کی پرستش میں بھولا رہا ورنہ جان بوجھ کر کون غم مول لیتا ہے، کون گلزارِ حیات ویران کرتا ہے۔ یہ پرستش کیا تھی خود آرائی کا روگ جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی گیا۔

ہائے کیوں تو نے نظر بھر کے اسے دیکھ لیا　　لگ گیا روگ نیا دل کو خود آرائی کا

اپنی صورت دیکھ کر محوِ خود آرائی ہوں میں　　دل میں داغِ عشق ہے اک آئنہ میرے لیے

اس خود آرائی میں عمر گنوانے سے زندگی کیا راس آتی۔ اس تصویر کا دامن پاک رکھنے کے لیے طوفان سے لڑنا پڑا ہے۔ بڑے بڑے تھپیڑے سہے ہیں ؎

نہ پوچھو زندگی کس طرح گذری　　میں ہر ہر سانس پہ رو رو دیا ہوں

کشمکشِ حیات نے ہلکان کر دیا۔ مار ڈالا۔ دو ایک بار بے اختیار موت کی دعا لب پہ آئی مگر فوراً کسی نے چونکا دیا ؎

عظمتِ زیست بھو نتا ہے جگر　　موت کا خواستگار ہوتا ہے

پھر وہی میں تھا اور میری روش ؎

دل ہے سینے میں تو غم سے عہد و پیماں کیجیے　　موت کے ارمان سے جینے کا ساماں کیجیے

ان سب کیفیتوں (وہ باطنی کیفیتیں جن کا ذکر سطور بالا میں بزبانی جگر صاحب کیا گیا) سے عبارت ہے حسن کے تقاضے پورے ہونا۔ کیا خوب کہتے ہیں ؎

مآلِ زندگی ہے عشق کی تعبیر ہو جانا　　فدائے حسن یوں ہونا کہ خود تصویر ہو جانا

---

[1] یعنی ان کی فطرت کے اجزا جن کا ذکر اوراقِ ماسبق میں آ چکا۔

جگر صاحب ایمائے حسن سے عشق کے رنگ میں ہر سانس پر نکھرتے چلے گئے آخر آخر ان کی زندگی سرتا پا حسین وجمیل ہو گئی۔

میں ذکر کر رہا تھا ان کیفیتوں کا جن کی ہم آغوشی میں جگر صاحب اکثر مسرور و مدہوش ہو گئے لیکن ان کی لذت تقریر نے ذرا بہکا دیا۔ اب پھر وہی سلسلہ انھیں کی زبان سے شروع کرتا ہوں۔ حدیث خودی صفحہ ۱۲۷ پر لکھتے ہیں۔
" پھر یہ کیفیتیں بھی پیدا ہوئیں اور کئی کئی دن تک دل و دماغ بلکہ تمام ہستی پر کیف و سرور کا عالم طاری رہا ہے ور میں کھویا کھویا سا رہا ہوں ؎

بالیدگی روح ہے یا جلوۂ نگار — پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لیے ہوئے

نہ جانے زخم دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی — پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

ابھی کہ اب میں ان کی نظر پر نثار ہوں — دل میں اتر گئے ہیں مرے گلستاں کئی

نفس عنبر فشاں، مسرور دل، آنکھیں منور ہیں — وہ یاد آیا کہ ہوتی ہے سحر صحن گلستاں میں

شب فراق تھی یہ غم کی محویت جیسے — وہ دلنوازِ جگر ہم سے ہم کلام رہا

یہ تخئیل کے گل بوٹے نہیں۔ جگر صاحب نے تخئیل سے کمہار کا کام لیا ہے مٹی کا نہیں۔ انھوں نے شروع سے خر تک وہی لکھا ہے جو سوچا سمجھا اور محسوس کیا ہے۔ یہ ان کی کیفیات و واردات قلب ہیں جو تغزل کے نہایت دلکش ل میں پیش کی گئی ہیں۔ اس خلوص و صداقت میں جگر صاحب آپ اپنی مثال ہیں۔ یہاں ہمیں کہہ دینا پڑتا ہے "ستیم شیوم سندرم" دوسرے شعر میں ایک واقعہ منضبط ہے جو انھوں نے "خواب پریشاں" میں بیان کر دیا ہے۔ رجوان کی صداقت نگاری کا ایسا ہی ثبوت ہے جیسے سورج اور روشنی کا۔ لکھتے ہیں :۔

" ... اس کیفیت و سرور کی جو تنہائی رات تھی کبھی نہ بھولے گی۔ جاڑوں کے دن تھے غالباً جنوری ۱۹۳۹ء کوئی تاریخ تھی۔ دن بھر تو بے حد افسردگی بلا وجہ دل پر مسلط رہی۔ اسی حالت میں بستر پر پہنچا۔ آدھی رات گذر چکی ں، میں جاگ رہا تھا۔ صبح سے جو غم کی حالت طاری تھی اب بس اس میں ڈوبا ہی جا رہا تھا کہ دفعتاً سینہ میں روازہ سا کھلا، روشنی بھر گئی اور میں ہمہ تن سرور تھا۔ یہ چشم زدن کی بات تھی۔ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے سات ٹھ روز تک یہ کیفیت رہی۔ اسی حالت میں سامنے کی تمام چیزیں بے روح اور بے رنگ معلوم ہوتی تھیں جیسے

ہیولانی خاکے۔ اس زمانہ میں ایک غزل کہہ رہا تھا اس کیفیت کو بھی نظم کر دیا ؎

نہ جانے زخم دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی　　پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

اس حسین وجمیل بلکہ نورانی زندگی کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے آستانے پہ سر جھکا دیں۔ جگر صاحب کو خود اپنی اس عظمت کا احساس ہے۔ رباعی ؎

آئینۂ عشق ہے فسانہ میرا　　معمور حیات ہے ترانہ میرا
دعویٰ جسے رما کے بیٹھا ہوں جگر　　سجدہ کی جگہ ہے آستانہ میرا

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اس بلندی پہ آج پہنچا ہوں　　جس طرف دیکھتا ہوں پستی ہے

اس رفعت وعظمت کے باوجود پندار، غرور یا خود نمائی کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑا۔ آپ بیات کے حربوں کے وہ نمونے ہم نے پیش کیے جن سے جگر صاحب کو اپنی مشکل راہوں ہی زندگی ملتی رہی۔ ان کی جان تھکنے نہیں پائی بلکہ اس میں منزل بہ منزل تازگی پیدا ہوتی گئی۔ جگر صاحب کا شعر ہے ؎

دیکھی ہیں ہم نے ان کی تلون مزاجیاں　　گزرے ہیں ہم پہ دور بہار و خزاں کئی

بادی النظر میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے شادی وغم کے بہت سے دور دیکھے ہیں یہ بھی صحیح ہے۔ اور جو میں سمجھا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے یعنی ان کی بے تابی روح کے تقاضے پورا کرنے کے لیے وصل کی نشاط انگیز روح افزا کیفیتیں بھی ان پر طاری ہوئیں اور فراق کی روح فرسا حالت بھی۔ مقدم الذکر کی شہادت میں چند اشعار پیش کر دیے گئے۔ اب موخر الذکر کا کچھ احوال لکھتا ہوں۔ ذیل کا شعر بھی پیش کیا گیا ؎

یہ کیسا ضبط ہے سینے میں انگارے سے جلتے ہیں　　یہی آنسو ہیں کیا وہ اے جگر جو کم نکلتے ہیں

اس شعر کے متعلق اپنی کتاب MYSTRIES OF MY MIND میں لکھتے ہیں:-

"جس رات میرے بیٹے نامی کو اجل آئی اس سے پہلے صبح ہی سے یہ شعر بار بار ایسی غم آگینی کے ساتھ دماغ میں گونج رہا تھا جیسی کبھی میں نے محسوس نہیں کی۔"

اس سانحے نے جگر ضبط وصبر کا باندھ تنکے کی طرح توڑ کر بہا دیا۔ آخر ہر چیز کی حد ہونی چاہیے۔ سچ کہا ہے۔ ؎

دکھ ہو تو سہہ بھی لے کوئی۔ ہو بوجھ اٹھا بھی لے　　سر پہ پھٹے پہاڑ تو پھر کیا کرے کوئی

اس صدمے کے بعد ان کی زندگی میں زلزلہ آگیا۔ حدیث خودی صفحہ آخر پہ لکھتے ہیں:-

"۱۹۴۲ء میں جو نور نظر نامی کو اجل آئی میرے دل ودماغ میں انقلاب عظیم آگیا۔ تمام خیالات ومعتقدات میں غیر معمولی تزلزل پیدا ہوگیا تسلیم ورضا کا زعم بالکل باطل ثابت ہوا۔ میرے لیے دنیا ویران تھی۔ چاروں طرف

ستا تھا۔ شعر و سخن خصوصاً غزل کا مشغلہ نحس معلوم ہونے لگا۔ کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی تھی ؎

گر خدا ہے بھی تو معتقد ورنہ خدا کچھ بھی نہیں غم ہی غم ہے دہر میں غم کے سوا کچھ بھی نہیں

یہی نہیں MYSTRIES OF MY MIND میں لکھتے ہیں کہ "میں خدا کو بہت برا بھلا کہنے لگا۔ دراصل یہ الحاد چلتی پھرتی چھاؤں تھی بلکہ سلسلۂ ارتقا کی ایک سیڑھی آگے بڑھنے کے لیے۔ بھلا جگر صاحب جن کی رگ رگ میں حسن یا عشق سما چکا ہو۔ ذکر و فکر محبوب جن کا اوڑھنا بچھونا ہو اپنی زندگی کی منتہائی منزل سے روگردانی کر سکتے تھے۔ حدیثِ خودی کے اسی صفحہ پر اسی عبارت کے بعد مندرجہ بالا شعر کی توجیہ کے طور پر لکھتے ہیں:-

"پردے بہت رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان میں شاید ایک پردہ یہ بھی تھا ؎

غفلت کبھی ملال کبھی اور جنوں کبھی ان کے مرے حجاب رہے درمیاں کئی"

(باقی آئندہ)

محمد سخاوت مرزا

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

مصنفہ نظامی بہمنی

نظامی اردو کا سب سے قدیم پہلا شاعر ہے۔ جس نے ایک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھی ہے۔ یوں تو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت امیر خسرو، حضرت خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ کے قدیم اردو میں اشعار ملتے ہیں۔ اور مولانا سعد سلیمان[1] لاہوری کا دیوان ہندی بھی بیان کیا جاتا ہے مگر وہ ناپید ہے۔ ہماری ناقص رائے میں سب سے پہلا شاعر نظامی ہے جس کا مستقل کارنامہ مثنوی کدم راؤ ہے۔ نظامی کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں البتہ مثنوی زیر بحث کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان علاؤ الدین احمد شاہ بہمنی (۸۳۸ھ - ۸۶۲ھ) ابن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی (۸۲۵ھ - ۸۳۸ھ) کا معاصر اور درباری شاعر تھا۔ جس نے ان دونوں سلاطین کی مدح کی ہے۔

نظامی کا نام فخر الدین تھا۔ جس کا ایک شعر میں اشارہ ہے۔ بیدر شریف قدیم دار السلطنت بہمنیہ میں ایک مقبرہ فخر الملک[2] کا موجود ہے۔ تاریخ سلاطین دکن میں اس کو فخر الملک ترک[3]، نیز ایک جگہ فخر الملک[4] دکنی (وفات ۹۱۶ھ) بھی بیان کیا گیا ہے۔ جو مشہور وزیر محمد گاواں کا داماد تھا اور بڑے بڑے معرکوں میں اس نے حصہ لیا تھا۔ اور یوسف عادل شاہ خاں کا بھی رفیق رہا۔ اس کا مقبرہ حضرت خلیل اللہ بت شکن ابن شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی کے مقبرہ سے مماثلت رکھتا ہے۔ مگر ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ

---

[1] پنجاب میں اردو، مولفہ محمود شیرانی مطبوعہ۔

[2] یادداشت احقر متعلقہ دار السلطنت بہمنیہ بیدر شریف قلمی

[3] سلاطین دکن ص ۵۹۸

[4] فخر الملک ص ۶۶۸ سلاطین دکن مطبوعہ

بھی فخر الدین نظامی تھا؟ بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ نظامی سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی بانی سلطنت
بہمنیہ کا معاصر تھا، مگر جب اس نے علاء الدین بہمنی اور اس کے پدر بزرگوار سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کا ذکر کیا
ہے تو ہم یہ کس طرح قرار دے سکتے ہیں کہ وہ حسن گنگو بہمنی متوفی (۷۵۹ھ) کا معاصر تھا۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب
اور مولوی عبد الحق مرحوم نے نظامی کو نظام شاہ بہمنی (۸۶۵/۸۶۷ھ) الملقب بہ احمد شاہ کا درباری شاعر قرار
دیا ہے۔ جس سے ہمارے مکرم افسر امروہی صاحب کو اختلاف ہے۔ استدلال یہ ہے کہ "نظام شاہ کم عمر تھا
بوقت تخت نشینی اس کی عمر آٹھ نو سال سے زائد نہ تھی تو اس کا درباری کیسے ہو سکتا ہے۔ اور تخلص نظامی رکھنا
نظام شاہ کے نام کی مناسبت سے لازمی نہیں ہے" وغیرہ۔ مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ سلطان نظام شاہ بہمنی کے
دربار میں بڑے بڑے فضلا اور شعرا موجود تھے۔ دربارداری کے لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ سلطان وقت کم سن ہو،
شعرا تو فقط نام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بہر حال نظامی کا سلطان علاء الدین بہمنی الملقب بہ احمد شاہ کا
معاصر ہونا اور پھر خود اس کا سلطان کی مدح سرائی کرنا، اس کے اشعار مندرجہ مثنوی سے ظاہر و باہر ہے اور
اس کی مثنوی کی تصنیف کا زمانہ عہد سلطان علاء الدین احمد شاہ بہمنی (۸۳۹/۸۶۲ھ) ابن احمد شاہ ولی البہمنی ہونے
میں کوئی شبہ نہیں معلوم ہوتا۔ زبان کی قدامت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ نظامی کے مابعد
شاعروں میں ایسی سخت زبان کی پیچیدگی موجود نہیں۔

سلاطین بہمنیہ کے سکہ جات پر ایک مستقل طویل مضمون ڈاکٹر اسپیٹ سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ کا رسالہ
اسلامک کلچر (انگریزی)[2] حیدر آباد دکن میں شایع ہو چکا ہے اور بھی بعض مقالے اور کتابیں موجود ہیں نیز عجائب خانہ
حیدر آباد دکن میں بہمنی سلاطین کے سکے محفوظ ہیں نیز خانگی اشخاص[3] کے پاس بھی ہیں۔

سلطان علاء الدین احمد شاہ بہمنی ابن سلطان احمد شاہ ولی البہمنی کے سکہ جات کی عبارتیں درج ذیل ہیں۔

سکہ ۱

علاء الدنیا والدین
احمد شاہ بن احمد
شاہ السلطان

---

[1] قومی زبان، کراچی، ستمبر ۱۹۵۷ء۔
[2] اسلامک کلچر انگریزی ۱۹۳۵ء
[3] سکہ جات بہمنیہ مخزونہ کتب خانہ سید محمد بیدری حال مقیم کراچی

سکہ ۲

سکہ جات مسکوکہ ۸۴۰ھ تا ۸۵۸ھ۔ گویا یہ اٹھارہ سال کے سکے ہیں

سیدھا رخ:
المتوکل
علی اللہ الغنی

بایاں رخ:
احمد شاہ
بن احمد شاہ
الولی البہمنی

نمونہ نمبر ۳

احمد شاہ
ابن احمد شاہ
بہمن شاہ

سکہ ہمایوں شاہ بہمنی ۸۶۲ / ۸۶۵ھ

بایاں رخ:
علاؤ الدنیا والدین
ہمایوں شاہ بن احمد شاہ
ابن احمد شاہ ولی البہمنی

سیدھا رخ:
المتوکل
علی اللہ القوی الغنی
ابو المغازی
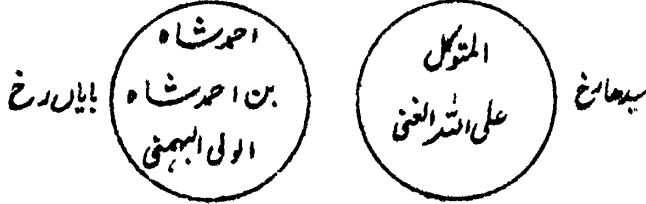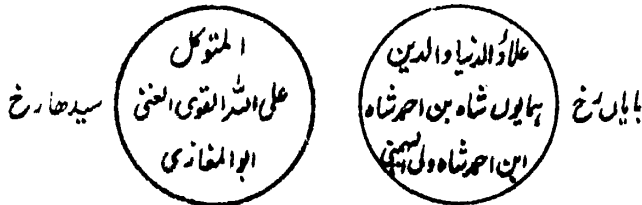
سلطان نظام شاہ کے سکوں میں بھی اس کو احمد شاہ سے مخاطب کیا ہے بلکہ اس کی ولدیت بھی موجود ہے، جس سے اس بات کا شبہ باقی نہیں رہتا کہ نظام شاہ بھی سلطان احمد شاہ سے ملقب تھا۔ چناں چہ اس کے سکہ جات کی عبارت[1] یہ ہے :۔

نمونہ ۱ سکہ جات (۸۶۶ / ۸۶۷)

الراجی
بتائید الرحمٰن

احمد شاہ
بن ہمایوں شاہ
البہمنی

---

[1] رسالہ اسلامک کلچر انگریزی مضمون ڈاکٹر الیسٹ پروفیسر جامعہ عثمانیہ

نمونہ نمبر ۲
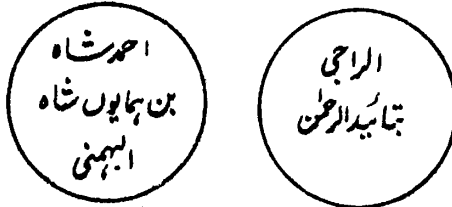
نظام شاہ ابن ہمایوں شاہ بہمنی ۸۶۵ھ میں بعمر ۸ سال تخت نشین ہوا اور ۸۶۷ھ میں دفعتاً فوت ہوگیا۔
ممکن ہے کہ نظامی نے یہ مثنوی[۱] سلطان علاء الدین احمد شاہ ثانی بہمنی (۸۳۸/۸۶۲ھ) کے زمانے میں لکھی
، مگر وہ اس کو سلطان کے پاس پیش نہ کرسکا ہو۔ چناں چہ سلطان علاء الدین کی مدح کے عنوان میں اس کے
م کے ساتھ "نوراللہ مرقدہٗ" لکھا ہے۔ مخفی نہ رہے کہ ہمایوں شاہ بہمنی کا زمانہ سخت افراتفری اور ظلم و ستم کا تھا
ناں چہ وہ ظالم مشہور ہے۔ کسی دل جلے نے تاریخ وفات نکالی ہے ؎

ہمایوں شاہ مرد و رُست عالم تعالی اللہ زہے مرگ ہمایوں

نظامی نے اس کی والدہ مخدومہ جہاں جو اس کی کم سنی کی وجہ سے ایجنٹ تھی اس مثنوی کو پیش کیا ہو۔
ر ایسی بعض مثالیں قطب شاہی دور میں بھی ملتی ہیں۔ چناں چہ "قطب مشتری" وجہی۔
بہر حال نظامی کا علاء الدین احمد شاہ ثانی (۸۳۸/۸۶۲ھ) کا معاصر ہونا تو قطعی ہے۔ علاء الدین حسن گنگو بہمنی
(۷۴۸/۷۵۹ھ) کے دور سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ حسن گنگو بہمنی کے بیٹوں میں احمد شاہ نامی کوئی شہزادہ
یں تھا۔ البتہ احمد شاہ ولی البہمنی اس کا پوتا اور اس سلسلہ کا نواں بادشاہ تھا۔ احمد شاہ ولی البہمنی برادر
وز بہمنی ابن سلطان داؤد شاہ ابن سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی۔ گویا احمد شاہ ولی حسن گنگو بہمنی کا بیٹا
ں بلکہ پوتا تھا اور بلحاظ تخت نشینی نواں بادشاہ تھا۔
حسن گنگو بہمنی جلوس ۷۴۸ھ سے احمد شاہ ولی بہمنی جلوس ۸۲۵ھ۔ ۷۸ سال کا تفاوت ہے۔
اس مثنوی کے صحیح نام کا پتہ نہیں چلتا۔ در اصل یہ کوئی عشقیہ افسانہ نہیں ہے۔ راجہ کدم راؤ اور اس کے وزیر
م راؤ کا افسانہ ہے۔ اسی مناسبت سے نصیر الدین ہاشمی مرحوم اور مولوی عبدالحق بابائے اردو مرحوم نے اس مثنوی کو
م راؤ ہی سے موسوم کیا ہے۔ اس کا ماخذ کوئی قدیم سنسکرت قصہ ہے۔ ہندو اعتقادات کے لحاظ سے یہ قصہ

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ مخطوطہ انجمن ترقی اردو۔
تذکرہ سلاطین دکن مؤلفہٗ عبدالجبار خاں ص ۶۸ مطبوعہ۔

آماگون پرتو مبنی نہیں، البتہ اس کے مماثل قالب بدلنے کی مہارت سے متعلق ہے جس کی مشق اور کمال قدیم سنیاسیوں کو حاصل تھا۔ دراصل نظامی نے راجہ کدم راؤ کے طوطے کے قالب میں منتقل ہونے اور اس کے وزیر کی چالاکی اور دغابازی کا قصہ بیان کیا ہے ایسے قصے ہندو دھرم میں رائج ہیں۔

نظامی نے ایک جگہ "سنگھاسن" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سنسکرت میں ایک کتاب سنگھاسن بتیسی بہت مشہور ہے جو راجہ بھوج والی دھار انگر کے ایک درباری شاعر نے لکھی تھی جس میں راجہ کے محل کی بتیس تپلیوں سے ایک علیٰحدہ علیٰحدہ کہانی کہلوائی گئی ہے، ممکن ہے کہ یہ قصہ شاید اُن ہی میں سے ایک ہو۔

ہمارے ہندوستان کے ایک ادیب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک کتاب قدیم مثنویوں پر تالیف کی ہے جو قدیم سنسکرت قصوں سے ماخوذ ہیں۔ مگر فاضل مؤلف نے ان کہانیوں کی تفصیل نہیں دی، صرف سرسری اشارہ کر دیا ہے کہ یہ عورتوں کی بدچلنی سے متعلق ہیں۔ ان تصانیف میں مثنوی کدم راؤ زیر بحث کا بھی ذکر ہے، مگر اس کے ماخذ اور صحیح موضوع کے اظہار سے معرا ہے اور اشعار کی تعداد بحوالہ ہاشمی مرحوم ۴۲۵ لکھی ہے وہ بھی غلط ہے۔

البتہ متاخرین میں شاہ حسین حقیقت لکھنوی ثم مدراسی کی ایک مثنوی "ہیرامن طوطا" تصنیف ۱۲۶۸ھ میری نظر سے گزری جو کاپیتھ پریس سے باتصویر شایع ہوئی تھی کدم راؤ کا قصہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ جس کے بعض اہم عنوانات یہ ہیں:-

۱ - تصویر بادشاہ اور سیاح کی اور مسافرخانہ، سکھانا سیاح کا علم کایا پلٹ بادشاہ کو۔
۲ - تصویر بادشاہ اور وزیر کی اور بتانا بادشاہ کا علم کایا پلٹ وزیر کو۔ اور جانا بادشاہ اور وزیر کا شکار کو، اور ہرن ہو جانا بادشاہ کا، اور بادشاہ بن جانا وزیر کا۔
۳ - جانا بادشاہ کا بقالب آہو، اور دیکھنا ایک مردہ طوطے کا اور قالب آہو کو چھوڑ کر طوطے میں آنا۔
۴ - تصویر صیاد و طوطا اور مہاجن بچہ کا مع روپیہ کے اور قد آدم آئینہ کا اور میسوا کا۔
۵ - تصویر بادشاہ زادی کی مع مکان اور طوطے کی مع پنجرہ کے۔
۶ - قصہ کہنا طوطے کا اپنی شہزادی سے، اور سننا شہزادی کا پنجرہ طوطے کا ہاتھ میں لے کر (مع تصویر)
۷ - آنا وزیر کا بادشاہ کے گھر میں، اور اٹھنا بادشاہ زادی کا اس کی تعظیم کو اور بٹھانا تخت پر (مع تصویر)
۸ - کایا پلٹ دکھانا وزیر کا بادشاہ زادی کو مرغ بے جان میں، اور مار ڈالنا شہزادی کا وزیر کو اور آنا بادشاہ کا اپنے قالب میں طوطے سے (مع تصویر)

مخطوطہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

یہ کتب خانۂ خاص بابائے اردو مرحوم (مولوی عبدالحق) کا ایک نادر و نایاب مخطوطہ ہے۔ آخری حصہ کچھ
قص ہے تب بھی یہ ۹۹۴ اشعار پر مشتمل ہے۔ مولوی ہاشمی صاحب نے ان کی تعداد ۶۸۷ د۔ افسر امروہی صاحب نے
۱۰۳ ابیات بیان کی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہم نے ہر باب کے اشعار کی تعداد سطور مابعد میں کر دی ہے۔
سنہ کتابت اور مقام درج نہیں۔ اس مثنوی کے ساتھ ایک دوسری مثنوی بدیع الجمال، ایک نامعلوم شاعر
امین تخلص کی اس کے ساتھ شیرازہ بند تھی، جو جلد بندی میں علٰحدہ کر دی گئی۔ دونوں مخطوطات بلحاظ کاغذ و نہج
خط، ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔ آخر الذکر مثنوی میں عادل شاہ بیجاپور کا ذکر ہے۔ غالباً یہ سلطان علی
اول شاہ اول معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ کہتا ہے ؎

کیا شاہ جگ کوں علی داد گر — رکھیا عدل سوں ملک آباد کر
لکھیا خوب تھا شاہی دکے "بخت" میں — تو تاریخ ہوئی تس کے تجہ وقت میں

اگر لفظ بخت سے ۱۰۰۲ھ تاریخ نکلتی ہے تو یہ ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸/۱۰۳۷ھ کا عہد قرار پاتا ہے۔

سو ہے نام شاہی ایسے شاہ کوں — جنی جوت دیتا سُرج ماہ کوں
ارے جیواب مدح تس کا بکھان — کہ جس کاری ہے غاشدار آسمان
سلیماں مکاں شاہ جمشید جاہ — سکندر اعلی بھوج عادل شاہ

یعنی یہ بیان کرتا ہے کہ اگر یہ شاہی کے "بخت" میں یعنی قسمت میں لکھا تھا کہ میں اس قصۂ بدیع الجمال
نظم کروں تو یہ تاریخی مادہ تجھ جیسے بادشاہ کے زمانہ میں مستخرج ہوا۔
مکرمی افسر امروہی کا خیال ہے کہ رسم الخط کے اعتبار سے اس کی کتابت دو سو برس پہلے کی کہی جا سکتی
ہے مگر ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اگر دو سو برس قبل کی کتابت تسلیم کی جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے
اس کی کتابت ۱۱۸۴ھ یعنی آخر بارہویں صدی ہجری میں ہوئی ہے۔ مگر ایک مخطوطہ ولایت نامہ قریشی بیدری
کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اس کا رسم الخط بھی ایسا ہی ہے اور یہ تصنیف بھی ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانہ
کی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی کتابت تین چار سو سال قبل کی معلوم ہوتی ہے، جو عہد عادل شاہی میں بمقام
بیجاپور ہوئی۔

عنوانات:۔

۱۔ گفتن کدم راؤ بانا کپنی — ۱۴ بیت

۲ - رفتن پدم راؤ خلعت کردن کدم راؤ را ۔ — ۹ بیت

۳ - گفتن کدم راؤ قصہ کوریال و ناگن بارانی خود — ۲۳ بیت

۴ - عرضداشت رانی باراؤ — ۴۴ بیت

۵ - بازگفتن راؤ بارانی — ۳۵ بیت

۶ - کدم راؤ قبول نکرد آں پدم راؤ — ۲۱ بیت

۷ - تعریف کردن پدم راؤ کہ کدم راؤ کونہ است — ۱۴ بیت

۸ - گفتن پدم راؤ مضرت صحبت مسافرآں و جوگی و جنگم وغیرآں — ۶ بیت

۹ - تفت شد کدم راؤ بر پدم راؤ — ۸ بیت

۱۰ - بازگفتن پدم راؤ کہ صحبت جوگی و مسافر نگیرد — ۲۹ بیت

۱۱ - کدم راؤ بازرگانی پدم راؤ ربا ررا — ۱۹ بیت

۱۲ - تشریف دہائیوں مدھر بدھ وزیر احتشام را — ۱۳۱ بیت

۱۳ - پشیمانی نوردن اکھرناتھ جوگی کہ راؤ شدہ است — ۲۹ بیت

۱۴ - بازدادن اکھرنات جوگی کہ راؤ شد — ۹ بیت

۱۵ - عرضداشت کردن مدھر بدھ وسن پردھان جوگی جکے راؤ شدہ است — ۱۶ بیت

۱۶ - گفتن اکھرنات جوگی با وزیر — ۳۴ بیت

۱۷ - فرمایش ناپسندیدہ کردہ اکھرنات راؤ شدہ است — ۵ بیت

۱۸ - فرمایش نامعقول کردہ — ۳۵ بیت

۱۹ - تفت شدن اکھرنات جوگی بر مدھر بدھ وزیر — ۲۶ بیت

〃 〃 〃 〃 — ۷۹ بیت

۲۰ - کدم راؤ طوطی شدہ است ؛ فرمایش پدم راؤ بودہ است — ۱۲ بیت

۲۱ - سرخی : - کوادں مولودی کوئی اپ جیر عیس را بگوید مارا بگیر — ۵۵ بیت

۲۲ - 〃 - چناں توبہ کردم راؤ روح کہ توبہ از توبہ نصوح ا — ۲۱ بیت

۲۳ - 〃 - فہم نکردن پدم راؤ سخن کدم راؤ کہ طوطی شدہ است — ۴۱ بیت

۲۴ - 〃 - گفتن کدم راؤ طوطی شدہ است — ۶۷ بیت

۲۵ - 〃 - عذرخواہی کردن پدم با کدم — ۳۰ بیت

۲۶۔ سرخی، گفتن کدم راؤ با پدم راؤ کہ خاطر خود جمع دار ۱۷ بیت
۲۷۔ " " پدم راؤ گفتن کہ سخن پوشیدہ باید کرد ۱۰ بیت
۲۸۔ " " رفتن کدم راؤ در محل خرم دریافتن عیش خورمی

کدم راؤ کے قصہ کا خلاصہ یہ ہے:۔
یہ کوئی عشقیہ افسانہ نہیں، بلکہ ایک قدیم کایا کلپ کا افسانہ ہے، جس کا ماخذ کوئی سنسکرت قصہ معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ راجہ کدم راؤ جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس کی ملاقات مسمی اکھرنات جوگی سے ہوگئی۔ اس نے کہا کہ مجھے کایا کلپ یعنی قالب بدلنے کا ہنر آتا ہے۔ راجہ کے وزیر پدم راؤ نے جب یہ سُنا تو راجہ کو کئی مرتبہ نصیحت کی کہ ان جوگیوں اور سیاحوں کی صحبت اچھی نہیں ہوتی۔ آپ سخت نقصان اٹھائیں گے۔ مگر راجہ نے ایک نہ سُنی اور اس جوگی سے قالب بدلنے کا عمل سیکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ کدم راؤ ایک طوطے کے قالب میں منتقل ہوگیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اکھرنات جوگی خود راجہ کے قالب میں منتقل ہوکر بادشاہ بن بیٹھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب راجہ نے پدم راؤ وزیر کی بات نہ سنی تو اس نے جوگی سے سازش کرلی۔ چناں چہ اس کی اس حرکت کو کدم راؤ نے بری نظر سے دیکھا اور کہا کہ خیر تیرا بھی انجام اچھا نہ ہوگا۔ کدم راؤ کے دوسرے وزیر مدھر بدھ نامی کو جوگی نے پہلے تو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا۔ مگر جوگی کی یہ حرکت کہ خود بادشاہ بن بیٹھا ہے ناگوار تھی، جوگی اور وزیر مدھر بدھ میں ایک مرتبہ باہم سخت گفتگو ہوئی تو جوگی نے کہا کہ میں کیا کروں جو کچھ میں نے کیا اس کی تمام ذمہ داری پدم راؤ وزیر پر ہے۔ آخر میں کدم راؤ جو طوطا ہوگیا تھا پدم راؤ کو ڈانٹتا ہے اور وہ اپنے فعل پر نادم ہوکر راجہ کدم راؤ سے معافی مانگ لیتا ہے اور جوگی کے ذریعہ راجہ کو پھر اپنے اصلی قالب میں منتقل کرادیتا ہے اور راجہ خوشی خوشی اپنے محل میں جاکر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

حمد ۲۹ بیت

آغاز:۔

گسائیں تھیں ایک دنہ جگ ادآر	بروبر دنہ تھیں دینھار
اے میرے آقا توہی ایک ہے تیرے سوا دنیا میں کوئی نہیں	بحر و بر دونوں کو دنیا میں توہی دینے والا، (یعنی سرسبز و شاداب رکھنے والا)
اکاس انچہ، پاتال دھرتی تھیں	جھاں کچھ نکوئی تھاں ہے تھیں
یہ اونچا (بلند) آسمان، یہ پست زمین تیرے ہی ہے	جہاں کسی چیز کا گزر نہیں وہاں توہی ہے
رجنھار[1] انگھیے رجنھار توں	رھنھار پچھیں رھنھار توں

توہی اول ہے۔ توہی آخر اور پائندہ ہے (یعنی ابدالاباد رہے گا) تجھی کو بقا ہے

---

[1] رجن ہار = راج کرنے والا، حاکم

نظامی سے کنھ عاجب یارہوئی ستھا رسُن نغز گفتار ہوئی

(نظامی جیسے سخن گو کا جو دوست ہو۔ تو سننے والا اس کے کلام کو سُن کر ضرور نغز گفتار ہو سکتا ہے)

نعت :۔ مع مناقب خلفا راشدین ۲۲ بیت

رتن چار تھے لی کیبی چار جن رتن بیچ میں جم رہی جیو کھن

چار آبدار موتی تھے جن کو چار شخص لے گئے یعنی وہ دربے بہا ہو گئے اور اس دربے بہا کے درمیان ہمیشہ آسمان کی طرح قائم رہے یعنی اپنی آب و تاب کو قائم رکھا

ابابکر ساچا، عمر کا نیاؤ[1] کہ عثمان بھنڈاری[2] علی کھول داؤ[3]

حضرت ابو بکر سچے اور حضرت عمرؓ باوقار تھے اور حضرت عثمان بڑے مہمان نواز۔ اور حضرت علی گویا تلوار کے دھنی تھے

عطارد مسخر ہوا لے قلم مسخر کیا سور دے ہت علم

عطارد مسخر ہو گیا اور اس نے ہاتھ میں قلم لے لیا یعنی اس کے دار الانشا کا میر منشی بن گیا۔ سورج نے اس کے ہاتھ میں علم دے کر عطارد کو مسخر کر لیا۔

علم گاڑ کھن، سور چل سرا چاؤ طبل ڈھول برغوں بدل[4] توں بجاؤ

آفتاب نے آسمان پر علم گاڑ کر یعنی جھنڈا نصب کر دیا اور اپنا سر اٹھا کر چلتا بنا۔ اور بادل سے کہا کہ تو طبل، ڈھول اور برغوں بجانا شروع کر دے۔

چمکن لگے جب لتاث[5] ھیسر چڑھا وا کیا دھرت اکاس پر

جب ستارے خصوصاً آسمان پر قمقموں کی طرح لٹک لٹک کر چمکنے لگے تو زمین کو آسمان پر سربلندی حاصل ہو گئی۔ وہ فخر کرنے لگی۔

نام و تخلص شاعر :۔ سنور فخر دیں اب کیتے سنورے الوالامر اپنا اسی سنورسی

اے فخر الدین اب تو کس طرح سنور سکتا ہے؟ اولوالامر کو اپنانے ہی سے سنور سکتا ہے (یعنی الوالامر کی اطاعت ہی سے سرخروئی حاصل کر سکتا ہے)

نظامی[6] اوپر پھیری ایک چکہ رتن لال، موتی، بھری تیں[7] مکہ

غالباً نظام شاہ بہمنی یا سلطان وقت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو اگر نظامی پر ایک نظر کرم پھیر دے یعنی ڈالے تو اس کا منہ جواہر، لعل اور موتیوں سے بھر جائے گا۔

---

[1] نیاؤ (دھ) = عدل۔ [2] بھنڈاری = خزانہ دار۔ [3] داؤ = ماہر جنگ؛ [4] بدل = بادل۔ [5] لتک؛ [6] نظامی [7] تیرا۔

عنوان "مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقدہٗ" ۹ بیت

بڑا شاہ وو شاہ جس شاجگا دجگ رہیں سیوق[1] جوزم[2] تس پاے لگ

وو بڑا بادشاہ ہے اور ایسا جگت کا بادشاہ ہے جس کے پاؤں تلے سب غلام ہیں؟

انھیں[3] ستہ کیا شاد دکھن دھرن گگن دل[4] دھرت دل مسخر کرن

وہی بادشاہ ہے جس نے سرزمین دکن و شاد و آباد کر دیا۔ آسمان و زمین کے طبقات کو مسخر کر لیا۔

محاورے اور ضرب الامثال :-

بھلا سے کوں بھلائی کرے کچھ نہ ہوئے برے کوں بھلائی کرے ہوے توٹے

بھلے آدمی کے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو کچھ نہیں ہوتا۔ بُرے کے ساتھ بھلائی کرنا گویا اس کو اپنا نقصان ہے۔

جو کچھ کال[5] کرنا سو توں اَجکر نہ گھال[6] آج کا کام توں کال پر

(آج کا کام کل پر مت ڈال)

نہ سنیا کتارا[7] کمر ساہ ھوئے دوگن جو رکوں لاب کالاہ ھوئے

کٹار کمر ہی پر سہاتی ہے۔ دوگن (سوت) اپنے فائدہ کو ہی دیکھتی ہے۔

دُنی[8] جھوٹ ہے، جیونا[9] جھوٹ جان نکو جیو کدلا[10] نہ نیرنگ اس آن

(دنیا جھوٹ ہے اور زندگی بھی جھوٹ یعنی سراب ہے) تو پھر تو اپنے دل کو کیوں مکدر کرتا ہے۔ نیرنگی اچھی نہیں۔ بقول: دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا۔

کہے بات رانیں کہ تجہ چھانو بل ہمیں جیونا جرم تجہ کاؤ[11] تل

رانی نے یہ بات کہی کہ میں صدقہ جاؤں تیرے سائے تلے ہم کو جینا بہتر ہے؟

دکھ سکھ :-

کہ جے توں بوے مُنجھے دُکہ نہ جے بولیا کرے بھی مجے سُکہ نہ ۸۴

تو جو مجھ سے کہے گا اس سے مجھے کوئی دکھ نہیں، اور جو تو کہہ کر گزرے گا اس سے مجھے کوئی سکھ نہیں۔

اتال :- سبولیا[12] تجھے جو نہتا[13] بولناں اتال[14] ایک سجری[15] رہیا کولناں

تجھے جو بولنا نہ چاہیے تھا وہ تو تو نے کہہ ڈالا۔ اب ایک سجری کھولنا باقی رہ گیا ہے۔

---

[1] سیوک۔ [2] جسم۔ [3] وہی۔ [4] دل بمعنی طبق۔ [5] کال = کل۔ [6] اج = آج۔ [6] گھال = گھال۔ گھالنا۔ ڈالنا۔ [7] کتارا = کٹار، خنجر۔ [8] دنی: دنیا۔ [9] جیونا = جینا۔ [10] کدلا = گدلا، مکدر۔ [11] کاؤ = تنقید، نکتہ چینی۔ [12] سبولیا۔ [13] نہ تھا۔ [14] اب۔ [15] سجری = معمہ۔

مرے ناگن جیونٹاں[1] رات کھائیں جو اپری[2] کچھو[3] دیس چیلاں[4] اگھائیں[5]

ناگن مرجائے تو رات بھر میں اس کو چیونٹیاں کھا جاتی ہیں اور کچھ باقی رہ جاتا ہے تو دن میں چیلیں اسے کھاکر سیر ہو جاتی ہیں۔

کبھو[6] دو پہر رات رام[7] اور رام رھیا سوٹ[8] پر سوت اب دیکھ کام

چلیا سا[9] اندری ساندری ناگہ رات سلاؤں کدم راؤ تب ناگ جات

ناگ سانپ، رات کو آہستہ آہستہ چلتا رہا کہ جب تک کدم راؤ کو مت کی نیند نہ سلاؤں گا (تو) اس تن یہ ناگ چلتا رہے گا۔

بچارِیا[9] ہری پنکہ کیتا اڑدل کہاں تک اڑوں جائے کیہ ہر پڑوں

طوطے نے خیال کیا کہ سیر کتنا اور کہاں تک اڑوں اور کہاں جا کے پڑوں۔

قدم چھوڑ کے جانا:۔

بھلا بھی تہیں منجہ برا بھی تہیں ترے پائے (دکوں) چھوڑ جاسوں کہیں

میرے لیے اگر برا ہے تو تو ہی ہے اور بھلا ہے تو تو ہی۔ میں تیرے قدم چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

جو پاپی کرے پاپ سو نرکہ جائے کہ پکڑے اپس ٹانگ لے آپ پائے

جو گنہگار گناہ کرتا ہے تو وہ خود اپنے کیے کو آپ بھگتتا ہے۔ بقول؎ خود کردہ را علاج نیست۔

اڑھل (اڈول): ۔نہیں جھکنے والا مستحکم۔

کھڑا تیر ہو جیوں رھیا تھا ادھل کماں ہو پڑیا پنکہ کے پائے تل[10]

جو تیر کی طرح سیدھا کھڑا رہتا تھا اور جھکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا یعنی بڑا متکبر اور شان والا تھا ایسے شخص نے کمان کی طرح پرندہ (طوطے) کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

جہاں توں دھرے پاؤ ہوں سر دھروں انیس سار کی لک تیڑ[11] ی[12] کروں

جہاں تو پاؤں رکھے وہاں میں اپنا سر رکھ دوں گا اور اپنی لاکھ مرتبہ تڑی غالباً تھری کروں گا۔

کرے کام اب توں کرے جیوں گوال[13] کھلاوے کسے پان مانگے اکال[14]

اب تو ایسے کام کر رہا ہے جیسے کوئی گھوسی کرتا ہے کسی کو پان کھلاتا ہے اور کسی سے اگال مانگتا ہے۔

آکاس کے تارے توڑنا:۔

کھوا[15] بھی بہت جھوبن نہ بول جور[16] جنگل دھرت آکاس تارے نہ توڑ

---

[1] چیونٹا۔ چیونٹی۔ [2] کچھ۔ [3] چیل۔ [4] سیر ہونا۔ [5] کبھی۔ [6] رام رام کرنا۔ [7] سوت کاتنا؟ [8] لق و دق جنگل۔ [9] بچارنا، سوچنا [10] طوطا۔ [11] پاؤں پر گر پڑنا۔ [12] شیخی کرنا۔ [13] گھوسی۔ [14] پان کا اگال۔ [15] ایک کیڑا۔ [16] زور (یا جور)

پاتال کی سدھ لانا۔ پاتال خبر لانا (تحت الثریٰ کی)

کھود مارنا۔

کمہ نہ لانا۔ منہ نہ دکھانا۔

کہیں جانوں پاتال کی سدھ لیوں | کہ کھود ماریں نہ کمہ آن لیئوں

جس گائے کا دودھ پینا اسی کی گانا سہ

جو جس گائے کا دودھ پیوے سو گائے | ہوی دیکہ پا کھیرا سے کاٹ کھائے (بیل)

پت کرنا :۔

کہ جی پت کرے دکہ منجہ دھرے | کہوں ایک تجہ بول جے پت کرے

سوا لاکھ لاب = سوا لاکھ فائدے

کھول کر کہنا :۔

سوا لاکھ منج لاب ایک بول تجہ | سوا ایئی کدھیں تیں (تونے) کھیا کھول نجہ

تیرا ایک بول میرے لیے لاکھ فائدے پر مبنی ہے۔ ایسا کبھی تونے مجھ کو کھول کر کہا ہے۔

تجھے نہ کہوں تو اور کس کو کہوں :۔

سیانا[1] کھر آت بدہ[2] ونت توں | تجھے نہ کہوں اور کس کو کہوں

اچھوتا آستاں :۔

کہ جے داب منجہ دین ہے تجہ دھیان | اَچھوتا اچھو منجہ تجہ آستان

غصہ میں دانت کرڈ کرڈانا :۔

بھر دانت کرریا اتھیا کوپ[3] کر | کھڑک[4] کارہ دوکا؟ مدھر مد پر

بھوندا۔ بھوندا دھرے من بہت دشت[5] بھاؤ | پیاری الک پیٹ[6] میں بیس[8] یاؤ یاؤ؟

بھوندا میری دشت[5] تل یوں دسے | کہ کسپٹ[9] پر یا بھوئیں اُپر جیوں دسے

کرے انکہ[10] او جَہل[11] بھت چھند بند | کہ دشت[12] انت تج کوں کہے سور چند[13]

نجانیں کہ پیری تھان تن دھری | تھا کا نکرا[14] دانت تل کیا کری

---

[1] ہوشیار۔ [2] عقلمند۔ [3] غصہ۔ [4] تلوار کھینچ لینا۔ [5] نظر۔ [6] پیٹ۔ [8] بیس پاؤ پیٹ میں پاؤں پسارنا۔ پیٹ کے گن۔ [9] نظر سے۔ گھاس پات۔ [10] انگ۔ آگے۔ [11] چُھل۔ [12] نظر کی انتہا۔ [13] چاند سورج۔ [14] کنکر۔ دانت تلے کنکر آجانا۔

سہدیسہ، پردیسہ۔ جو کچھ میں کہیا بھید سہدیسہ — کہوں اب کچ بھید پردیسہ

کھانڈ، کھاری = کھری کھانڈ کا سکہ مد پیو ناں — کھاری کرا دکھ سے جیو ناں

تل بھرے کھڑے نہ رہنا:۔

کرجے بول میرا سُنے تس کہوں — کرجے نہ سنے تل کھڑے نہ رہوں

بست = کہ اس بست تھیں بات دھوی جکوی — نہ کو کاندھیں ہوی رسوا نہ ہوی

تبیس، ۳۲، لکھن: جو بتیس لکھن کیرا ہوی تن — سوئیں تن اسے نورتی دھن بسن

الاس:۔ اکھرنات من میں اتھیا کر الاس[۱] — چلیا سات سکلی کدم راؤ باس

گانٹھ دینا:۔

گگن اور دھرتی سکوں کا نٹھ دی — سمندر سکوں ایک دم سوک[۲] دے

زمین آسمان کو گانٹھ دوں گا یعنی قلابے ملا دوں گا۔ ایک لحظہ میں سمندر خشک کر سکوں گا۔

بجرانک[۳] انجن انی بند دھار — تھنب جل گگن جا نوں اپار

تھگلی لگانا:۔

ادھاری[۴] کہ جی سنجھ بھائی کہیں — دیوں تھگلی چند سورج تھیں

باسی تواسی:۔

سو جیو کی تھون ہوں جو باسیے دھروں — نہ باسی دھروں نہ تو ایسے دھروں

نہ بڑا آج تھیں توں اس ابھا[۵] میں — تھیں دیکھ مکھ[۶] گھال گریباں منہ

ٹونا[۷] نامن:۔

نہ پوناں نہ تامن نہ چیپرا کروں — نہ چیتکی نہ کون پال نیری دھروں

نہ پارا[۸] نہ تانبا نہ سیسا کھپر — کروں لوہ کے کھان بھنکار ابھر[۹]

کہ جے کچھ نوری امنت دیکھ رنج — امنت رنج دیکھیں امت ہوئے گنج

جو ایک سیت پا کر سنجالی بجنے — نہ کچا نہ پکا پچھانے بجنے

نہ بولوں کدھیں جھوٹ پن ساچ بول — کہ جس بول تھیں ہوں ہوں اونچ[۱۰] مول

---

[۱] امداد کرنا۔ [۲] خوش۔ [۳] سوکھا دینا۔ [۴] آنکھ کا سرمہ۔ [۵] دودھ خور۔ [۶] عیش۔ [۷] گریبان میں منہ ڈالنا۔ [۸] پارا۔ تانبا۔ سیسا۔ کھپر۔ لوہ۔ کھان۔ [۹] ضرورت سے زیادہ۔ [۱۰] اونچا مول، بڑا مول۔

امر-　　امر بدیا دیوُ تب جان کر　　کیا پار پروَنس کرہت دھر

سانپ کی رفتار :-

سبھی ٹھانو جے سانپ کوَدھا[51] چلے　　اپس ٹھانو وہ بھی سوسیدھا چلے
سو بھیے دیکہ کرسات کھڑکھڑ پھری　　سمندر کہ ایسا گگن کن سلے
سو بھیے دیکہ مرچال اپنیں چلے

سانپ ہر طرف ٹیڑھا تو چلتا ہے مگر اپنے مقام (بل میں) پہ تو سیدھا ہی جاتا ہے۔

اکھرنات منتر سکھا یا رھس[52]　　یکایک پڑیا توٹ مندرہ کلس
جتائی بہت اوسگن راؤ کوں　　نہ پوچھیا کیے راؤ اس بھاؤ کوں
پری ساج کہ کر کیسی گن سگن　　کھیوں بیتی بیسیا جائے کھن الخ
پڑھا اکھرنات منتر سکال[53]　　کھیا دیکہ تیہ (بیٹھی) تیو برن سنبھال
کدم راؤ منتر پڑھیا رہس کر　　کیا پار پار پروَنسی کیتا سنور
کہے فخر دیں ایک ساچا بچن　　بھلے برکھیٹی جی کرے کولی گن
کدم جیو جب لگ نلے کور آپ　　اکھر جیو جوگی نہ اندر شتاب

پسیانی خوردن اکھرنات جوگی کہ راؤ شدہ است :-

اکھر بیس تن راؤ بجتاؤ ناں　　کہ کت دھنک اپ راج جلواوناں
نہ اگلا کہوں دیکہ یہ کون ہے　　نہ بچھلا مجھے کچھ اَنھون ہے
پچھانوں نہ جانوں نہ بوجھوں کسے　　جیسے دیکہ بوجھوں سو ہے پھر دیسے

..　..　..　..　..　..　..　..　..　..

کہ جی جانو مندھر سنوارا نواس　　نہ دھن بات جانوں نہ رانی نہ داس
نکرناں منجے تھا سو کیتا نکھت　　بنا ہے اَلس یکوں راج جھت
منجھے کیا ہوا بھل کدم تن لئیں　　جو اس کی کچھو بدہ نہ منجہ ہئیں

پڑھک[54] ایک راواں جو اکھر تھا سجات　　براد یکہ منجہ کال دیتا کجات

---

[51] کودھا۔ ٹیڑھا (کوندھا = برق)۔ [52] پوشیدہ۔ [53] علی الصباح۔ [54] بولتا ہوا طوطا۔

پنہار ناہیں کرے کیوں ندوس اڑنتا[1] پنکھرو دھرے رلادوس
کر اکھیپ[2] رآداں پرھاوں بنجائے جو بھر کر نرک اپنا آپ کھائے

ڈھنڈو رابھرانا۔ کلی ۔ چڑیاں ۔ گالی :۔

ڈھنڈ وڑا پھراویں کلیان کو چڑیاں کہ راواں کیا راودی گالیاں

ابھمان :۔

دُنیا میں وہی نر جس ابھمان ہے جس ابھمان ہے نہ وہ دوج[3] دان ہے

تفت شدن اکھرنات جوگی بر مدھر بدہ وزیر :۔

کھیا راؤ پردھان کوں کوپ جاؤ کہ جھیرا حیا توں مجھے سرا جاؤ

کدم راؤ طوطی شدہ است در فرمایش پدم راو بودہ است

جس کا ایک شعر اپنے طوطے پن سے بیزاری سے متعلق خوب ہے ؎

بچارہ یا ہری پنکہ کیت اڑوں کہاں لگ اڑوں جائے کیدھر پڑوں

میں بے چارہ ایک طوطے کی کس قدر اڑوں اور کہاں تک ؟ اور کدھر جا کر پڑ جاؤں۔ کدم راؤ یعنی جواب طوطا ہے۔ وزیر پر سخت گرم ہو کر کہتا ہے کہ کیوں نہ اس کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

کھڑا ہوے جو بات میں رانکہ (رانندہ) کہے کو توالیوں کہ منجھ کوں پکڑ

پدم راؤ سمجھیا نہ راآویں سخن نہ پوچھیا کہ راوان ہوا کت لبن

پدم راؤ، طوطے کی گفتگو کو نہ سمجھ سکا، اور اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ طوطا کس طرح ہو گیا۔ بالآخر پدم راؤ وزیر شرمندہ ہوا اور راجہ سے جو طوطے کے بھیس میں تھا معافی مانگ لی۔

کھڑا تیر سو جیوں رہیا تھا اڈھل کماں ہو پڑیا پنکہ کے پائے تل

پدم راؤ جو اپنے غرور و تکبر میں تیر کی طرح کھڑا ہوا تھا اور کبھی کسی کے آگے سر نہیں جھکایا تھا، آخر کار طوطے کے پاؤں پر کمان کی طرح گر پڑا۔

کہ توں ساچ میرا گسائیں کدم پدم راؤ تجہ پاو کیرا کدم

جہاں توں دھرے پاؤں ہوں سر دھروں اپس سار کی لک ترڑی کروں

یہ سچ ہے کہ حقیقت میں کدم راؤ! تو میرا آقا ہے۔ پدم راؤ تیرے پاؤں کی خاک ہے؟ جہاں

---

[1] اڑتا ہوا۔ [2] مسافر۔ [3] دوسرا تحفہ۔

تو اپنا قدم رکھے گا میں وہاں اپنا سر رکھ دوں گا اور گویا اپنے کو مٹا دوں گا۔

غرض کدم راؤ نے پدم راؤ وزیر کو معافی دے دی اور تسلی دی کہ تو خاطر جمع رکھ۔ تو وزیر نے عرض کی ؎

کہ جے تون بولے نبھے دُکھ نہ ۔۔۔ جے بولیا کرے بھی مجھے سکھ نہ

بُرا بھلا جو کچھ بھی تو بولے مجھے سزاوار ہے مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں اور جو کچھ تو بول کر کر ڈالے مجھے اس سے سکھ آرام بھی نہ ہوگا۔

آخری عنوان یہ ہے "رفتن کدام راؤ در محل خرم و دریافتن عیش خرمی"

خلاصہ یہ کہ کدم راؤ اپنے اصل بھیس (قالب) میں آجاتا ہے اور دوبارہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔

بعض ماخذ :-

۱ - اردو مثنویاں : گوپی چند نارنگ - مطبوعہ دہلی

۲ - اسلامک کلچر (رسالہ انگریزی) : ۱۹۳۵ء حیدرآباد دکن۔ مضمون ڈاکٹر اسپیٹ

۳ - بساتین السلاطین (فارسی) : ابراہیم زبیری - قلمی

۴ - پنجاب میں اردو : محمود خاں شیرانی مطبوعہ -

۵ - تذکرہ سلاطین دکن (بہمنیہ) : عبدالجبار خاں - مطبوعہ حیدرآباد

۶ - قومی زبان، کراچی : ستمبر ۱۹۶۴ء

۷ - مثنوی ہیرا من طوطا : شاہ حسین حقیقت لکھنوی - مطبوعہ

۸ - ہندی اردو لغت : راجیشور راؤ اصغر - مطبوعہ

۹ - اردو انگریزی ڈکشنری : پلاٹ - مطبوعہ

ڈاکٹر حکم چند نیّر

نوادرِ بنارس

(لالہ سری رام دہلوی مؤلف خمخانۂ جاوید کے اردو، فارسی اور عربی مخطوطات
مخزونہ سینٹرل لائبریری بنارس ہندو یونیورسٹی کی مختصر فہرست)

لالہ سری رام دہلوی کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ دلّی کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے۔ یہ خاندان ہمیشہ سے علوم وفنون کا گہوارہ اور قدرداں رہا ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مؤتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل تھے جو اپنی ذہانت وذکاوت اور کارآگہی وکارکردگی سے اکبری نورتنوں میں شامل ہوکر وزارت کی کرسی اور صدر دیوان کے جلیل القدر عہدے پہ سرفراز ہوئے تھے۔ راجہ ٹوڈرمل صاحبِ سیف وقلم تھے۔ انھوں نے بنگال، بہار اور یوسف زئی وغیرہ مہمات اکبری میں دادِ شجاعت دی اور ترجمہ بھگوت پران، رسالہ حساب اور خازن اسرار وغیرہ کتابیں لکھ کر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔ دربار شاہی کا دستور العمل اور دیگر قوانین وضوابط مرتب ومدوّن کیے۔ اس ضمن میں سیکڑوں اصطلاحیں وضع کیں جو صدیوں کے الٹ پھیر میں بھی ٹکسال باہر نہیں ہوئیں۔ راجہ صاحب کی استعداد وقابلیت کے تمام مورخین معترف ومداح ہیں۔ صاحبِ[۲] خلاصۃ التواریخ لکھتا ہے کہ:-

"در دقائق سیاق وحقائق حسابِ بے نظیر، در علم محاسبات موشگاف، ضوابط وقوانین وزارت وتنظیم احکام سلطنت وبند وبست امورِ مملکت وآبادی ومعموری رعیت ودستور العمل کار ہائے

---

[۱] یونیورسٹی کے کلا بھون (عجائب گھر) میں دیگر عجائبات کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی کے مصور اور خوشخط مخطوطات محفوظ ہیں۔ ان کی فہرست تیار ہو رہی ہے۔

[۲] سجان رائے بٹالوی، خلاصۃ التواریخ ص ۴۰۹

دیوانی قانون، حفظ حقوق سلطانی و افزونی خزانہ و امنیت ممالک و تادیب سرکشاں و تسخیر ممالک

"دستور مناسب امراد پیمہ مواجب سپاہ و دوامی پرگنات تنخواہِ جاگیر از و یادگار است"

راجہ ٹوڈر مل کا سب سے بڑا کارنامہ وہ فرمان ہے جس سے ہندوستان میں فارسی زبان کی تعلیم و تدریس و ترویج و ترقی کی راہیں استوار ہوئیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ راجہ صاحب کی مساعی جمیلہ کی بدولت ہندو مسلمانوں میں ربط و اتحاد بڑھا اور نتیجۃً مشترکہ تہذیب اور زبان (اردو) جیسی مبارک یادگاروں کی بنیاد پڑی۔

اس خانوادے کے ایک رکن رائے صاحب ماسٹر پیارے لال آشوب تھے جو لالہ سری رام کے حقیقی تایا تھے۔ آشوب محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ اپنی کاردانی اور خوش اسلوبی کی بدولت انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ افسران وقت میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ جب تک دلی میں رہے وہاں کی علمی و ادبی زندگی کی روح رواں بنے رہے۔ دہلی سوسائٹی کے پہلے سکریٹری تھے مرزا غالب کے قدرداں اور عزیز دوستوں میں سے تھے تمام عمر زبان و ادب کی خدمت اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتے رہے۔ پنجاب میں اردو زبان کی توسیع و ترویج کے سلسلے میں آشوب کی گراں قدر مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں کی کوششوں سے آزاد حالی، کریم الدین اور مولوی سید احمد دہلوی وغیرہ لوگ لاہور پہنچے جہاں ان کے جوہر کھلے اور آسمان ادب پہ آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے۔

لالہ سری رام کے والد رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے بیرسٹر کا شمار دہلی اور پنجاب کے ماہرین قانون میں ہوتا تھا۔ اردو زبان سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر جونز کے رسالہ منطق کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا تھا۔ مصروفیات کی وجہ سے وہ تصنیف و تالیف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کر سکے لیکن ع "اگر پدر نتواند پسر تمام کند"، کے مصداق ان کے فرزند ارجمند لالہ سری رام تمام عمر اردو زبان کی خدمت میں منہمک رہے۔

لالہ سری رام ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے وہ چودہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ اور ایم۔ اے پاس کر کے ۱۸۹۸ء میں منصف کے عہدے پہ فائز ہو گئے ۱۹۰۴ء تک لاہور، امرتسر، جالندھر، رہتک اور دلی وغیرہ مقامات پہ کام کرتے رہے۔ لیکن فطرتاً آزاد طبع اور ذکی الحس آدمی تھے، ملازمت کی پابندیاں ان کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ (حالاں کہ ان کی ملازمت معمولی نہ تھی۔ آج سے نصف صدی پہلے کے زمانے کا تصور کیجیے تو معلوم ہوگا تو اس سے بھی کہیں معمولی ملازمتوں کے لیے کیسے کیسے لوگ سرگاڑی پانو پہیہ کیے رہتے تھے) اس لیے انھوں نے ۱۹۰۴ء میں ملازمت کی بیڑیاں کاٹ پھینکیں اور آزاد ہو کر یکسوئی سے علمی اور ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

لالہ سری رام نہایت وسیع مشرب اور نیک منش انسان تھے۔ مخلص دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کے حلقۂ احباب میں رئیس، امیر، شاعر، ادیب، ہندو، مسلم غرض کہ ہر طبقے اور ہر حیثیت کے لوگ شامل تھے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی[1] لکھتے ہیں :-

"اپنے زمانے میں وہ سب سے زیادہ کثیر الاحباب شخص تھے، شعرا اور ادبی مذاق والوں کا ملجا و ماویٰ تھے ہی، عمائد اور سربرآوردہ اصحاب اور والیان ریاست میں بھی وہ اجنبی نہ تھے۔ ان کے دوستوں کے وسیع حلقے میں مذہب و ملت اور چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی۔"

لالہ سری رام بڑے ستودہ صفات آدمی تھے۔ تعصب کو ان کی ذات میں گزر نہ تھا۔ ہندو مسلم کا امتیاز ان کے نزدیک بے معنی تھا۔ رواداری اور خوش اخلاقی، خلوص و محبت اور پابندیٔ وضع کو ان کے یہاں طبع ثانی کی حیثیت حاصل تھی اور یہی [illegible] انھیں قدیم ہندوستانی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ بنائے ہوئے تھیں، وہ ان قدروں کے امین تھے جو مشترکہ تہذیب کی یادگار ہیں۔ فرحت اللہ بیگ[2] لکھتے ہیں :-

"یہ خوشامد نہیں واقعہ ہے۔ اگر کسی کو دہلی کی پرانی صحبت دیکھنی ہو تو لالہ سری رام سے جاکر ملے جس خلوص اور محبت سے ملتے ہیں اور جس طرح اردو پر جان چھڑکتے ہیں اس کا لطف کچھ ان سے مل کر ہی آسکتا ہے۔ قلم سے اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔"

لالہ سری رام نے امارت کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی رئیسانہ پائی تھی۔ وسیع النظری و کشادہ دلی اور شاعر دوستی و ادیب نوازی انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ہونہار شاعروں اور ادیبوں کی دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ان کے کلام کے مجموعے حاصل کرتے، ترتیب و تدوین کے بعد منتخب کلام چھپواتے،[3] اس طرح سیکڑوں اٹھ جاتے اور اس میں ادب اور ادیب کی خدمت کے سوا کسی ذاتی منفعت کا انھیں خیال نہ تھا ان کا کتب خانہ کمیاب اور نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کا خزانہ تھا۔ مشہور ہے کہ جب کسی کو کسی کتاب یا مخطوطے کی ضرورت ہوتی، وہ سیدھا ان کے یہاں جاتا۔ اور وہ ایسے فراخ دل تھے کہ مخطوطہ نکال کر فوراً پیش کر دیتے، اپنے کو مہمان خانہ موجود، خدمت کے لیے نوکر چاکر حاضر اور لالہ سری رام ہیں کہ حوصلہ افزائیاں کرتے نہیں تھکتے اور خوشی

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد پنجم۔ ص ۴۔ مرتبہ کیفی

[2] آغا جان عیش دہلوی از فرحت اللہ بیگ مطبوعہ اردو، اورنگ آباد بابت اکتوبر ۱۹۲۸ء

[3] دیوان انور، مہتاب داغ، یادگار داغ، ضمیمہ یادگار داغ کی طباعت و اشاعت اور کلام مائل و کلیات مشتاق کی ترتیب و تدوین اس کی بین مثالیں ہیں۔

سے پہلے نہیں ملا کے بعض آپ کی اور ادب کی خدمت کا موقع ملا۔

ان کی ادب دوستی اور فیاضیِ طبع یہاں تک ہی محدود نہ تھی۔ اس کا عالم کچھ اور ہی تھا۔ آپ کو مخطوطے کی نقل درکار ہے۔ ادھر سوال پیش ہوا، ادھر انھوں نے وعدہ کیا کہ چند دنوں میں نقل بھجوا دوں گا۔ اب کیا ہے نقل کے لیے انتظامات ہو رہے ہیں۔ کاغذ، قلم، دوات، سیاہی اور کاتب یک جا ہو گئے، نقل تیار ہوئی اور بندہ بندھا کر ڈاک کے ذریعے بھجوا دی۔ پچاسوں خرچ ہو گئے اور ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ بلکہ خوش ہیں کہ زبان دی تھی اس کی لاج بھی رکھی۔

تاریخ اور ادب لالہ سری رام کے خاص مضمون تھے اور یہی تمام عمر ان کا موضوعِ سخن رہے مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ سیکڑوں قلمی اور ہزاروں مطبوعہ کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ خود شاعر تو نہ تھے لیکن اعلیٰ پائے کے سخن فہم اور جوہر شناس تھے۔ دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں کا جو انتخاب انھوں نے اپنے تذکرے میں دیا ہے وہ اگرچہ حرفِ آخر کی حیثیت نہیں رکھتا لیکن اس میں کمی بیشی کی گنجایش بھی زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح 'زمانہ' 'مخزن' وغیرہ کے لیے انھوں نے جو تاریخی مضامین لکھے تھے وہ تحقیق و تلاش اور دلی کی ٹکسالی زبان کا عمدہ نمونہ ہیں۔

تصنیف و تالیف کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی میں دامن گیر ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ظہیر دہلوی کے بھائی انور دہلوی کا تیسرا دیوان شایع کر کے ایک خوش گو شاعر کو ہمیشہ کی گمنامی سے بچا لیا۔ (انور کے پہلے دو دیوان ضائع ہو چکے تھے)۔ مہتاب داغ، یادگارِ داغ اور ضمیمہ یادگارِ داغ مرتب کر کے شایع کیں۔ انور کے شاگرد مرزا محمد تقی مائل کا مجموعۂ کلام[1] اور بہاری لال مشتاق دہلوی کا کلیات مرتب کر چکے تھے لیکن بوجوہ شایع نہ کر سکے۔

لالہ سری رام کا عظیم ترین کارنامہ تذکرۂ ہزار داستاں معروف بہ خمخانۂ جاوید ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کا کام انھوں نے ۹۲-۱۸۹۱ء میں شروع کر دیا تھا۔ جلد اول کے دیباچے میں ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو لکھتے ہیں کہ "اس وقت کو جب میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کا اول جزو لکھنا شروع کیا تھا آج پورے سترہ برس ہو گئے"۔ خمخانۂ جاوید سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک باقاعدہ دفتر قائم کیا جس میں کئی ادیب کام کرتے تھے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ جمع کیا جس میں سیکڑوں کمیاب مخطوطات اور ہزاروں مطبوعہ دواوین و رسائل فراہم کیے۔ حالات کی تلاش اور تحقیق اور مخطوطات و مطبوعات کی فراہمی کے لیے

---

[1] دیوانِ مائل شایع کردہ حسرت موہانی کا ماخذ یہی مجموعۂ کلام ہے۔

دور دراز علاقوں کے سفر کرتے۔ جو کتابیں مل جاتیں خرید لیتے جو نہ مل سکتیں ان کی نقلیں تیار کراتے، انتخاب تیار کرتے۔ اس طرح ملازمین کی تنخواہوں، کتب کی خریداری، نقلوں کی اُجرت اور سفر خرچ میں ہزاروں پر پانی پھر جاتا مگر اس خدا کے بندے کو تو یہ دھن تھی کہ خمخانۂ جاوید تشنۂ تکمیل نہ رہے۔

خمخانۂ جاوید اسم بامسمیٰ ہے۔ اس نے مصنف کے ساتھ ہزاروں شاعروں کو بھی زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ یہ اردو کا سب سے بسیط اور جامع تذکرہ ہے۔ مولانا حالی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے بلا مبالغہ شعرائے اردو کی ایسی انسائیکلوپیڈیا ہوگی جس کی نظیر اردو تذکروں میں نایاب سمجھی جائے گی۔ اور اردو زبان میں یہ ایک اضافہ ہوگا جس کا تمام اہل ملک کو ممنون ہونا چاہیے"[1]

لالہ سری رام نے ۹۲-۱۸۹۱ء میں اس تذکرے کا ڈول ڈالا تھا۔ اور اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کی ترتیب و تنظیم میں ہمہ تن مصروف رہے۔ یہ زمانہ چالیس برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک ہی مقصد کی تکمیل میں چالیس برس تمام و کمال انہماک سے مصروف رہنا بڑا صبر آزما کام تھا لیکن لالہ سری رام نے ہمت نہ ہاری اور سالہا سال تک جگر کاوی اور دیدہ ریزی سے تحقیق و تلاش اور ترتیب و تدوین میں مصروف رہے۔

خمخانۂ جاوید کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں نول کشور پریس لاہور سے چھپی جس کے ۶۸۹ صفحات میں ۶۳۸ شاعروں کے حالات اور منتخب اشعار مع تبصرہ درج ہیں۔ دوسری جلد ۱۹۱۱ء میں لالہ جیون لال کے اہتمام میں امپیریل بک ڈپو پریس دہلی سے شایع ہوئی جس کے ۵۶۴ صفحات پر ۴۸۴ شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تیسری جلد ۱۹۱۷ء میں دلی پرنٹنگ ورکس میں طبع ہوئی جس کے ۶۸۱ صفحات اپنے دامن میں ۵۳۴ شاعروں کے حالات اور اشعار کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ چوتھی جلد ۱۹۲۶ء میں ہمدرد پریس دلی میں چھپی جو ۵۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۳۲۱ شعراء کے کلام و حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پانچویں جلد کا مسودہ مکمل ہو چکا تھا۔ لالہ سری رام کی وفات کے بعد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے یہ جلد ۱۹۴۰ء میں شایع کرائی۔ اس کے ۶۰۸ صفحات میں ۶۰۷ شاعروں کے حالات اور منتخب اشعار درج ہیں۔ پانچوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۳۰۷۶ ہے جن میں ۲۶۸۴ شاعروں کا ذکر ہے (دیباچہ، فہرستیں اور تقریظیں جو تین سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ان سے علاوہ ہیں)

خمخانۂ جاوید کی متذکرہ بالا پانچ جلدوں میں حرف الف سے حرف عین تک کے اکیس حروف تہجی سے شروع ہونے والے شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حروف تہجی کے لحاظ سے ابھی بارہ حروف باقی ہیں جن کے لیے

---

[1] سری رام، خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص ۲، تقریظ از مولانا حالی۔

کم از کم تین جلدیں درکار ہوں گی۔ خمخانۂ جاوید کی پہلی چار جلدیں لالہ سری رام کی حیات میں شایع ہو چکی تھیں باقی جلدوں کے لیے بھی مواد فراہم کر چکے تھے اور ترتیب و تنظیم میں مصروف تھے کہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۰ء کو پیام اجل آ پہنچا اور اردو زبان و ادب کا یہ جان بار عاشق راہی ملک عدم ہو گیا۔

لالہ سری رام اردو کے عاشق تھے۔ انھوں نے اس کی خدمت کے لیے اپنی زندگی اور دولت وقف کر رکھی تھی۔ زندگی کے آخری لمحات میں بھی وہ تذکرے کے خیال سے غافل نہیں ہوئے۔ اپنی وصیت میں تذکرے کی ترتیب و تکمیل اور طباعت و اشاعت کے متعلق مفصل ہدایات درج کر دیں۔ ایک کثیر رقم الگ کر دی اور پنڈت کیفی کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

لالہ سری رام نے اپنے وصیت نامے میں دیگر امور کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے یہ بھی لکھا کہ ان کا کتب خانہ قلمی تصاویر، مطبوعات کی طباعت و اشاعت کا حق وغیرہ غرضیکہ پوری زندگی کا علمی و ادبی اندوختہ بنارس ہندو یونیورسٹی کو دے دیا جائے۔ مولوی مہیش پرشاد سابق صدر شعبہ اردو، فارسی و عربی بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری کے کچھ کارندوں کے ساتھ شاید ۱۹۳۳ء میں دلی گئے اور ان کی کوشش سے یہ علمی ذخیرہ یہاں منتقل ہوا۔ اور الماریوں میں بھر کر عطیات کے سیکشن میں رکھ دیا گیا۔

لالہ سری رام کے کتب خانے کو دیکھ کر بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ انھیں کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا (مطبوعات کے مختلف ایڈیشنوں اور مخطوطات کی نقول سے بھی اس امر کی توثیق ہوتی ہے) انھوں نے اردو، فارسی اور عربی کی ہزاروں کتابیں جمع کیں۔ بعض مخطوطات پر ان کی قیمت لکھی ہوئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بعض نسخوں کے لیے اس زمانے میں پان سو روپے تک صرف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان کا کتب خانہ نہ صرف بہترین اور مکمل کتب خانہ ہے بلکہ بیش بہا نوادر کا گنجینہ ہے۔ پنڈت کیفی نے اگرچہ اس کتب خانے کے بارے میں لکھتے ہوئے اختصار سے کام لیا ہے اور تفصیلات فراہم نہیں کیں لیکن ان کے بیان سے اس کی نوعیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

> " لالہ سری رام کا کتب خانہ ادب اور آرٹ کا عجائب گھر تھا۔ فارسی، عربی، اردو اور ہندی کی کتابیں ہزاروں تھیں۔ جن کے موضوعوں کی نوعیت گوناگوں تھی۔ قلمی کتابیں جنھیں آجکل مخطوطات کہتے ہیں سیکڑوں تھیں۔ ان میں بہت سی باتصویر تھیں۔ چھپی ہوئی کتابوں کا تو ذکر ہی کیا۔ ایک بڑی تعداد ان کتابوں کی تھی جو کم یاب اور نایاب ہیں۔ یہی کیفیت قلمی تصویروں

۱۔ خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۲

کی تھی۔ ایسی تصویریں پانسو سے زیادہ تھیں۔ خطاطی یعنی مختلف رسم الخط کے نمونے قطعوں، وصلیوں اور مرقعوں کی شکل میں بہت سے تھے۔ پرانے شاہی فرمان بھی بہت خاصی تعداد میں تھے۔"

یہ کتب خانہ فردِ واحد کے ایثار اور قربانی کی بے نظیر مثال ہے۔ نوابوں اور راجاؤں نے جو کتب خانے قائم کیے ہیں اُن سے اس کا مقابلہ کرنا ٹھیک نہ ہوگا کیونکہ ان لوگوں کے وسائل اور ذرائع کے ساتھ اختیارات بھی غیر محدود تھے۔ لالہ سری رام کسی جاگیر کے مالک یا ریاست کے راجہ نہ تھے۔ لیکن علم و فن سے محبت کی وجہ سے انھوں نے اپنے محدود وسائل سے یہ نوادر جمع کیے۔ ان کی ادب دوستی کی مثال بے نظیر نہ سہی کم نظیر ضرور ہے۔

یہ نوادر اس عظیم تہذیب کی یادگاریں ہیں جو پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف مذاہب اور اعتقادات رکھنے والے مفکروں اور عالموں نے اپنے افکار و تصورات اور خیالات سے سے مالامال کیا اور فنونِ لطیفہ سے اس کی آبیاری کر کے چندے آفتاب چندے ماہتاب بنایا۔ یہ نوادر ہمارا تہذیبی اور تمدنی ورثہ ہیں۔ ان کی حفاظت و نگہداشت ہمارا فرض ہے۔ ان کے مطالعے سے ہم اپنے ماضی کی فکری اور تہذیبی قدروں کو سمجھ سکتے ہیں اور ایک روشن مستقبل کی بشارت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس ذخیرے سے میرا تعلق ۱۹۶۰ء سے قائم ہوا جب میں دلّی سے یہاں آیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ لالہ سری رام نے اپنا کتب خانہ بنارس ہندو یونیورسٹی کو دے دیا ہے۔ مزید برآں میں نے لائبریری میں کچھ کتابوں پر "عطیہ لالہ سری رام ٹنڈن ایم۔ اے دہلوی" مہر لگی ہوئی دیکھی لیکن یہ بات تو میرے قیاس ہی سے باہر تھی کہ موصوف نے اپنے کتب خانے میں اس قدر گراں بہا مخطوطات جمع کر رکھے تھے۔ فہرستیں دیکھیں تو جی للچایا کہ ان مخطوطات کو دیکھوں۔ اس کام کے لیے کافی وقت درکار تھا جو یہاں عنقا تھا کیونکہ میں ان دنوں پی ایچ ڈی کے لیے "سرور جہان آبادی کی حیات اور شاعری" کے عنوان سے مقالہ لکھ رہا تھا۔ درس و تدریس سے جو تھوڑا بہت وقت بچتا تھا وہ تحقیقی کام کی نذر ہو جاتا۔ ابھی مقالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ میں تعلیم و تعلم کے لیے امریکا چلا گیا۔ اس طرح سے بات آئی گئی ہو گئی۔ امریکا سے واپس آیا تو مہینوں اس "جنت ارضی" کے خوابوں کے طلسم میں گرفتار رہا۔ علاوہ ازیں کچھ نئی مجبوریاں ایسی پیدا ہو گئیں کہ میں مخطوطات کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے خیال سے بالکل غافل بھی نہ ہو سکا۔ کیونکہ یہ خیال دل میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ ان مخطوطات کی ایک مختصر فہرست تیار ہونی چاہیے۔ اس دوران میں ہمارے شعبے میں ڈاکٹر امرت لال صاحب عشرت کا تقرر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر عشرت ڈھائی برس ایران میں رہ کر فارسی زبان و ادب سے محبت نامے کی تجدید کر آئے تھے۔ میں نے دورانِ گفتگو ان سے مخطوطات کا ذکر کیا۔ انھوں نے آمادگی کا

اختیار کیا۔ میری ہمت بندھی۔ میں نے اردو کے مخطوطات سنبھالے اور ڈاکٹر عشرت فارسی کے مخطوطات لے کر بیٹھے اور آٹھ دس ماہ کی دیدہ ریزی کے بعد ایک کیٹلاگ (مختصر فہرست) انگریزی زبان میں تیار ہو گیا۔

یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے اس کیٹلاگ کی طباعت و اشاعت کے لیے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہ بیل کب منڈھے چڑھتی ہے۔ اس لیے کہ ایسے کاموں میں خط و کتابت کو کئی اوگھٹ گھاٹیوں سے سینے کے بل چل کر گزرنا پڑتا ہے اور بات مہینوں کی سرحد سے نکل کر برسوں تک جا پہنچتی ہے۔ ادھر کچھ احباب کے تقاضے برابر بڑھتے جا رہے تھے کہ وضاحتی فہرست نہ سہی ایک مختصر فہرست ہی کسی جریدے میں شایع کر دی جائے تاکہ تحقیقی کام کرنے والوں کو ان مخطوطات کی نوعیت معلوم ہو جائے۔ بارہ تیرہ سو مخطوطات کی مختصر فہرست کے لیے کم از کم پچاس صفحات درکار تھے اور رسائل اس کے حامل نہ ہو سکتے تھے۔ حال میں جب علی گڑھ گیا تو میں نے قبلہ سرور صاحب سے اس مسئلے پر گفتگو کی موصوف اسے انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی جریدہ "اردو ادب" میں شایع کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس طرح ان کی ادب دوستی کی بدولت یہ فہرست آپ کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔

کتب خانے کے بارے میں پنڈت کیفی کا بیان درج ہو چکا ہے۔ لیکن اس بیان سے لالہ سری رام کے کتب خانہ میں مخزونہ مخطوطات کے صحیح اعداد و شمار کا پتہ نہیں لگ سکتا۔ پرانی فہرست (اگرچہ وہ بھی مکمل نہیں) اور دیگر اطلاعات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مخطوطات کی اصلی تعداد، موجودہ تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ موجودہ ذخیرے میں اردو کے مخطوطات کی تعداد فارسی کے مخطوطات کے مقابلے میں حیرت انگیز حد تک کم ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی ان میں موجود نہیں حالاں کہ لالہ سری رام کے بیان مندرجہ دیباچہ خمخانہ جاوید جلد اول کے مطابق بیسیوں تذکرے ان کے پیش نظر تھے۔ ویسے بھی اردو کے مخطوطات زیادہ ہونے چاہئیں کیوں کہ یہ کتب خانہ بیک وقت لالہ سری رام اور "خمخانہ جاوید" کا کتب خانہ تھا۔ کتنے مخطوطات گم ہو گئے یا ضایع ہو گئے ہیں؟ صحیح اعداد و شمار بوجوہ فراہم نہیں کیے جا سکتے لیکن کیسے ضایع ہوئے، یہ داستان درد اگرچہ طویل ہے لیکن بڑی عبرت خیز ہے۔ اس لیے مختصراً بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

لالہ سری رام صاحب نے اپنی وصیت کی نقل یونیورسٹی کو بھیجتے وقت یہ درخواست کی تھی کہ جب تک خمخانۂ جاوید کی تمام جلدیں مکمل نہ ہو جائیں۔ تذکرے سے متعلق کتابیں اور مخطوطات تذکرے کے دفتر میں رہنے دیے جائیں۔ ان کی وفات کے بعد جب یہ کتب خانہ یہاں منتقل ہونے لگا تو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکرے، دواوین اور رسائل وغیرہ روک لیے گئے اور کہا گیا کہ تذکرے کے مکمل ہوتے ہی یہ تمام کتابیں یونیورسٹی کے

جواب کردی جائیں گی ۔ تذکرے کے کام کے لیے علامہ کیفی ناظر ہوئے تھے ۔ انھوں نے اس کی پانچویں جلد ۱۹۴۰ء میں شایع کرادی ۔ باقی جلدوں کا کام بھی تھوڑا بہت ہو رہا تھا کہ ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا ۔ ادھر یونیورسٹی میں بھی ان پچیس تیس برسوں میں کئی تبدیلیاں ہوگئیں ۔ اس بات کو جاننے والوں میں سے کئی اللہ کو پیارے ہوگئے کئی ملازمت سے سبکدوش ہوگئے ۔ کئی لوگ یہاں سے تبدیل ہو کر دوسرے مقامات پر چلے گئے ۔ اس لیے نہ تو یونیورسٹی سے کسی نے سلسلہ جنبانی کی اور نہ لالہ سری رام کے وارثوں ہی نے وہ کتابیں یونیورسٹی کے حوالے کیں ۔ تین چار برس پہلے جب مجھے ان واقعات کا علم ہوا تو میں نے جناب شیام نندن لال صاحب دہ، رجسٹرار بنارس ہندو یونیورسٹی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ۔ موصوف نے لالہ سری رام کے قانونی وارث لالہ امر چند کھنہ[1] کو ان کتابوں کے متعلق کئی خطوط لکھے ۔ راقم نے بھی اپنے طور پر کئی خط لکھے لیکن کھنہ صاحب نے جواب نہ دینا تھا اور نہ دیا ۔ میرا خیال ہے کہ سیکڑوں مخطوطات اور ہزاروں مطبوعات اب محفوظ نہیں رہیں ۔ کیفی صاحب کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا ۔ بہت سے لوگ انھیں ملنے کے لیے تذکرے کے دفتر میں آیا کرتے تھے ۔ کچھ احباب ضرورت کی کتابیں ان سے مستعار لے جایا کرتے تھے ۔ مگر یہ کتابیں کبھی واپس نہ کی گئیں کیونکہ آخری ایام میں کیفی صاحب کی معذوریاں اور مجبوریاں بڑھ گئیں تھیں اور تقاضا کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ اسی طرح کارندے بھی بہت کچھ اٹھا لے گئے ۔ کچھ عرصہ پہلے اردو کے ایک پروفیسر نے بتایا کہ سنڈیلہ کے ایک شخص نے (جو تذکرے کے دفتر میں ملازم تھے) گذشتہ چند برسوں میں کئی نادر اور بیش بہا مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں لوگوں کے پاس فروخت کی ہیں ۔ اور یہ کتابیں لالہ سری رام کے کتب خانے کی تھیں ۔

راقم کو بھی اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد اور خاصا دلچسپ ہے ۔ وہ یہ کہ مجھے کتابیں (بالخصوص قدیم مطبوعات) جمع کرنے کا شوق ہے ۔ بنارس میں اردو و فارسی ادبی کتابوں کا بارہوں مہینے قحط رہتا ہے ۔ اس لیے تعطیلات میں جب اپنے وطن جاتا ہوں تو کتابیں خریدنے کے لیے دلی ضرور جاتا ہوں ۔ چار برس بیشتر ایک دن ایک کتب خانے میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب دو تین کتابیں بیچنے کے لیے میرے پاس لائے ۔ میں کتابیں دیکھنے میں محو ہوگیا اور وہ صاحب مکتبہ کے مالک سے باتیں کرنے لگے ۔ چند ہی منٹ میں وہ یکایک جھپٹے ۔ کتابیں چھینیں، یہ جا، وہ جا اور دم زدن میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ۔ میں منھ تکتا رہ گیا (بھلا کر بھی کیا سکتا تھا) یہ کتابیں لالہ سری رام کے کتب خانے کی تھیں اور جیسے ہی ان حضرت کو یہ معلوم ہوا کہ میرا تعلق اب

---

[1] لالہ سری رام لاولد تھے ۔ انھوں نے اپنے ایک عزیز کی لڑکی کو گود لے لیا تھا اور اس کی شادی لالہ امر چند کھنہ سے کردی تھی اس لیے کھنہ صاحب ان کے قانونی وارث ہیں ۔

بنارس یونیورسٹی سے ہے۔ انھیں خطرہ لاحق ہوگیا کہ اب ان کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اسی لیے ان حضرت نے یہ نازیبا حرکت کی۔ ان امور سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خزانہ کس طرح لٹا اور کیسے برباد ہوا۔

اس سرمائے کا کچھ حصہ یہاں بھی برباد ہوا ہے۔ وہ اس طرح کہ جس زمانے میں یہ کتب خانہ یہاں منتقل ہوا تھا اس زمانے میں نہ تو لائبریوں کی ترتیب و تنظیم اس معیار کی تھی اور نہ ہمارے یہاں مخطوطات کی اہمیت کا ایسا احساس ہی تھا۔ مخطوطات اور مطبوعات کو بلا امتیاز الماریوں میں بھر دیا گیا (ڈھیر کر دیا گیا، کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا) اور جو الماریوں میں نہ سما سکے انھیں زمین پر رکھ دیا گیا۔ مزید برآں ان کی حفاظت بھی اس طرح نہ کی گئی جیسی کہ کی جانی چاہیے تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مخطوطات دیمک کی نذر ہو گئے۔ کچھ مخطوطات کی حالت یہاں تک ناگفتہ بہ ہو چکی تھی کہ ایک لفظ پڑھ لینا جوئے شیر لانے سے زیادہ دشوار تھا کیوں کہ ان میں کیڑوں اور مٹی کے سوا کچھ نہ رہا تھا اس طرح بہت سے مخطوطات ضائع ہو گئے۔

فی الحال اس ذخیرے میں کل ۱۱۸۲ مخطوطات محفوظ ہیں جن میں ۱۵۶، ۲، ۹ اور ۵۶ مخطوطات بالترتیب اردو، فارسی اور عربی کے ہیں۔ بعض مخطوطات کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ اس طرح شمار کرنے سے مخطوطات کی تعداد ۹۵۱ ہوتی ہے۔ اور باقی ۲۳۰ مختلف نسخوں کی نقلیں ہیں۔ سب سے قدیم مخطوطہ ۱۳۵۶ء کا لکھا ہوا مرغوب القلوب کا نسخہ ہے جس میں شمس تبریز کے فرمودات جمع کیے گئے ہیں۔ اس ذخیرے میں بہت سے اہم اور نادر مخطوطات موجود ہیں جو تفصیلی ذکر کے مستحق ہیں لیکن طوالت کے خوف سے گریز کیا جا رہا ہے۔ داستانِ درد کافی طویل ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ لالہ سری رام کے کتب خانے کے متعلق مجھے کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہوں گی یا ہو سکتی ہیں۔ بہر حال ع

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

(فہرست صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ ہو)

لہ شکر ہے کہ بہت سے مخطوطات زمانے کی دستبرد سے بچ گئے ہیں۔ انھیں تمام و کمال احتیاط سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ فہرست صرف انھیں مخطوطات کی ہے۔

اردو مخطوطات

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۱	U.I.3/1	نصاب رنگین	سعادت یار خاں رنگین			ترکی اردو لغت (خالق باری کی طرز)
۲	U.III.24/1	مصائب الصابرین حصہ اول	سید علی رضا عرف میر بولاقی	۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷-۸ء	۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷-۸ء	شہیدان کربلا کے بیان میں
۳	۲	مفتاح	مصنف شیخ عبد القادر جیلانی مترجم سید محمد قادری	.	.	مفتاح فتوح الغیب کا ترجمہ دکنی میں
۴	۴	تحفۃ الہند	مولوی عبید اللہ	۱۸۶۲ء		اسلام کی خوبیوں کے بیان میں
۵	۵	ا۔ وضو نماز ب۔ نور الاسلام	محمد ابراہیم	۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء	۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء	بچوں کے لیے
۶	U.IV.4/2	تقویم الرمل	سید مصطفیٰ حیدر آبادی			نواب عماد نواز جنگ کا زائچہ
۷	U.VII.2/1	طب احمدی	سید تاج الدین قادری	۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء		
۸	U.VIII.2/1	رسالہ ترقی درخت توت	مترجمہ موتی لال دہلوی			انگریزی سے ترجمہ
۹	U.IX.2/1	غوث الاعظم حصہ اول	نامعلوم			شیخ عبد القادر جیلانی رح کی مدح میں نظم و نثر
۱۰	۲	ایضاً حصہ دوم	نامعلوم			
۱۱	U.IX.3/1	دیوان عبد	عبد			نعتیہ کلام
۱۲	۲	کلیات عیش	حکیم آغا جان عیش دہلوی		۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء	غزلیں، رباعیات، قصیدے اور قطعات درج ہیں۔
۱۳	۳	کلیات عیشی	طالب علی خاں عیشی		۱۸۸۰ء	غزلیں، مسدس، مخمس، مثنوی شرارۂ عشق اور مشاعرہ چراغ بے دود کی طرحی غزلیں
۱۴	۴	دیوان عاجز	عاجز			عاجز نے مشہور شعرا کی غزلوں میں اپنا تخلص درج کرکے اپنا دیوان تیار کیا ہے جیسے داغ کا شعر

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
						[illegible] سے نہیں کھیلی [illegible] گئی ہے کہ آتی ہے اردو زبان آ گئے تھے
۱۵	۵	تماشا ہوائی مجلس	عاجز			نہایت کم پایہ ڈرامہ ناقص [illegible]
۱۶	۶	دیوان اکبر قدیم	اکبر			صرف غزلیں درج ہیں
۱۷	۷	کلیات اختر	قاضی محمد صادق خاں اختر			غزلیں، قصیدے، مسدس، مثنوی اور قطعے درج ہیں
۱۸	۸	مثنوی سراپا سوز	ایضاً	۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸-۹ء	۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹-۳۰ء	ایک قیمتی نسخہ جس میں مثنوی کی شان نزول کے متعلق مصنف کا بیان درج ہے۔
۱۹	۹/۱	کلیات عارف	زین العابدین خاں عارف			قصیدے، مرثیے، سلام، مخمس، ترکیب بند، منظوم خط اور غزلیں درج ہیں۔
۲۰	۹/۲	ایضاً	ایضاً			نامکمل نسخہ
۲۱	۱۰	انتخاب دیوان عزیز اللہ خاں	عزیز اللہ خاں عزیز			ولی کا معاصر۔ شاید عزلت کے ماموں۔ دکنی زبان میں بہت اچھے اشعار کہے ہیں۔
۲۲	۱۱	دیوان بالا	بالا			ردیف وار غزلوں پر مشتمل ہے
۲۳	۱۲	دیوان بہادر المعروف بہ گلستان خیال	بل بہادر سنگھ بہادر والی راجگڑھ		۱۹۱۲ء	ایضاً
۲۴	۱۳	دیوان بشیر معروف بہ گلدستہ اشعار	بشیر دہلوی			ایضاً
۲۵	۱۴	کلیات بیتاب	عباس علی خاں بیتاب رامپوری	۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء		قصیدے، غزلیں، رباعیاں، منظوم خط، مخمس، واسوخت اور مثنویاں درج ہیں۔
۲۶	۱۵	دیوان بیمار	بیمار رامپوری			[illegible]

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۲۷	۱۶	گلشن بہار	مترجم دولت سنگھ			عنایت اللہ کی فارسی مثنوی بہار دانش کا منظوم ترجمہ
۲۸	۱۷	دیوان دلسوز	خیراتی خاں دلسوز علی گڑھی			فرانسو صاحب فراق، آرام کا کلام بھی شامل ہے۔ انتہائی کرم خوردہ اور ناقص نسخہ
۲۹	۱۸	کلیات والہ	مرحمت خاں والہ و ثاقب لکھنوی			قصیدے، غزلیں اور مثنویاں درج ہیں۔
۳۰	۱۹/۱	دیوان فرحت	فرحت رام پوری			حاشیہ پر آباد کی غزلیں درج ہیں۔ ناقص الآخر
۳۱	۱۹/۲	دیوان امید	فرحت علی امید			ناقص الطرفین
۳۲	۲۰	کلیات فراق مع انتخاب دیوان ظفر	ثنا اللہ فراق			
۳۳	۲۱	مکاشفات الاسرار	غمگین دہلوی		۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۸ء	رباعیات کا مجموعہ۔ عمدہ نسخہ
۳۴	۲۲	مخزن اسرار	ایضاً	۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷-۳۸ء		غزلیں مطلعے اور رباعیاں ردیف وار درج ہیں۔
۳۵	۲۳	بستان فصاحت	فقیر محمد خاں گویا			قصیدے، غزلیں، ترکیب بند اور سلام درج ہیں۔
۳۶	۲۴	ایضاً	ایضاً			نامکمل نسخہ
۳۷	۲۵	مثنوی لیلیٰ مجنوں	میر حسین عرف میر تجلی دہلوی		۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵-۶ء	پہلا ورق موجود نہیں
۳۸	۲۶	دیوان حسن لکھنوی	حسن لکھنوی			ایضاً
۳۹	۲۷	مثنوی پدماوت ورتن سین	عبرت و عشرت			
۴۰	۲۸	کلیات احسان	عبد الرحمٰن احسان		۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء	قصیدے، غزلیں، قطعے، مثنویاں یوسف زلیخا اور فارسی کلام
۴۱	۲۹	دیوان عشرت اول	ہادی علی عشرت فیض آبادی		۱۸۹۱ء	ردیف وار غزلیں درج ہیں
۴۲	۳۰	جواہر خانۂ عشق	محمد حبیب اللہ عشق			ردیف وار غزلیں درج ہیں

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۴۳	۳۱	دیوان فراسو	فراسو			انتہائی کرم خوردہ نسخہ
۴۴	۳۲	کلیات جرأت	قلندر بخش جرأت			مکمل کلیات
۴۵	۳۳	مثنوی جرأت	ایضاً		۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷-۸ء	در ہجو سرما و دیگر مثنویاں
۴۶	۳۴	بیاض	نامعلوم		۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء	مختلف شعرا کی غزلیں ہیں
۴۷	۳۵	بیاض	نامعلوم			ایضاً
۴۸	۳۶	ا۔ بیاض	مرتبہ رگھبیر سہائے بسمل میرٹھی		۱۸۴۳ء	ایضاً
		ب۔ گلشن بے خار	ایضاً			ایضاً
۴۹	۳۷	بیاض	مرتبہ گوکل پرساد ورما			ایضاً
۵۰	۳۸	بیاض	مرتبہ منشی جگل کشور دہلوی			ایضاً
۵۱	۳۹	بیاض نوحہ جات	نامعلوم			
۵۲	۴۰	مجموعۂ مثنویات اردو	نامعلوم		۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء	شعلۂ شوق میر۔ قول غمیں مومن
۵۳	۴۱	بیاض	نامعلوم			
۵۴	۴۲	بیاض	پنڈت کالکا پرساد شاد	۱۸۷۰ء		منظوم اردو و فارسی خطوط بنام پنڈت مہتاب رائے
۵۵	۴۳	دیوان معروف	الٰہی بخش خاں معروف		۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳-۴ء	دیوان ثانی
۵۶	۴۴	دیوان ممنون	میر نظام الدین ممنون			
۵۷	۴۵	دریائے عشق	میر تقی میر			
۵۸	۴۶/۱	دیوان مصحفی	مصحفی			دیوان دوم
۵۹	۴۶/۲	دیوان مصحفی	مصحفی			〃
۶۰	۴۶/۳	〃	مصحفی			دیوان سوم
۶۱	۴۷	دیوان درد	خواجہ میر درد		۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶-۷ء	
۶۲	۴۸	بیاض درد و اثر	نامعلوم			انتخاب
۶۳	۴۹	مثنوی گلزار ارم	میر غلام حسن حسن دہلوی	۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء		
۶۴	۵۰	مثنوی سحر البیان	〃	۱۷۸۵ء		

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۶۵	۵۱	مثنوی سحر البیان	میر غلام حسن حسن دہلوی	۱۷۸۵ء		
۶۶	۵۲	دیوان میر حسن	〃		۱۸۰۲ء	
۶۷	۵۳	کلیات ممنون	میر نظام الدین ممنون		۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱-۲ء	
۶۸	۵۴	دیوان میر اول	میر تقی میر دہلوی			
۶۹	۵۴/۲	دیوان میر سوم	〃			نادر نسخہ
۷۰	۵۵	آئینہ حکمت	سہیل رضوی دہلوی			اردو و فارسی کلام کا مجموعہ
۷۱	۵۶	دیوان مبین	غلام دستگیر مبین			ردیف غ تک
۷۲	۵۷	دیوان حسن	حسن لکھنوی تلمیذ خواجہ وزیر			
۷۳	۵۸	انتخاب دیوان محیط	رام جس محیط			
۷۴	۵۹	کلیات مومن	مومن خاں مومن			
۷۵	۶۰	انتخاب دیوان منیر	منیر شکوہ آبادی			
۷۶	۶۱	دیوان	حافظ شاہ محمد نعیم عطا دہلوی			
۷۷	۶۲	دیوان ناسخ	ناسخ لکھنوی		۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹-۴۰ء	یہ نسخہ نواب حسن علی خاں کے لیے تیار کیا گیا تھا
۷۸	۶۳/۱	کلیات شاہ نصیر	شاہ نصیر			
۷۹	۶۳/۲	پارہ دیوان	شاہ نصیر			ناکمل کرم خوردہ
۸۰	۶۴ (ا)	نصیحت نامہ	عظمت اللہ نیازی	۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۸ء	۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷-۸ء	} کم پایہ مثنویاں
۸۱	(ب)	قیامت نامہ	〃	〃	〃	
۸۲	۶۵	دیوان ریختہ	سعادت یار خاں رنگین			یہ نسخہ مسٹر بیلی ریزیڈنٹ لکھنؤ نے اقبال الدولہ کو دیا تھا
۸۳	۶۶	دیوان صادق	صادق لکھنوی شاگرد نصیر و انشا			
۸۴	۶۶/۲	گل مضامین	〃		۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹-۷۰ء	
۸۵	۶۷	صحیح البیاض	جعفر حسین جعفر لکھنوی			دیوان
۸۶	۶۸/۱	مجموعہ قصائد	مرزا رفیع سودا			نعتیہ قصائد

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۸۷	۹۵/۳	کلیات سودا	مرزا رفیع سودا			
۸۸	۹۵/۴	"	"		۱۹۱۶ء	فارسی کلام بھی شامل ہے
۸۹	۹۵/۵	کلیات سودا	"			مع دیباچہ اصلح الدین
۹۰	۹۵/۶	کلیات سودا	"			انتخاب
۹۱	۶۹	قصائد سودا	"			
۹۲	۷۰/۱	دیوان سودا	"			صرف غزلیں درج ہیں
۹۳	۷۰/۲	دیوان سودا	"			انتخاب غزلیات
۹۴	۷۱	قصائد سودا	"			
۹۵	۷۲	دیوان شہید	محمد بخش شہید سندیلوی		۱۸۹۶ء	
۹۶	۷۳	دیوان شوق	غلام رسول شوق			
۹۷	۷۴	دیوان شرر	شرر			
۹۸	۷۵	کلیات سہیل	سید حیدر علی سہیل			
۹۹	۷۶	دیوان	چھنول طرب و دیگر			
۱۰۰	۷۷	دیوان توقیر	توقیر			ناقص الاول
۱۰۱	۷۸	گلشن دانش	یکتا		۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸-۵۹ء	
۱۰۲	۷۹	مثنوی یوسف زلیخا	نجیب			
۱۰۳	۸۰	دیوان ذکا	خوب چند ذکا دہلوی		۱۸۷۲ء	
۱۰۴	۸۱	دیوان ذاکر	ذاکر لکھنوی			
۱۰۵	۸۲	دیوان ضیا	احمد حسین ضیا		۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء	مصنف نے خود کو شاہ عالم کا استاد لکھا ہے۔
۱۰۶	4 IX-51 / 1	ہشت چمن	لالہ گنگا پرساد	۱۸۵۲ء	۱۸۵۲ء	داستان ماہرو و رضوان شاہ
۱۰۷	۲ (ا)	انشاء محمد (فارسی)	جلال الدین طباطبائی			نامکمل
۱۰۸	(ب)	قصہ جان عالم و انجمن آرا معروف بہ فسانہ عجائب	رجب علی بیگ سرور	۱۸۴۴-۵ء	۱۸۵۲ء	

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۱۰۹	[illegible] (ا)	نامعلوم	نامعلوم			مختصر ہندی ناول
۱۱۰	(ب)	برجبیندر وجے	نامعلوم			ہندی دوہے
۱۱۱	(ج)	چٹکلے	نامعلوم			ہندی چٹکلے پہیلیاں
۱۱۲	(د)	بال ودھوا	نامعلوم			مختصر ہندی ناول
۱۱۳	(س)	کلکی اوتار ناٹک	نامعلوم			مختصر ہندی ناٹک
۱۱۴	۲	نامعلوم	مرزا وزیر بیگ			داستان خاقان وملکہ جان
۱۱۵	M.IX.53 / ۱ (ا)	مجموعہ خطوط	نامعلوم			نہایت کم پایہ زبان وبیان
۱۱۶		مثنوی	”			”
۱۱۷	M.IX.6 / ۱/۱	بھگوت پران دسلم اسکندھ			۱۸۹۲ء	ہندی ترجمہ بخط اردو
۱۱۸	۱/۲	”				”
۱۱۹	۱/۳	بھگوت پران ایکادشی اسکندھ				”
۱۲۰	۱/۴	”			۱۸۵۴ء	”
۱۲۱	۲ (ا)	ترجمہ گورو بھگتی پرکاش	سری مہاراج چرنداس مترجمہ روپ لال		۱۸۲۳ء	(ہندی (بخط اردو)
۱۲۲	(ب)	مثنوی	نامعلوم			کسی فارسی مثنوی کا ایک مختصر حصہ
۱۲۳	(ج)	گورو چیلا سمواد	سری چرنداس مترجمہ نامعلوم		۱۸۲۳ء	
۱۲۴	(د)	گورو پریکشا	”		۱۸۲۳ء	
۱۲۵	(س)	سہج پرکاش	نامعلوم		۱۸۲۸ء	پوبانک کتھا کو ہندی میں نظم کیا گیا ہے
۱۲۶	(ص)	دھرم جہاز	چرنداس		۱۸۸۸ء	”
۱۲۷	۴	نامعلوم	چرنداس			منظوم کرشن لیلا (ہندی میں).
۱۲۸	۵	پوران دسلم اسکندھ	چرنداس		۱۸۵۸ء	ہندی نظم
۱۲۹	۶ (الف)	قصہ گوپی چند	انبی پرشاد مدہوش		۱۸۵۸ء	منظوم
۱۳۰	(ب)	رامائن بال کانڈ	تلسی داس		۱۸۵۸ء	
۱۳۱	(ج)	رامائن اجودھیا کانڈ	”		۱۸۵۸ء	
۱۳۲	(د)	رامائن ارن کانڈ	”		۱۸۵۸ء	

نمبر شمار	نمبر کتاب	نام کتاب	نام مصنف	سنہ تصنیف	سنہ کتابت	کیفیت
۱۳۳	(۵)	راماین اتر کانڈ			۱۸۵۸ء	
۱۳۴	۷	کرشن لیلا				بھاگوت گیتا کا منظوم ہندی ترجمہ
۱۳۵	۸/۱	پدماوت	ملک محمد جائسی		۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء	
۱۳۶	ا ۸/۲	ایضاً	ایضاً		۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء	
۱۳۷	ب	قصہ سسی پنوں	ہاشم		۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء	بزبان پنجابی
۱۳۸	۸/۳	پدماوت	ملک محمد جائسی		۱۸۹۲ء	کرم خوردہ
۱۳۹	۹	بیاض	نامعلوم			ہندو دیوی دیوتاؤں کی تعریف میں ہندی نظمیں
۱۴۰	۱۰	نیت منجری و براگ منجری	مہاراجہ سوائی پرتاپ سنگھ	۱۷۹۵ء	۱۸۹۲ء	
۱۴۱	۱۱	سدت دھرم امرت برشنی				بھگوت گیتا کا منظوم ہندی ترجمہ
۱۴۲	۱۲/۱	راماین اجودھیا کانڈ	تلسی داس			
۱۴۳	۱۲/۲	راماین "	"		۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء	
۱۴۴	۱۲/۳	راماین	"		۱۸۰۲ء	
۱۴۵	۱۲/۴	رام چرت مانس	"		۱۱۸۷ھ	
۱۴۶	ا ۱۳	لنگ پران	مترجمہ جوالا پرشاد بھارگو		۱۸۷۶ء	
۱۴۷	ب	منوسمرتی	"		۱۸۷۶ء	
۱۴۸	ا ۱۴	بیاض عاجز	پنڈت بہاری لال عاجز			مذہبی نظمیں بزبان [illegible]
۱۴۹	ب	ادویت پرکاش	وی رام ولی			"
۱۵۰	[illegible]	رسالہ صاد و ضاد	محمد یوسف علی خاں	۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸-۹ء	۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸-۹ء	ص اور ض کے [illegible] بحث کی گئی ہے
۱۵۱	۱۳۷	رسالہ ہردلعزیز	منی لال الہ آبادی		۱۸۹۰ء	اصلاح معاشرت [illegible]
۱۵۲	ا ۱۳۸	بیاض	نانک شاہ بیلا شاہ			چودہ صفحات [illegible] فارسی [illegible]
۱۵۳	ب	پدماوت	ملک محمد جائسی			
۱۵۴	۱۳۹	بیاض	نامعلوم			[illegible]
۱۵۵	۱۴۰	کشکول مضامین	"			[illegible]
۱۵۶	[illegible]	[illegible]	[illegible]			

مفتوں کوٹوی

راجستھان میں فروغِ اردو کا صد سالہ جائزہ

اردو کے متعلق اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اس کی تخلیق ہندوستان میں ہوئی۔ یہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہر جگہ اس کے پرستار، فدا کار نظر آتے ہیں۔ جن میں غریب بھی ہیں امیر بھی۔ ہندو بھی ہیں مسلم بھی۔ اس کی تعمیر و تزئین میں ملک کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کا ہاتھ رہا ہے۔ اس نے قشقہ بھی لگایا، زنّار بھی پہنی، تسبیح کی گردان بھی کی، سجدے بھی ادا کیے، فقیروں اور خدا پرستوں میں بھی یہ گھلی ملی، رندوں، زندہ دلوں اور بادہ خواروں میں بھی اٹھی بیٹھی، امیروں کے محلوں میں بھی اس کا بول بالا رہا، اور غریبوں کے جھونپڑوں میں بھی یہ چہکتی رہی۔ پنجاب میں بھی اس کی آبیاری ہوئی، بنگال میں بھی اس کا جادو چلا، بہار بھی اس کی بہار سے مستفیض ہوا، مدراس میں بھی اس کے مدارس قائم ہوئے۔ پھر راجستھان اس کی شگفتگی و شادابی سے کیوں نہ لہلہا اٹھتا؟ بقدر ظرف و حوصلہ یہاں کے باشندوں نے بھی اسے خونِ جگر سے سینچا، دماغ سوزیوں سے جِلا دی اور اپنی فطری صلاحیتوں اور استعدادوں سے اس کا رنگ روپ نکھارا۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں کی ادبی کاوشیں اور کوششیں عدم شہرتی اور تاریکی میں دبی رہیں یہاں کے بیشتر فدا کاران ادب اور پرستاران اردو معرض گمنامی میں رہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ کچھ اسباب کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

راجستھان پر مجموعی نظر میرے خیال سے حسب ذیل وجوہات ہیں جن کی بنا پر راجستھان کی ادبی خدمتیں تاریخ ادب اردو میں نمایاں مقام حاصل نہ کر سکیں :-

(۱) بیرونی محققین و مورخین نے اس سلسلے میں زیادہ کاوش و کوشش سے کام نہیں لیا، سرسری نظر ڈالا معمولی معلومات فراہم کیں اور وہ بھی بڑی بڑی ریاستوں کے متعلق اور انھیں کو اپنے اطمینان کے لیے کافی سمجھ لیا۔

(۲) اندرونی طور پر یہ صوبہ قبل آزادی مختلف ریاستوں پر مشتمل تھا۔ ریاستی حد بندیاں، ملکی حد بندیاں

کے مانند سدراہ بنی رہیں۔ دائرۂ کار محدود بھی رہا اور متعین بھی۔ اس لیے مقامی طور پر ادبی سرگرمیاں برقرار رہیں بیرونی سرگرمیوں کو نہ زیادہ متاثر کیا گیا۔ نہ ان کا زیادہ اثر قبول کیا گیا۔

(۳) اکثر ریاستوں کے حکمراں اردو علم و ادب سے بے بہرہ رہے۔ مقامی اور مادری بولیاں بولتے رہے یعنی سرکاری طور پر اردو کو کوئی سہارا نہ مل سکا۔ ایسے مقامات پر اردو اپنے خدمت گزاروں اور پرستاروں کے بل بوتے پر ہی ضیا بار رہی اور وہی اس کی شمعیں روشن کیے رہے۔

(۴) تخلیقات اور نگارشات بہت کم چھپیں اور جو چھپیں مقامی طور پر ہی افادہ و استفادہ کا ذریعہ بنی رہیں۔ ریاستی حد بندیاں ان کی عام قبولیت و پذیرائی میں مانع رہیں۔

اس کے بعد اب ادبی ذخائر کی عدم طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں کچھ لابدی امور کی جانب اشارات کیے جاتے ہیں:-

(الف) ادبا و شعرا سے تونگری ویسے ہی دور رہتی ہے۔ پھر یہ دماغی کاوشیں چھپیں تو کیوں کر؟

(ب) طبیعتوں کے فقیر منشی، شہرت سے بے نیازی اور مزاج کی قناعت پسندی بھی اس سلسلے میں کارفرما رہی۔ فطری لگن کی وجہ سے اردو پرستی برقرار رہی اور اپنے ماحول کی جگمگاہٹ کا سبب بنی رہی۔ لیکن نام و نمود سے بے اعتنائی نے وہ جوش و خروش نہ ابھارا جس سے یہ صلاحیتیں منصۂ شہود پر آسکتیں۔

(ج) بیشتر رؤسا رجوں کہ اردو سے وابستہ نہ تھے اس لیے ایسی ادبی کاوشوں سے اور ایسے ادبی خدمت گزاروں سے غیر ملتفت و بے تعلق رہے۔ ارباب قلم، خود تہی دست۔ کوئی مالی امداد نہیں۔ پھر ادبی کاوشیں روشنی میں کیونکر آسکتی تھیں؟

(د) اردو پریس کی کمی بھی ایک بڑا سبب رہی ہے۔ آج بھی راجستھان کے ایک دو مقامات اجمیر، ٹونک، جے پور میں اردو پریس ہے۔ اگرچہ تشفی بخش نہیں، تاہم ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقیہ دیگر علاقے تمام تر اس نعمت سے محروم ہیں۔ غیر مطبوعہ تخلیقات ہر ریاست کے اردو ادبا و شعرا کے پاس درجنوں مل جائیں گی۔ جن میں سے اکثر تصنیفات شائع ہو کر اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کر سکتی ہیں لیکن اردو پریس کی کمی ایسی تصنیفات کو اجاگر نہ کر سکیں۔ یہی وجہ راجستھان میں رسائل و اخبار کی کمی کی بھی ہے۔

مطبوعہ کتابوں۔ رسالوں اور اخباروں سے جو مختلف ریاستوں سے وقتاً فوقتاً معرض وجود میں آئے ریاستی حد بندیوں کے تحت بکمالہ واقفیت نہ ہو سکی، نہ مکمل استفادہ ہو سکا۔ اب ریاستوں کے انضمام کے بعد صوبائی سطح پر اردو سرگرمیاں منظم و مجتمع کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یہ فال نیک ہے۔ کاش راجستھان کے ارباب قلم اردو نوازی کے پُر خلوص جذبہ کے ساتھ بکمالہ اس طرف ملتفت ہو سکیں۔

راجستھان کی مختلف ریاستیں

راجستھان کی جن ریاستوں میں سرکاری طور پر اردو مروّج رہی مثلاً ٹونک اور جے پور یا جہاں کے فرماں روا خصوصی توجہ کے ساتھ اردو کی جانب متوجہ رہے۔ مثلاً جھالاواڑ کے راجہ بھوانی سنگھ اور ان کے بعد راجہ راجندر سنگھ محمور۔ وہاں اردو شعر وادب نے بھی مقامی حدود میں اچھا فروغ وارتقا حاصل کیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کے انتزاع کے بعد وہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے مختلف ریاستوں کی جانب رُخ کیا۔ چناں چہ ریاست ہائے رامپور، حیدرآباد، فرخ آباد، عظیم آباد مرشد آباد، بھوپال، ٹانڈہ وغیرہ میں اردو پرستوں کا اچھا اجتماع ہوگیا۔ راجستھان کی ریاستیں بھی ایسے بیرونی مہمانوں کا مرکز اجتماع بنی رہیں۔

ریاست الور

تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ کے صفحہ ۳۵ پر ریاست الور اور جے پور کا عام تذکرہ اس ضمن میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"الور نے بھی جہاں کے حکمراں مہاراجہ شیودھان سنگھ مشہور قدردان سخن تھے ظہیر، تقدیر، تشنہ شاگردانِ ذوق۔ میر مجروح اور سالک شاگردانِ غالب کی بڑی قدر کی۔ مہاراجہ موصوف نے مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب کو بھی اپنے یہاں بلایا تھا۔ اسی طرح ظہیر اور ان کے چھوٹے بھائی انور جے پور چلے گئے اور آخر الذکر کا انتقال وہیں ہوا۔"

الور سے متعلق یہ ایک دور کی جھلک تھی جو بیرونی مورخ ادب اردو کے قلم سے نمایاں ہوئی لیکن خدمتِ اردو یا اردو کے ارتقائی نشیب وفراز کے سلسلہ میں یہ سرسری تذکرہ قطعاً ناکافی ہے۔ چناں چہ انجمن ترقی اردو نے جب ریاستوں کی زبان اردو کے جائزے کے متعلق قدم اٹھایا تو اسی الور کے متعلق صاحب جائزہ نے ۲۵ صفحات رنگ ڈالے۔ جب کہ تاریخ ادب اردو کے مورخ رام بابو سکسینہ نے صرف دو تین سطروں میں معاملہ ختم کردیا تھا۔ ایک اشارہ اور قابل توجہ ہے۔ اگر کوئی الور ہی کا اہلِ قلم اردو کے فروغ وارتقا کا جائزہ لینے کی طرف ملتفت ہوتا تو وہ اور بھی تحقیقی وتدقیقی امور روشنی میں لاتا اور یہ معلومات "تاریخ ادب اردو" کے لیے بیش بہا سرمایہ ہوتیں یہیں یہ بھی سوچ لیجیے کہ ایسا نہ ہونے سے تاریخ ادب اردو کی تکمیل پر کتنا حرف آتا ہے، یہ مان لینے میں کوئی باک نہیں کہ ہم تاریخ ادب اردو سے ابھی پورے طور پر آگاہ نہیں ہیں۔ اکثر مقامات کی ادبی سرگرمیاں اور ادبی خدمتگزار ہماری معلومات میں نہیں آسکے ہیں، اور یہ نقصان تاریخ ادب کے لحاظ سے بڑا نقصان ہے۔

یہ خامی ہمارے مقامی اہلِ قلم ہی پوری کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے دائرۂ واقفیت پر بھرپور لکھیں اور تاریخ اردو کو بہر وجوہ مکمل کرنے کی کوشش کریں۔ صاحب تذکرۂ شعرائے جے پور نے جے پور کی حد تک یہ خامی پوری کردی ہے۔

ریاست ٹونک تاریخ ادب اردو میں ٹونک کا ذکر موجود ہے لیکن وہی سرسری انداز کا۔ بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی اور ان کے چھوٹے بھائی مضطر خیرآبادی سے نواب محمد ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ان کے دربار میں ظہیر، اسد، غلش مشہور شعرا موجود تھے۔ نواب سلیمان خاں اسد میر اسیر کے شاگرد تھے اور غلش جناب داغ دہلوی کے۔ ریاست کے انضمام تک یہاں کی سرکاری زبان اردو رہی ہے، مختلف اردو تصانیف وجود میں آئیں۔ اردو کے بڑے بڑے خدمت گذار یہاں موجود تھے۔ ۱۲۷۸ھ میں مرزا غالب دہلوی نے ایک قصیدہ وزیر الدولہ کے پاس بھیجا۔ جواب میں ذرا دیر ہوئی تو مرزا نے وہ قطعہ لکھ بھیجا جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

گفتم خرد بہ خلوت اُنس کاے شمع و چراغ ہفت ایواں

ریاست جودھپور اردو کنونیشن جے پور ۱۹۵۶ء کی روداد کے صفحہ ۲۶ پر قاضی [illegible] نے ادبیات راجستھان کے سلسلہ میں منشی دیبی پرشاد بشاش کا ایک اردو [illegible] کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔ جائزہ زبان اردو ۱۹۴۰ء میں جودھپور کے حالات کے متعلق دس اوراق موجود [illegible] جناب لیاقت اللہ خاں نے جو جودھپور ہی کے اہل قلم ہیں۔ اردو کے فروغ و ارتقا کے متعلق مضمون سپرد قلم [illegible] وہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے۔ بڑا معلوماتی بھی اور بڑا تاریخی بھی۔ یہ مضمون مقامی ہندی اخبار جو [illegible] ۱۹۶۴ء میں ترجمہ ہوا ہے، اور جودھپور کی اردو خدمات پر وسیع معلومات رکھتا ہے۔

میں یہاں راجستھان کی ہر ریاست کا تفصیلی تذکرہ خدمت اردو کے متعلق نہیں کرسکتا، [illegible] البتہ ان ریاستوں پر مکمل روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کے متعلق ہمارے مورخان اردو زبان معلومات فراہم نہ کرسکے۔ ہاڑوتی ایجنسی کی ریاستیں، کوٹہ، بوندی اور جھالاواڑ بھی اپنی اردو خدمات کے لحاظ سے بڑی سرگرم عمل رہی ہیں۔ ان ہی کا تفصیلی تذکرہ ان صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے ریاست جھالاواڑ اور ریاست بوندی سے سرسری تعارف حاصل کرلیجیے۔ ان کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

ریاست جھالاواڑ افتخار الشعرا مولوی عبد الوحید نیرنگ کے دیوان سے ارباب ذوق ناواقف نہ ہوں گے۔ راجہ بھوانی سنگھ حکمران جھالاواڑ نے بڑے انہماک سے اس دیوان کے اشعار کی ترتیب اور طباعت کی جانب توجہ کی۔ اس دیوان کی ابتدائی تعارفی سطروں اور اس کے متعلق لکھی ہوئی تاریخوں سے اس ریاست کے ادبی ذوق اور علمی مذاق کا پتہ چل سکتا ہے۔ راجہ بھوانی سنگھ دیوانِ نیرنگ کو طبع نہ کرا سکے تھے یہ کام ان کے بعد راجہ راجیندر سنگھ مخمور، ان کے صاحبزادے نے انجام دیا۔

ریاست بوندی "جائزہ زبان اردو" کے بقول "ریاست بوندی کے راجاؤں نے اپنے دفاتر میں مقا

ی ہاڑوتی ہندی رسم الخط کے ساتھ دفتری تحریروں میں استعمال کی۔ بعض راجہ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے
نتی کے ساتھ دفاتر میں اردو فارسی الفاظ کی آمد کو روکا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں بھی جبکہ مہاراجہ رگھبیر سنگھ حکمراں تھے، سرکاری
کام جاری ہوئے کہ "اردو فارسی الفاظ سرکاری تحریروں میں نہ آنے پائیں"۔ ان تنگ نظریوں اور سختیوں کے باوجود
تب میں اردو فارسی رائج تھی۔ مسلم اور غیر مسلم اردو پرستار اپنی ادبی خدمت گزاری میں محو تھے۔ تصنیف و
یف کا سلسلہ قائم تھا۔ اسی جائزہ کی فہرست کتب میں منشی اندر سہلائے کے ایک مطبوعہ ناول کا نام سرفہرست
ج ہے۔ جمپا عرف چمبیلی ۱۹۱۴ء "بوندی کی کٹار" آنجہانی کی کوئی غیر مطبوعہ تصنیف ہے۔ جو شاید ناول ہی ہو۔
منشی چھیدی لال چرخ۔ کلام منشی ایشوری پرشاد عاصی بھی درج فہرست ہے۔ منشی پربھو دیال ورمن۔ رقم
نھیں اپنے نانا خسر آنجہانی عاصی کے شاگرد ہیں۔ ایک مقطع میں کہتے ہیں ؎

مثل عاصی کس کو استادی کا دعوی ہے رقمؔ حکم ان کا میں بجا لاتا ہوں شاگردانہ آج

منشی پربھو دیال رقم، مولانا غیاث الدین غیاثی اور مولوی فضل الرحمٰن کے مکتبوں کے ساختہ و پرداختہ ہیں جن کا
ں علم بوندی میں بالعموم جاری تھا۔ عملی فلسفۂ گیتا، اردو زبان میں ان کی حال ہی کی تصنیف ہے جو گیتا کی مکمل تفسیر
۔ پچھلے دو تین سال قبل جناب رقم کی یہ تصنیف اختتام کو پہنچی ہے۔ ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کی
مانیف ہیں: (۱) جان نثار شیجا (۲) سنتان سدھار (۳) فن تقریر (۴) یوگ سادھن کی تیاری (۵)
ر کی فضیلت (۶) اندرشکتی کا ظہور (۷) روحانی طاقت (۸) نیک خیالی کی فتح (۹) موت پر فتح (۱۰)
ن آسن (۱۱) تحفۂ میلاد النبی (۱۲) دیال رامائن (۱۳) کلام رقم۔ بوندی کی یہ مایۂ ناز شخصیت اس وقت
پھترویں سال میں ہے اور سراپا ثبوت ہیں اس امر کا کہ اردو کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں۔ اردو کا چراغ راجستھان
ں ایسی ہی قابل فخر ہستیوں کے طفیل روشن رہا ہے۔

یاست کوٹہ انسان اپنے ماحول کے متعلق اچھی معلومات بہم پہنچا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے میں اب ریاست
کوٹہ کا ذکر کرتا ہوں:۔

یہ ریاست راجپوتانہ میں تاریخی ریاست رہی ہے۔ راجستھان میں بھی اس کی حیثیت منفرد ہے۔ اب
یہ صنعتی مقام بھی بن گیا ہے اور یہاں کئی فیکٹریاں، کارخانے کھولے جانے ہیں جن میں سے کچھ کھل بھی چکے
ں۔ اس کا محل وقوع چمبل ندی کے کنارے اس کے بہاؤ کے رخ پر یعنی جنوب بہ شمال ہے۔ مغرب میں چمبل
یہ مشرق میں آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ ہاڑا راجپوت یہاں کے حکمراں رہے ہیں۔ جب فرمان شاہجہاں
دران حکومت مادھو سنگھ جی (فرزند ثانی راؤ رتن، ریاست بوندی) ۱۶۳۲ء میں ریاست کوٹہ قائم ہوئی
بتدا میں یہ بھیلوں کی بستی تھی۔ راجپوتوں نے پھر اپنا تسلط قائم کیا۔ یہاں کے باشندوں کا تمدن ہر قدم پر تہذیب

شائستگی چاہتا تھا۔ بولنے کی زبان ہاڑوتی تھی لکھنے کی زبان دیسی ہندی جسے کائستھی بھی کہتے ہیں۔ چوں کہ ریاست بوندی کے علاقے سے وجود میں آئی تھی اس لیے وہی زبان ہوتی چاہیے تھی جسے جارج [illegible] نے ہاڑوتی بہ رسم الخط ہندی لکھا ہے۔

ریاست کوٹہ میں دستورالعمل اور قوانین اردو میں

بہ عہدِ سلطنتِ برطانیہ ۱۸۳۲ء میں ملک کے دفتروں میں اردو نے فارسی کی جگہ لے لی تھی۔ بقول جناب قیصری ۱۸۷۳ء میں جب ممتاز الدولہ نواب فیض علی خاں نواب آف پہاسو، مدارالمہام ریاست کوٹہ مقرر ہو کر آئے تو انھوں نے ریاست کی جانچ پڑتال کی اور دیوانی، فوجداری، مال، خزانہ، جنگلات، کسٹم، فوج وغیرہ دیگر محکمہ جات کے دفاتر باقاعدہ اردو میں ترتیب دیے۔ مختلف محکموں کا دستورالعمل مرتب کیا۔ چناں چہ دیوانی، فوجداری اور مال کا دستورالعمل جیل پریس کوٹہ سے طبع ہو کر نفاذ پذیر ہوا۔ دستورالعمل عدالت ہائے دیوانی میں نے دیکھا ہے جو "حسب الحکم نواب ممتاز الدولہ حاجی محمد فیض علی خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی مدارالمہام، راج کوٹہ بہ فیض اہتمام محمد ارتضیٰ انسپکٹر جیل خانہ ۱۸۷۵ء میں طبع ہوا" نصف صفحہ اردو میں نصف ہندی میں یعنی وہی اردو بہ رسم الخط ہندی ہوا کرتی تھی۔

ریاست کوٹہ کے دفتروں میں اُردو

۱۹۱۱ء تک ریاست کوٹہ کے دفاتر اردو میں رہے پھر رسم الخط ہندی ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء حصول آزادی تک دفاتر میں اردو کے اثرات کافی دخیل رہے ہیں جو ہمارا سبھی کا مشاہدہ ہے۔ اب بھی میری عدالتانہ زندگی میں کبھی کبھار اردو کی تحریرات و دستاویزات دیکھنے میں آ جاتی ہیں۔ لیکن ملک کے قلب و دماغ کی تبدیلی کے ساتھ اب رسم الخط ہندی مائل بہ سنسکرت ہوتا جا رہا ہے۔

جمہور میں اُردو

جب تک دفاتر میں اردو رہی۔ اہل کاران و ملازمان۔ وکلاء و افسران سب کی زبان و قلم پر اردو رائج رہی۔ سرکاری مدارس میں اردو کو فروغ ہوا۔ مقامی آبادی بھی ان ضوباریوں سے مستفیض ہوئی اور ع "روشن چراغ ہوتے ہیں سو اک چراغ سے" کے مصداق اردو جمہور کے عام استعمال کی چیز رہی۔ سرکاری حساب و کتاب ہو یا ذاتی مراسلت و مکاتبت، گفتگو عام جلسوں میں ہو یا خاص صحبتوں میں! ان سب معاملات میں عام طور پہ اردو ہی رواں دواں تھی اگرچہ مخصوص و محدود ذہنیتیں ہندی کے فروغ و ارتقا کی جانب کوشاں تھیں۔

ریاست کوٹہ کے افسران و وکلا میں اُردو

میرے پاس اردو داں، افسران و اہل کاران کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ہندو مسلمان سب ہی نہایت فر [illegible]

ہیں اور اکثر ناموں کے آگے "منشی" کا لفظ مرقوم ہے۔ منشی ہیرالال ادھو لیہ سب جج کے نام کے آگے کسی اہل کار نے بابو لکھ دیا۔ بڑے خفا ہوئے اور اسی وقت منشی لکھوایا۔ افسروں میں منشی ہیرالال سود۔ پنڈت شری رام جج۔ بابو جگدیش سہائے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پنڈت بشن لال کول سشن جج۔ پنڈت کشن لال اسسٹنٹ مال وغیرہم اردو کے اچھے واقف کار تھے۔ بابو بالمکند حاکم باغات، مولوی ثابت لکھنوی کے شاگرد ہیں گپت تخلص ہے۔ وکلا صاحبان میں منشی برجموہن لال احقر، منشی عبدالرزاق رضا، مولوی افضل حسین ثابت جناب محمود حسن ثاقب ادبی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

ریاست کوٹہ کے سرکاری مدارس میں اردو مولوی مظہر الہادی تحصیل، ہیڈ مولوی محمد علی، مولوی محمد سلیمان، مولوی حسن علی اور ماسٹر بھگوان داس اردو کی تعلیم و تعمیر کے لیے بھلائے نہیں جا سکتے۔

مکتبوں میں اردو خانگی مکتبوں میں اردو کا فیض بطور عام جاری تھا۔ محلہ رام پورہ میں مولوی فقیر محمد صاحب کے مکتب نے کئی طلبہ کو دولت علم سے مالا مال کیا۔ منشی بھیروں لال حاکم فوج کا مکتب بھی عام استفادہ کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ منشی اجودھیا پرشاد حاکم پن ارتھ ریاست کوٹہ شوقیہ طور پر اپنے مکان ہی پر فارسی کتب مثلاً شاہنامہ، سکندر نامہ، یوسف زلیخا پڑھایا کرتے تھے۔ ملا گھاسی خاں صاحب کے مکتب کا فیض یافتہ میں بھی ہوں۔ جہاں عربی و فارسی تعلیم کا سلسلہ ملا صاحب کی زندگی یعنی ۱۲ اگست ۱۹۲۰ء تک برابر جاری رہا۔ اب بھی کئی مکتب ہیں جن میں ذریعہ تعلیم محض اردو ہے۔ غیر سرکاری مدرسوں میں مدرسہ اسلامیہ کوٹہ اور مدرسہ اسلامیہ یاراں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان دونوں مقامات پر امتحانات جامعہ اردو کے سینٹر بھی قائم ہیں۔ جہاں مجموعی طور پر ہر سال سو سوا سو طلبہ مختلف امتحانات اردو میں شریک ہوتے ہیں۔

واعظین مبلغین ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد قومی ترقی کا جذبہ رکھنے والے اپنا اپنا پیغام لے کر اٹھے۔ بالعموم اردو ہی میں واعظین و مبلغین تقریر فرمایا کرتے تھے۔ مولوی کریم بخش صاحب کوٹہ کے وہ شیریں بیاں واعظ ہیں جن کی تقریروں اور دلپذیر وعظوں سے مقامی آبادی بہت مستفیض ہوئی۔ اس نسبت سے کہ وہ ہم وطن بھی تھے اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عملی مجسمہ بھی تھے۔ حافظ جان محمد اور مولوی نور الحسن، مولوی عبدالکریم صاحبان بھی اردو میں رواں دواں تقریریں کرتے تھے۔ میلاد خواں پارٹیاں آج بھی اردو نثر و نظم سے عام مذہبی دماغوں پر اپنے اثرات چھوڑتے رہتے ہیں۔ مولوی سراج۔ مولوی شمس الدین۔ حافظ کلو کی میلاد خواں پارٹیاں لوگوں کے دل و دماغ میں اب بھی بسی ہوئی ہیں۔ میلاد خوانیاں آج بھی ہوتی ہیں۔ حاضرین جلسہ مذہبی وعظ کے ساتھ

لاشعوری طور پر اردو کی تابناکیوں سے اپنا ذہن منور کرتے رہے ہیں۔

پریس کوٹہ جیل پریس میں سرکاری کاغذات کی چھپائی بالعموم اردو ہندی میں ہوا کرتی تھی۔ ۱۸۹۲ء میں پنڈت نہاری لال جھالاواڑ سے لیتھو پریس لائے تھے لیکن اب وہ ناپید ہے۔ دوسرا لیتھو پریس میر برکت علی محافظ دفتر عدالت فوجداری نے قائم کیا تھا۔ وہ تجارتی حیثیت کا تھا۔ کچھ دن چل کر بند ہو گیا۔ ان دنوں کوٹہ میں کوئی اردو پریس نہیں ہے۔

اخبار و رسائل روزانہ اردو اخبار کوٹہ سے کبھی جاری نہیں ہوا۔ لیکن اردو پرستوں کی قلمی جولانیاں مختلف زمانے میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی رہیں جن کا اجمالی تعارف یہاں کرایا جاتا ہے۔

(۱) نور بانت زندگی، اردو قومی ماہنامہ از مولوی محمد سلیمان مرحوم ۱۹۲۵ء۔ (۲) کوٹہ مسلم گزٹ از حافظ محمد اسحاق ۴۷، ۱۹۴۶ء۔ (۳) آصفی گزٹ کوٹہ از قاضی شجاع الدین احمد ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء (۴) ہربرٹ کالج میگزین کوٹہ۔ ۱۹۴۵ء سے بند ہو گیا۔ اکتوبر، جنوری، اپریل میں شایع ہوتا تھا۔ اردو کے صفحات بھی اس میں شامل رہا کرتے تھے۔ (۵) نیو ہائی اسکول میگزین کوٹہ۔ سنہ ۱۹۵۶ء سے شروع ہے۔ سالانہ ایک اشاعت نکلتی ہے (۶) شاد کوٹہ اپریل ۱۹۵۸ء نومبر ۱۹۵۹ء از للتا پرشاد شاد میرٹھی، پندرہ روزہ۔

قلمی رسالے (۱) افکار ۴۶۔۱۹۴۵ء (۲) آفتاب ۴۶۔۱۹۴۵ء (۳) شوکت ۱۹۴۶ء (۴) طالب علم ۱۹۴۹ء (۵) تنظیم ۱۹۴۹ء (۶) کارواں ۱۹۵۱ء (۷) ابر باراں ۱۹۵۲ء مکرر احیاء ۱۹۵۸ء اب بند ہے۔

کتابیں فی الحال پتہ چلا ہے کہ ۸۳ اردو تصانیف کے وجود میں لانے کا فخر کوٹہ کی سرزمین کو حاصل ہے جن میں سے کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ کچھ مطبوعہ ہیں۔ حیات دبیر ۱۹۱۳ء از مولوی افضل حسین ثابت لکھنوی حیات دبیر جلد دوئم حصہ اول ۱۹۱۵ء از ثابت لکھنوی۔ دربار حسین ۱۳۳۸ھ از ثابت مرحوم۔ مخزن اسرار معرفت ۱۹۴۹ء از شاد میرٹھی۔ طریقۃ الصلوٰۃ از جناب سلامت اللہ۔ تذکرۂ راجیہ کوٹہ ۱۹۱۹ء از چودھری موہن چند ناظم بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

کوٹہ کی عام ادبی فضا اس مضمون میں جہد آزادی، ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ راجپوتانہ کی اکثر ریاستوں میں اردو وہاں کے رئیسوں کے ذوق و شوق سے پنپی ہے۔ ورنہ عوام کی دلچسپی اس کے فروغ و ارتقاء کا باعث ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں رئیسوں کی تین شقیں کر لینی مناسب ہیں۔ وہ ریاستیں جہاں کے رئیس اردو کی طرف ملتفت تھے مثلاً ٹونک جھالاواڑ، الور، جے پور۔ وہ رئیس جنھوں نے ہندی کی ترویج میں اردو سے بے التفاتی برتی مثلاً ریاست بوندی

جیسا کہ سطور بالا میں جائزۂ زبان اردو کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ وہ ریاستیں جو نہ مزاحم ہوئے اور نہ متوجہ۔ کوٹہ اسی ضمن میں ہے۔ انتزاع سلطنت مغلیہ کے بعد دلی کے شعرا و ادبا بیشتر لکھنؤ میں اور وہاں کے بعد مختلف ریاستوں میں اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت چلے گئے اور اکثر وہیں کے ہو رہے۔ کوٹہ بھی ایسے بکھرے موتیوں اور ٹوٹے ستاروں کے لیے ملجا و ماویٰ ثابت ہوا۔ سرکاری ملازمتیں اور کاروباری سہولتیں میسر آ جانے پر یہ لوگ اپنے ادبی رجحان کی جانب متوجہ ہوئے چناں چہ "سید کے باغ" میں ایسے عام اجتماع ہوتے۔ سیٹھ کنور لال کانوہرہ اور راج صاحب کناڑی کی حویلی میں بھی شاندار جلسے جمتے۔ خاص نشستوں میں جناب ثابت لکھنوی (مولوی افضل حسین) ثاقب دہلوی (وکیل محمود حسن) اور جناب سہیل امروہوی (مولوی مظہر الہادی) کے یہاں ایسے چرچے رہتے۔ لیکن اس ضمن میں مقامی و غیر مقامی، مسلم و غیر مسلم کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ نہ کوئی خط فاصل کھینچا جا کر ادوار قائم کیے جا سکتے ہیں۔ حیات دبیر ۱۹۱۳ء میں ثابت صاحب نے شایع کی اس پر تاریخیں مقامی و غیر مقامی مسلم و غیر مسلم سبھی کی مدح ہیں اور کافی تعداد میں ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں ولی عہد ریاست مہاراج کمار بھیم سنگھ کی شادی ہوئی۔ اس کے سہرے اور تہنیتی قصیدے ایک مجموعے کی شکل میں چھپے ہوئے ہیں۔ ملازم و غیر ملازم، مسلم و غیر مسلم سبھی شامل ہیں بھارتیندو سمیتی کوٹہ کے تحت بسنت کے موقع پر بڑے شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ کالج کے اینول ڈنر کے مشاعرے آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اسی کالج میں ۱۹۳۴-۳۵ء میں ہندی اردو پوئٹس ایسوسی ایشن قائم ہوئی جس کے تحت ہر ہفتہ ملی جلی ادبی نشستیں رہتی تھیں۔

ریاست کوٹہ میں ادبی انجمنیں، بزمیں اور مشاعرے

تا حد معلومات کچھ بزم اور مشاعروں کے نام لکھے جاتے ہیں جس سے اردو کی سرگرمیوں کا اندازہ ہو سکے گا۔ (۱) انجمن تنظیم المومنین کوٹہ ۱۹۲۷ء (۲) انجمن ہلال احمر ۱۹۳۱-۳۲ء (۳) بزم ادب کوٹہ ۱۹۳۳ء جو اب تک قائم ہے۔ شروع بزم سخن کے نام سے قائم ہوئی۔ پھر بزم خیال اس کا نام تبدیل ہوا۔ کچھ دنوں بعد بزم ادب مقرر ہوا۔ جائزہ زبان اردو ۱۹۴۰ء میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ (۴) انجمن تنظیم المسلمین کوٹہ ۱۹۳۴ء (۵) ہندی اردو پوئٹس ایسوسی ایشن ہربرٹ کالج کوٹہ ۱۹۳۵ء (۶) مشاعرہ پریم منڈل ۱۹۳۵ء (۷) مشاعرہ دی ہربرٹ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کوٹہ ۱۹۳۵ء (۸) مشاعرہ مبارکباد ۱۹۳۶ء بہ سلسلہ پیدائش فرزند عثمان غنی مائل (۹) فی البدیہہ مشاعرہ ۱۹۳۷ء (۱۰) مشاعرہ سکل سنار سہکاری دوس کوٹہ ۱۹۳۸-۳۹ء (۱۱) مشاعرہ مبارکباد گولڈن جوبلی ہز ہائینس کوٹہ ۱۹۳۹ء (۱۲) مشاعرہ ریلوے انسٹی ٹیوٹ کوٹہ جنکشن ۱۹۴۰ء (۱۳) بزم افکار کوٹہ ۱۹۴۵-۴۶ء (۱۴) بزم شوکت ۱۹۴۶ء (۱۵) بزم اطفال ۱۹۴۶-۴۷ء (۱۶) مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کوٹہ ۱۹۴۶ء (۱۷) بزم احباب باراں ۱۹۵۷ء (۱۸) بزم شعور

کوئٹہ ۶۱-۱۹۶۰ء ۱۹۶۱ء) مشاعرہ دسہرہ کوئٹہ ۱۹۵۳ء سے اب تک۔

شعراء شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ خالص رنگ قدیم والوں میں سے کچھ یہ ہیں:۔ ثابت لکھنوی، سخنور ٹونکی، سہیل امروہوی، محترمہ اللہ بندی وفا، میر محبوب حسن ثاقب، بابو ہیرالال سود شیدا، وکیل برج موہن لال احقر، منشی ریاض احمد بسمل، مولوی عبداللطیف یکتا، شیخ قربان علی قربان، وکیل ریاض الحسن ریاض، بابو عبدالقادر ندا، مرزا عباس بیگ مرزا، قاضی امداد علی علی، سید نورالحسن نور، مولوی فضل احمد صیفی، مولانا عبدالستار عبد، منشی چندی سہائے سخن، لالہ شنکر لعل بی۔ ایس سی بے عقل، منشی اشرفی لال اشرفی، منشی کالکا پرشاد حزیں و شاد بریلوی، منشی بالمکند گپت، ناظر علی محمد علی، منشی ٹکٹ نراین انسپیکٹر، ملا عبداللطیف لطیف، ممتاز علی بکل، ماسٹر ہرنراین شائق، ماسٹر محمد اسحاق اسحاق، بابو فریدالدین فرید، مقبول احمد مقبول، سررشتہ دار حافظ حکمت علی حافظ، پیر عارف علی عارف، مولوی محمود عالم قیصری وغیرہ وغیرہ۔ انھیں ۱۹۳۰ء تک کے شعراء میں سمجھ لیجیے۔ جن میں سے بیشتر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

متوسط زمانہ، ۱۹۴۷ء تک کا قائم کیجیے۔ تو حسب ذیل شعراء سر محفل نظر آئیں گے۔ جن میں رنگ قدیم و جدید دونوں کی آویزشیں ہیں:۔

حافظ نور محمد انور، شاہ عبدالرزاق عاجز، مولوی سراج احمد سراج، منشی عبدالرزاق تمکین، ملا رحمت علی رحمت، پیر عثمان غنی سائل، احمد حسین راغب، عبداللہ خاں شیدا، عبدالرشید خاں وحشی، (سر تاج لبنی) محمد اکمل اکمل، عبدالعظیم خاں بسمل، وکیل احمد حسین جوہر، منشی علی احمد ثمر، ظہیر گلشن آبادی، محمد سلمان رہبر، امیر محمد اختر، حافظ محمد بخش مجروح، لال محمد جوہر، نور محمد قیس، حاجی ڈم ڈم کوئٹوی، عمر توفیق، لطیف، اور راقم الحروف مفتون کوئٹوی۔

اب لطفی کوئٹوی، شاد کوئٹوی، شاداب، ظفر غوری، ظفر پرواز، گوہر، بہار، خمار، امین، نثار، آزاد، نیاز وغیرہ کوئٹہ کی بزم ادب کی رونق ہیں۔ باراں ضلع کوئٹہ میں شبیر، آزاد، عزیز مانگردلی، سرور، محمود الہ آبادی، سرور، ابن رضا وغیرہم بزم احباب کے مخصوص شعراء ہیں۔ ان میں شعر و ادب کے جدید میلانات و عصری رجحانات کی بھی کامل جلوہ گری نظر آتی ہے۔

ادبا حال کے نثر نگاروں میں سلطان احمد بی۔ اے تحقیقی و تاریخی مقالے لکھتے ہیں۔ شاد کوئٹوی اور دیا ساگر نثر نگاری اور افسانہ نگاری کی طرف بھی رجحان رکھتے ہیں۔ کوئٹہ میں ہنس راج الفت جویلوی اور مختار الرحمٰن راہی جے پوری کے باعث افسانہ نگاری کا چرچا عام ہوتا جا رہا ہے۔ مظہر ابراہیمی کوئٹوی کا ذکر بہ حیثیت ڈرامہ اور ناول نگار خصوصی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ میں بھی کچھ نثر لکھ لیتا ہوں جس کا نمونہ اس مضمون

سے بطور آپ کے پیش نظر ہے۔

لائبریریاں پبلک لائبریری اور ڈویژنل لائبریری کوئٹہ میں اردو کی کتابیں ملتی ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری ۱۹۶۳ء میں قائم ہوئی۔ متعدد اشخاص کے یہاں اردو، فارسی اور عربی کتابیں اب بھی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مدرسہ اسلامیہ کوئٹہ اور باراں میں بھی اچھی لائبریری ہے۔

اسکولوں میں اردو باٹن پول مڈل اسکول کوئٹہ اور مہاتما گاندھی ہائر سیکنڈری اسکول کوئٹہ میں اردو رائج ہے کوئٹہ اور مفصلات کے اور بھی کئی ابتدائی اسکولوں میں اردو رائج ہو گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو شاخ کوئٹہ اس سلسلہ میں کوشاں رہتی ہے۔

کوئٹہ جنکشن کوئٹہ سے چار میل دور کوئٹہ جنکشن (بجانب شمال) اردو سرگرمیوں کے لحاظ سے قبل ۱۹۴۷ء بڑی اچھی ہمہمی کا مرکز رہا ہے۔ ریلوے اور ڈاکخانے کی ملازمت مرکزی حکومت کے تحت ہونے کے باعث یہاں دہلی، لکھنؤ، اکبرآباد، یو پی، پنجاب وغیرہ مقامات وصوبہ جات کے بڑے قابل افراد مجتمع ہوتے رہے ہیں۔ خوب مشاعرے ہوتے۔ بڑی ادبی نشستیں رہتیں۔ حضرات اعتضاد احمد، قیام الدین، یقین الدین جلیل روہتکی، جلیل مرزا، فضل احمد دہلوی، ڈاکٹر فوجدار، للتا پرشاد شاد میرٹھی، آصف حیات خاں، ماسٹر عبدالرب، جعفر صاحب، غلام محمد شہاب الدین، عباس علی اسٹیشن ماسٹر وغیرہم۔ اردو شعر و ادب کے فروغ وارتقا کے سبب بنے ہوئے تھے۔ دو احسن مزاح نگار تھے ساتھ ہی مرثیہ گو بھی۔ مقامی طور پر یہاں محمد حسان ٹیلر ماسٹر۔ عبدالغفور۔ انعام الحق بڑے اردو پرست اور اردو نواز تھے۔ جناب محمد احمد خاں پھوپھا جو کسی زمانہ میں ریلوے کے رنگ و روغن کے ٹھیکہ دار تھے۔ آج بھی اس ماحول کی ترجمانی بڑی خوش بیانی سے کرتے ہیں۔ بہار بدایونی، جمیل قریشی۔ ابرار حسن خمار۔ ودیا ساگر، شاد کوٹوی۔ لطفی کوٹوی۔ سیتا رام زیبا سے آج کل بھی یہاں کی ادبی فضائیں پُربہار ہیں۔

مفصلات قصبۂ باراں، امتحانات جامعہ اردو کا مرکز ہے۔ اور "بزم احباب" باراں کا دائرۂ عمل۔ مدرسۂ اسلامیہ باراں، ملحقہ لائبریری کے باعث اردو کا قابل تعریف ادارہ ہے۔ قصبۂ چھپیا بڑود واقف چھپیا بڑودی۔ خلیل آفریدی۔ سیٹھ علی محمد علی وغیرہم کی اردو سخن سنجیوں سے پُر رونق ہے قصبۂ مانگرول میں عزیز مانگرولی شعر و ادب کی فضائیں عام کر رہے ہیں۔

شعرائے کوئٹہ کا نمونۂ کلام میں اس مضمون کو نامکمل سمجھوں گا اگر اس میں کوئٹہ کے چند شعراء کا کلام بطور نمونہ پیش نہ کروں ۔

جی شوق سے جہاں میں کہ جینا بُرا نہیں ذلت کی زندگی میں مگر کچھ مزا نہیں

ہے انھیں سے مرے جذباتِ ندامت ضیا
جو ستارے رہے پلکوں پہ درخشاں ہوکر
— توقیر کوڑوی

کبھی تو حسن کی فطرت میں ایسا انقلاب آئے
کہ وہ آئے ہمارے سامنے اور بے حجاب آئے
مجھے لذت کش سازِ محبت اس قدر کردے
کہ نالوں سے صدائے نغمۂ چنگ و رباب آئے
— توقیر کوڑوی

شرابِ محبت مری زندگی ہے
اگر جام توڑا تو دم توڑ دوں گا
عمر چشمِ مخمورِ ساقی کے آگے
یہ اک جام کیا جامِ جم توڑ دوں گا
— عمر کوڑوی

دل کو آزادِ غمِ سود و زیاں کرنا پڑا
زندگی کو خوگرِ جورِ بتاں کرنا پڑا
مرحلے ہوتے ہیں طے شکوے گلے کے جس جگہ
آپ سے ترکِ تعلق اب وہاں کرنا پڑا
— امین تشلیلی کوڑوی

وہ ظلمتِ حیات سے آگے نکل گئے
جو لوگ حادثات کے سائے میں پل گئے
پھر آج ان کی یاد میں آنسو نکل گئے
کچھ دور ساتھ چل کے جو راہیں بدل گئے
— لطفی کوڑوی

نیرنگیٔ فطرت کے ہر سانچے میں ڈھل جانا
یہ عشق کو مشکل ہے اور حسن کو آساں ہے
ہے کش مکشِ غم کا دونوں پہ اثر یکساں
کچھ میں بھی پریشاں ہوں کچھ وہ بھی پریشاں ہے
— شاد کوڑوی

تکتے تکتے رخِ تاباں کو ترے اہلِ نظر
آنکھ سے ہو گئے معذور، خدا کی قدرت
چاٹ کر میری رقم بات وہ کرتے بھی نہیں
کھٹے ہیں اب مرے انگور، خدا کی قدرت
— ڈم ڈم کوڑوی

زہے یہ عارضِ روشن اور اس پہ زلفِ سیہ
اسی کو گردشِ لیل و نہار کہتے ہیں
ہنوز نرگسِ بے نور نے نہیں دیکھا
یہ دیدہ ور کسے جانِ بہار کہتے ہیں
— عزیز بانگمولی

نہیں دیکھا جہاں میں تیرا ثانی
حسیں گزرے ہیں لاکھوں ہی نظر سے
وہاں لفظ و بیاں کی کیا ضرورت؟
جہاں اظہار ہوتا ہو نظر سے
— لطیف کوڑوی

محبت آج کل بدنام کیوں ہے؟ ہم نہیں سمجھے
کسی کی زلف پہ الزام کیوں ہے؟ ہم نہیں سمجھے
دعا مانگی تھی اے پرواز ہم نے صبحِ روشن کی
مقدر میں ہمارے شام کیوں ہے؟ ہم نہیں سمجھے
— ظفر احمد پرواز

کہکشاں کی یہ شبنمی راہیں
سردِ احساس کے اندھیرے میں
چاندنی بن کے جھلملاتی ہیں
زندگی کے نئے سویرے میں
— ظفر غوری

چھپائے جلوۂ دیر و حرم نگاہوں میں
لٹا رہا ہوں میں سجدے کسی کی راہوں میں
غرض کے سجدوں سے بہتر ہے ہر طرح آزاد
وہ زندگی جو کٹے بے غرض گناہوں میں
— ماسٹر شریف حسین آزاد

لب پہ شکوے نہیں، نظروں میں پیامات نہیں
اب تری بزم میں تقریبِ ملاقات نہیں
یہ بھی ہے حسن کی آزاد خیالی مفتوں
کہ جوابات بھی پابند سوالات نہیں
— مفتوں کوڑوی

بھلا کیوں کر نہ لے جان گلستاں ہم پہ پیار آئے — نظر پھیرو خزاں آنے، نگہ ڈالو بہار آئے
قدم رک رک کے اٹھتے تھے گماں ہوتا تھا منزل کا — مقامات اس طرح کے راستے میں بیشمار آئے
پرکاش چند چاند

مجبور ہو کے گردشِ دورِ زماں سے ہم — جاتے ہیں آج اٹھ کے ترے آستاں سے ہم
محسوس ہو رہا ہے یہ ان کے خیال میں — جیسے گزر رہے ہوں کسی امتحاں سے ہم
جوہر کوٹوی

تاب نظارہ ہے دل انساں لیے ہوئے — ذرہ ہے ظرف مہر درخشاں لیے ہوئے
رہبر یہ پردۂ گل و لالہ میں دیکھنا — بیٹھا ہے کون رازِ گلستاں لیے ہوئے
رہبر کوٹوی

مقصود لفظ کن سے نمود وجود تھی — اپنا ہی راز آپ سے پنہاں نہ ہو سکا
باغباں برق نظر کو آزمانے کے لیے — کر رہا ہے جمع تنکے آشیانے کے لیے
قیس کوٹوی

میز کی گرد نہیں دل کا ہے ثابت یہ غبار — اب نہ تا حشر کبھی اُن سے صفائی ہو گی
کم ظرف سے نہ مانگ کہ ثابت نہ ہو ذلیل — قطرہ بھی نام کو نہیں جام حباب میں
مولوی افضل حسین ثابت مرحوم مصنف حیات دبیر، دربار حسینی وغیرہ

راجستھان کی ہاڑوتی ریاستوں میں کوٹہ، بوندی، جھالاواڑ — ڈویژن کوٹہ انھیں پر مشتمل ہے۔ ہمارے محققین و مورخین نے راجستھان کی اردو ادبی سرگرمیوں کا جائزہ کما حقہٗ نہیں لیا ہے۔ جے پور، جودھپور، اجمیر، ٹونک کا ذکر پھر بھی کہیں آ جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا ہاڑوتی ریاستوں کی ادبی خدمتیں، کاوشیں اور کوششیں پردۂ خفا میں ہیں۔ ان تینوں ریاستوں میں سے ریاست جھالاواڑ، اردو فروغ و ارتقا کے سلسلے میں سرکاری حیثیت بھی رکھتی ہے۔ یعنی یہاں کے رئیس، راجہ بھوانی سنگھ اور پھر ان کے بعد راجہ راجیندر سنگھ مخمور اردو کی جانب خصوصی التفات رکھتے تھے۔ میں نے ان تینوں ریاستوں کی اردو تعمیر و تزئین پر روشنی ڈالی ہے اور یہاں کے اردو خدمت گزاروں اور اردو پرستاروں کا ذکر کیا ہے۔ راجستھان کی ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھوتا ہے، کیوں کہ ہمارے اہل قلم کی توجہات اب تک اس طرف منعطف نہیں ہو سکی ہیں۔ ریاست کوٹہ کی ادبی فضاؤں کی سیر کے بعد اب دوسری ریاست کی ادبی فضا کی سیر کیجیے :-

بوندی میں اردو کا فروغ و ارتقا

چودھری مول چند ناظم (صاحب تذکرۂ راجیہ کوٹہ ۱۹۱۹ء) کے بقول راؤ دیوسی نے بتاریخ کرشن پکش نومی (۹) بہ ماہ اساڑھ سمبت ۱۳۹۸ مطابق ۱۳۴۲ء ریاست بوندی کی بنیاد ڈالی۔ یہ رئیس راجپوتوں کی نسل ہاڑا سے تھا اس لیے اس نے اپنے علاقہ کا نام ہاڑوتی رکھا۔ رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء میں ہاڑوتی کو زمین کی ساخت

یعنی میدانی علاقہ اور زراعتی اصطلاح میں بارانی علاقہ کی وجہ سے ہاڑوتی کہا گیا ہے لیکن صاحب تذکرۂ راجیہ کوٹہ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور ہاڑا راجاؤں کے زیرِ حکومت علاقہ کو ہاڑوتی بتایا ہے بالکل اسی طرح جس طرح جھالا راجپوت راجاؤں کے زیرِ حکومت علاقہ کو جھالاواڑ کہا جاتا ہے۔ صاحب تذکرۂ راجیہ کوٹہ لکھتے ہیں کہ ہاڑوں کی حکومت اور بود و باش ناگور میں تھی تو وہ ضلع ہاڑوتی کہلاتا تھا ابوالفضل مصنف اکبر نامہ نے ہاڑوتی کے لفظ میں بجائے حرف "ت" کے "ل" استعمال کر کے ہاڑولی لکھا ہے۔ ناگور عہد دولت شہنشاہ اکبر میں ایک سرکار یا ضلع تھا۔ چناں چہ لکھا ہے کہ ہاڑولی سرکار۔ ناگور را گویند قوم ہاڑہ باشند۔ اور لفظ ہارا میں الف کے بجائے ہائے ہوز استعمال کی ہے۔ کرنل جیمس ٹاڈ صاحب نے بھی اسی قدر زمین کو ہاڑوتی تسلیم کیا ہے جو زیرِ حکومت اقوام ہاڑا ہے اور اس لیے بوندی کوٹہ کی ریاستوں کو ہاڑوتی کہا گیا ہے لیکن دراصل علاقہ ہاڑوتی کی قدرتی شناخت اس کی زبان و پوشش سے ہے۔ ہاڑوتی کی زبان بھاشا، راجپوتانہ و مالوہ سے جدا ہے۔ یہ بذاتِ خود ایک علٰحدہ زبان ہے۔ حرفِ ربط "کو" کے بجائے "نے" اور فعل ہے یا تھے کے بجائے "چھے" بولا جاتا ہے مثلاً کوٹہ لے گیو چھے" یعنی کوٹہ گیا ہے۔ میں ایک تانبہ پتر کی نقل تذکرۂ راجیہ کوٹہ کے صفحہ ۱۷ سے نقل کرتا ہوں جس سے ہاڑوتی زبان کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

"مہاراج دھراج سری مادھو سنگھ جی دیو بچنات۔ جوگی نند ناتھ، چیلا رگھوناتھ ہیں۔ دھرتی بگیہ بہتر (۷۲) انکہ ۲، بگیہ گاؤں ایک میں موضع بتور خورد کی آسیا گھاٹا کی میلوڑی میں دھرتی بگیہ اکتیس پرگنہ پلائتھہ کو سدا مد رہنی چھے۔ سدا ہن پایا جاسی، مہاراؤ جی سری راؤ رتن نے تھائیں تانبہ پتر کر دیو چھو سو تانبہ پتر دیکھ مہاں نے بھی بحال کر دینو۔ حکم حضور سے ہو یو جھاں نے دلیو درخواست چودھری رام دت جی دھرتی تکمٹ کے آسن پر چڑھائی چھے۔ سدا مد پایا جوشی۔ متی بیساکھ بدی چودش سمبت ۱۶۷۴ بکرمی۔"

یہی وہ ہاڑوتی زبان ہے جو بقول صاحب جائزہ زبان اردو (۱۹۴۰ء) مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند۔ برسم الخط ہندی دفتری تحریروں میں استعمال ہوتی رہی۔ بوندی کے ہاڑا حکمراں مغل بادشاہوں کی ملازمت اور درباداری میں رہے ہیں اور وقتاً فوقتاً سرکار مغلیہ سے اعزازات و خطابات سے معزز و مفتخر بھی رہے ہیں۔ حتیٰ کہ راؤ رتن والی بوندی (۱۶۰۸ء تا ۱۶۱۸ء) شہنشاہ جہانگیر کا نامی پنجہزاری جنرل تھا۔ سربلند رائے اور رام راج خطاب پائے ہوئے تھا مغلیہ تہذیب و شائستگی یہاں کے راجپوتوں کے رہن سہن اور پوشش و خورش میں داخل ہوئی۔ زبان پر بھی فارسی الفاظ چڑھے۔ مذکورہ بالا تانبہ پتر میں بھی کئی الفاظ عربی و فارسی کے موجود ہیں۔ ان فارسی الفاظ کا استعمال عام بول چال میں بھی ہوا لیکن سرکاری زبان وہی ہاڑوتی بہ رسم الخط ہندی رہی ریاست میں شعبۂ فارسی ضرور قائم رہا جو سلطنت

منلیہ سے مراسلت رکھتا تھا۔ ادبی وتہذیبی اتفاقی جانب یہاں کے رئیس عام طور پر متوجہ نہیں پائے جاتے چنانچہ فارسی اردو کا چلن عام ہو سکا نہ ہندی ہی عروج کو پہنچ سکی۔ یہ حکمراں اور دیگران کے وابستگان دولت اپنی خاندانی، موروثی اور مادری زبان ہاڑوتی بولتے رہے۔ تعلیمی ترقی کی جانب بھی ان کا التفات کوئی خاص نہیں پایا جاتا۔ جمہور، مقامی بولی ہاڑوتی سے بالعموم اپنا کام چلاتے رہے ہیں۔ بیرونی افراد جو بہ سلسلہ معاش۔ خواہ کاروبار ہو یا ملازمت ریاست میں آئے اپنے اپنے حلقے میں اپنی اپنی زبان استعمال کرتے رہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو بیرونی افراد معاشی ضرورتوں کے تحت ریاست میں آئے اور جنھوں نے سرکاری ملازمتیں اختیار کیں ان میں کثرت سے اردو فارسی جاننے والے تھے اور خصوصیت سے بیرونی مسلمان اچھے اچھے عہدوں پر فائز تھے۔ لیکن بقول صاحب زبان جائزہ اردو ان کو بطور خاص اس کی پابندی رکھنی پڑتی تھی کہ اردو الفاظ استعمال نہ ہونے پائیں کیوں کہ ریاست کے بعض راجا ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے سختی کے ساتھ دفتری تحریروں میں اردو فارسی الفاظ کی آمد کو روکا ہے۔ چناں چہ ۱۹۰۸ء میں جب کہ مہاراؤ راجہ رگھوبیر سنگھ حکمراں تھے احکام صادر ہوئے کہ اردو فارسی الفاظ سرکاری تحریروں میں نہ آنے پائیں۔

میری فراہمی معلومات کے تحت اواخر انیسویں صدی عیسوی یعنی سمبت ۱۹۲۵ بکرمی مطابق ۱۸۶۸ء میں پنڈت گنگا سہائے دیوان ریاست بوندی کا زمانہ سرکاری طور پر اردو کے لیے سازگار نظر آتا ہے۔ انھوں نے نظم و نسق ریاست کو درست کیا۔ تجربہ کار اور فارسی داں لوگ باہر سے بلوائے۔ قوانین ریاست جوڈیشل، مال وغیرہ کے مرتب کیے۔ اسی زمانے میں منشی ہرنام سہائے مہتمم بندوبست مقرر ہوئے۔ رائے صاحب منشی مکٹ بہاری لال حاکم سرحدات مامور ہوئے۔ منشی رگھبر دیال سرمنشی محکمہ ضلع غیر تعیناتی کیے گئے۔ اخیر کے دو صاحبان منشی پربھودیال رقم بوندوی کے علی الترتیب تایا اور والد ہیں۔ منشی پربھودیال رقم بوندوی خود بھی ریاست میں مختلف عہدوں پر مامور رہے ہیں اور وہیں سے پنشن یاب ہو کر اب بمقام جے پور مقیم ہیں۔ یہی رقم صاحب رقم طراز ہیں کہ پنڈت گنگا سہائے کے زمانے میں جو قوانین اور دستور العمل مرتب ہوئے وہ اگرچہ ہندی میں تھے لیکن ہر صفحہ پر اردو ترجمہ بھی ساتھ ہوتا تھا۔ ریاست میں کوئی پریس نہیں تھا۔ نول کشور پریس لکھنؤ میں ان کی چھپائی ہوا کرتی تھی۔ پنڈت گنگا سہائے سنسکرت کے فاضل تھے۔ یو۔ پی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بھاگوت کا سنسکرت سے سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مہا منڈل سبھا بنارس سے انھیں "ودیا واچپتی" کا خطاب حاصل تھا۔ وہ اردو سے بھی واقف تھے۔ ساتھ ہی اردو کے قدرداں و سرپرست بھی تھے۔ اور یہی ایک بڑے ادیب کی پہچان ہے کہ اسے کسی ادب سے تعصب یا دشمنی نہیں ہوتی۔

دربار ہائی اسکول بوندی میں اردو زبان کے مدرس، اردو کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولوی غیاث الدین غیاثی

اور منشی ایشوری پرشاد عاصی عرصۂ دراز تک اس اسکول میں اردو فارسی کے معلم رہے ہیں۔ شاد احمد شاہ شیدو کیپ بوندی۔ شیخ محمد رمضان علی کو بھی سرکاری اسکول میں مدرس بتاتے ہیں جائزہ میں جناب اشرف حسین کو ہیڈ مولوی ہائی اسکول بوندی لکھا ہے۔

سرکاری عنایت و عتاب کی حد تک اردو کے متعلق یہ معلومات فراہم ہو سکی ہیں۔ تاہم اردو اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے عوام کے دلوں میں گھر کرنے میں یہاں بھی اپنی وسعت تک کامیاب ہے۔ لازماً اردو فارسی داں اصحاب کی آمد اور بہ سلسلۂ ملازمت ان کا ریاست میں قیام، مقامی باشندوں پر اثر انداز ہونا چاہیے تھا۔ پھر مقامی باشندے بھی مکتبوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چناں چہ جائزہ زبان اردو میں نجی مکاتیب کی تعداد ۸ بتائی گئی ہے اور ان میں ان طلبا کی تعداد جو دیگر مضامین کے ساتھ اردو بھی پڑھتے تھے۔ تین سو درج ہے۔ منشی بربھود یال رقم تحریر فرماتے ہیں کہ میرے لڑکپن کے زمانے مولوی غیاث الدین غیاثی۔ مولوی وحید احمد، مولوی صادق حسین اور مولوی فضل الرحمن صاحبان کے مکاتب خصوصیت سے نمایاں کام کرتے رہے ہیں۔ ہر مکتب میں طلبا کی تعداد پچاس ساٹھ سے کم نہیں ہوتی تھی۔ منشی ایشوری پرشاد عاصی سہسوان ضلع بدایوں (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ تلاش معاش میں بوندی آئے اور تازیست بوندی ہی رہے۔ ان کا زمانہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کا سمجھنا چاہیے۔ مولوی غیاثی اور منشی عاصی صاحبان ہائی اسکول میں ملازم بھی تھے اور خانگی طور پر ان کے یہاں مکتب بھی جاری تھے یہ کسی ادبی انجمن کے رکن تو نہیں رہے لیکن بوجہ علمیت و فضیلت عام و خاص شائقین علم و ادب ان سے اصلاح و صلاح لیا کرتے تھے۔ منشی بربھود یال رقم، مولوی فضل الرحمن اور مولوی غیاث الدین غیاثی کے مکتبوں کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ شاعری میں انھوں نے منشی ایشوری پرشاد عاصی سے تلمذ حاصل کیا۔ منشی عاصی ان کے نانا خسر بھی ہوتے تھے۔ اپنی شاگردی کا ذکر اس شعر میں انھوں نے کیا ہے ؎

مثل عاصی کس کو استادی کا دعویٰ ہے رقم   حکم ان کا میں بجا لاتا ہوں شاگردانہ آج

بوندی میں اردو پریس آج تک نہیں ہے۔ نہ کوئی اردو اخبار یا کوئی اردو رسالہ کبھی جاری ہوا۔ ایک سرکاری لائبریری ہے جس میں اردو کتابیں موجود ہیں (جائزہ زبان اردو صفحہ ۱۱۲) لیکن شہر کے اردو فارسی خواں حضرات کے پاس اردو فارسی کتابوں کے ذخیرے اب بھی موجود ہیں۔

اردو امتحانات کا مرکز یہاں نہ اب اس وقت قائم ہے نہ اس سے پہلے قائم تھا۔ پنجاب کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل نیز ادیب، ادیب ماہر اور ادیب فاضل کے لیے طلبا خانگی طور پر تیاری کیا کرتے تھے۔ چناں چہ جناب رقم نے منشی فاضل کا امتحان اسی خانگی تیاری کے بعد دیا۔ ان کے دوست مصطفیٰ خاں "مولوی عالم" نے بھی اسی طرح منشی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ جناب رقم نے اسٹوڈنیس ڈیبیٹنگ کلب

قائم کیا تھا جس میں بزبان اردو تقریریں ہوتی تھیں۔ پندرہ سال تک یہ کلب کامیابی سے کام کرتا رہا۔

بوندی کے مولوی عبدالغفور صاحب چمن قادری، مولوی چاند محمد صاحب، مولوی قمرالدین صاحب اردو میں بڑی رواں تقریریں کرتے ہیں۔ راقم السطور نے اپنے لڑکپن میں مولوی عبدالکریم کی تبلیغی تقریریں سنی ہیں جو وہ بسلسلۂ وعظ، بوندی سے کوٹہ آکر کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ تقریریں بڑی شستہ و شائستہ اردو میں ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں نثار احمد نثار ایڈووکیٹ اردو کے خصوصی ہمدردوں میں سے ہیں۔ ان سے حالات کی فراہمی میں مجھے بہت کچھ امداد ملی۔

اردو کی اس عام حیثیت کے بعد اب اس کی ادبی حیثیت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جائزۂ زبان اردو میں حسب ذیل مطبوعہ کتابوں کا ذکر ملتا ہے (۱) کلام حضرت مولانا سراج الدین سراج ۱۹۰۱ء (۲) ناول چمپا عرف چنبیلی مطبوعہ ۱۹۱۴ء ابوالعلائی پریس آگرہ، مصنفۂ جناب اندر سہائے۔ (۳) محشر خیال (۴) کیفر کردار (ڈرامہ)۔ (۵) عورت کا پیار (ڈرامہ) یہ تینوں تصانیف نمبر ۳، ۴، ۵ شاد ہاشمی کی ہیں۔ (۶) سفینۂ مغفرت منشی واجد حسین کا کلام ہے جو ۱۹۳۲ء میں افضل المطابع بمبئی سے چھپا ہے۔ جناب رقم بوندوی کی کتاب جاں نثار مسیحا ۱۹۱۴ء میں شایع ہوئی اور تحفۂ عید میلاد النبی ۱۹۵۸ء میں۔

منشی برج بھو بن لال رقم بوندوی کی اردو تصانیف میں فن تقریر، تجرد کی فضیلت، اندر شکتی کا ظہور، روحانی طاقت، نیاب خیالی کی فتح، موت پر فتح ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی ہندی تصانیف سنتان سدھار، یم دوتیہ کتھا۔ چھپ چکی ہیں۔ ان رسم الخط ہندی سمجھیے بقیہ زبان بیشتر اردو ہے۔ ان کی کچھ ہندی کتابیں ابھی اور غیر مطبوعہ ہیں۔

شعر و سخن کے سلسلہ میں کلام رقم ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ کلام غیاثی۔ کلام منشی چھیدی لال چرخ۔ کلام منشی ایشوری پرشاد عاصی۔ کلام وارث۔ کلید خیال از منشی مغیث الدین وصال ہاشمی۔ ہنگامۂ خیال از نذیر عثمانی تصویر خیال از منشی واجد حسین واجد بھی غیر مطبوعہ ہیں۔ منشی واجد حسین کے افسانے "ثمرۂ افعال" اور "بوالہوس کوتوال" بھی ہنوز چھپے نہیں ہیں اور اسی طرح "نثار رسول" جناب نثار احمد نثار ایڈووکیٹ کا نعتیہ مجموعۂ کلام ہے، یہ بھی ابھی تک طباعت سے محروم ہے۔

ان مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف سے بوندی کی اردو ادبی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو کہاں کہاں پہنچی ہے! اس نے اپنی نفاستوں، لطافتوں، صلاحیتوں اور دل کشیوں سے کس کس کو اپنا پرستار اور خدمت گزار بنایا ہے! یک جہتی و یک رنگی کی فضا جو اس کے خمیر و ضمیر میں ہے اس کے فدا کاروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندو و مسلم کی کوئی تخصیص نہیں، امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ اس کے دربار میں سب موجود ہیں۔ تعصب و تنگ نظری کو دخل نہ ہو تو صاف نظر آئے گا کہ اردو ملک کے ہر طبقہ اور مذہب کی زبان ہے نیز یہ بھی کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچی ہے اور اس نے اپنا جادو جگایا ہے۔

بوندی کے کچھ موجودہ شعراء کا کلام پیش نہ کرنا اس مضمون کی تکمیل پر حرف لائے گا۔ جائزہ زبان اردو [illegible]
ایک انجمن مشاعرہ اصلاح الادب ۱۹۳۲ء کا ذکر موجود ہے، منشی رقم بوندوی بھی اپنی تحریر میں بوندی میں چند
روزہ مشاعرہ کا قیام درج کرتے ہیں۔ طرحی مشاعرے منعقد ہوتے رہنا بتاتے ہیں۔ اور آنجہانی عاصی کو اس وقت کا
زبردست شاعر ہونا بیان فرماتے ہیں۔ افسوس ہے متذکرہ شعرائے سلف میں سے کسی کا کلام دستیاب نہ ہو سکا
چند موجودہ شعراء کا کلام درج کیا جا رہا ہے۔

حضور احمد شفق نوجوان شاعر ہیں۔ فطری ذوق و شوق کی بنا پر طبع سلیم کی رہنمائی میں جادۂ شاعری پر گامزن
ہیں بی۔اے ہیں۔ تیس کے قریب عمر ہے ؎

اپنا لیا ہے ہم کو غمِ روزگار نے — اب ہم تمہاری شان کے شایاں نہیں رہے
حسن رونے سے اور نکھر اترا — پھول کا منھ دھلا گئی شبنم
ہماری بے سروسامانیوں سے ان کی عظمت ہے — شفق ورنہ وہ یوں اکرام فرمانے کہاں جائیں؟

نثار احمد صاحب نثار بوندی کے مشہور ایڈووکیٹ ہیں۔ اقبال سے متاثر ہیں۔ نعتیہ کلام کے دو شعر پیش ہیں:

لے گیا انسانیت کو منزلِ مقصود پر — اس کا ہر نقشِ قدم جنت کا زینہ بن گیا
دشمنوں نے سر جھکا کر رکھ دیا — خلق کی تلوار۔ تیرا شکریہ

منشی پربھو دیال ورمن رقم بوندوی:۔ پیدائش ۱۲ جنوری ۱۸۹۱ء ریاست بوندی کے مختلف عہدا
پر سرکاری ملازمت میں رہے۔ اب پنشن یاب ہو کر اپنے لڑکے جگدیش دیال کے ساتھ جے پور رہ رہے ہیں
مولویوں کے فیض یافتہ اور مکتبوں کے ساختہ و پرداختہ ہیں۔ سنسکرت بھی جانتے ہیں۔ انگریزی سے بھی خو
واقف ہیں۔ فارسی بھی انھوں نے پڑھی ہے۔ اردو میں شعر گوئی کرتے ہیں۔ جناب ایشوری پرشاد عاصی
تلمذ حاصل ہے۔ رنگ قدیم ہے۔ کلام دلپذیر ہے۔ نیز فنی خوبیوں اور ادبی تابانیوں سے لبریز۔ اب بھی
قرطاس و قلم میں ڈوبے رہتے ہیں۔ خدا انھیں تادیر قائم رکھے ؎

تیرے دندان پُرضیا سے آج — گل ہوا ہے چراغ گوہر کا
عشق زلفِ سیہ فام ہوا — اپنے قبضہ میں ملک شام ہوا
برہم وہ ہو کے بولے کہ تو مار کھائے گا — بوسے جو میں نے زلفِ گرہ گیر کے لیے
رقم آج ہے عزم شب خوں کا شاید — ملی ہے مسی پان کھائے ہوئے ہیں
برق حسرت سے جلی رخسارِ تاباں دیکھ کر — آگے تیری زلف کے بھرتی پھری پانی گھٹا

اخیر میں اردو زندہ باد — اور پائندہ باد کے نعروں کے علاوہ زبان و قلم سے اور کیا نکل سکتا ہے۔

جھالاواڑ میں اردو کا ماحول

ریاست کوٹہ اگرچہ سمبت ۱۳۲۱ مطابق ۱۲۶۴ء میں قائم ہوگئی تھی لیکن اسے انفرادیت پوس بدی ۳ سمبت ۱۶۸۸ مطابق ۱۶۳۲ء میں نصیب ہوئی (سمارکا ۱۹۶۴ء مرتبہ نگر پریشد کوٹہ زیر اہتمام ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کوٹہ) واقعہ یوں ہے کہ جب شہزادہ خرم کو راؤ مادھو سنگھ کی دیکھ ریکھ میں قلعہ جو نیر علاقہ بیجاپور میں نظر بند رکھا گیا تو اس زمانہ میں ان دونوں یعنی شہزادہ خرم اور راؤ مادھو سنگھ میں گہری وابستگی، دوستی کی حد تک ہوگئی شہزادہ خرم نے بادشاہ ہونے پر راؤ مادھو سنگھ کو اس کی نیک سلوکی اور خیر اندیشی کا بدلہ چکانے کا وعدہ کیا۔ ۱۶۲۷ء میں جب خرم شاہجہاں کے نام سے بادشاہ ہوا تو اس نے ۱۶۳۲ء راؤ مادھو سنگھ کو ریاست کوٹہ کا ایک جداگانہ حکمراں تسلیم کر لیا اور اسے شاہی اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ ریاست کوٹہ کے تخت نشین حکمرانوں میں اٹھارھویں صدی کے اخیر میں مہاراؤ امید سنگھ رئیس، جھالا راجپوتوں کے بھانجے تھے۔ مہاراؤ امید سنگھ کی پچاس سالہ عہد حکمرانی میں ظالم سنگھ جھالا ہی مختار کل رہے ہیں جو مہاراؤ امید سنگھ والی کوٹہ کے ماموں تھے۔ اسی وقت سے ریاست کوٹہ کی وزارت، جھالا راجپوتوں کے سپرد ہوگئی۔ جب رئیس کوٹہ مہاراؤ کشور سنگھ کے بعد مہاراؤ رام سنگھ کے بعد گدی پر بیٹھے تو روایات قدیمہ کے مطابق قلمدان وزارت مدن سنگھ جھالا نے سنبھالا۔ لیکن جب ان میں باہمی اختلافات اپنے عروج تک پہنچ گئے تو انگریز سرکار نے ریاست جھالاواڑ کی بنا ڈالی۔ ریاست کوٹہ کا کچھ حصہ انھیں دیا گیا اور جھالا حکمرانوں کے لحاظ سے وہ حصہ جھالاواڑ کہلایا۔ اسے ایک علحدہ ریاست تسلیم کیا گیا۔ آزادی ہندوستان کے بعد انضمام ریاست تک ریاست جھالاواڑ پر یہی جھالا راجپوت حکمراں رہے ہیں۔ آخری رئیس راجہ ہرش چند تھے جو ان دنوں صوبہ راجستھان کے وزیر ہیں۔ جائزہ زبان اردو ۱۹۴۰ء مرتبہ انجمن ترقی اردو کے بقول بعض سیاسی حالات کی بنا پر اس میں اس قدر تبدیلیاں ہوئیں کہ اس ریاست کے والیوں کو انفرادیت قائم کرنی نصیب نہ ہوئی۔ یکم جنوری ۱۸۹۹ء کو اس کی انفرادیت قائم ہوئی اور اسی تاریخ سے جھالاواڑ میں اردو کا جائزہ لینا مناسب رہے گا۔

پنڈت پرمانند چترویدی دیوان ریاست نے اس زمانے میں مولوی عبدالوحید نیرنگ کو ریاست میں طلب فرمایا۔ ان کی قدر ذاتی اور خصوصیات خاندانی کے تحت یکم جنوری ۱۸۹۹ء سے انھیں دربار میں ملازم رکھا گیا۔ اردو کے تذکرہ کے سلسلے میں مولوی صاحب ممدوح کو ہرگز نہیں بھلایا جا سکتا۔

ریاست جھالاواڑ میں اردو کے فروغ و ارتقا بلکہ اس کے عروج و ارتقاء کا دور مہاراج رانا سر بھوانی سنگھ بہادر کا عہد بڑا قابل قدر اور لائق فخر رہا ہے۔ مہاراج بہادر اردو زبان، خصوصاً شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے دربار میں انگریزی زبان کے فاضل ہندی اور سنسکرت کے ودوان۔ عربی و فارسی کے عالم اور زبان اردو کے ادیب و شاعر

روزانہ صبح سے دس بجے تک حاضر رہتے تھے اور ماجرہ بموجب ، ہارون الرشید اور مامون الرشید کی مجالس علمیہ کی طرح علم و فن پر دلچسپ مباحثے ہوتے تھے۔ ہز ہائی نس خود ہر علم و فن میں خاص دلچسپی سے کام لے کر بامو قع داد دیتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس سلسلے میں اردو اور اردو شاعری کو درجۂ امتیاز حاصل تھا۔ ۱۹۰۵ء میں انھیں رئیس جھالا راج رانا بھوانی سنگھ کے ایما سے ایک پندرہ روزہ بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈپری۔ حضرت نیرنگ کو شرکت کے لیے مجبور کیا گیا۔ ان کی اس شرکت نے ذوق و شوق کو دوبالا اور ہر موزوں طبع کو شعر و سخن کا دلدادہ کر دیا۔

رئیس مرحوم نے مولوی نیرنگ مرحوم کی قدر دانی کا حق ادا کر دیا۔ خود نیرنگؔ مرحوم کے الفاظ ہیں کہ "یہ امر میرے لیے باعث ہزار گونہ افتخار ہے کہ میرے آقائے نعمت مہاراج رانا سر بھوانی سنگھ بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی والی جھالا واڑ نے اس مجموعہ (دیوان نیرنگ) کی ہر غزل کو مطلع سے مقطع تک ملاحظہ و سماعت فرماکر جا بجا قیمتی مشوروں سے عزت بخشی، غالباً دنیا میں یہ پہلا دیوان ہے جسے ایک والی ملک نے خاص وقت مقرر کر کے حرف بہ حرف سماعت فرمایا اور دربار عام منعقد فرماکر اس ہیچ میرز کو سند افتخار الشعرا مطبوعۂ لندن عطا کر کے اعزاز و افتخار بخشا اور دیوان بغرض طبع نیرؔ پریس لکھنؤ میں بھیج دیا۔" (دیوان نیرنگ)

افتخار الشعراء کا یہ خطاب تقریب سالگرہ کے وقت ۲ دسمبر ۱۹۲۷ء رئیس وقت نے مرحوم کو عطا فرمایا تھا۔ (دیوان نیرنگ ۱۹۲۹ء)۔ اس سے قبل ۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء کو جب ممتاز اراکین ریاست کو جاگیریں اور منصب عطا ہوئے، جناب نیرنگ کی حوصلہ افزائی پنشن میں اضافہ سے کی جا چکی تھی۔ درباریوں میں نام درج کر دیا گیا تھا۔ اس طرح ان کی یہ پیشین گوئی راست ثابت ہوئی ؎

عجب کیا ہے چمک جائے جو میرا اختر قسمت ہوا شوق سخن راجہ بھوانی سنگھ کے دل میں

یہ مقطع بھی اسی قسم کی قدر افزائی کا مظہر ہے ؎

قدر دانی سے مہاراج کی بے شک نیرنگؔ ہے شب و روز ہمیں لطف سخن غربت میں

حافظ محمد عالمگیر کیفؔ ٹونکی کا یہ مقطع بھی رئیس موصوف کی قدر دانی کا ترجمان ہے ؎

راجہ بھوانی سنگھ نے کی قدر کیفؔ کی اچھا ہوا غریب کی بگڑی سنبھل گئی

آغا شاعر قزلباش دہلوی بھی ریاست جھالا واڑ کے اس قدر داں رئیس کے مرہون منت رہے ہیں۔ آغا صاحب رسالہ "آفتاب" جھالا واڑ کے مدیر خاص تھے۔ اردو شعرا و ادبا کی قدر دانی، اردو زبان کی قدر دانی سمجھنا چاہیے۔ قبل ۱۹۰۶ء کو ریاست میں سرکاری زبان اردو رہی، بیرونی پروپگنڈے سے مجبور ہو کر مہاراجہ نے ۱۹۰۶ء میں اردو رسم الخط کے بجائے دیوناگری رسم الخط کے اجرا کا حکم دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ احکام بھی نافذ کیے کہ رسم الخط سے قطع نظر، ہندی اور سنسکرت کے نامانوس اور ادق الفاظ سرکاری مراسلتوں میں نہ لائے جائیں۔

مہاراجہ بھوانی سنگھ کی اس اردو دوستی کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس ہاڑوتی ٹونک ایجنسی کی ایک ریاست بوندی میں ہاڑوتی رسم الخط ہندی میں رائج تھی۔ یہاں بعض راجہ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے سختی کے ساتھ دفتری تحریروں میں اردو فارسی الفاظ کی آمد کو روکا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مہاراجہ رگھبیر سنگھ حکمران بوندی نے احکام جاری کیے تھے کہ اردو فارسی الفاظ سرکاری تحریروں میں نہ آنے پائیں۔

سرکاری پریس میں اردو سیکشن کی موجودگی، رئیس مذکور کی اردو پرستی کی حمایت جتلاتی ہے۔ سرکاری کتب خانوں میں اردو کتابیں کافی تعداد میں تھیں۔ راجہ راجیندر سنگھ مخمور کی لائبریری میں بھی اردو کتب موجود تھیں۔ بیسویں صدی کے عشرۂ اول میں ہز ہائی نس مہاراجہ بھوانی سنگھ کے حکم سے آفتاب نامی رسالہ سید محمد حسین رضوی بی۔ اے کی ادارت نکلنا شروع ہوا۔ اس آن بان کے ساتھ کہ اس کے معیار کی تعریف ۱۸ اپریل ۱۹۰۶ء کے خط میں مولانا حالی نے بھی کی۔ ۲۶ اپریل ۱۹۰۶ء کا خط شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ دہلوی کا ہے۔ وہ بھی آفتاب کی درخشانیوں اور تابانیوں کے سلسلہ میں رطب اللسان ہیں۔ آفتاب کا احیاء شروع جنوری ۱۹۲۰ء میں جناب آغا شاعر قزلباش کی ادارت میں پھر ہوا۔

راجہ بھوانی سنگھ کے بعد ان کے فرزند راجہ راجیندر سنگھ مخمور نے بھی اردو کی قدر دانی کا سلسلہ جاری رکھا "دیوان نیرنگ" راجہ بھوانی سنگھ کے زمانۂ حکومت میں چھپ نہ سکا تھا، پریس میں بھجوا دیا گیا۔ انھوں نے اسے چھپوایا راجہ بھوانی سنگھ سخن فہم تھے۔ یہ سخن فہم ہونے کے ساتھ سخن ور بھی تھے اور مخمور تخلص کرتے تھے۔ "انجمن راجیندر" انھیں کے نام سے انھیں کی سرپرستی میں چلتی رہی۔ مخمور شعر کہتے، شعر سنتے اور مشاعروں میں بہ نفس نفیس خود شامل ہوتے۔ ذوق و شوق کی یہ فراوانی تھی کہ اپنی مہارانی کا علاج کرانے کے سلسلہ میں یورپ تشریف لے گئے تو وہیں سے طرحی مصرعے بھیجے جاتے۔ اور مشاعرے جاری رکھنے کی ترغیب دیتے رہتے۔ تذکرۂ شعرائے جھالاواڑ انھیں کے زمانے میں ترتیب پا رہا تھا۔ یہ معلوم نہیں وہ شایع ہوا کہ نہیں۔ گمان غالب ہے کہ وہ شایع نہ ہو سکا۔

رسالہ آفتاب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک اور پھر اس کے احیاء ۱۹۲۰ء کے علاوہ وہ لیکچروں کا سلسلہ بھی قابل قدر ہے جو ۱۹۱۴ء ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ یہ سلسلہ سابق مہاراج کے حکم سے شروع ہوا تھا۔ ہر افسر ریاست موضوعات جنگ میں سے کسی ایک موضوع کو اختیار کر کے اس پر تیار ہو کر لیکچر دیا کرتا تھا۔ یہ تمام لیکچر سرکاری مطبع میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی زبان اردو ہے، رسم الخط بھی اردو ہے۔ رسالہ سہ ماہی "شاعری کا پایلیٹ" سید مصطفیٰ احسن رضوی مرتب کرتے تھے، جس میں شعراء کا تین مہینے کا کلام جمع کر دیا جاتا تھا۔ اس رسالہ کا اجراء بطور خاص اس وقت سے ہوا تھا جب کہ سابق مہاراج (بھوانی سنگھ) شعراء کو نیچرل شاعری پر چلنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

"جائزہ" کی رو سے ریاست جھالاواڑ کی حسب ذیل کتابوں کا طباعت پذیر ہو جانا پایا جاتا ہے:-

(۱) چار چمن از مبین خاں مرحوم سابق بخشی فوج ۱۸۸۳ء۔ شریں ریاست جھالاواڑ کی تاریخ۔
(۲) ڈرامہ پر ایک دقیق نظر از سید محمد حسین رضوی ۱۹۰۴ء۔ مطبوعہ مفید عام پریس آگرہ۔
(۳) اسلامی لغت حصّہ اوّل مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء
(۴) اسلامی لغت حصّہ دوم مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء } از سید حامد حسین رضوی علیگ
(۵) اسلامی لغت حصّہ سوم مطبوعہ پریس پھلواری شریف پٹنہ
(۶) دیوان نیرنگ از مولوی عبدالوحید نیرنگ کاکوروی ۱۹۲۹ء

محمد عزیز الرحمن عزیز جھالاواڑی رؤسائے وقت کے مزاج داں، مقرب خاص اور حضور رس رہے ہیں۔ بفضلہ آج بھی حیات ہیں۔ ان کی زندگی جھالاواڑ کے چار رئیسوں کی ملازمت اور حاضر باشی میں گزری۔ راج رانا ظالم سنگھ ان کے ابتدائے شباب کے رئیس ہیں۔ راجہ ہریش چندر ان کے آخر شباب اور عہد پیری کے رئیس ہیں۔ جو ریاست جھالاواڑ کے آخری رئیس تھے۔ کیوں کہ ان کے بعد ریاست کا انضمام وقوع پذیر ہوگیا۔ ہز ہائی نس راج بھوانی سنگھ اور مہاراجہ راجیندر سنگھ مخمور کا زمانہ انھوں نے خوب دیکھا ہے۔ مہاراجہ راجیندر سنگھ مخمور کا انتقال ناگہانی طور پر ہوا۔ ان کا زیادہ عہدِ ملازمت راجہ بھوانی سنگھ کے دورِ حکمرانی پر مشتمل رہا ہے۔ عزیز صاحب اِس رئیس کی ادب پرستی اور علم نوازی کے آج بھی مدّاح ہیں۔ انھیں قربتِ قریبہ حاصل تھی۔ سرکاری مشاعروں، تقریبوں اور جلسوں میں اکثر اہتمام عزیز صاحب ہی کا ہوتا تھا۔ ان کے کلام میں جا بجا سالگرہ، ہولی، جشن استقبالیہ، جشن غسل صحت، جشن شیر کشتن وغیرہ موقعوں پر کہی ہوئی نظمیں، قصیدے اور قطعات موجود ہیں۔ اسّی کے قریب ان کی عمر ہے اور سلف کی یادگار ہیں "بھوانی ناٹ شالا" کے بھی یہ مہتمم رہے ہیں جہاں رئیسانہ انداز پر ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ جن میں رئیس وقت، اراکین ریاست اور معززین شہر ہی شمولیت کرسکتے تھے۔ اردو ان ڈراموں کی زبان ہوتی تھی۔ سالگرہ کے جشن بھی ریاست کے عوام میں اردو کے فروغ کا سبب بنے۔ عزیز صاحب کی یہ رباعی ملاحظہ کیجیے ؎

ہر دل ہے جو آج مائلِ سالگرہ — یارب عشرت ہو حاصلِ سالگرہ
ہے دل سے دعا عزیزؔ کی بارِ خدا — ہر سال یونہی ہو محفلِ سالگرہ

سالگرہ کا مشاعرہ بھی جھالاواڑ کے سخنوروں اور سخن فہموں کے لیے روحانی سرور اور وجدانی کیف کا سبب "آسماں تک غلغلہ پہنچا مبارکباد کا" سالگرہ کا وہ پہلا مشاعرہ تھا جسے رئیس وقت راجہ بھوانی سنگھ نے بہت سراہا اور یہ سلسلہ قائم ہوگیا۔ راجپوتانہ کے راجپوت رئیسوں میں ہولی کا تہوار بھی بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا

عزیز صاحب کے کچھ اشعار جشن ہولی کے سلسلے میں ملاحظہ کیجیے ؎

گلے ملتے ہیں سب بچھڑے ہوئے دلدار ہولی میں — مگر تو بے سبب کرتا ہے کیوں تکرار ہولی میں؟
غضب ہے یہ تلوّن او بتِ عیار ہولی میں — کبھی اقرار ہولی میں کبھی انکار ہولی میں

جناب عزیز کے متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے جس سے جھالاواڑ کے ذوق ادبی کا پتہ چل سکے گا ؎

فتنہ گر اپنی چال ڈھال کو دیکھ — پھر کسی اپنے پائمال کو دیکھ

اندیشۂ عقبیٰ نے مزا زیست کا کھویا — ہر دم یہی کھٹکا ہے وہاں دیکھیے کیا ہو!

وعدہ کی وفا میں ہے ابھی شام کا وقفہ — اپنی نہیں دم بھر کی خبر دیکھیے کیا ہو!

دل ہم نے دیا ان کو عزیز اپنا سمجھ کر — اب آگے مقدر ہے وفا ہو کہ جفا ہو

عزیز صاحب مولوی نیرنگ صاحب کے شاگرد ہیں۔ جھالاواڑ کی ادبی سرگرمیوں کا اندازہ کچھ ان قطعات سے بھی کیا جا سکتا ہے جو دیوان نیرنگ ۱۹۲۹ء کے آخر میں درج ہیں۔ ان کی تعداد اکیس ہے جن میں سے چار پانچ شعرا کو چھوڑ کر بقیہ تمام شعرا نیرنگ صاحب کے شاگرد ہیں۔ تاریخیں عیسوی، ہجری، بکرمی سنین میں ہیں۔ اور تاریخیں واقعی بے پناہ ہیں "سرمایۂ افتخار نیرنگ" منشی سکندر خاں اثر کا مصرع تاریخ ہے۔ نیرنگ مرحوم نے اپنے دیوان کا نام بھی اسی کو قرار دیا۔ دیوان میں دو قصیدے ہیں جو راجہ بھوانی سنگھ حکمران جھالاواڑ کے جشن سالگرہ کے موقع پر کہے گئے ہیں۔ نیرنگ صاحب کا ایک مخمس داغ دہلوی کی غزل پر ہے۔ دوسرا جلیل کی غزل پر اور تیسرا نواب محمد ابراہیم علی خاں والیٔ ٹونک کی غزل پر۔ ایک مخمس مصنف نے خود اپنی غزل پر کہا ہے۔ نیرنگ مرحوم کا رنگ قدیم ہے۔ زبان شستہ و شائستہ ہے۔ پختہ اور استادانہ رنگ ہے۔ اپنے تخلص نیرنگ سے بعض مقطعوں میں اچھا فائدہ اٹھایا ہے ؎

بزمِ عشاق میں نیرنگ کی عزت ہے بہت — کیوں نہ ہو؟ چشمِ حسیناں میں جو دن رات رہے

مجھ کو طلسمِ عشق مجسم بنا دیا — نیرنگ چشمِ یار بڑی سحر ساز ہے

سما ہی اس طرح نیرنگ نے الفت پری رو سے — کہ اس کے دل میں وہ، یہ چشمِ افسوں گر میں رہتا ہے

کچھ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے ؎

ڈری ڈری سی ہے طبیعت، پھری پھری ہے نظر — اور آپ کہتے ہیں دل میں غبار کچھ بھی نہیں

کفن بہانہ ہے ایسا سیہ کار ہوں میں — کہ لے چلے ہیں مجھے سب چھپا کے پردے میں

زمانہ آپ کو چاہے مگر قصور معاف — کوئی دکھا تو دے دو دن نباہ کر کے مجھے

رات کی رات ٹھہر جاؤ سویرے جانا — دو گھڑی دن نہ چڑھے چار گھڑی رات رہے

سفید ہو کے نہ پیری میں بے خبر ہوتے — کہاں کی نیند مجھے پھٹ پڑی سحر ہوتے

چلے کس بے کسی سے چھوڑ کر دنیائے فانی کو — جنازہ خود اٹھانا ہوگا مرگ ناگہانی کو

جناب نیرنگ کا انتقال ۲۴ ردسمبر ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ ان کے شاگرد مرزا عبدالسلام بیگ شفیق نے نیرنگ مرحوم کے مقطع کے مصرع ثانی سے تاریخ رحلت نکالی ہے ؎

یہیں چھوڑا یہاں کا رنگ نیرنگ — چلا دامن فشاں اس خاک داں سے

۱۳۶۷ھ

جھالا واڑ کی یہ ادبی سرگرمیاں تاریخ ادب راجستھان کی ترتیب میں ہرگز ہرگز بھلائے جانے کے قابل نہیں۔

اختتامیہ غرض اردو ہمیشہ جمہور کے تعاون واشتراک سے پلی بڑھی ہے۔ اپنے خدمت گزاروں کے سہارے نکھری اور سنوری ہے۔ اب دستور کے تحت ملک کی زبان ہندی تسلیم کر لی گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء تک اردو ہر جگہ جگمگاتی اور مقبول رہی ہے۔ اس کے بعد سے معاشی اور سیاسی الجھنیں اس کے لیے پابہ زنجیر بنتی جا رہی ہیں۔ اردو اس جگہ کی (پاکستان کی) قومی وملکی زبان بنی جہاں اس کی پیدائش نہیں ہوئی ہے اور جہاں اس کی تخلیق تعمیر، تزئین وتہذیب ہوئی ہے وہاں سے اسے جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ تاہم قومی یک جہتی اور ملکی ہم آہنگی کے لیے جتنی ضرورت ہمیں اس کی پہلے تھی آج اس سے زیادہ ہے۔ حقیقت شناس نظریں اسے خوب سمجھتی ہیں۔ متعصب اور تنگ نظر دماغ شاید اس تہ تک دیر سے پہنچیں، لیکن اس واقعہ کا انکشاف ان پر دیر سویر ضرور ہو جائے گا۔ دستور کے تحت اردو بھی ملک کی چودہ زبانوں میں سے ہے۔ اسے یہ مقام اس کی ماضی کی توانائی پر حاصل ہوا ہے۔ اردو کی

صلاحیتیں، وسعتیں، قبولیتیں اور لطافتیں ہمیں ضائع نہیں کرنی چاہئیں۔ انھیں اکٹھا کیا جا کر تاریخ ادب اردو کے اوراق میں شاندار اضافہ کرنا چاہیے۔ حال و مستقبل کبھی ان کی طرف دیکھیں گے اور ضرور ان اوراق پر فخر کرتے ہوئے اپنے اسلاف کی میراث سے کما حقہٗ فائدہ اٹھائیں گے، یوں بھی اردو ہندی کی حلیف ہے، حریف نہیں مخالف ذہنیتیں اسے زیادہ نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ نقصان پہنچا ہے، پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا تو اسے اپنوں ہی کی بے حسی اور بے علمی سے۔ عدم توجہی و عدم التفاتی سے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے دائرۂ واقفیت کے ادبی خدمت گزاروں کو منظم کریں۔ اردو کے فروغ و ارتقا میں دلچسپی لیں۔ اردو کے موجود و مرحوم خدمت گزاروں کو مقامی ارباب قلم اور دنیا سے روشناس کرائیں، حالات کے تقاضوں اور قانونی دائروں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں سرگرم عمل رہنا چاہیے ؎

یہ راجستھان ہی کیا؟ دور تک ہیں تذکرے اس کے   ریاض دہر کی ہر شاخ پر ہیں چہچہے اس کے
لبوں پہ گفتگو اس کی، زباں پہ زمزمے اس کے   نگاہوں میں جمال اس کا، دلوں میں ولولے اس کے
شباب و حسن کی یہ زندگی ہے، زندہ باد اردو
فضائیں اس سے نغمہ ریز ہیں پائندہ باد اردو

کتابیات

(۱) تاریخ ادب اردو مصنفہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مترجمہ از مرزا محمد عسکری بی۔ اے۔
(۲) جائزہ زبان اردو مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء
(۳) تذکرۂ شعرائے جے پور مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۸ء
(۴) روداد اردو کنونشن جے پور ۱۹۵۶ء
(۵) سرمایہ افتخار نیرنگ (دیوان نیرنگ) ۱۹۲۹ء
(۶) دستور العمل عدالت ہائے دیوانی ریاست کوٹہ ۱۸۷۵ء
(۷) مہاتما گاندھی ہائر سکنڈری اسکول میگزین کوٹہ ۱۹۶۱ء
(۸) رہنمائے تعلیم دہلی اگست و ستمبر ۱۹۶۱ء
(۹) میلاد شریف سراج ۱۳۴۴ھ
(۱۰) نور بافت زندگی ۱۹۲۵ء
(۱۱) آصفی گزٹ کوٹہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۷ء

(۱۲) [illegible] کالج میگزین کوئٹہ ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۵ء
(۱۳) رسالہ دلشاد کوئٹہ ۵۹-۱۹۵۸ء
(۱۴) حیات دبیر مصنفۂ مولوی افضل حسین ثابت لکھنوی ۱۹۱۳ء
(۱۵) دربار حسین ۱۳۳۰ھ
(۱۶) صبر جمیل (برق غم) از ثابت لکھنوی مرحوم۔
(۱۷) مخزن اسرار معرفت از شاد میرٹھی ۱۹۴۹ء
(۱۸) تذکرہ ناجیہ کوئٹہ از چودھری مول چند ناظم ۱۹۱۹ء
(۱۹) طریقۃ الصلوٰۃ از جناب سلامت اللہ مرحوم
(۲۰) سہرے اور قصائد ۱۹۳۰ء
(۲۱) جذبات شاد از شاد میرٹھی۔
(۲۲) بقائے سخن از للتا پرشاد شاد میرٹھی۔
(۲۳) رسالہ جہاں نما گنگوہ ۱۹۶۱ء
(۲۴) رسالہ شعلہ و شبنم دہلی ۱۹۶۰ء سے مئی ۱۹۶۴ء تک کے شمارے۔
(۲۵) رسالہ شان ہند دہلی ۱۹۵۶ء ۱۹۶۴ء
(۲۶) شمارۂ اردو ادب علی گڑھ ۱۹۶۲ء
(۲۷) رسالہ ہماری زبان علی گڑھ ۸ دسمبر ۱۹۵۸ء
(۲۸) فروغ اردو لکھنؤ مارچ ۱۹۵۹ء سے تا حال۔
(۲۹) ہفت روزہ طوفان اجمیر، اکتوبر ۱۹۶۰ء
(۳۰) آندھرا پردیش حیدرآباد نومبر ۱۹۶۲ء
(۳۱) جام نو، کراچی ۱۹۶۳ء
(۳۲) رسالہ سدا بہار، دہلی، فروری ۱۹۶۲ء
(۳۳) نیرنگ خیال، لاہور، جنوری ۱۹۶۲ء
(۳۴) سارکا (ہندی) ۱۹۶۴ء مرتبہ نگر پریشد کوئٹہ
(۳۵) رسالہ ہندی ہفت نامہ جن گن جودھپور۔ ۱۹ نومبر ۱۹۶۴ء

سید فضل المتین

اختر شیرانی کا "رومان"

اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء کا تعارف "ہماری زبان" بابت ۲۲ جنوری اور یکم فروری ۱۹۶۵ء میں کرا چکا ہوں۔ اب "رومان" بابت نومبر ۱۹۳۶ء کا تعارف درج ذیل ہے

رومان بابت نومبر ۱۹۳۶ء

پیش نظر شمارے کے ٹائیٹل کور کا پہلا ورق اور شروع کے ۸ صفحات غائب ہیں۔ صفحہ ۹ پر "مضامین اور مضامین نگار" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "تعارف" مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:

"چند لمحے پریم چند کے ساتھ | اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند کا انتقال پچھلے ماہ کا نہایت افسوسناک حادثہ ہے۔ وہ ۱۸۸۵ء میں موضع ڈھیا ضلع بنارس میں پیدا ہوئے اور ۵۶ سال کی عمر میں ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو انتقال فرما گئے۔ تین سو کے قریب مختصر افسانے اور ۹ ناول ان کی یادگار ہیں گو کسی مغربی مصنف کے دماغی کارناموں کے مقابلے میں یہ تصنیفات بلحاظ تعداد بہت کم ہیں۔ لیکن ایک اعلیٰ درجہ کے ہندوستانی مصنف کے لیے بہت کچھ ہیں۔ ہندوستان کی مخلوق اپنے اہل قلم کی جیسی کچھ قدر کرتی ہے، اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ منشی پریم چند بھی ابنائے زمانہ کے شکوہ سنج رہے اور ناقدری کا داغ دل پر لیے ہوئے چل بسے۔ چند ہی ماہ گزرتے ہیں کہ وہ لاہور تشریف لائے تھے اور ہماری طرح بہت سے لوگوں کو ان سے پہلی ملاقات کا اتفاق ہوا تھا جو افسوس ہے اتنی جلد آخری ملاقات بن گئی۔ یہاں گنجائش نہیں کہ ہم ان کے متعلق مفصلاً اظہار خیال کر سکیں۔ اس لیے ہم اس فرض کو کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں البتہ جناب اوپندر ناتھ اشک کا ایک دلچسپ مضمون پیش کیا جا رہا ہے جس سے ان کے بعض حالات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ زیر نظر مضمون شوق اور تاسف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

اودیس سے جانے والے سُن! | صاحبزادہ متین اللہ خاں واثق ٹونک کے ممتاز شعرا میں ہیں وہ اپنے سینے میں حبِ وطن اور خدمتِ قوم کے شریفانہ اور دردمندانہ جذبات کا تلاطم رکھتے ہیں۔ زیرِ نظم ان کے ایسے ہی وطن پرستانہ افکار کا نتیجہ ہے اور ہماری نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کے متعلق یہ دلچسپ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان کی یہ نظم ہماری نظم کا جواب ہونے کے باوجود سرزمین اندور میں لکھی گئی ہے۔ جہاں واثق صاحب اب بھی "غالباً" جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس صورت میں ان کو بھی "وطن" یا "دیس" سے اتنا ہی فراق و بُعد ہے جتنا ہمیں گویا یہ نظم بھی ہماری نظم کا جواب ہونے کے بجائے ایک اور "غریب الوطن" ہی کے جذبات غربت سے مناسبت کا آئینہ ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس نظم میں شاعر نے بعض ایسے مسائل کو بھی چھیڑا ہے جن کو وطن کی موجودہ ہیئت انتظامی کے اہم ترین مسائل کی حیثیت سے یاد کیا جا سکتا ہے اور جن کی طرف توجہ کرنا ہر محبانِ وطن کا اولین فرض ہوا کرتا ہے۔ لسان الغیب نے آج سے صدیوں پہلے اپنے شیریں الفاظ میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا ؎

"اسپِ تازی" شدہ مجروح بزیرِ پالان "طوقِ زرّیں" ہمہ در گردنِ "خر" می بینم

ظہورِ مہدی | اختر صاحب کی نظمیں ہمیشہ کسی نہ کسی مفید اور قابلِ غور موضوع سے بحث کرتی ہیں "مہدی" اور "ظہورِ مہدی" کے اس عام خیال اور "عقیدہ" سے متعلق ہے جو عام مسلمانوں کی فکر و نظر کا لاحاصل اور رائگاں عنوان بنا رہا ہے۔ اس سلسلے میں شاعر کے انقلابی افکار نے وطن دوستی کو ضم نہیں ہونے دیا۔ جو ان کا اولین امتیاز ہے۔ ا۔ش

مندرجہ بالا تمام عبارت اختر شیرانی کے قلم کی مرہونِ منت ہے۔

صفحہ ۱۵ پر "اردو کی بہترین غزلیں" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "کشکولِ اختر" "غزل نسیم دہلوی" اشعار کی کل تعداد ۶ ہے۔ مطلع و مقطع حسبِ ذیل ہے:

سفر ہے دشوار، خواب کب تک، بہت بڑی منزلِ عدم ہے
نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

یہ مصرع بجز مصیبت کمال ہم کو پسند آیا
نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

صفحہ ۱۱ سے "نقد و نظر" کی سرخی کے ذیل میں "دیوان خواجہ معین الدینؒ اجمیری" "کیا یہ دیوان ان ہی کا ہے" "پروفیسر ح۔ محمود خاں صاحب شیرانی لکچرر پنجاب یونیورسٹی" کے مضمون کی دوسری قسط شروع ہوتی ہے صفحہ ۱۹ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۹ ہی پر "اے مرگِ ناگہاں" کے عنوان سے "(غزل)" سردار اللہ نواز خاں بی۔ اے (آنرز) درج ہے۔ مطلع اور مقطع حسبِ ذیل ہے:۔

اجازت ہو تو میں تفسیرِ دردِ دل بیاں کر لوں زباں کو محرمِ آئینِ واندازِ فغاں کر لوں
ابھی اس دہر میں مجھ کو بہت کچھ کام کرنا ہے ٹھہر! اتمامِ کارِ عشق۔ مرگ نا کہاں کر لوں

غزل کے اشعار کی کل تعداد ۷ ہے۔

صفحہ ۳ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "کالج سے خطاب" "(بادۂ کہن کا ایک جام)" "ڈاکٹر سید صدیق حسین نجمی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ پی۔ سی۔ ایم۔ ایس۔ لاہور)" کی نظم درج ہے۔ اس نظم کے اشعار کی کل تعداد ۲۰ ہے۔ آخر میں "مارچ ۱۹۲۳ء۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور" تحریر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظم مارچ ۱۹۲۳ء میں کہی ہے۔

صفحہ ۱۲ سے "افسانہ" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "ہموطن پردیسی" "(ایک روسی افسانہ)" "ش۔ م۔ عمر روق۔ ایم۔ اے" کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔ افسانہ کی ابتدا میں صفحہ ۲۰ پر "ادارہ" کی جانب سے جو نوٹ دیا گیا وہ قابل توجہ ہے:۔

"بادی النظر میں روسی ادبیات زندگی کا ایک نہایت قنوطی زاویہ نگاہ پیش کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام روسی مصنفوں کی دنیا میں۔ جن میں ٹالسٹائی، ڈوسٹووسکی، اور چیکو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اداسی چھائی ہوئی ہے۔ ان کی دنیا میں مسرت کا نام ونشان نہیں۔ اس کی بہبودی و بہتری کی موہوم امید تک بھی نہیں۔ ان کی دنیا ظلم، بے رحمی، سفاکی، یاس وحسرت، ناکامیوں اور لاچاریوں کا پرغم و دلسوز ماتمی جلوس ہے۔ تمام انسان رسوم وقیود کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بیکس ہیں۔ وہ سوسائٹی کے آہنی اصولوں کے مطابق اپنے آپ کو وضع نہیں کر سکتے اور بے رحمی سے کچل دیے جاتے ہیں۔ مگر یہ دنیا ان کی خیالی دنیا نہیں۔ انھوں نے اس دنیا کو اپنی آنکھوں سے اس سے زیادہ مہیب شکلوں میں دیکھا ہے۔ وہ خیالی گورکھ دھندوں میں الجھ کر نہیں رہ گئے۔ وہ "جنگ عظیم" اور "انقلاب روس" کے پروردہ ہیں۔ جن سے روئے عالم کی سیاسی وتمدنی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ اخلاقیات کا قصر عالی شان منہدم ہو گیا۔ تمام عالم اور خاص کر روس ظلم و بے رحمی کے خوفناک پردوں میں لپٹ گیا۔ انقلاب پسندوں نے قتل وخون سے وہ ہیبت ناک مناظر پیش کیے کہ دنیا کی خوفزدہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انھوں نے اپنی آزادی کے جامے کو انسانی خون سے خوب ہی رنگا۔ اس زمانے کے زیر اثر تصانیف غم و یاس کے بادلوں سے گھری ہوئی نہ ہوں تو اور کیا ہوں۔ اگر ادب زندگی کا مرقع ہے تو روسی ادب اس لحاظ سے دنیا کا ممتاز ترین ادب ہے۔

لیکن ظلم وسفاکی سے انسانی دل میں رحم وہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا لابدی امر ہے۔ اور اس غمزدہ فضا میں یہی ہمدردی توازن پیدا کرتی اور اس طرح آرٹ کی شرائط کو پورا کرتی ہے۔ ان کی تمام تصانیف

میں خیالی ہمدردی کی ایک لہر دوڑتی نظر آتی ہے اور انسانی ہمدردی کی یہ تصنیف میں ایک عجیب مضمر ہے
جو ہر خود بشر کے دل میں ایک کسک سی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی کسک روسی ادب کی خاص خاصیت ہے۔
مندرجۂ ذیل افسانہ "وبسٹین کیٹیو" کی تصنیف ہے۔ کیٹیو ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۰۶ء میں ملک کی جنگی خدمت کے لیے فوج میں داخل ہوا۔ دو دفعہ زخمی ہوا۔ اور بہت عرصے تک قید میں دن کاٹے
یہ افسانہ اس نے دورانِ جنگ میں لکھا۔ ان دنوں میں جب کہ وہ خود جنگ میں شریک تھا! (ادارہ)

یہ افسانہ صفحہ ۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ افسانہ مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور افسانوی ٹیکنک پر پورا اترتا ہے
بلاشبہ یہ افسانہ اردو کے بہترین (ترجمہ کیے گئے) افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۲۶ ہی پر اختر شیرانی کی وہ مشہور غزل درج ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

چٹکیاں لینے لگا دل میں تقاضائے طفلی   آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند

اس غزل کے اشعار کی کل تعداد ۹ ہے۔ مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے ؎

لیلئ عشق کو درکار ہیں دیوانے چند   نجد میں پھر نظر آنے لگے ویرانے چند

بزمِ ہستی سے نکالے گئے اختر کیا جلد   ابھی پینے بھی نہیں پائے تھے پیمانے چند

صفحہ ۲۷ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "رات" "(شیلے کی مشہور نظم کا آزاد ترجمہ)" ہے۔ یہ منظوم ترجمہ "ایس۔ اے رحمٰن صاحب ایم۔ اے۔ آئی سی۔ ایس سشن جج" نے کیا ہے۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے :-

"عجلت سے پار کر کے مغرب کا بحر اخضر
آشب کی راج رانی!

تھا غارِ تارِ خاور۔ تیرا مقام دن بھر
بُنتی رہی وہاں پر۔ بیٹھی ہوئی اکیلی
کچھ خوف کے فسانے۔ خوشیوں کے چند سپنے
جن سے ہے ہول تیرا۔ اور الفتیں بھی تجھ سے
کر تیز تر روانی!"

یہ نظم کل ۵ بندوں پر مشتمل ہے۔ آخر میں "(میانوالی)" اور "ایس۔ اے۔ رحمٰن" تحریر ہے۔
صفحہ ۲۸ سے "علم تاریخ کی ماہیت" "ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی۔ لٹ (پنجاب) پروفیسر اسلامیہ کالج۔ پشاور"۔ کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس مضمون کے شروع میں یہ نوٹ دیا گیا ہے :-
"ذیل میں مسٹر ہنری جانسن پروفیسر کولمبیا یونیورسٹی کی کتاب "تاریخ کی تعلیم" کے پہلے باب کا آزاد ترجمہ پیش

کیا جارہا ہے جس میں پروفیسر موصوف نے روایت، ماخذ، جرح و تعدیل، اور نقد و تبصرہ، تاریخ کے مختلف تصورات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تعجب ہے کہ مصنف نے تاریخ کے ارتقا کے سلسلے میں مسلمان مورخین اور علی الخصوص علامہ ابن خلدون کا ذکر تک بھی نہیں جنھوں نے تاریخ کے سائنٹفک نظریے کی بنیاد ڈالی ہے۔"

اس مضمون کی اہمیت اور خصوصیت کا اندازہ ذیلی سرخیوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:۔
"تاریخ کیا ہے"۔ "ماخذ، آثار و روایات"۔ "اصولی اور فروعی ماخذ"۔ "زمانۂ قبل از تاریخ"۔ "نقد و جرح" "خارجی تنقید"۔ "خارجی تنقید کا تعلق دیگر علوم کے ساتھ"۔ "خارجی تنقید کی ایک اور غرض"۔ "تنقید کے لیے بعض ضروری سوالات"

یہ مضمون صفحہ ۳۵ پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں "باقی" تحریر ہے یعنی یہ مضمون کی پہلی قسط ہے۔

صفحہ ۳۵ پر "غزل" "آغا میرزا بیضا خاں مروی ایرانی" درج ہے۔ مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:

اللہ رے مرزا ترے شعروں کی روانی گویا کہ بہا آتا ہے دریائے معانی
عیسیٰ کی طرح چرخ سے اترا تھا تو مرزا افسوس زمانے نے تری قدر نہ جانی

صفحہ ۳۶ پر "صفحۂ زریں" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "ایک آرزو"۔ "(نظم)"۔ "محترمہ کنیز فاطمہ خاتون حیا لکھنوی" کی نظم شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۳۷ پر ختم ہوتی ہے نظم کے اخیر میں (لکھنو) ۔ (۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء) تحریر ہے۔ اس نظم کے کل بندوں کی تعداد ۹ ہے۔ ہر بند تین اشعار پر مشتمل ہے پہلے بند کے اشعار ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں۔ دیگر بندوں میں پہلے دو شعر ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں اور ہر بند کا تیسرا شعر پہلے بند کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہے۔ پہلا بند حسب ذیل ہے ؎

حالِ غمِ محبت کہنے کی آرزو ہے شرحِ گدازِ الفت کہنے کی آرزو ہے
رودادِ رنج و حسرت کہنے کی آرزو ہے تفصیلِ شامِ غربت کہنے کی آرزو ہے
پھر داستانِ فرقت کہنے کی آرزو ہے
پھر تم سے دل کی حالت کہنے کی آرزو ہے

اس نظم کا انداز بیان اور دیگر شہادتیں اس بات کی غماز ہیں کہ یہ نظم "تخیل اختر" کی کرشمہ سازی ہے۔ دراصل اختر شیرانی کی بہت سی "تخلیقات" فرضی اور موجود "صنفِ نازک" کے ناموں کی لیبل سے شائع ہوئیں۔ یہ ایک اہم کام ہے کہ کوئی صاحب چھان بین کر کے ایسی نظموں کا پتہ چلائیں جو اختر شیرانی کے قلم کی مرہونِ منت ہیں مگر دیگر ناموں سے منسوب چلی آتی ہیں۔ اس طرح معتد بہ کلام کا اضافہ اختر شیرانی کی کلیات میں ہوسکے گا۔

صفحہ ۳۰ سے "پریم چند" سے متعلق وہ اہم مضمون شروع ہوتا ہے جس کے متعلق "اختر شیرانی" تعارف میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ اور جو نقل ہو چکا ہے۔ یہ مضمون "تذکرہ و سوانح" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "پریم چند کے ساتھ۔" (خطوط کی روشنی میں) مسٹر اوپندر ناتھ اشک بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ لاہور کی تخلیق۔ اس مضمون کی اہمیت اور خصوصیت کا اندازہ درج ذیل۔ ذیلی سرخیوں سے کیا جا سکتا ہے۔

"تعارف"۔ "پریم چند جی اور اخبارات"۔ "ہنس اور جاگرن" (یہ پریم چند کے ماہوار اور ہفتہ وار جرائد۔ نام ہیں) "پریم چند جی اور سنیما"۔ "زبان کے متعلق پریم چند جی کا نظریہ"۔ "پریم چند جی کی پسندیدہ کتابیں"۔ "پریم جی اور دیہات"۔ یہ مضمون "پریم چند" کے سلسلے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس پر کسی قدر روشنی ڈا ضروری سمجھتا ہوں۔

"تعارف" کے ذیل میں اشک نے اپنی ایک کہانی "عورت کی فطرت" (نومبر ۱۹۳۱ء) کے بارے میں پر کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا ہے۔ آج بھی "پریم چند" کا یہ نظریہ قابل غور ہے

"...میرے خیال میں تو کوئی نئی چیز کہنے سے کہیں یہ بہتر ہے کہ فطرت کا ایک سچا خاکہ کھینچ دیا جائے..."

"پریم چند جی اور اخبارات" کے ذیل میں اشک لکھتے ہیں:۔

"منشی پریم چند کے کچھ خطوط سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اخبارات نے ان کی زندگی میں ان کی وہ قدر افزائی نہیں کی جس کے لیے وہ مستحق تھے۔ اور پبلشروں کے سلوک سے تو وہ نالاں تھے ہی..."

حال ہی میں ان کے ناول کرم بھومی کا اردو ترجمہ "میدان عمل" کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ناول کے آخری صفحات میں، جب جیل میں بچھڑے ہوئے مدت کے بعد ملتے ہیں۔ تو سب خوش ہیں۔ سب کے چہرے غرور اور مسرت سے سرخ ہیں لیکن منی اداس ہے۔ دیکھیے اس کی حالت کا نقشہ پریم چند کس طرح کھینچتے ہیں۔

"ہری منی، وہ الگ بے دلی سے سر جھکائے کھڑی ہے۔ اس کی زندگی کی سونی منڈیر پر ایک طائر جانے کہاں سے اڑتا ہوا آکر بیٹھ گیا۔ وہ آنچل میں دانے بھرے آ کر تی، پاؤں دبائے اسے پکڑنے کے لیے لپکی۔ اس نے دانے زمین پر بکھیر دیے۔ طائر نے دانے چگے۔ اسے پر اعتبار نظروں سے دیکھا۔ گویا پوچھ رہا ہو۔ تم مجھے محبت سے پالو گی یا چار دن میں بہلا کر پر کاٹ لو گی۔ اور دیواروں سے سر ٹکرانے کے لیے چھوڑ دو گی۔ لیکن اس نے جونہی طائر کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، وہ پھر سے اڑ گیا اور ایک اونچی شاخ پر پھدکتا ہوا اسے شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ میں آسمان کا سیاح ہوں۔ تمھارے پنجرے میں میرے لیے سوکھے دانے اور کلھیا میں پانی کے چند قطروں کے سوا اور کیا ہے"

ستی کی زندگی میں امکانات جس طرح آئے اور جس طرح چلے گئے اس کا اظہار اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔ سب ناول کو پڑھ کر اس ایک پیرے میں منی کی مایوسیوں اور حسرتوں کی داستان کا نقشہ پریم چند نے اس طرح کھینچا ہے کہ پڑھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کیا استعارے ہیں اور کیا تشبیہات۔ منشی پریم چند کو وہ درجہ دینے میں جو انھیں موت کے وقت حاصل تھا۔ ان کے لاکھوں عقیدت مندوں کا ہاتھ مدیران اخبارات سے کہیں زیادہ ہے۔ اور یہی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پریم چند اپنے پڑھنے والوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے، ان کے دلوں کے بادشاہ تھے۔ مگر وہ پروپگینڈہ یا کسی ایڈیٹر کی جنبش قلم کے بنائے ہوئے شہنشاہ نہ تھے۔"

"ہنس اور جاگرن" کے ذیل میں اشک لکھتے ہیں :۔

" اپنے طور پر ادب کی خدمت کرنے کے لیے انھوں نے ہنس اور جاگرن ماہوار اور ہفتہ وار جریدے نکالے لیکن سرسوتی پریس۔ مالی پریشانی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ انھیں نفع پر نہ چلا سکے۔ فروری ۱۹۳۴ء کے ایک خط میں انھوں نے اس طرف ہی اشارہ کیا ہے۔ یہ خط انھوں نے ہفتہ وار جاگرن کے دفتر سے لکھا ہے۔ اس کا بیشتر حصّہ میں ذیل میں دے رہا ہوں :۔

سرسوتی پریس۔ کاشی

۱۴ فروری ۱۹۳۴ء

عزیزم اوپیندر ناتھ جی

ایک مدت کے بعد تمھارا خط ملا۔ جسے پڑھ کر گونہ فکر پیدا ہوگیا۔ اہل قلم کے لیے یہ بڑی مشکل کا زمانہ ہے۔ خاص کر جب صحت خراب ہو جائے۔ ہندی میں اخباروں کی حالت اردو سے بہتر نہیں۔ میں خود دو اخبار شائع کر رہا ہوں اور دونوں میں برابر نقصان اٹھا رہا ہوں۔ یہاں تک کہ اب جی بیزار ہوگیا ہے اور چاہتا ہوں کہ کسی طرح خوبصورتی سے نجات پا جاؤں۔

ہندی میں بھی حالت نہایت حوصلہ شکن ہے۔ بک سیلروں کا تجربہ آپ کو جیسا تلخ ہوا۔ اس سے زیادہ تلخ مجھے ہو رہا ہے۔ وہ —— میرے ڈیڑھ سو روپے دبائے بیٹھا ہے ... ایک دوسرا بک سیلر لاہور میں میرے قریباً سات سو روپے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا یہ حال ہے۔ بک سیلروں کا یہ۔ بیچارہ مصنف کیا کرے ...

پریم چند

ایک دوسرے خط میں بھی انھوں نے جاگرن کے اس نقصان کی طرف اشارہ کیا تھا اور لکھا تھا
"اتنا نقصان برداشت کرنا میری استطاعت سے باہر ہے۔ لیکن استقلال سے برداشت کیے

جا رہا ہوں۔ مگر گاہکوں کی بیشی سے اس نقصان کے پورا ہونے کا بھروسہ نہیں۔ ہاں اشتہارات کافی تعداد میں مل جائیں تو بار ہلکا ہو جائے۔"

مندرجہ بالا عبارت سے آگے "پریم چند اور سنیما" کے ذیل میں اشک نے لکھا ہے:۔

"اسی نقصان سے تنگ آکر جیسا کہ انھوں نے خود مجھے بمبئی سے لکھا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ سنیما کی "روشن دنیا" میں آئے تھے۔ لیکن اس طرف انھیں بے حد مایوسی ہوئی۔ ضمیر اور آرٹ کا خون کرکے انھیں یہاں رہنا منظور نہ تھا۔ ان کے دو فلم 'بازارِ حسن' اور 'مل' تیار ہوئے ....

پریم چند اس روشن، حسن آفریں اور نشاط انگیز دنیا میں نہ رہ سکے۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ خسارہ کا خیال پس پشت ڈال کر بقول خود وہ اپنے "کنج عافیت" میں واپس جانے کے لیے بے قرار ہو گئے۔

بمبئی سے انھوں نے ۱۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو ایک طویل خط لکھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ انھوں نے "سنیما کی دنیا" کے متعلق اپنے تلخ تجربات کا بھی ذکر کیا اور اس دنیا میں اپنی آمد اور کنارہ کشی کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ میں اس خط میں سے ایک اقتباس نیچے دے رہا ہوں۔

"بمبئی میں تو اب اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ یہاں "ڈائریکٹروں کی ذہنیت ہی انوکھی ہے 'بازارِ حسن' کی مٹی پلید کر دی... اب 'مل' کچھ اچھی رہی ہے... لیکن سچ پوچھو تو مجھے اپنا وہ کنج عافیت ہی زیادہ پسند ہے۔ جلد ہی اس دنیا سے کنارہ کشی حاصل کر لوں گا اور بنارس چلا جاؤں گا۔"

"... اور جیسا کہ انھوں نے لکھا تھا ویسا کیا بھی۔ جلد ہی بنارس چلے گئے۔ پھر انھوں نے 'ہنس' کو نئی شکل میں نکالا۔"

"زبان کے متعلق پریم چند جی کا نظریہ" کے ذیل میں اشک لکھتے ہیں:۔

"اس خط میں جس کا جواب انھوں نے بمبئی سے دیا میں نے انھیں ایک کہانی "نشانیاں" بھی بھیجی تھی جسے بعد میں انھوں نے 'ہنس' میں سب سے پہلے جگہ دے کر شائع کیا۔ ان ہی دنوں میں میری سب سے پہلی کہانی "سرسوتی" میں شائع ہوئی۔ اس کا نام "پریم کی دیوی" تھا جو میری اردو کہانی "محبت کی قربانگاہ" کا حرف بہ حرف ترجمہ تھا۔ چوں کہ ہندی میں یہ پہلا ہی ترجمہ تھا۔ اس لیے میں اس میں خواہ مخواہ ہندی الفاظ لے آیا تھا اور نشانیاں چوں کہ اس کے بہت دیر بعد لکھی گئی تھی اس تحریر کی روانی کم نہ ہونے پائی تھی۔ دونوں کہانیوں کے متعلق لکھتے ہوئے انھوں نے اپنا نظریہ بھی لکھا۔

"نشانیاں" لکھنے پر تمھیں مبارکباد دیتا ہوں۔ بہت اچھی چیز ہے۔ اسی ماہ 'ہنس' میں دے رہا ہوں۔ سرسوتی میں تمھاری کہانی پریم کی دیوی پڑھی۔ اس میں تم نے خواہ مخواہ ہندی الفاظ ٹھونسنے

کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں الفاظ چاہے ہندی۔ اردو عربی یا فارسی کہیں سے بھی لیے جائیں۔ لیکن ضروری یہ ہے کہ واقعات کا تسلسل اور تحریر کی روانی قائم رہے۔

پریم چند جی اپنی تصانیف میں بھی اسی اصول کے قائل تھے۔ ہندی میں ان کی اپنی طرز تحریر ہے انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ لفظ کہاں سے آتا ہے۔ خیال رکھا ہے تو واقعات کے تسلسل اور تحریر کی روانی کا۔ اپنے ناٹک "پریم کی ویدی" میں تو وہ مستثنیٰ جیسے دقیق اور "لکڑ توڑ" جیسے عام الفاظ تک لکھ گئے ہیں۔

ہندی میں کنج عافیت کا دوسرا نام ہی "پریم آشرم" ہے اس میں سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"یہ سب آپ کو کٹ پتلی بنا کر نچائیں گے۔ بدنامی سے بچنے کا اس کے سوا اور کوئی اپائے (چارہ) نہیں کہ انھیں منھ ہی نہ لگایا جائے۔ آپ کا الہداد حسین ایک ہی گھاگ ہے۔ اس سے ہوشیار رہو وہ طرح طرح سے آپ کو اپنے پنجے میں لانے کی کوشش کرے گا۔ آج ہی میں نے اس کے منھ سے ایسی باتیں سُنیں جس سے مجھے ایسا ودت (ظاہر) ہوتا ہے کہ وہ آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔"

اسی زبان کو انھوں نے ہندوستانی کا نام دیا اور اس کی توسیع کے لیے اپنی زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے بے حد کوشش بھی کی۔ انھوں نے جس کام کی داغ بیل ڈالی ہے وہ ان کی موت کے بعد ختم نہیں ہو گیا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ زمانۂ جدید کے ادیب PROGRESSIVE WRITERS پرانی، دقیانوسی و دقیق الفاظ سے پُر طرز تحریر کو چھوڑ کر آسان، سلیس، بامحاورہ ہندوستانی کو اپنائیں گے۔

"پریم چند کی پسندیدہ کتابیں" کے ذیل میں اشک لکھتے ہیں :-

... دو تین بار انھوں نے مجھے وسیع مطالعے کی ضرورت پر زور دیا گنیش گنج لکھنؤ سے اپنے خط میں انھوں نے لکھا :-

"اگر میری صلاح تو یہی ہے کہ بہت زیادہ کہنے کے مقابلے میں لٹریچر اور فلاسفی کا مطالعہ کرتے جاؤ — کیوں کہ اس وقت کا مطالعہ زندگی بھر کے لیے کافی ہوگا۔

ایک دوسرے خط میں انھوں نے لکھا :-

"پڑھنے کے لیے کسی لائبریری سے سائیکالوجی کی کوئی کتاب لے لو۔ اسکولی یا درسی نہیں۔ ابھی ایک کتاب نکلی ہے THE ASPECTS OF A NOVEL اس موضوع پر یہ اچھی کتاب ہے۔ مطلب صرف ہے کہ انسان وسیع الخیال ہو جائے۔ اس کی ہمدردیاں وسیع ہو جائیں۔ ٹیگور کے ادبی اور فلسفیانہ مضامین بہت اعلیٰ درجے کے ہیں۔ رومان رولینڈ کا وویکانند ضرور پڑھو۔ ان کی "گاندھی جی" بھی پڑھنے کے

قابل ہے۔ مارلی کی لٹریری سوانح عمریاں لاجواب ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی فلسفیانہ کتابیں، ٹالسٹائی کی WHAT IS ART وغیرہ کتابیں وغیرہ ضرور دیکھنی چاہئیں۔

تمھارا خیر اندیش

دھنپت رائے

اس سے معلوم ہوگا کہ پریم چند جی نہ صرف باقاعدہ لکھتے تھے بلکہ باقاعدہ مطالعہ بھی کرتے تھے...

"پریم چند جی اور دیہات" کے ذیل میں اشک نے لکھا ہے :-

"دیہات کی آزاد فضا پریم چند جی کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے ... وہ ہمیشہ دیہات کے لیے تڑپتے رہے ... جہاں بھی انھوں نے دیہات کا ذکر کیا ہے کمال کر دیا ہے "کنج عافیت" اور ان کا تازہ ہندی ناول "گئودان" ان کی اس بیکلی کا بین ثبوت ہیں "پریم آشرم" ہی وہ جگہ ہے جہاں وہ خود جا کر رہنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ میدان عمل، چوگان ہستی اور بازار حسن میں بھی جہاں جہاں انھوں نے دیہات یا دیہاتیوں کا ذکر کیا ہے۔ الفاظ میں جان ڈال دی ہے اور "چوگان ہستی" تو دیہات کے اجڑنے کی المناک داستان ہے ... ان کا آخری خط مجھے ۹ جولائی کو ملا۔ جب کہ وہ بستر علالت پر دراز تھے۔ شاید وہ زیادہ تکلیف میں تھے۔ اس لیے خط نہایت مختصر ہے لیکن کتنا درد انگیز اور موثر!

سرسوتی پریس۔ بنارس کینٹونمنٹ

۶ر جولائی ۱۹۳۶ء

ڈیر اوپندر ناتھ۔ دعا۔ تم تعجب کر رہے ہوگے کہ میں نے تمھارے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ بات یہ ہے کہ میں پندرہ دن سے قیدیٔ بستر ہو رہا ہوں، ہاضمہ کی شکایت ہے۔ جگر اور طحال کی خرابی۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ تمھاری پریشانیوں کا قصہ پڑھ کر رنج ہوا۔ اس مہاجنی دور میں پیسے کا نہ ہونا عذاب ہے۔ زندگی خراب ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہ بھولنا کہ افلاس و مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ ان ہی آزمائشوں میں انسان انسان بنتا ہے۔ اسی میں استحکام آتا ہے۔

ہندی میں بھی وہی کیفیت ہے جو اردو میں۔ کتابیں نہیں بکتیں پبلشر کوئی نئی کتاب چھاپتے نہیں۔ قلم پر زندہ رہنا مشکل ہو رہا ہے جس کسی اخبار میں جان دینے کے سوا اور کوئی رستہ نظر نہیں آتا۔ اگر آدمی کا قابو ہو تو کسی دیہات میں جا بیٹھے۔ دو چار جانور پال لے اور زندگی گاؤں والوں کی

خدمت میں گزار دے۔ شہر میں۔ خاص کر بڑے شہر میں رہ کر تو صحت، زندگی۔ سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے۔

فی الحال اتنا ہی۔ تھک گیا ہوں۔ لیٹوں گا۔

پریم چند

اور پھر تین مہینے کی طویل علالت کے بعد وہ دیہات کے کسی کونے میں جا بسنے کی اس خواہش کو دل میں لیے ہوئے ہی اس جہان سے کوچ کر گئے۔ بدبخت مردہ پرست ہندوستان موت کے بعد تو اپنے اس شہنشاہ کی یاد میں آنسو بہایا کرے گا۔ عقیدت کے پھول چڑھایا کرے گا۔ اس کی برسیاں منایا کرے گا۔ لیکن زندگی میں —— اوہ! یہ کہانی دوسری ہے۔ میں ان کی موت کے بعد اس خط کو کئی بار پڑھ چکا ہوں اور تصور میں اس شیر دل ادیب کی زندگی کے کئی نقشے کھینچ چکا ہوں جو جانتا تھا کہ افلاس و مصائب کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے اور جو ان آزمائشوں سے گزر کر صرف انسان نہ بنا بلکہ دیوتا بن گیا۔ لیکن میں اس خط کو پڑھ کر دل ہی دل میں رو دیا بھی ہوں۔ کچھ ان کی بے بسی پر۔ کچھ اپنی بے بسی پر۔

صفحہ ۴۶ کی پیشانی پر تحریر ہے۔

او دیس سے آنے والے بتا!

اے صبا گر بجوانانِ چمن باز رسی!!
خدمت ما برساں سرو و گل و ریحاں را!!!
(ایک نووارد ہموطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب

اور

ایک وطن پرست کی طرف سے اس کا جواب)

خطاب   از اختر شیرانی

"خطاب" کی ذیلی سرخی کے بعد اختر شیرانی کی مشہور نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۵۰ پر ختم ہوتی ہے۔ اس نظم کے بندوں کی کل تعداد ۳۳ ہے۔

صفحہ ۵۳ پر "او دیس سے جانے والے سن!" "لسان الملک صاحبزادہ متین اللہ خاں واثق ٹونکی" کی "جواب" کی ذیلی سرخی سے شروع ہوتی ہے۔ اس نظم کے متعلق "تعارف" کے ذیل میں اختر شیرانی، روشنی ڈال

چکے ہیں جو میں نقل کر چکا ہوں۔
یہ نظم صفحہ ۵۰ پر ختم ہوتی ہے۔ اس نظم کے کل بندوں کی تعداد ۲۵ ہے۔
صفحہ ۵۰ پر ہی بعنوان "شباب" آنسہ ادریسی بیگم (شاہجہانپوری) کا ایک نثر پارہ ہے۔
صفحہ ۵۸ سے "سچا رومان" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "بنت عم" "(عربوں کے رومان عہد قدیم میں)" قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی" کا وہ ترجمہ ہے جو انھوں نے "نوری بروایت جبلہ بن اسود" کے اصل افسانے سے یا ہے۔ یہ افسانہ صفحہ ۶۲ پر ختم ہوتا ہے۔
صفحہ ۶۲ ہی پر مشہور افسانہ نگار اور شاعر "احمد ندیم قاسمی بی۔اے" کی "غزل" درج ہے۔ "غزل" کے اشعار کی کل تعداد ۱۰ ہے۔ مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے :-

ترے حضور میں اپنی جبیں اٹھا نہ سکا عبودیت کی تمناؤں کو دبا نہ سکا
ندیم تیری جوانی کو موت نے لوٹا مگر کوئی ترے اشعار کو بھلا نہ سکا

اس غزل سے "احمد ندیم قاسمی" کے ۱۹۳۶ء کے رنگ سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔
صفحہ ۶۳ سے "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "غزل" "اختر شیرانی" کی وہ غزل شروع ہوتی ہے جس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے :-

ہر ذرہ اس کے حسن سے روشن ہے آج کل امرتسر ایک وادیٔ ایمن ہے آج کل
اختر پھرے نہ کس لیے آوارہ سا یہاں امرتسر اس پری کا نشیمن ہے آج کل

اسی غزل میں ایک شعر یہ بھی ہے :-

بعد از غم جدائی عذرا مرے لیے یادِ زبورؔ و ماتم شیونؔ ہے آج کل

صفحہ ۶۳ کے حاشیہ پر یہ صراحت ہے ؎۱ جواں مرگ عبدالحق خاں "زبور" (کوئٹہ) اور ؎۲ میرزا شجاع خاں شیون" (امرتسر)
اس غزل کے اشعار کی کل تعداد ۱۳ ہے اور یہ صفحہ ۶۴ پر ختم ہوتی ہے۔
صفحہ ۶۵ سے "راز و اسرار" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان "بند کمرہ" "مسٹر محمود عبدالحی خلجی ایم۔اے۔ سابق مدیر روزنامہ "تریاق" لاہور" کا افسانہ شروع ہوتا ہے۔ یہ افسانہ صفحہ ۷۶ پر ختم ہوا ہے۔ آخر میں "(ماخوذ)" لکھا ہے۔
صفحہ ۷۶ ہی پر "غزل" "صاحبزادہ سلطان حامد خاں شردتؔ آف جاورہ" درج ہے۔ "غزل" کے اشعار کی کل تعداد (۶) ہے اور مطلع و مقطع حسب ذیل ہے :

الفت ہے مجھ کو آپ کے تیرِ نظر کے ساتھ رکھتا ہوں اس کو جان کے دل کے جگر کے ساتھ

شدت میں منتظر ہوں خطِ شوق کا ہنوز قاصد بھی اُڑ گیا کہیں میری خبر کے ساتھ

صفحہ ۷ سے "شاعر انقلاب میر اثر سیالکوٹی" کی نظم "ظہور مہدی" شروع ہوتی ہے۔ اس نظم سے متعلق "تعارف" ذیل میں اختر شیرانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقل کر چکا ہوں۔ یہ نظم صفحہ ۸۰ پر ختم ہوتی۔ اس نظم کے اشعار کی کل تعداد ہے۔ پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہے:-

میں ایسے مہدی سے باز آیا وطن سے جو بے نیاز کر دے نگاہِ ملت کو بے کسی سے مثالِ چشمِ ایاز کر دے
رشی کی یہ سرزمیں ہے ماثر، ہزاروں مہدی کرے گی پیدا مگر نگاہِ خودی کو تو بھی بطرزِ آئینہ باز کر دے

صفحہ ۹۰ سے "تخیلات" کی سرخی کے ذیل میں "پاگل خانے کے فلسفی کا روز نامچہ" شروع ہوتا ہے یہ دوسری پہلی قسط سے متعلق رومان اکتوبر ۱۹۳۶ء[1] میں ذکر آ چکا ہے۔ یہ روز نامچہ صفحہ ۸۷ پر ختم ہوتا ہے۔

صفحہ ۸۰ ہی پر "غزل" ملک عبدالحمید صاحب حمید گورنمنٹ ہائی اسکول (دہتوگی) درج ہے۔ اس غزل اشعار کی کل تعداد ۷ ہے۔ مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے:-

جھومتی میکدہ بر دوش گھٹائیں آئیں کیسی بھیگی ہوئی کوثر میں ہوائیں آئیں
نخلِ ماتم ہوں چمن زار زمانہ میں حمید بجلیاں مجھ پہ گرانے کو گھٹائیں آئیں

صفحہ ۸۸ پر "نظم" کی سرخی کے ذیل میں بعنوان کنوار کا مہینا اور صحن چمن" جناب محمد علی خاں اختر رامپوری منشی فاضل کی ایک نظم درج ہے۔ اس نظم کے اشعار کی کل تعداد ۲۰ ہے۔

صفحہ ۸۹ پر "فلمی حصہ" کی سرخی کے ذیل میں" شیخ افتخار الرسول بیرسٹرایٹ لا" کا مضمون" سنیما اور صنعت و حرفت" شروع ہوتا ہے۔ یہ مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصہ اہم ہے اور صفحہ ۹۲ پر ختم ہوتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں صفحہ ۹۲ ہی پر یہ اشتہار درج ہے:-

آئینہ خانے میں!

حضرت اختر شیرانی اڈیٹر "رومان" کے پانچ دلچسپ افسانے جو ہندوستان کی فلمی زندگی کی پستیوں اور تاریکیوں سے بحث کرتے ہیں۔ یہ پانچوں افسانے صرف ایک رات کی خامہ فرسائی کا دلآویز نتیجہ ہیں، اور فلمی دنیا کے نقاد مسٹر مہندی اڈیٹر فلستان کے اصرار پر لکھے گئے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ

منیجر "رومان" بک ڈپو۔ ۱۸ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

---

[1] رومان بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء" کے لیے دیکھیے "اختر شیرانی کا رومان" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ جنوری و یکم فروری ۱۹۶۵ء

صفحہ ۹۳ پر بعنوان "زندگی" "آغا فضل کریم صاحب آنی سیالکوٹی (کلکتہ)" کی "نظم" درج ہے۔ اس نظم کے اشعار کی کل تعداد ۱۳ ہے۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہے:

کہہ رہی ہے گردش لیل و نہار زندگی ہر خزاں کے بعد آتی ہے بہار زندگی
آ گئے وہ بھی عیادت کے لیے ارمان آج مٹ چکے جب سب مرے نقش و نگار زندگی

صفحات ۹۴-۹۵ اور ۹۶ پر اشتہارات درج ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ صفحہ ۹۴ پر جو اشتہار ہے وہ غالب کے تعلق سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

غالب نامہ (باتصویر)

از

شیخ محمد اکرام آئی سی۔ ایس سب ڈویژنل آفیسر سورت

یہ ضخیم کتاب دراصل تین کتابوں کا مجموعہ ہے

(۱) تذکرہ۔ جس میں پہلی مرتبہ غالب کے تفصیلی حالات کو سوانحی تسلسل کے ساتھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس سے نہ صرف شاعر کی زندگی کی مکمل اور مربوط تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے بلکہ شاعر کے ماحول سے بھی صحیح واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

(۲) تبصرہ۔ جس میں مرزا کے اردو۔ فارسی کلام پر چار شاعرانہ دوروں کی مختلف خصوصیات پر مرزا کے فلسفہ مذہب اور دیگر ادبی اور ذہنی پہلوؤں پر ایک ایسے شخص کا بصیرت افروز تبصرہ ہے جو بیک وقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا فاضل ہے۔

(۳) انتخاب۔ جس میں مرزا غالب کا مروجہ دیوان اردو اور ان کے فارسی اور غیر مطبوعہ اردو کلام کا نہایت بامذاق اور جامع انتخاب شاعر کے چاروں دوروں میں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس سے شاعر کی ذہنی نشو و نما اور شاعر کی ارتقائی کیفیت بخوبی نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

کتاب برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے اور فی الحقیقت پڑھنے اور پاس رکھنے کی چیز ہے۔ حجم تقریباً ۵۰۴ صفحات۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت بہترین، باتصویر قیمت تین روپے۔ جو اصحاب خریدنا چاہیں اپنا نام درج رجسٹر کرائیں۔ کتاب کی قیمت بڑھائے جانے پر بھی ان سے تین روپے لیے جائیں گے۔

المشتہر

منیجر مسلم گجرات پریس۔ سورت۔ احاطہ بمبئی

صفحہ ۹۴ پر شروع میں "منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا

ڈاک خانہ لاہور" کی جانب سے ادویات کا اشتہار ہے اور آخر میں "اردو کا بلند پایہ علمی، ادبی، اخلاقی و اسلامی ماہنامہ" "تاج" کا اشتہار "تاج کمپنی لاہور" کی جانب سے دیا گیا ہے۔ آخر میں چوں کہ بعض اہم مصنفین کی تصانیف کا اشتہار ہے اس لیے اسے من وعن نقل کرتا ہوں۔

طلسمات۔ پروفیسر سید عابد علی عابد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی کے افسانوں کا مجموعہ۔
جوانی کی تلخیوں اور رنگینیوں کے ۱۵ مرقعے

اس میں کچھ افسانے وہ ہیں کہ جوانوں کی مستی انگیز عشق کی نمایاں تصویریں ہیں۔ کچھ افسانے وہ ہیں جو ہماری معاشرت کے بعض گھناؤنے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس میں قصے ہیں ان نازنینوں کے جن سے تقدیر نے ان کے خاوند چھین لیے اور جن کو بیوہ کا لقب دے کر انسان نے ہمیشہ کے لیے مسرت سے محروم کر دیا۔

شعلے ۔ از احمد علی ایم۔ اے (مصنف ضبط شدہ کتاب "انگارے")	عہ
سلامبو ۔ مشہور فرانسیسی ادیب گستیو فلابیر کی مشہور کا ترجمہ، دو جلد	سے
آشوب زمانہ ۔ ایم۔ اسلم کی تازہ تصنیف	عہ
ضرب کلیم ۔ حضرت علامہ سر اقبال کا تازہ مجموعۂ کلام اردو	عگا
لمحات رنگین ۔ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں کا مجموعہ	عگا
میری کہانی ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ، دو جلد	للعہ
میدان عمل ۔ منشی پریم چند کی تازہ تصنیف	عگا
نجم السحر ۔ مصر قدیم کی ایک داستان از عنایت اللہ دہلوی	عگا
مصطفیٰ کمال اتاترک ۔ از کے۔ حمید بارایٹ لا۔ مجلد	عگا

داستان ۔ دنیا کی سب سے رنگین کتاب APHRODITE BY PIERRILDLY کا ترجمہ۔
از عابد علی عابد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی قیمت صرف عگا

ہاشمی بک ڈپو۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

آخر میں ٹائیٹل کور دبیز اور چکنا ہے۔ اندرونی صفحہ سادہ اور بیرونی صفحہ پر انگریزی میں SYKES CRICKET BATS SYKES TENNIS RACKETS کا اشتہار ہے۔

سودا پر دو نئی کتابیں

کلام سودا۔ انتخاب و ترتیب ڈاکٹر خورشید الاسلام

سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۳۲۸۔ قیمت چھ روپے

سودا کے جامع انتخاب کی ضرورت ایک عرصے سے ادبی حلقوں میں محسوس کی جارہی تھی بعض اداروں نے کچھ انتخابات شائع بھی کیے ہیں لیکن وہ سودا کی شاعری کی بھرپور نمائندگی نہیں کرتے۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے سودا کے بہترین کلام کا جامع انتخاب متن کی صحت اور کتابت و طباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ پہلی بار شائع کیا ہے۔ یہ انتخاب اردو کے بالغ نظر نقاد و محقق ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کلیات سودا کے مختلف مخطوطات اور مطبوعہ اڈیشنوں سے موازنہ اور مقابلہ کرنے کے بعد کیا ہے۔ اس انتخاب میں سودا کی شاعری کے تمام ادوار و اصناف کی نمائندگی کا خیال رکھا گیا ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا۔ مرتب ڈاکٹر خلیق انجم

سائز ۲۲×۱۸۔ صفحات ۶۹۰۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے

اس کتاب میں ڈاکٹر خلیق انجم نے مرزا محمد رفیع سودا کی زندگی کے حالات کو نئے تاریخی و تحقیقی مواد کی روشنی میں بالکل نئے انداز سے ترتیب دیا ہے اور ان کی شاعری کو ان تاریخی، ادبی، تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی رجحانات، حالات اور واقعات کے پس منظر میں تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے جو سودا کی شخصیت، فکر اور شاعری پر اثر انداز ہوئے۔

سودا کی حیات اور کارناموں سے صحیح واقفیت کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ذاکرہ غوث

مظہر الاخبار

(مدراس کا ایک صدی پیشتر کا اخبار)

آرکاٹ اور علاقہ مدراس میں اردو کی جو خدمت کی گئی ہے، اس کی داستان ابھی تک پوری طرح منظر عام پہ نہیں آئی ہے اور ابھی بہت سارے پوشیدہ خزینوں کو کھولا جانا باقی ہے۔ صحافت مدراس کی داستان بھی کہا جاتا ہے کہ لذیذ تر بھی ہے اور دراز تر بھی۔ ہم شاکی تو ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اردو صحافت پہ شائع ہونے والی کتاب میں مدراس کے لیے چند ہی صفحے مختص کیے گئے ہیں لیکن قصور بھی شاید ہمارا ہی ہے کہ اپنے خزینوں کو ابھی ہم نے ظاہر ہونے نہیں دیا ہے۔

مظہر الاخبار کے تین پرچے میری نظر سے گزرے جو کم و بیش ایک صدی پیشتر کے ہیں۔ ان میں دو نامکمل ہیں اور ایک مکمل۔ اس سے ایک صدی پہلے کی صحافت مدراس کے کچھ پہلو روشنی میں آتے ہیں اور اس سے شاید تحقیق کی نئی راہیں کھل سکیں۔

مظہر الاخبار کا تذکرہ نصیر الدین صاحب ہاشمی (جن کو مرحوم لکھتے شدید ذہنی کرب محسوس ہوتا ہے) "مدراس میں اردو" میں گارساں دتاسی کے حوالے سے صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷ پر کیا ہے اور یہ لکھتے ہوئے کہ اس اخبار کا ایک پرچہ اُن کے پاس موجود ہے اس کی کچھ عبارت بطور نمونہ نقل کی ہے۔

اس اخبار کے تین شمارے جو میری نظر سے گزرے ان کے نمبر اور تاریخ اشاعت حسب ذیل ہیں:۔

(الف) نمبر (۳) جلد (۸) صفر المظفر ۱۲۸۰ھ جولائی ۱۸۶۳ء نامکمل
(ب) نمبر (۳۵) جلد (۹) ۲۹ ذی حجہ ۱۲۸۱ھ ۲۵ مئی ۱۸۶۵ء نامکمل
(ج) نمبر (۲۱) جلد (۱۱) ۱۸ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ ۳۱ جولائی ۱۸۶۶ء مکمل

ہاشمی صاحب نے گارساں دتاسی کے حوالے سے مظہر الاخبار کا سنہ اشاعت ۱۲۷۲ھ۔ ۱۸۵۹ء لکھا ہے لیکن شمارہ (۳) پر درج کردہ تاریخ اور اس کی دس روزہ اشاعت پر نظر کرتے ہوئے غالباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار کی اشاعت کا آغاز ۱۸۵۵ء سے ہی ہو گیا تھا۔

مظہر الاخبار مدراس کا پہلا اخبار نہیں ہے۔ جامع الاخبار سنہ اشاعت ۱۲۵۷ھ جولائی ۱۸۴۱ء کو مدراس کا پہلا اخبار مان لیا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ اسی سے مدراس میں تاریخ صحافت کا آغاز ہوا۔ مظہر الاخبار کا آغاز اس کے پندرہ سال بعد ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی غدر ۱۸۵۷ء سے پیشتر ہی اس کی اشاعت کا آغاز ہو گیا تھا۔ مدراس کا ایک اور اخبار اعظم الاخبار ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء سے شائع ہونے لگا تھا۔ یہ گویا جامع الاخبار اور مظہر الاخبار کے درمیان کی کڑی ہے ہو سکتا ہے کہ اس زنجیر کی اور کئی درمیانی کڑیاں تلاش سے دستیاب ہو سکیں۔

مظہر الاخبار کے ان تین پرچوں کے مطالعے سے جن امور کا انکشاف ہوتا ہے ان کی یہاں صراحت کی جاتی ہے

یہ اخبار مہینے میں تین بار یعنی ہر دسویں روز محلہ ترل کھٹری عقب مسجد والا جاہی سے خواجہ بادشاہ عبرت کی ایڈیٹری میں شائع ہوا کرتا تھا۔ سرورق پر ایڈیٹر کا نام اور مقام اشاعت درج نہیں ہے۔ آخری صفحہ کے نیچے یہ معلومات درج ہیں۔ صفحات عموماً بارہ یعنی چار ورق۔ کبھی کبھی آٹھ صفحات پر بھی شائع ہوا ہے۔ صفحہ کا سائز طول میں ایک فٹ اور عرض میں آٹھ انچ سے کچھ کم ہے۔ چاروں طرف ایک ایک انچ یا اس سے کچھ کم حاشیے چھوڑے گئے ہیں جن پر بھی بعض اوقات کوئی خبر یا کتابوں کے نام اشتہار کے طور پر ایک آدھا جانب درج ہیں۔ ہر صفحہ پر دو کالم ہیں اور ہر کالم میں اکیس سطریں۔ خبروں کے عنوان جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ اکثر اصل خبر کے ساتھ اس سے متعلقہ دیگر امور بھی لکھے جاتے ہیں۔ اخبار میں خبروں اور مضامین کے درج کرنے میں کوئی خاص ترتیب غالباً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ خبروں کے علاوہ غزلیں اور مضامین بھی درج کیے جاتے تھے صفحہ اول کے پہلے صف میں اخبار کا نام اور اس سے نیچے جلی قلم سے تین سطروں میں نام تاریخ سنہ نمبر وغیرہ انگریزی اور اردو دونوں میں درج ہیں۔

۱۲۸۳ھ

مظہر الاخبار

جلد ۱۱	VO 11	31 TH JULY. 1866	No 27	نمبر (۲۱)

۱۸ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ ۳۱ جولائی ۱۸۶۶ء ۱۷ آڑی ۱۲۷۶ فصلی

MUZHAROOL AKHBAR MADRAS

بقیہ آدھے صفحے میں ایک کالم میں اخبار کے متعلق ایک شعر فارسی اور دوسرے میں اشتہار کے عنوان سے اخبار کی قیمت وغیرہ درج کی گئی ہے۔

ہست ایں صحیفۂ ما   مظہرِ لفظ و مظہرِ معنیٰ

ہر خبر کا ظہور ہے اس سے   نام اس کا ہے مظہر الاخبار
دیکھیے چشم غور سے اس کو   ہے یہ منظور مردم امصار
خوبی اس کی بیاں سے باہر ہے   اس کا ہی شہرہ ہے بشہر و دیار
مشتریوں کی مہربانی سے   ہے یہ مانند ماہِ پرانوار
بلبل دل فدا نہ ہو کس رنگ   رشک گلشن ہے یہ نقش و نگار
بار پائے گا ہر مقام میں یہ   ہر مہینے میں نکلے گا سہ بار
جوشِ دریائے سعی عبرت سے   ہے یہ اخبار کیا ہی گوہر بار

بیت

بہار اس کی شگفتہ چمن چمن ہے اب   معطر اس سے مشام ہر انجمن ہے اب

بعد کی اشاعتوں میں دوسرے کالم میں اشتہار سے اوپر یہ رباعی بھی درج ہے ؎

بنگر چہ صحیفۂ نزاکت بار است   ہر سطر گلست و ہر ورق گلزار است
صد صبح صفا بکار ایں ہست   مجموعۂ لطف مظہر الاخبار است

اشتہار کی ابتدائی عبارت "خریداران جنس اخبار و شایقان یاقت و آثار پہ مخفی و محجب نہ رہے کہ یہ اخبار لطافت بار ر[illegible] اعتبار اس روز کو ایک بار چھپ کر شائع ہوگا۔ الخ

اصل اخبار کا آغاز صفحہ دوم سے ہوتا ہے پہلے صفحہ پہ پہلے کالم میں "مدراس مسرت اساس" کے عنوان سے [illegible] مدراس کی موسمی کیفیت وغیرہ درج کی جاتی ہے اور اس کے بعد جس ترتیب سے خبریں وصول ہوتی ہوں گی درج [illegible] جاتی ہوں گی۔ اخبار میں شہر مدراس اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے متعلقہ خبروں کے علاوہ شمالی ہند، اسلامی [illegible] لک اور دیگر اقطاع عالم سے متعلق خبریں بھی درج ہوتی ہیں۔ اور ہر خبر کے اخیر میں ذریعہ کا حوالہ ہوتا ہے کہیں فقط یا [illegible] لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ غالباً نامہ نگاروں کے پاس سے وصول ہونے والی خبریں ہوتی ہوں گی۔ اور کہیں مختلف اخبار [illegible] نام لکھے گئے ہیں، جس سے خبر اخذ کی گئی ہے۔ اس طرح کے حوالوں میں ہمیں اس دور کے مختلف اخباروں کے نام [illegible] ہوتی کے لیے ملتے ہیں۔ حوالے کے کچھ اخبارات کے نام یہ ہیں۔ لطیف الاخبار۔ شعلۂ طور۔ کانپور گزٹ۔ منفلیٹ [illegible] الاخبار۔ ایک جگہ حوالہ میں کرناٹک ٹیلی گراف کا بھی ذکر ہے۔

اخبار کے لیے خبروں کے ترجمہ کا بھی فوری اور اچھا انتظام تھا مثلاً "ٹیمس" میں ۲۶ جولائی کی شایع ہونے والی [illegible] کا ترجمہ ۳۱ جولائی کے مظہر الاخبار میں شائع ہوا ہے۔

اشتہارات میں کتابوں کے اشتہار ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اخبار میں ڈاکٹر لولاک کے ترص کا اشتہار ہے۔ دمن
ہوے کا اشتہار ہر پرچے میں ہے۔ ایک پرچے میں یہ اشتہار ایک پورے صفحے پر درج ہے۔

اخبار کی زبان کم وبیش وہی ہے جو اس زمانے میں شمالی ہند میں بھی بروج تھی۔ رجب علی بیگ سرور کی زبان
قفلی اور مسجع زبان جس میں قافیہ پیمائی کا خاص التزام رہتا ہے۔ دکھنی زبان اور خاص مدراسی زبان بھی استعمال ہوئی
ہے۔ مشرکوٹ سے نہیں بلکہ ت سے لکھا گیا ہے۔ جمع بنانے کا عربی قاعدہ مروج ہے۔ کاغذ کی جمع کواغذ کی گئی ہے
مجہ کے اخیر پرچے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ماہ ذیحجہ پر پرچہ کا سال ختم ہوتا ہے اور محرم سے نئے سال کا آغاز ہوتا ہے۔

چندہ اشتہار میں درج شدہ تحریر کے مطابق حسب ذیل ہے۔

اہالیان شہر سے ایک روپیہ ماہانہ۔ اضلاع وامصار سے مع محصول ڈاک سالانہ پیشگی گیارہ روپے چار آنہ۔
ششماہی چھ۔ مابعد سال تمام بارہ روپیہ آٹھ آنے۔ نوابان وراجگان عالی شان سے ماہوار مع پوسٹیج ۲ روپیہ
ین آنے۔ اور سالانہ پیشگی چوبیس روپیہ آٹھ آنے۔ مابعد سال تمام پینتالیس۔ ایک اخبار بھی خرید کر بند کر دینے
الوں سے پوری ماہانہ رقم لی جائے گی۔ مراسلہ نگاروں کو اخبار مفت، محصول ڈاک خط واخبار نامہ نگار کے ذمہ۔
جرت مطلب خاص فی سطر چار آنہ۔ مضمون مفید عام مفت چھاپیں گے۔

مظہر الاخبار کتنے سال تک جاری رہا اور کب بند ہوا اس کا علم نہ ہو سکا۔ دستیاب شدہ پرچوں سے یہ پتہ تو چلتا
ہے کہ اس نے اپنی عمر کے گیارہ سال تو پورے کیے تھے۔

اگر اس اخبار کے فائل دستیاب ہو سکیں تو جنوبی ہند کی سیاست وادب کے متعلق بڑے اچھے معلومات فراہم
ہو سکنے کے امکانات ہیں۔

حاصل ہونے والے پرچوں میں سے کچھ مندرجات کی نقل اور ان میں سے بعض کے متعلق مختصر صراحت اُمید
۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

نمبر (۳) جلد (۸) سے ماخوذ۔

"مدراس مسرت اساس۔ ان دنوں کچھ دھوپ کا لطف رہا کرتا ہے۔ کچھ فیض ابر مطیر جاگیر ہے۔ ہوائے
سرد بجان مرغوب ودلپذیر ہے۔ خاطر اہالیان شہر مطمئن ہے۔ سرمایہ تسکین بدست تجر آئین ہے۔ لیکن ابھی
بارگرانی اجناس سے کسی کو سبک دوشی حاصل نہ ہوئی۔ تشویش عدم روزگار رونانہ سلسلہ جنباں ہے مصیبت
سی تصدیع بے کراں ہے۔ گزراوقات کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ ہر فرد بشر زندگی سے تنگ ہو گیا۔ خدا ہی اپنے
ردوں پر مہربان ہووے۔ اسی کا فضل ہر زمان ہووے۔ آمین۔

مسقط وایران۔ صاحب اخبار سندین کے پاس مقیمہ مسقط کے ایک مخبر کی تحریر آئی ہے۔ وقائع نگار

بمبئی نے اس کی خبر اڑھائی ہے۔ مخبر مذکور کا بیان ہے کہ ان دنوں سرکار انگریزی سے سرکار ایران کے ساتھ کچھ سخت پیام درمیان آیا ہے۔ جو رملال اور بکھیڑے کا سامنے آیا ہے۔ قیاساً یہ صورت معاملہ ہرات کے سبب پائی جاتی ہے۔ اخبار سندین کے حوالے سے بمبئی گزٹ مرقوم ہے کہ ایک نئی طرح کی دھوم ہے کہ مکران کی طرف تیلیگراف کا تار لگانے کی تجویز کرنے کو دیار سندھ کا کمشنر مانسفلڈ جو گیا ہے تاریخ ۲۸ کو ابوشہر کی طرف جانے والا تھا کمشنر مذکور نے حکومت داران مکران کے ساتھ رشتہ دوستی کا مضبوط کرنے کو تالیف قلب کا یہ طرز نکالا تھا کہ انگریزی باجوں کی پیٹیاں اور عمدہ تلواریں اور نفیس نفیس کپڑوں کے تھانے بطور تحفہ دوستانہ کے ان کو سوغات دیے تھے۔ اس باعث سے وہ لوگ سرکار انگریزی پہ بہت بھروسہ اور اعتبار رکھتے ہیں۔ لالچ کا پیار رکھتے ہیں۔ فقط از کشف الاخبار

اقواب کلاں بہت مشہور ہے۔ ہرجگہ مذکور ہے کہ موسے سایر نام کا جہاز جو کئی روز کے اول لندن سے یہاں آیا ہے اوم اسٹرانگ نام کے توپیں بہت زبردست درازقد لایا ہے ایک سو دس رطل کا گولہ اس میں سماتا ہے سنگ خارا بھی اس کے سامنے ٹکڑے ہو جاتا ہے وہ توپیں یہاں اتاری جائیں گی۔ آیندہ دیکھیے یہاں رہیں اور کہیں جائیں گی۔ ایضاً۔

ماخوذ از نمبر (۳۵) جلد (۹) میلہ۔ ۱۶ ویں ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کو قریہ کُلم میں جناب تمیم انصاری کے میلے کا اچھا ٹھاٹ ہوا۔ بڑا ہجوم دھام نظر آیا۔ لوگ مدراس کے اطراف واکناف سے جوق جوق بذریعہ کشتی واسطے حصول زیارت مبارک کے روانہ ہوئے تھے۔ غرض بعد فراغت وانصرام جلسہ سب کے سب اپنے گھروں کو واپس آئے، یکدست سرمایۂ سعادت ابدی پائے۔ فقط۔

(قریہ کُلم میں سیدنا تمیم انصاریؓ کی درگاہ اب بھی جنوبی ہند کی مشہور زیارت گاہوں میں سے ایک ہے اور سولہویں ذی الحجہ کو تقریب عرس کو بڑا اجتماع ہوتا ہے)

سپہ سالار۔ مدراس۔ ۱۶ ویں ماہ رواں کو جناب سر ہوپ گرانٹ صاحب بہادر سپہ سالار عساکر مدراس بذریعہ گردون دود کش راہی بنگلور ہوئے۔ شاید ایک ہفتے کے بعد وہاں سے مراجعت کریں گے۔ اور سپہ سالار جدید آئے تک گورنر صاحب کے دارالامارے میں تشریف رکھیں گے۔

(گردون دود کش کا لفظ غالباً ریل گاڑی کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ جیسے کہ تلنگی میں اس کے لیے "پوگا بنڈی" دھوئیں کی گاڑی کا لفظ مستعمل ہے)

نوٹ۔ اہالیان گورنمنٹ نے عزم جزم کیا ہے کہ پانچ روپیہ کا نوٹ بکثرت جاری کریں۔ چوں کہ اس کے معاج کی اکثر ضرورت پڑے گی بڑا کام چلے گا۔ فقط از [illegible]

نمبر(۲۱) جلد (۱۱) سے ماخوذ

گھاس کا کپڑا

صاحب لارنس گزٹ تحریر فرماتے ہیں کہ سرزمین شہر چین چو خو کو میں ایک قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے کہ اہل ختا اس سے کپڑا بناتے اور اسے ریشم سے زیادہ داموں کو بیچتے ہیں ۔ وصف اس کپڑے میں یہ ہے کہ ریشم سے زیادہ مضبوط اور باریک ہوتا ہے اور رنگ میں اس کے ایک عجیب و غریب نزاکت پائی جاتی ہے فقط ۔ از اخبار پنجابی لاہور

ماہی برقی

صاحب لارنس گزٹ لکھتے ہیں کہ ولایت میں تباہی جہازان دشمنی کے لیے وقت معرکہ بحری کے اور واسطے حفاظت دریائی موذی جانوروں کے ایک آلہ بہ شکل ماہی اس قدر عمدہ ایجاد ہوا ہے کہ جس طرف اس کو دوڑاتے ہیں آناً فاناً میں مثل بجلی کے کوندھ کر اپنے مقابل کی چیز کو خواہ وہ کیسی ہی سخت ہو تباہ کر دیتا ہے اس میں باروت وغیرہ مصالح بھرا ہوتا ہے اور بوسیلہ قوت برقی کے تیز رفتاری بدرجۂ غایت ہوتی ہے ۔ فقط ۔

غریبوں کی دہائی

سنتے ہیں کہ دہلی سے ہزارہا من غلہ بذریعہ ریل اضلاع مشرق کی طرف کھچا چلا جاتا ہے اس سبب سے دہلی اور اس کے نواح میں روز بروز گرانی اس جنس کی ہوتی جاتی ہے ۔ ایک شاعر نادار نے یہ قطعہ حسب حال خوب لکھا ہے ۔ قطعہ ـــ

آئی ہے اس نواح میں جب روز سے یہ ریل — پورب کے سمت ہوتی ہے غلہ کی ریل پیل
جایا کرے گا یوں ہی ہمیشہ اگر اناج — ہے یہ یقیں کہ نکلے گا غریبوں کا خوب تیل فقط

نین ہسپتال

آنکھ کے بیماروں کی ہسپتال بنانے کے لیے بمبئی کے مشہور سیٹھ کاؤس جی جہانگیر جی ریڈی منی نے سرکار میں پچاس ہزار روپیہ دیا تھا مگر ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ اس کی بنا میں صرف ہوئے اور ستر ہزار روپے جو کم تھے سو سیٹھ صاحب موصوف نے وہ رقم بھی پہنچا دیا ہے اور یہ ہسپتال سر جمشید جی جے جے بھائی کے ہسپتال کے قریب ہے اور اس ہسپتال جدید میں ۸۰ بیمار بکشادگی رہنے کی وسعت ہے اور بالفعل آنکھ کے مریض اس ہسپتال میں ۸۰ سے ۹۰ تک آتے ہیں جو قابل ہسپتال میں رہنے کے ہیں وہ رہتے ہیں اور باقی اپنے اپنے مکانوں کو چلے جاتے ہیں فقط

(لطیف الاخبار)

بندوبست قلعہ پشاور

معلیت مطبوعہ ۲۹ جون ۱۸۹۳ء [illegible] رقم ہے کہ اتوار کے دن پشاور کے قلعے پر دوہرے پہرے کر دیئے

گئے اور انگریزی فوج کو حکم ہوا ہے کہ ہر وقت چست و چالاک رہے اور افسروں کو رخصت کی ممانعت ہے۔ ہنوز سبب اس کا سوائے حکام کے کسی کو معلوم نہیں فقط از کانپور گزٹ۔

نمبر (۳) جلد (۸) جولائی ۱۸۶۳ء کے اخبار میں درج شدہ محمد منور حسین صاحب منور منشی پند رھویں رجمنٹ ساکن ترچنا پلی کی غزل کے چند شعر۔

ہمیں مد نظر کس نیر اعظم کا جلوا تھا مقابل جس کے خورشید فلک ادنیٰ ستارا تھا
خزاں آتی نہ گلشن میں تو شادی کی بہار اڑتی نہیں گل تھا وہ دولہن تھی نہیں بلبل وہ دولہا تھا
گرفتار سیہ بختی ہوں جو موذی سے الفت کی تصور زلف کا جس پہ کیا میں نے وہ کالا تھا
خیالوں نے مرے سٹے کی بلندی عرش اعلیٰ کی فلک کیا تھا مرے دشت جنوں کا ایک ٹیلا تھا
برآمد ہو گیا تھا وہ منور کو ٹھے پر شاید جو ہر اک کہہ رہا تھا کہ کل شب چاند پورا تھا

اسی پرچہ میں قاضی بدرالدولہ مرحوم اور ۳۱ رجولائی ۱۸۶۶ء کے اخبار میں سالار الملک بہادر بخشی فوج کرناٹک کے انتقال کی اطلاع بڑے حزن و ملال کے ساتھ دیتے ہوئے دونوں پرچوں میں تین چار کالم میں تفصیلات درج ہیں۔

(قاضی بدرالدولہ اور سالار الملک اس شاندار علمی خاندان کے افراد ہیں جو نویں صدی ہجری کی ابتدا سے مسلسل دینی، علمی و ملی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔"
خانوادۂ بدرالدولہ حصہ اوّل مصنفہ مولانا یوسف کوکن صاحب ریڈر

جنوبی ہند میں اس خاندان نے اردو ادب کے لیے جو خدمات انجام دیے ہیں۔ اس کی تفصیل "خانوادہ قاضی بدرالدولہ حصہ اول" سے بخوبی واضح ہوتی ہے)

انجمن کی چند نئی مطبوعات

بازدید ۔ ڈاکٹر منیب الرحمٰن

سائز ۱۸×۲۲ ۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے

منیب الرحمٰن کا شمار ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی جدید شاعری کا مزاج و معیار متعین کیا ہے اسلوب و فکر کی جدت، احساس و جذبہ کی شدت اور تجربہ و خیال کی ندرت ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ بازدید ان کی نظموں کا بہترین انتخاب ہے جسے نفیس کاغذ پر سادہ و پرکار گرد پوش کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے اردو کے جدید شعری رجحانات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مجموعہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

فائز دہلوی اور دیوان فائز ۔ مرتبہ و مولفہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۲۶۹ ۔ قیمت ۔ ۵ روپے پچاس پیسے

اردو کے چوٹی کے محقق پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کی مولفہ و مرتبہ یہ کتاب فائز دہلوی کے اردو دیوان اور ان کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ فائز دہلوی کا یہ دیوان اردو کی لسانی و ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۵ء میں انجمن نے شائع کیا تھا۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے جو بالکل نئی معلومات اور اضافوں کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔

تذکرہ گلشن سخن ۔ مرتبہ و مولفہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

سائز ۱۸×۲۲ ۔ صفحات ۳۸۴ ۔ قیمت چھ روپے

[illegible] اس تذکرہ کا سال تصنیف ۱۱۹۴ھ ہے۔ اس تذکرے میں ۲۱ [illegible] کے منتخب اشعار شامل ہیں۔ اردو شاعروں کے تذکروں میں اس تذکرے کو [illegible] حاصل ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اس تذکرے کی اہمیت [illegible] کو جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ [illegible] کا موازنہ و مقابلہ کر کے اہم اختلافات کی نشان دہی کی ہے۔ اس تذکرے سے اردو کی ادبی تاریخ کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہوتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ششماہی رسالہ

اُردو ادب

ایڈیٹر
پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ

شمارہ (۴) ۱۹۶۶ء
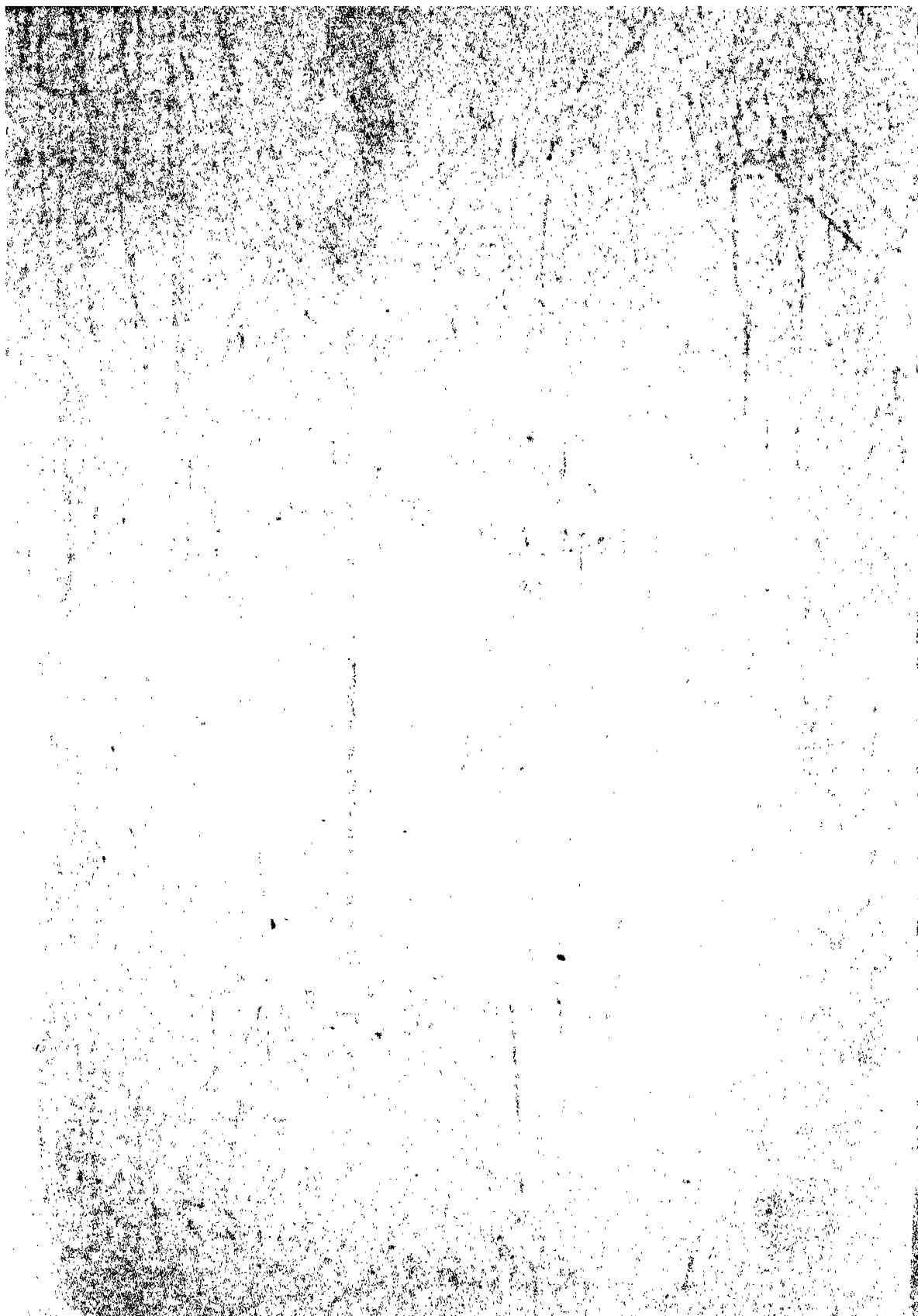
انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

اردو ادب

(تخلیق نمبر)

ایڈیٹر

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

قیمت سالانہ بارہ روپے
قیمت فی پرچہ تین روپے

(کتابت ابوطاہر زیدی)

سید ضیاء علی پرنٹر و پبلشر نے کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں دہلی سے چھپوا کر انجمن ترقی اردو ہند کے صدر دفتر علی گڑھ سے شائع کیا۔

اردو ادب

فہرست مضامین

حیات اللہ انصاری

پرانے کوہ و صحرا

(۱)

محل دارنی نے کڑک کر صدا لگائی

"حضور نواب شوکت الشان صاحب تشریف لا رہے ہیں۔"

شوکت نے پہلی مرتبہ اپنے خاندانی نوابی محل میں قدم رکھا۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے کو ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں بیمار ماں اور بوڑھے باپ کے ساتھ پایا۔ خدمت گار کا کیا سوال کوئی چولھا جلانے والا تک نہ تھا۔ اں کچھ دنوں کے بعد رخصت ہوگئیں۔ پھر یہ رہ گیا یا ابا حضور۔ ابا حضور نے ایک ایک کرکے سب عزیزوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ کیونکہ جہاں کوئی بے رخی برتتا اور پہلے سے، جب کہ یہ نواب تھے، مختلف برتاؤ کرتا تو یہ کنارہ کش ہو جاتے۔ اب تو پرانے ملنے والوں میں سوائے لالہ شیام ناتھ کے اور کوئی نہیں رہ گیا تھا، وہی کبھی کبھار آجاتے تھے۔ مگر جب آتے تو ان کے طور طریقوں سے یہی معلوم ہوتا کہ گویا کہ وہ محل میں آئے ہیں۔ ٹوٹے پلنگ پر اس طرح بیٹھتے گویا کہ وہ عالی شان مسند ہے اور پان کی ایک گلوری بھی اس طرح شکریہ اور تسلیم کے ساتھ قبول کرتے گویا کہ وہ دنیا کی کوئی نرالی نعمت ہے جسے نواب صاحب خصوصیت سے ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

ادھر نئے دوستوں میں کچھ لٹے ہوئے نواب اور بگڑے ہوئے راجا صاحبان تھے۔ وہ بھی دو چار سال سے ان میں سے ایک آدھ چوتھے پانچویں دن آجایا کرتا تھا۔ یہ لوگ پرانے زمانے کی باتیں کرتے تھے جو کہ ان کے خیال میں دنیا کا سب سے اچھا زمانہ تھا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ اب تو ہر چیز بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی ہے۔ یہ لوگ پرانے زمانے کی باتوں کو یاد کرتے اپنی بیماریوں خاص کر اختلاج کی تفصیل سناتے، پرانے استادوں کے اشعار پڑھتے، شوکت پر ترس کھاتے کہ اس کے کھانے کھیلنے کے دن اس طرح کھنڈروں میں کٹ رہے ہیں، یہ سب زمانے کا قصور ہے اور پھر ٹھنڈی سانس بھرتے، دو چار گلوریاں نواب صاحب کے خاصدان سے بہت تکلف کے ساتھ کھاتے اور ذرا دیر ٹھہر کر چلے جاتے۔

ان لوگوں کے علاوہ گھر میں آنے والے کچھ اور لوگ بھی تھے مرغ باز، بٹیرباز، نوابوں کے پرانے مصاحب قدیم طرز کے داستان گو جن کی داستانوں میں قصہ کم اور لفاظی زیادہ ہوتی تھی، بوڑھے رکاب دار، بیٹھی آواز والے گویے اور ناکام نچنیے یہ وہ لوگ تھے جن کی اب کہیں کھپت نہیں رہی تھی۔

یہ لوگ جب آتے تو آتے ہی اپنے فن کی باتیں کرنے لگتے۔ صرف مصاحبین ایسے تھے جو نواب صاحب سے ان کی خوبیوں کی باتیں کرتے تھے۔ آنے والوں کا یہ گروہ ہمیشہ شروع مہینہ میں اس وقت سے آنا شروع کرتا جب اسے یہ خبر مل جاتی کہ گزارے کی رقم آگئی ہے اور اس وقت تک آتا رہتا جب تک اس رقم میں کچھ جان باقی رہتی۔

یہ گروہ جب آتا تو اپنے ساتھ گزرے ہوئے زمانے کی خوش مذاقیوں کی بو باس لے کر آتا۔ ان کے آتے ہی قہقہے لگنے لگتے اور سبحان اللہ اور واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ پھر تو کسی دن مرغ مسلم بھن رہا ہے تو کسی دن بادشاہی دال پک رہی ہے، کبھی شیرمال کے زعفرانی ٹکڑے تیار ہو رہے ہیں یا ماہی پلاؤ دم دیا جا رہا ہے، یا کشمیری چائے بن رہی ہے جس میں آدھا حصہ بالائی ہوتی ہے۔ چائے کی پیالیاں مہمانوں کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں تو ان کے ساتھ خستہ شیرمالیں بھی ہیں، اور ہوش ربا کی داستانیں بھی، داستان نہیں تو کسی شاعر کا کلام کسی بوڑھے گلے کی تانیں اور گٹکریاں ہی سننے میں آجاتی ہیں۔ یہ چہل پہل بس تین ہی چار دن رہتی کیوں کہ ادھر نواب صاحب کے خاصدان میں پان کی کمی نظر آئی اور ادھر ان پرانے وفاداروں نے نواب صاحب کو قرض سے بچانے کے لیے آنا چھوڑا، کہتے تھے کہ بھئی وہیں تک گدگدانا اچھا جہاں تک آنسو نہ آجائیں۔

شوکت نے اب تک تو صرف نوابی محل کی باتیں ہی باتیں سنی تھیں اور شاید یہ باتیں باتیں ہی رہتیں اگر خاندانی حالات نے پلٹا نہ کھایا ہوتا۔ اس پلٹے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج شوکت نے سراپا اشتیاق بن کر اپنے خاندانی نوابی محل میں قدم رکھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملاقات ہو، ساتھ ساتھ کھٹک بھی تھی کہ کہیں مجھ سے کوئی بے تکی حرکت نہ سرزد ہو جائے۔

محل دارنی کی صدا کو کہیں دور پر محل کے اندر دہرایا گیا اور پھر آدھے منٹ کے بعد دہرانے والی نے جوابی صدا لگائی۔

"چھوٹے نواب صاحب بہادر کو عزت کے ساتھ لایا جائے"

محل دارنی: "قدم رنجہ فرمائیں حضور"

محل دارنی نے ایک ہاتھ سے اپنے گوٹے کناری سے لدے ہوئے بھاری پائنچے سنبھالے اور دوسرے سے آنچل برابر کرتی ہوئی آگے آگے چلی پھاٹک کی اس ڈیوڑھی سے گزر کر جہاں پالکیاں رکھی جاتی تھیں ایک صحن سا ملا اس کے بعد ایک اور ڈیوڑھی جو ایک اچھا خاصا مکان تھا جس کے اوپر صحنچیاں تھیں اور نیچے بڑے بڑے دالان ایک ط

ے دالان میں ماما ئیں گجرے بنا رہی تھیں انھوں نے شوکت کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر تسلیمیں عرض کیں، دوسری طرف کے دالان
یں چڑی مارن کالے بھجنگے لیے بیٹھی تھی، محل دارنی نے شوکت سے کہا۔

"حضور ایک لمحہ قیام فرمائیں آج منگل کا دن ہے نا؟"

چڑی مارن نے جھک جھک کر شوکت کو تین سلام کیے پھر اپنے ٹوکرے سے ایک کالا بھجنگا نکالا اور شوکت کے
اتھے سے چھلا کر چھوڑ دیا، بھجنگا ایک اڑان میں چھوٹے صحن سے آسمان کی طرف نکل گیا۔

چڑی مارن "سلامت رہیں حضور"

شوکت نے چڑی مارن کو انعام دیا اور محل دارنی کے ساتھ آگے چلا۔ محل دارنی نے جیسے ہی ڈیوڑھی پار کی اسے
چھریرے بدن اور لمبے قد کی دو جوان خادمائیں جن کو محل کی اصطلاح میں قلماقنیاں کہا جاتا تھا ملیں، جو پٹاپٹی کی چوڑی گوٹ
لگے ہوئے لہنگے پہنے تھیں اور ان پر راجپوتی وضع کے دوپٹے تھے جن کا ایک کونا لہنگے میں اُڑس لیا گیا تھا اور دوسرے کونے سے
گاتی باندھی گئی تھی، دونوں نے جھک جھک کر تسلیمیں عرض کیں اور پھر ذرا بلند آواز سے کہا۔

"اللہ رکھے چھوٹے نواب حضور تشریف لا رہے ہیں"

دونوں بسم اللہ بسم اللہ کہتی ہوئی کمر لچکاتی ہشیار باش کی صدائیں لگاتی آگے آگے چلیں۔

راستے میں کچھ خادمائیں آتی جاتی ملیں، کچھ ادھر ادھر بیٹھی کام کر رہی تھیں، ان میں سے جو بھی دیکھتی کہ شوکت
کو اس عزت سے محل میں بلایا گیا ہے تو وہ اگر بیٹھی ہوتی تو کھڑی ہو جاتی اور آتی جاتی ہوتی تو ٹھہر جاتی پھر آداب اور مجرا
بجالاتی اور دعائیں دینے لگتی۔

"خدا سلامت رکھے چھوٹے نواب کو"

"خدا حضور کو پروان چڑھائے"

"دولت و اقبال سلامت رہیں"

"جو آنے والی ہو مجھ ناچیز پر آجائے۔ یہ چاند سا ٹکڑا ہر بلا سے محفوظ رہے"

صحن بے حد بڑا تھا جس میں درخت لگے تھے اور بیچ میں بڑا سا حوض تھا جس کے بیچ میں فوارہ چھوٹ رہا تھا اور
بطخیں تیر رہی تھیں، حوض کے ایک طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں، یہاں ایک بڑا سا چوکا لگا ہوا تھا جس پر چاندنی
بچھی تھی مگر اس وقت ذرا ٹھنڈ ہو گئی تھی اس وجہ سے چوکے پر سے قالین اور گاؤ تکیے اٹھا دیے گئے تھے۔

صحن سے گزر کر چبوترہ ملا جس پر لال رنگ کے چو رُخے پتھروں کا فرش تھا، اس سے گزر کر سات دروں کا
بہت لمبا چوڑا اور اونچا دالان ملا جس کے اوپر لال اور ہری مخمل کی چھت گیری لگی تھی جس کے چاروں طرف زردوزی کی
بیل تھی اور جگہ جگہ اسی کام کے بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ بیچ میں سہ رنگ کا جھاڑ لٹک رہا تھا اور اس کے گرد رنگ برنگی

انڈیاں تھیں۔ سات دروں کے دالان کے بیچ کے در میں ایک چھوٹا سا گنگا جمنی فوارہ نصب کیا گیا تھا جس کے نیچے ایک چھوٹا سا شیشے کا حوض تھا جس میں ننھی ننھی لال لال مچھلیاں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ اس فوارے سے نکلنے والی ہلکی پھوار میں کیوڑہ ملا ہوا تھا جس کی مہک بیگموں کے لباسوں میں لگے ہوئے عطروں کی خوشبوؤں میں اس طرح گھلی ملی جا رہی تھی جیسے کسی خوش گلو کے گانے کے ساتھ سارنگی کی آواز!

فرش کے بیچ میں زربفت کی قالین پر نواب بیگم صاحبہ تشریف فرما تھیں، بارہ کلیوں کا بہت بھاری مرصع پائجامہ پہنے، اوپر تنگ شلوکا جو نیفے سے ذرا اوپر آ کر ختم ہو گیا تھا اور پیٹ کی ذرا سی دھار دکھائی دے رہی تھی، اس پر بادلے کا شربتی دوپٹہ تھا۔ وہ کلے میں گلوری دبائے معاملات کا فیصلہ کر رہی تھیں اور حکم دے رہی تھیں۔

نواب بیگم صاحبہ کا بدن کسی حد تک بھاری تھا مگر کھال ملائی کی طرح چکنی اور ملائم تھی اور رنگ دودھ اور انگوری شراب کے رنگوں کا مرکب تھا۔

بیگم صاحبہ کا حکم ہر طرف چل رہا تھا، لیکن ان کے انداز سے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ حکم چلا رہی ہیں۔

چوکے پر یہاں سے لے کر وہاں تک شادی کا سامان بکھرا ہوا تھا، گنگا جمنی اور چاندی کے برتن کھنک رہے تھے زیوروں کے سٹ چمک رہے تھے اور عطردان مہک رہے تھے، لال، ہرے، گلابی، نیلے، زعفرانی اور دھوپ چھاؤں والے، غرض کہ ہر رنگ کے رنگ برنگی جوڑے ہر طرف لگائے جا رہے تھے، محل کی لڑکیاں مغلانیوں کو ساتھ لیے تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں، کسی طرف دوپٹہ پر کرن ٹانکی جا رہی ہے تو کسی طرف بارہ کلی کے پائجامے پر بانکڑی لگائی جا رہی ہے۔ ان کاموں کے سلسلے میں شور سے ہو رہے ہیں، سُریلی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، فقرے چل رہے ہیں اور دبی دبی ہنسی ادھر ادھر مچل رہی ہے۔

"نیلے پر سنہرا گوٹا کیسا رہے گا؟ میرے خیال میں تو اچھا رہے گا۔"

"چل بھاگ۔ کیا کیا باتیں فرماتی ہو۔ نیلے آسمان پر نکلنے والا چاند روپہلا ہوتا ہے یا سنہرا؟"

"ارے یہ شیشیاں تو اس عطردان کی نہیں معلوم ہوتیں۔"

"اے میری بھولی بھالی بہنا تم تو بڑی شیشیوں کو چھوٹے خانوں میں رکھ رہی ہو۔ سمجھیں کچھ۔"

"ارے اس کپڑے کی دھوپ چھاؤں تو ہلکی پڑ گئی۔"

"دیکھتی نہیں ہو کہ شام ہو رہی ہے۔ ایسے میں چھاؤں بڑھے گی نہیں تو اور کیا ہو گا۔"

"اے بہن! اس کشمیری چادر کو کس تہہ سے موڑوں کہ سب پھول کھل جائیں۔"

شوکت جب دالان کے پاس پہنچا تو دونوں قلماقنیوں نے الگ الگ ٹکڑوں میں ایک ہی بات کہی۔

پہلی قلماقنی: "جناب علیا نواب بیگم صاحبہ ملاحظہ ہو"
دوسری قلماقنی: "چھوٹے نواب شوکت الشان بہادر تشریف لے آئے"
ایک دبلی پتلی چمکتی خادمہ لڑکی جو بہت بڑا پاندان کھوے سبک ہاتھوں سے گلوریوں پر گلوریاں بنائے چلی جارہی تھی بولی۔
"ماشاءاللہ حضور کی عمر بہت بڑی ہے۔ جناب علیا نواب بیگم صاحبہ آپ کو ابھی ابھی پوچھ ہی رہی تھیں"
بیگم صاحبہ نے نظر بھر کر شوکت کو دیکھا۔
"آؤ بیٹا نواب شوکت الشان آؤ۔ تمھارے آنے سے ہم سب کو بہت خوشی ہوئی۔ اس کو اپنا ہی گھر سمجھو اور اب آتے رہنا۔ یہ تمھارے دادا ہی کا تو محل ہے کسی اور کا تھوڑی ہے"
بیگم صاحبہ کے محبت بھرے لہجے میں دکھلاوا ضرور تھا لیکن اس میں تھوڑی بہت اصلیت کی جھلک بھی تھی۔ شوکت کو بیگم صاحبہ نے اپنے قالین پر بٹھالیا۔ پھر شوکت کے سامنے دو خوان لاکر کھولے گئے۔ ایک میں زعفران کے شربت کا جگ اور گلاس اور کابل کے سردے کی قاشیں تھیں اور دوسرے میں کشمیری چائے اور کئی طرح کے حلوے ایک میں ٹھنڈی چیزیں اور دوسری میں گرم۔
شوکت نے شربت کا گلاس اٹھالیا۔
اتنے میں کسی نے سامنے سے آکر شرم و نزاکت سے جھک کر تسلیم کی۔ بیگم نے کہا "یہ تم سے چھوٹی تمھاری بہن نواب عفت آرا ہیں۔ ان سے بڑی نواب عصمت آرا مانجھے میں ہیں۔ جاکر ان کو سلام کرآنا۔ وہ تم سے چار برس بڑی ہیں"
عفت آرا کا رنگ نمکین، بدن سبک اور خال و خط بے حد نازک تھے۔ وہ بار بار اپنے دوپٹے کا آنچل سنبھال رہی تھی۔ اس موقع پر اس کے ہاتھ اور انگلیاں اس طرح حرکت کرتے تھے گویا رقص کا کوئی مدرا ہو۔
"ارے شوکت تم کہاں!!"
یہ مظفر تھا، جو شوکت کا رشتہ کا بھائی اور ہم سن تھا اور جس سے پتنگ بازی ہوا کرتی تھی مظفر اسی جوش سے کہنے لگا۔
"بھئی خوب آئے تم شوکت۔ بیت بازی میں ایک آدمی کم پڑ رہا تھا۔ حضور نواب چچی بیگم صاحبہ ان کو لے جاؤں اپنے ساتھ"
"ہاں ہاں کیوں نہیں؟ ان سے پردہ کون کرے گا؟ جاؤ بیٹا شوکت اپنے ہم سنوں میں جاکر کھیلو"

(۲)

شادی کے موقع پر جو ایک ہنسنے ہنسانے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے وہ ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ تکلفات کے پردے کمزور ہو گئے تھے اور دوستی کرنا اور کسی حد تک بے تکلف ہو جانا آسان ہو گیا تھا۔ شوکت جو بیت بازی میں شامل ہوا تو ذرا ہی دیر میں یہ محفل والوں میں کھپ گیا اور ہر طرف سے لوگ پکارنے لگے نواب شوکت، نواب شوکت بھائی، نواب شوکت چچا، اور بھئی شوکت نواب۔ یہ بھی اسی طرح وہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کے نام لینے لگا۔

یہ بیت بازی دوپہر کے کھانا کھانے کے بعد سے چل رہی تھی اور برابر نئے نئے ممبر آکر شامل ہو رہے تھے۔ ایک آدھ پرانے ممبر چلے بھی گئے تھے۔ اس وقت دو نئے ممبر آئے ایک چمن مرزا اور دوسرا شوکت، ان دونوں کو قرعہ ڈال کر ایک کو ایک طرف اور دوسرے کو دوسری طرف شامل کر لیا گیا۔

چمن کو آدھی کے قریب خالق باری یاد تھی اور وہ بھی اس طرح کہ جس حرف کا شعر دینا ہوتا تھا اس حرف کا شعر ذرا ہی دیر میں اسے یاد آجاتا تھا۔ اس کے آنے سے بیت بازی بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگی اور کھٹا کھٹ شعر دیے جانے لگے۔ اس طرح جو بیت بازی چلی تو دو گھنٹوں میں دونوں طرف کا سرمایہ ختم کے قریب پہنچ گیا اور رفتار سست ہونے لگی پھر رات کے کھانے کے بعد جو محفل جمی تو شوکت کی پارٹی کے دیوالیہ ہونے کے آثار نظر آنے لگے۔ شوکت ابھی تک کوئی خاص کارنامہ نہیں دکھلا سکا تھا کیوں کہ اس کو اشعار تو کافی یاد تھے لیکن یہ یاد نہیں تھا کہ کون شعر کس حرف سے شروع ہوتا ہے اس وجہ سے شعر دینے کے لیے اس کو اپنے سارے ذخیرے کو ٹٹولنا پڑتا تھا اور زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ وہ ٹٹولتا ہی رہ جاتا اور اس کی طرف کا کوئی لڑکا یا لڑکی شعر دے دیتا تھا لیکن جوں جوں بیت بازی کی رفتار دھیمی ہونے لگی شوکت کو موقع ملنے لگا کہ وہ اپنے ذخیرہ میں سے ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر کوئی شعر دے دے۔

ایک بجے رات کے قریب جب شادی کا شور و شغب محل میں مدھم پڑ گیا تھا اس وقت بیت بازی آکر رُکے یہ رُک گئی اور شوکت کی پارٹی مات کھانے لگی۔ جب کافی دیر ہو گئی اور اس طرف سے شعر نہیں آیا تو گنتی گنی جانے لگی جب معرکہ کی بیت بازی ہو تو یہ گنتی کا وقت بڑا سنسنی خیز ہوتا ہے۔ چناں چہ اس وقت شوکت کی پارٹی کے لوگ بہت بے چین تھے اور چمن کی پارٹی کے لوگ بہت خوش۔ یہ گنتی جو سو پر ختم ہونے والی تھی جب اسی پر پہنچی تو شوکت کی طرف کی ایک لڑکی ملبلا کر کہنے لگی۔

ہائے لوگوں کوئی شعر سوچو ایسا شعر جو ’ے‘ سے شروع ہوتا ہو جیسے یارب، یاد، یہاں .....

یاد کا لفظ سن کر شوکت کو شعر یاد آگیا اور اس نے کہا لیجیے شعر۔

اس وقت گنتی نوے پر آچکی تھی اور اس کے بعد مات کا اعلان ہونے والا تھا۔ اس لیے شوکت کے اس اعلان سے دونوں طرف کے ممبر چونک پڑے۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

شوکت کی پارٹی نے مسرت کے نعرے بلند کیے "وہ مارا !!"
چمن نے کہا بھئی نواب شوکت بھائی میں ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ وہ جو شعر بھی دیتے ہیں وہ اعلا درجے کا ہوتا ہے۔ وہ میری طرح "خالق باری، سرجن ہار" کے قسم کے اشعار دے کر طبیعت مکدر نہیں کرتے۔
مرزا چمن کے آخری فقرے پر قہقہہ پڑ گیا۔ بیت بازی پھر چل نکلی لیکن آدھ ہی گھنٹے میں پھر وال پر رک گئی۔ پھر وہی ایک طرف گھٹن اور ایک طرف مسرت کا عالم چھا گیا گنتی ستر پر آئی تھی کہ اسی لڑکی نادرہ نے کہا۔
"اللہ نواب شوکت بھائی پھر کوئی کرامت دکھلایئے"

شوکت۔　　دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اس شعر پر دونوں طرف سے واہ واہ ہونے لگی لیکن اس مرتبہ تین ہی چار شعروں کا تبادلہ ہوا تھا کہ پھر شوکت کی پارٹی مات کھانے لگی اور پھر گنتی گنی جانے لگی جب اسّی پار کر کے نوّے پہ گنتی آنے لگی تو پھر نادرہ نے تڑپ کر کہا۔
"اللہ نواب شوکت بھائی ایک شعر اور ..."
اس کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ شوکت نے شعر پڑھا۔

ایک کی آنکھ میں آنسو ایک کی نیچی نظر
دو دلوں کے بیچ میں یہ نامہ و پیغام تھا

اس شعر پر اتنی واہ واہ ہوئی کہ بیت بازی میں مشاعرے کا سماں بندھ گیا۔ چمن نے اس پہ فرمائش کی کہ نواب شوکت بھائی، یہ پوری غزل اگر یاد ہو تو سنا دیجیے، اس فرمائش پہ ہر طرف سے ہاں ہاں ہونے لگی۔
شوکت تو چوک کے پاس ہی رہتا تھا جہاں سے ہر وقت گانے اور ریاض کرنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ ان کو سنتے سنتے اور کھیل ہی کھیل میں ادا کرتے کرتے شوکت کا گلا کافی پکا ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے گانے کے بجائے یہ غزل معمولی ترنم سے سنا دی۔ کچھ بیت بازی کا پس منظر اور کچھ پہلے شعر کا اثر جو ابھی ذہنوں میں گونج رہا تھا اور ان سب پہ ڈھلتی ہوئی رات کی چھاپ اور پھر شوکت کی لچکیلی اور پاٹ دار آواز، اس پہ ترنم جو ہلکا تھا، پر تھا فنکارانہ ان سب نے مل کر شوکت کی غزل خوانی میں عجیب سحر پیدا کر دیا۔ لوگ جھوم جھوم گئے۔ مرزا محمود نے جو چمن کا بڑا بھائی تھا اٹھ کر اچانک شوکت کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ یہ اظہارِ ستائش لڑکیوں کو پسند نہیں آیا۔ پھر تو لیا محمود کو سب نے آڑے ہاتھوں۔

"مرزا محمود بھائی کو تعریف کرنا تو خوب آتی ہے"
"ہاں کیسی پھرتی سے اُٹھے اور منزل مقصود تک پہنچ گئے"
"چال کو تو دیکھو کیسی بے ساختہ تھی"
"آمد ہی آمد تھی، ذرا جو آورد ہو۔
"اور واپس بھی اسی طرح آئے۔ سنا ہے ٹینس میں یوں ہی ہوتا ہے"
"اسی کو کہتے ہیں طوفان کی طرح جانا اور آندھی کی طرح آنا"

اس پر دبی دبی ہنسی ہونے لگی۔ ان باتوں سے کچھ دیر کے لیے بیت بازی رک گئی۔ مرزا محمود کا یہ حال کہ معلوم ہوتا تھا کہ کانٹوں کے بستر پر بیٹھا ہو۔ ایک منٹ میں جانے کتنی مرتبہ نشست بدلی، پان کھایا، منھ رومال سے پوچھا، کھنکھارا، اگالدان استعمال کیا اور جانے کتنی مرتبہ کہا۔

"ہاں بھئی کسے شعر دینا ہے"
"شعر دو نا"
"یہ خاموشی کیسی"
"یا شعر دو یا مات مانو"

آخر کسی نے بیت بازی کا شعر دے دیا اور وہ چلنے لگی لیکن پھر دس پندرہ منٹ کے بعد شوکت کی پارٹی آکر رک گئی اور پھر گنتی گنی جانے لگی۔

محمود لڑکیوں کی باتوں سے کچھ تپا ہوا تھا۔ اس نے اچھل کر کہا اگر نادرہ نواب شوکت سے اسی طرح کہیں جیسے پہلے کہا تھا تو نواب صاحب کو جھٹ سے شعر یاد آجائے۔

یہ سن کر نادرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیسے وہ چوکے سے نیچے اُترنے لگی ایک خادمہ نے اپنی ڈیوٹی انجام دی اور لپک کر اس کا سلیپر شو اس کے پاؤں کے نیچے سیدھا کرکے رکھ دیا لیکن نادرہ غم اور غصہ سے اتنی الجھی ہوئی تھی کہ جوتوں میں اس کا پاؤں پہلی اور دوسری کوشش میں سیدھا نہیں گیا۔ تیسری کوشش میں وہ جوتا سیدھا پہن سکی اور پھر آنسو پوچھتی ہوئی تیز رفتاری سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی چلی گئی تب تو ایسا سناٹا چھا گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ محفل میں کوئی ہے ہی نہیں یہاں تک کہ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک جب سے محفل جمنا شروع ہوئی ہے کسی نے ابھی تک نہیں سنی تھی صاف سننے میں آنے لگی۔ کہیں کسی گملے میں ایک جھینگر بول رہا تھا اس کی آواز بھی صاف سنائی دینے لگی۔

ایسے میں مظفر کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہر سخن موقع و ہر نکتہ مکانے دارد۔"

مرزا محمود نے تیزی سے جواب دیا۔

"آپ کون ہوتے ہیں مجھے نصیحت کرنے والے"

یہ کہہ کر مرزا محمود نے اپنے اڑے ہوئے چہرے پر اطمینان لانے کی کوشش کی اور گاؤ تکیہ سے اس طرح ٹیک کر بیٹھ گئے گویا جو اس وقت ہو رہا ہے سب لغو باتیں ہیں اور قطعی قابل توجہ نہیں۔

نادرہ کے جاتے ہی محل کی لڑکیاں بھی ایک ایک کر کے جانے لگیں اور ویرانی سی چھانے لگی۔

لڑکوں اور لڑکیوں کی ایسی محفل میں کوئی نہ کوئی بزرگ ضرور موجود رہتا تھا اس وقت استانی جی تھیں الگ بیٹھی ڈلی کتر رہی تھیں۔ انھوں نے بھاری اور تنبیہ کرنے والی آواز سے کہا۔

"بیٹا مرزا محمود بہنوں میں بیٹھ کر ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

لڑکیاں دو دو چار چار کر کے برابر اٹھ اٹھ کر جا رہی تھیں اور شوکت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اٹھ کر چلا جاؤں یا بیٹھا رہوں۔ اتنے میں بھاری جوڑوں کے سرسرانے کی آواز آئی اور نواب بیگم صاحبہ اپنی تین خواصوں کے ساتھ شمامۃ العنبر خوشبو کے ہالے میں تیز رفتاری سے چلتی اور ہانپتی ہوئی آگئیں۔ آکر ادھر ادھر نظر ڈالی، پھر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ جو خواص ان کے بارہ کلی کے پائجامے کے پائینچے سنبھالے تھی اس نے پائینچے ان کے قدموں پر ڈال دیے اور خود پیچھے ادب سے کھڑی ہوگئی۔ دو خواصیں جن میں ایک کے ہاتھ میں خاصدان تھا اور دوسری کے ہاتھ میں صندوقچہ ادھر ادھر کھڑی ہوگئیں۔

نواب بیگم نے جب ان کی سانس قابو میں آگئی تو لڑکوں کی طرف دیکھ کر ذرا کڑوے مگر بزرگانہ لہجے میں کہا۔

"بچو، ہنسو کھیلو، یہی دن ہیں ہنسنے کھیلنے کے اور شادی بیاہ کے موقع پر تو ایسا ہوتا ہی ہے، لیکن منھ سے بات نکالو وہ گری ہوئی نہ ہو۔ میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ ایسی بات کس کی زبان سے نکلی، لیکن جس کی بھی زبان سے نکلی بہت برا ہوا۔ اب رات بھی آگئی ہے اس لیے محفل برخاست کر دو۔"

بیگم نے گھوم کر ایک خواص کی طرف دیکھا جو خاصدان لیے ہوئے تھی، اس نے فوراً خاصدان کھول کر نواب بیگم صاحبہ کی طرف بڑھا دیا۔ خاصدان میں پھولوں کے گجرے کے بیچ میں چھ گلوریاں اور قوام کی شیشی رکھی ہوئی تھی۔ بیگم نے دو گلوریاں لیں قوام کی شیشی سے ایک سینک بھر قوام لیا اور اٹھ کر واپس لوٹ گئیں۔

(۳)

دوسرے دن شام کو جب شوکت اس جگہ پہنچا جہاں محفل جمتی تھی تو وہاں کچھ نہ پایا۔ صرف استانی جی بیٹھی ڈلی کتر رہی تھیں۔ شوکت نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے آج سناٹا ہے۔

"نواب بہادر بیٹا! ہنسی مذاق، کھیل کود، شعر و شاعری ان سب میں مزا اسی وقت تک ہے جب تک بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ اور برابر والوں کی مروت رہے نہیں تو شریفوں کی صحبت اور رذیلوں کی ٹھیک میں فرق کیا رہ جائے گا۔ کل جو بات ہوگئی تھی وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب آج سب لڑکے سنا ہے مردانے میں ہیں اور لڑکیاں شادی کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں"

مردانے میں نہ تو لڑکوں کی صحبت کسی طرف بھی نظر آئی اور نہ بڑوں کی۔ بڑے لوگ ادھر ادھر دو دو چار چار کر پر یا کرسیوں پر بے ترتیبی سے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ فرش کے اگلے حصے پر دس بارہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں غل مچا رہے تھے اور کود پھاند کر رہے تھے۔

دوسرے دن شام کو نواب بیگم صاحبہ نے گھرانے کے لڑکے اور لڑکیوں کو اسی جگہ بلایا جہاں صحبت جمتی تھی کہا ہنسو کھیلو، شادی بیاہ کے موقعے اسی لیے ہوتے ہیں۔

آج کی صحبت میں نہ مرزا محمود تھا اور نہ ان کا بھائی چھمن۔ مگر کسی نے نہ تو ان کے بارے میں پوچھا اور ان کا تذکرہ آیا۔ صحبت ویسی ہی جم گئی جیسے پہلے جمتی تھی۔

آج چادر چھپول کا کھیل ہوا۔ عفت آرا اور مظہر کپتان چنے گئے۔ دونوں کپتانوں نے اپنے اپنے آدمی چن لیے۔ دالان کے بیچ میں پردہ لگا دیا گیا۔ کپتان پردے کے ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔ ایک کپتان نے "شیر آؤ" کوئی دبے پاؤں آ کر پردے کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دوسرے کپتان نے آواز دی "ماہی گیر آؤ" پردے کے دوسری طرف کوئی آ بیٹھ گیا۔ اب پہلے کپتان نے ماہی گیر سے آ کر پوچھا "بتلاؤ پردے کے اس پار کون ہے۔ نام رکھنے میں کسی نہ کسی طرح مناسبت جس کا نام رکھا جائے اس سے ضرور ہوتی تھی۔ ماہی گیر نے بہت سوچا شیر کو ہوسکتا ہے لیکن سمجھ میں نہ آیا۔ اس طرح دوسرا کپتان بازی ہار گیا۔

جب شوکت کی باری آئی تو اس سے کہا گیا کہ بوجھو پردے کے اس پار کون ہے۔ پردے کے اس پار اس کو چاندنی کہہ کر پکارا گیا تھا شوکت سوچنے لگا کہ اس پار چاندنی ہے چاندنی کون ہوسکتی ہے؟ چاندنی چاندنی... اچھا شوکت نے زور سے کہا: "نادرہ"۔

اور سچ مچ وہ تھی نادرہ ہی! شوکت اسے جیت کر اپنی طرف لے آیا۔ اس دن مرزا محمود نے جو شوکت اور کو ایک کڑی میں پرو دیا تو اس کا شوکت کے دل پر بھی کچھ اثر ہوا تھا اور اس کے دماغ میں یہ چیز مسلسل گونج رہی تھی مجھ سے کس جوش سے کہتی تھی کہ "شعر دیجیے نواب شوکت بھائی، اللہ سوچیے تو"۔

اس بات کو دل میں رکھ کر جب وہ چاندنی کو جیت لایا تو بہت خوش ہوا۔ محل کی لڑکیاں نادرہ کی بولی کی اڑاتی تھیں۔ بات یہ تھی کہ نادرہ بول چال میں کبھی کبھی فارسی اضافت بول جاتی تھی اور ایسے الفاظ بھی بول

تھی جو محل کی بول چال میں متروک تھے جیسے دانشور، نشانِ راہ، میدانِ عمل، نظرِ ثانی، صدائے بے ہنگام، رنگِ شفق وغیرہ فارسی اضافت تو وہ چیز تھی جسے بیگماتی زبان برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ جہاں محل کی کسی لڑکی کی زبان پر فارسی اضافت آئی وہاں تانی جی نے ٹوکا "اے توبہ بی بی تم تو مردوں کی بولی میں بات کرنے لگیں۔"

نادرہ کو جو محل کی لڑکیوں نے فارسی اضافت والے الفاظ بے دھڑک استعمال کرتے سنا تو طرح طرح سے اس کی ہنسی اُڑانے لگیں۔ ایک مرتبہ نادرہ نے کسی کے فقرے کے جواب میں کہا: "میں تو بس آپ کے نقشِ قدم پر چلتی ہوں" جواب اچھا تھا، کیوں کہ جس غلطی پر نادرہ پر فقرہ کسا گیا تھا وہی غلطی فقرہ کسنے والی بھی کر چکی تھی۔ لیکن محل کی لڑکیوں سے یہ فارسی اضافت اور یہ نامانوس ترکیب برداشت نہ ہوتی۔ ایک لڑکی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دوسری لڑکی سے جو دور دروازے کے پاس کھڑی تھی پکار کر کہا۔

"اے بہن۔ ذرا اغلاق ابواب کر دو۔"

اس پر محفل کی سب لڑکیاں منھ پھیر کر دبی آواز سے ہنس پڑیں۔

نواب افسرالدولہ کے ایک دوست تھے مرزا کامران جنھوں نے اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس دن اتفاق سے مرزا کامران کی بارہ تیرہ سال کی لڑکی روزی بھی آئی تھی، جو چوکے کے برابر بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر شوکت کے برابر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ تھا تو بہت گورا مگر اس پر ہندوستانی خون کا نمک بھی تھا۔ محل کی لڑکیاں تنگ مہری کے پائجامے اور ڈھیلے کرتے پہنتی تھیں اور سیدھے بال بناتی تھیں۔ کانوں میں بالیاں اور ناک میں ہلکی نتھ ہوتی تھی لیکن روزی تنگ پائجامہ اس پر ہلکی فراک پہنے تھی، لمبا دوپٹہ تھا، ناک میں کچھ نہ تھا، کانوں میں بندے تھے اور بال الٹے بنے ہوئے تھے۔ شوکت کو وہ سب لڑکیوں سے زیادہ دلکش اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کانونٹ میں پڑھتی تھی اس وجہ سے لہجے میں میم پن تھا۔ روزی نے جو اغلاق ابواب والا جملہ سنا تو غصہ میں کھڑی ہوگئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی، جب کسی نے اس سے ہمدردی نہیں دکھائی تو اٹھ کر تیر کی طرح چلی گئی۔

شوکت کو اس طرح نادرہ کی ہنسی اڑایا جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لیے اس نے جو روزی کو اس طرح اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تو سمجھا کہ اسے بھی یہی بات ناگوار ہوئی اور اسی پر چلی گئی۔ شوکت کے دل میں تو روزی کے ایسے خاموش احتجاج پر اس کے لیے ایک عزت پیدا ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا کہ دیکھو یہ مغربی تہذیب والے جانتے ہیں کہ آدابِ محفل کیا چیز ہوتے ہیں۔ اس کا بھی دل چاہا کہ میں بھی ایسے فقرہ پر ناراضگی دکھلاؤں اور روزی کی طرح چل دوں لیکن دو وجہوں سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ ایک بات تو یہ ہوئی کہ شوکت سوچنے لگا کہ اگر میں اس طرح نادرہ کے لیے خفا ہو کر چلا گیا تو کہیں میری یہ بات بھی اسی نظر سے نہ دیکھی جائے جس طرح مرزا محمود کی حرکت دیکھی گئی تھی۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ محل کی لڑکیوں نے جس طرح ہنسی اڑائی تھی اس میں کچھ ایسی لطافت اور نزاکت تھی کہ شوکت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ

شرارت سے چمکتی ہوئی آنکھیں، وہ شوخی سے کھنکھنتی ہوئی آوازیں اور وہ ہاتھوں سے آنچل کو سامنے لاکر ہنسنا۔ غرض کہ شوکت نادرہ کا طرف دار تھا لیکن اس کے مخالفوں کی طرف جھکنے سے بھی اپنے کو نہ بچا سکا۔

محل کی لڑکیاں نادرہ کی صرف بولی ہی کی ہنسی نہیں اڑاتی تھیں بلکہ اس کی چال پر بھی ہنستی تھیں۔ نادرہ جب چلتی تھی تو ہلکی سی چاپ بھی پیدا ہوتی تھی، اسی وجہ سے جب وہ آتی تھی تو چاپ سے معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ آرہی ہے اس چاپ پر محل کی لڑکیاں جن کے پاؤں سلیپر سمیت اس طرح زمین پر پڑتے تھے جیسے درخت سے پتے گر رہے ہوں، وہ مسکراتی تھیں اور ایک دوسرے کی طرف آنکھوں سے اشارے کرتی تھیں۔

ایک مرتبہ نادرہ تیز آئی اس وجہ سے چاپ زرا زور سے نکلی۔ پھر تو محل کی لڑکیاں یوں ایک دوسرے سے کہنے لگیں۔

"تم تو مجھے دھرتی دھمک معلوم ہوتی ہو"

"میری نظر میں تم تو دھرتی کھسک ہو"

"نہیں، زرا اور ہلکی۔ دھرتی مسک کہو"

"ہاں ٹھیک ہے۔ دھرتی بس زرا مسک جاتی ہے، باقی خیریت ہے"

"دھرتی چمک کیوں نہ کہو دیکھتی نہیں ہو کہ اس سے سر میں چمک پیدا ہو جاتی ہے"

شوکت کو ایسی باتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور لطف بھی۔

(۴)

نوابی محل ایک اچھی خاصی بھول بھلیاں تھا۔ دونوں ڈیوڑھیاں ہی دو مکانوں کے برابر تھیں۔ ان میں برآمدے اور کمرے اور ان کے اوپر صحنچیاں بنی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھیوں سے نکل کر بہت وسیع چمن اور فوارے والا صحن جس کے تین طرف بڑے بڑے دالان، ان کے پیچھے کمرے، اغل بغل صحنچیاں اور ان کے اوپر دو چھتیاں تھیں۔ ان میں سے دو پشت پر اپنے صحن الگ تھے۔ بڑے صحن کے چوتھی طرف نوکروں کے لیے کمرے، برآمدے اور کوٹھریاں تھیں اور ان کے بیچ میں باورچی خانہ تھا جو بجائے خود دالان، کمروں، کوٹھریوں اور صحن والا ایک مکان تھا۔ مکان کی دوسری منزل بھی اسی طرح کی عمارت تھی۔ ان سب رہائشی جگہوں کو ملانے والے زینے تھے، راہداریاں تھیں، گیلریاں اور کھڑ... تھیں۔ یہ سب مل ملا کر محل ایک ایسی جگہ بن گیا تھا کہ ایک ناواقف لڑکی وہاں راستہ بھول سکتی تھی۔

محل کی آبادی ایک اچھے خاصے محلے کی آبادی کے برابر تھی، وہاں کے مستقل باشندوں میں بیگم کے قریب اور دور کے عزیز اور ان کے لڑکے لڑکیاں اور بہویں اور داماد تھے، پھر ان سب کے نوکر خادمائیں اور خادماؤں کے لڑکے لڑکیاں مائیں اور دادیاں تھیں۔ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو بلا کسی خاص سلسلے کے رہ پڑے تھے ا

رہتے رہتے وہ بھی اس بڑے خاندان کا جزو بن گئے تھے۔ ان سب بسنے والوں کے پالتو جانور بھی تھے بکریاں، مرغیاں، بطیں، کبوتر، توتے، مینائیں، گلہریاں، بلبلیں، نیولے کے بچے۔

محل کا مردانہ حصہ بھی ایسا ہی وسیع تھا۔ بہت بڑی بارہ دری۔ اس کے پیچھے کمرے، صحنچیاں، دونوں طرف وسیع برآمدے، بغل میں چھ کمروں اور برآمدے والا وسیع مہمان خانہ، کافی دور ہٹ کر صحن کے پیچھے درختوں سے چھپا ہوا چھوٹے مکانوں کا ایک سلسلہ جن میں اصطبل بھی تھا، موٹر خانہ بھی تھا، ہاتھی خانہ بھی تھا اور چڑیا گھر بھی تھا، جن میں پرانے نواب صاحب کے وقت میں مرغ اور کبوتر وغیرہ رکھے جاتے تھے مگر اب خالی رہتا تھا۔ اسی طرح منشیوں، اہلکاروں اور نوکروں کی رہائش گاہیں بھی تھیں۔ مردانے کی مستقل آبادی بھی کافی تھی۔

محل میں جو سودے والیاں آجاتی تھیں وہ پہلی ڈیوڑھی میں دوکان لگا کر ایک طرف بیٹھ جاتی تھیں۔ کیوں کہ ان کو محل کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس جگہ بیٹھ کر بھی وہ اپنا سودا اس طرح بیچ لیتی تھیں جیسے اِدھر اُدھر محلے کی دوکانوں میں بکتا ہے۔ گھنٹوں تک گاہکوں کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔

سودے والیوں ہی کی طرح ٹونے ٹوٹکے اتارنے والیاں اور نظر گزر جھاڑنے والیاں بھی آتی تھیں۔ سیانوں اور عاملوں کی ایجنٹ بھی آتی تھیں۔ کوئی زعفران سے لکھی ہوئی ٹلیٹیں لے کر آرہی ہے، تو کوئی سفید مرغ کے خون سے لکھا ہوا نقش، ان سے تمام بلائیں بھاگ جاتی ہیں اور اقبال قائم رہتا ہے۔ بوڑھی جنہیں بھی لمبے کرتے پہنے، گلے میں خاکِ شفا سے بنی ہوئی تسبیحیں ڈالے آیا کرتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھوت پریت بھگاتی تھی تو کوئی بی بی کا روضہ لاتی تھی اور مور کے پروں سے بنے ہوئے مورچھلوں کو ہلا ہلا کر روضہ پر سے غلاف اتار کر اس کی زیارت کراتی تھیں۔

مردانے میں ریچھ والے، بندر والے، سپیرے، اختوں بختوں کا تماشا دکھانے والے اور جادو سے سب کچھ غائب کر کے پھر واپس لے آنے والے، یہ سب لوگ برابر آتے رہتے تھے اور ان کے تماشے بھی ہوتے رہتے تھے اور ان کو انعام و اکرام ملتے رہتے تھے۔

شادی میں شرکت کرنے کی غرض سے آج کل مہمانوں کی ایک فوج آئی ہوئی تھی اور ان کے ٹھہرنے کے لیے مردانے اور زنان خانے کے سب کمرے، کوٹھے اور صحنچیاں کھلوا دی گئی تھیں۔ ان میں جو الم غلم سامان بھرا تھا ان کو تہہ خانوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ شادی سے دو دن پہلے محل کے اندر اور باہر کا گوشہ گوشہ آباد ہو گیا تھا۔ ہر طرف لوگ آتے جاتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہتے تھے۔

نواب افسر الدولہ کے خاص دیوان خانے اور شہ نشین کو چھوڑ کر ابھی تک محل میں اور کسی جگہ بجلی نہیں لگی تھی اس وجہ سے رات کو مردانے اور زنانے صحنوں اور بڑے دالانوں میں تو گیس کے ہنڈے جلتے تھے باقی اور جگہوں کے لیے لیمپ، دیوار گیریاں اور لالٹینیں تیار کر کے لگا دی جاتی تھیں۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ

بارات کی دونوں صاحبزادیوں کی نظر سے جو چیز جتنی دور ہوتی تھی اتنا ہی اس میں بد دیانتی اور بے سلیقہ پن اور لاپروائی
ہوتی تھی۔ کسی لیمپ میں تیل کم ڈالا گیا یا چرا لیا گیا اس وجہ سے وہ نو ہی بجے سے گل ہوا جا رہا ہے، تو کسی دیوار گیری
کی بتی نہیں کاٹی گئی ہے اور وہ لو دے رہی ہے یا کسی لالٹین کی چمنی اپنی جگہ پر بیٹھی نہیں ہے اس وجہ سے وہ بار
بھڑک رہی ہے، کسی لالٹین کی چمنی ٹوٹی ہوئی ہے اس وجہ سے وہ دھواں دے رہی ہے، اور وہ چار لالٹینیں
ایسی بھی تھیں جن کی چمنی ٹوٹ گئی تھی یا کوئی لے گیا تھا اور اس کی جگہ کوئی دوسری چمنی لگائی نہیں گئی تھی وہ سو
کے تیل کے دیے کی طرح زرا دیر دھواں دے کر جلتی رہتیں پھر بھڑک بھڑک بجھ جاتیں اور اندھیرا ہو جاتا۔
لیکن پھر بھی مہمان ناراض نہیں تھے۔ سب ہی جانتے ہیں کہ شادی بیاہ میں ایسی بے انتظامیاں ہو ہی
جاتی ہیں۔

جس دن بارات آنے والی تھی اس دن گہما گہمی اور شور و ہنگامہ انتہا کو پہنچ گیا تھا اور محل کے سب بندھن
ٹوٹ گئے تھے۔ جوان لڑکے اور مرد ادھر ادھر کے زینوں اور راہداریوں اور دروازوں سے محل میں آ جاتے
تھے اور اپنی عزیز عورتوں سے باتیں کر لیتے تھے۔ نوکر بھی اندر سامان لے کر آتے تو بے دھڑک دوسری ڈیوڑھی
کر لیتے تھے۔ محل دارنی اور اس کے ساتھ کی دونوں سپاہی نما خادمائیں یا قلماقنیاں اس نرغے کے سامنے بے بس
برابر بیگم صاحبہ سے شکایت کرتی تھیں کہ باہر کے چوکیدار نگہبانی کر رہے ہیں، اور بلا روک ٹوک
بیگم صاحبہ جب چوکیداروں کو حکم بھجواتیں تھیں تو چوکیدار اپنی جگہ پر نہ ملتے تھے اور جب
لانے والا کسی اور حکم کی تعمیل کے لیے جا چکا ہوتا تھا۔

ایسے میں ایک چھوکری شوکت کو جو مردانے میں تھا، ڈھونڈتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
"آپ کو سب لڑکیاں اور لڑکے اندر بلا رہے ہیں بائیں باغ کی طرف کھلنے والے کمرے میں۔"
شوکت اندر گیا تو دیکھا کہ سب کسی بے حد اہم مسئلہ پر سوچ رہے ہیں اور بحث بے حد سنجیدگی
معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت زبردست معرکہ درپیش ہے۔
شوکت کو دیکھتے ہی محل کی ایک لڑکی نے کہا۔
"نواب شوکت بھائی ہم لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک سہرا خاص الخاص ہم لوگوں کی طرف سے
نکاح سے پہلے سنا دیا جائے۔ کیوں کہ نکاح کے بعد نرغہ ہوگا کہ ہم لوگوں کو موقع نہ ملے گا۔ آپ کیا
سے اتفاق کرتے ہیں؟"
شوکت نے یہ تجویز بسر و چشم مان لی۔
پھر اس لڑکی نے کہا کہ ...

کرنا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس بات کو کہ نکاح سے پہلے سہرا گایا جائے محل کے ضابطوں کی رکھوالیاں شرم و لحاظ کے قانون کی خلاف ورزی قرار دیکر سہرا گانے سے ہم کو روک دیں۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ جب سہرا گانے کا قصد ہو اس موقع پر چند ہوشیار لڑکیاں کوئی بہت زبردست مسئلہ لے کر بیگم صاحبہ کے پاس چلی جائیں اور معاملہ کو اتنا طول دیں کہ باقی لوگ سہرا گا کر ختم کر دیں۔"

"اگر فوراً ہی اس قصور پر نصیحت اور خفگی شروع ہو جائے تو سہرے کے گانے سے جو لطف آیا ہے اس کو آپس میں تقسیم کرنے کا کام ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیا جائے پھر سب اس جگہ اکٹھا ہو کر اس لطف کا حصّہ بانٹ لیں۔"

یہ پروگرام بھی بالاتفاق منظور کر لیا گیا، اب اور الجھن سامنے آگئی۔ ایک تو یہ وہ دو چار لڑکیاں کون ہوں جو ایسی قربانی کریں کہ جب سہرا گایا جانے والا ہو تو وہ آپس کا جھگڑا چکانے چلی جائیں، دوسرے یہ کہ وہ جھگڑا کیا ہو جس کے طے ہونے میں کم سے کم آدھ گھنٹہ لگ جائے، تیسرے یہ کہ لڑکے چاہے کتنے کہ وہ بھی ان کاموں میں شریک ہوں لیکن آج لڑکوں کو نیچے آنے سے منع کر دیا گیا ہے۔

عفت آرا نے کہا "نواب شوکت بھائی آپ کو ان منی منی سی الجھنوں کے لیے تھوڑے بلایا گیا ہے آپ کو تو پربت جیسی بھاری چیز ہٹانے کے لیے بلایا گیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ سندر یا سہرا، نگہ یا سہرا، نجریا سہرا کے ساتھ مچھریا سہرا آسکتا ہے یا نہیں۔"

"آنے میں کیا رکاوٹ ہے؟"

"بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ یہ کہ اس سے ہتک عزت بھی ہوسکتی ہے اور حق تلفی بھی۔"

"یہ کیسے؟"

بات کھلی تو شوکت کو معلوم ہوا کہ عفت آرا کا خیال ہے کہ اگر مچھریا کا قافیہ نہ لایا گیا تو دلہن کی حق تلفی ہوگی وہ یوں کہ اودھی میں مچھریا مچھلی کو کہتے ہیں اور دلہن واقعی مچھلی کی طرح بے زبان ہے، ایسی بے زبان ہے کہ کبھی آگے چل کر اسے شوہر پر بہت غصہ بھی آگیا تب بھی وہ اتنا بھی نہ کہے گی کہ "تم بڑے وہ ہو" لیکن نادرہ کا خیال ہے کہ مچھریا ہوئی مچھر کی مادہ، اگر دلہن مچھر کی مادہ ہوئی تو دولہا یقیناً مچھر قرار پائے گا۔ یہ بات بُری ہوگی۔"

"کیوں بری ہوگی؟"

"میں بتاؤں گی نہیں۔ بس سمجھ جائیے۔"

"چلیے میں بتاتی ہوں دیکھیے (سرگوشی کے انداز میں) دونوں یعنی دولہا بھائی اور مچھر یہ سمجھیں گے کہ

ان کی ہجو ملیح ہو رہی ہے۔ دو لہا بھائی کہیں گے کہ میرا ماشاء اللہ سے ذرا اچھا بدن ہے تو یہ لوگ نظر لگاتے ہیں اور پھر کہے گا کہ لو دیکھو مجھے کس سے تشبیہ دے رہے ہیں۔"

ان سب فقروں میں مسکراہٹیں اور دبی دبی زبان سے ہنسی چلتی رہی۔

ایک لڑکی نے مصنوعی غصہ میں کہا۔

"دیکھو تم میرے دولہا بھائی کو پھر پھر کہہ کر ان پر نظریں لگا رہی ہو، ابھی کل ہی تو ان کی اماں جان حضور فرما رہی تھیں (ان کی نقل کرتے ہوئے) ہے ہے میرے لاڈلے کو دانا نہیں لگ رہا ہے، دیکھو بے چارہ کتنا دُبلا ہو چلا ہے۔"

"دیکھو بہن! معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری نظریں مچل رہی ہیں ان کو لگنے کے لیے۔"

بحث ابھی جاری ہی تھی کہ نیچے سے دو لڑکیاں بھاگتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔

"بڑا پیارا موقع ہے۔ نواب بیگم صاحبہ اور سب بزرگ جوڑوں کے رکھوانے میں ایسے لگے ہوئے ہیں کہ ان کو کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں۔ چلو ایسے میں سہرا گا دیا جائے۔"

مگر ابھی نہ تو سہرے کی لے بنی ہے اور نہ ساتھ گانے کی مشق ہوئی ہے۔

دلہن کا پھوپھی زاد بھائی موجود تھا، جو نہ صرف لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں کھیلتا تھا بلکہ گڑیوں کے جوڑے بھی سیتا تھا۔ ان کے بیاہ پر ڈھولک کے گیت بھی گاتا تھا اور کبھی کبھی ناچتا بھی تھا۔ اس نے یہ سنتے ہی ڈھولک اٹھالی اور چار پانچ لڑکیوں کو بٹھا کر سہرے کو گانا شروع کر دیا، ذرا ہی دیر میں لڑکیاں تالی پہ چلنے لگیں اور لے بن گئی۔

لڑکیاں نیچے جب آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان تو واقعی خالی ہے کیوں کہ نواب بیگم صاحبہ اور دوسری بیگمات سب دوسری طرف ہیں لیکن صدر دالان جس کے پاس کی صحنچی میں دلہن مانجھے بیٹھی تھی، شمشاد میراثن نے گانا اور ناچنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی آواز کوئل کی ایسی تھی تو ناچ تڑپتی مچھلی کی طرح، یونہی اس کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی اور جب ناچتے کھڑی ہو جاتی تو فرائے بھرتا ہوا پتنگ معلوم ہوتی تھی۔ نواب بیگم صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ "یہ ہے تو موئی میراثن لیکن اس کے سامنے تو ڈومنیاں بھی مات ہیں۔" آنکھیں وہ چلاتی بھنوؤں کو وہ گردش دیتی، گردن میں لہر وہ لاتی، اور ان سب کاموں میں وہ پھرتی، وہ چلبلاپن کہ محل کی بیگموں کو اس کے رقص میں، طوائفوں اور ڈومنیوں کے رقص سے زیادہ مزا آتا۔

شمشاد، نواب بیگم اور دوسری بیگموں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر نوجوان عورتوں کی فرمائش پر اس وقت وہ گانا گا رہی تھی جن کو شوخیاں کہتے ہیں اور جن کو شادی بیاہ کے موقعوں پر گایا جاتا ہے لیکن کنواری لڑکیاں

کہ ان کے سننے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ اس وقت شمشاد یہ شعر گا رہی تھی ۔

دولہا بھائی آرہے ہیں لکھنؤ سے شام کو
باجی، آج آپا ہیں کچھ چپکی سی گھبرائی ہوئی

وہ گا بھی رہی تھی ناچ بھی رہی تھی اور بتا بھی رہی تھی، کبھی بتلاتی کہ وہ دولہا بھائی کس طرح گبرو جوان بنے مونچھوں پر تاؤ دیتے، گھوڑا اڑاتے چلے آرہے ہیں کبھی یہ کہ آپا کیسی چپ چاپ گھبرائی ہوئی، مسکراتی ہوئی، شپٹاتی ہوئی پھر رہی ہیں، اور کبھی یہ کہ باجی یعنی ماں کس طرح مسکرا مسکرا کر اپنی چھوٹی بیٹی کی زبان سے یہ بات سن رہی ہیں۔ ناچ میں بتانے اور نقلیں اتارنے میں شمشاد فرش پر دس گز کے اندر اڑی اڑی پھر رہی تھی، کبھی تو گرگرا کی طرح سمٹ جاتی، تو کبھی غمزوں بھری مینا کی طرح پھدکنے لگتی، اور کبھی بھوکے شکرے کی طرح جھپٹ پڑتی ۔ اس کی شوخیاں اور چلت پھرت پر محفل لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی ۔

محفل کی عورتوں کے بے انتہا انہماک سے فائدہ اٹھا کر لڑکے بھی جو ابھی اوپر سے آئے تھے ایک گوشہ میں کواڑوں کی آڑ لے کر کھڑے ہوئے اور اس نرالے رقص اور نقل کو حیرت سے دیکھنے لگے ۔ لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون سا پانسہ پھینکیں جو یہ صحبت یا تو برخاست ہو جائے یا کسی اور جگہ منتقل ہو جائے تاکہ ان کے لیے میدان خالی ہو جائے وہ اس جگہ اپنی محفل جما سکیں ۔

زنانے دیوان خانے میں ایک اہم مسئلہ زیر بحث تھا ۔ وہ یہ کہ دولہا ہاتھی پر آئے یا موٹر پر ۔ لڑکے والے ہاتھی پر اصرار کر رہے تھے لیکن لڑکی والے موٹر کے لیے بضد تھے ۔ لڑکی کے باپ نواب افسر الدولہ نے نواب بیگم صاحب سے کہلا دیا تھا کہ کمشنر صاحب اور دوسرے انگریز بہادر صاحبان بھی آئیں گے ۔ ایسے میں دولہا کا موٹر پر ہی آنا مناسب رہے گا۔ افسر الدولہ پرانے نوابوں میں نہ تھے ۔ وہ علی گڑھ کالج میں پڑھ چکے تھے اور کئی انگریزوں اور سرکاری افسروں سے دوستی تھی اور ان کو شکار بھی کھلوا چکے تھے ۔ جب وہ اپنی بیگم کو لے کر نینی تال جاتے تھے تو لاٹ صاحب سے ملانے ان کو بے پردہ لے جاتے تھے اور ایک مرتبہ تو لاٹ صاحب کی بھری پارٹی میں بھی بے پردہ لے گئے تھے اور سب کے سامنے لاٹ صاحب سے اپنی بیوی کا ہاتھ ملوایا تھا ۔

نواب افسر الدولہ کی بیٹیوں کو جہاں استانیاں گلستاں بوستاں وغیرہ پڑھاتی تھیں اور سلائی اور کڑھائی سکھاتی تھیں وہاں ایک میم صاحبہ بھی انگریزی بولنا اور کیک بنانا سکھانے آتی تھیں ۔ نواب صاحب کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ان کا شمار ماڈرن لوگوں میں کیا جائے اس وجہ سے ان کا اصرار تھا کہ ان کا ہونے والا داماد جو کہ خوش قسمتی سے اچھے خاندان کا ہونے کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی بھی تھا ۔ بجائے جامے کے شیروانی میں اور بجائے ہاتھی کے موٹر پر آئے ۔

جب لڑکی والوں نے موٹر کی تجویز پیش کی تو لڑکے کی دادی نے کہلوایا کہ کچھ یاد ہے کہ دارا شکوہ صرف اس وجہ سے

جنگ میں ہار گیا تھا کہ وہ ہاتھی سے اُتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا۔ نواب بیگم صاحبہ نے جواب میں کہلوا دیا کہ زمانہ بدل گیا ہے اب تو وہ شہزادہ میدان ہارے گا جو گھوڑے سے اُتر کر ہاتھی پہ بیٹھے گا۔ یہ جواب دے کر لڑکی والے سمجھے تھے کہ انھوں نے لڑکے والوں کا منھ بند کر دیا اور پالا مار لیا۔ لیکن اس وقت اس جواب کا جواب آیا اور اسے لے کر دولہا کی طرار اور دودھ شریک بہن ہلال بانو آئیں۔ بارہ کلیوں کا بھاری پائجامہ اس پر تنگ شلوکا اور چکن کا دوپٹہ، بھاری نتھ اور موٹے موٹے سونے کے کنگن پہنے ہوئے فینس سے اُتریں۔ جھک جھک کر سلام کرتی، نواب کے خاندان والوں کو دعائیں دیتی حوض، باغیچے، آرائش اور محل کی ہر ہر چیز کی خوبصورتی کی تعریفوں پر تعریفیں کرتی ہوئی آ کر بیٹھیں۔ دو چار باتوں کے بعد بیگم صاحبہ کی نوابی شان اور شرافت پر دو شعر سنا دیے۔ پھر مطلب پر آئیں۔

"اے نواب بیگم صاحبہ آپ کا جمال، جلال اور سہاگ سلامت رہیں، اقبال اور شان ہمیشہ چڑھتے سورج رہیں۔ دروازے پر ہاتھی جس طرح آج جھومتے ہیں اس طرح ہمیشہ جھومیں اور ان کی تعداد بڑھتی جائے۔ جو شان ہاتھی میں ہے وہ بھلا موٹر میں کہاں۔ بڑی کتاب میں ہاتھی کا نام آیا ہے اور الفیل سورت اتری ہے۔ سبحان اللہ کیا کہنا اس کا! یہ موا موٹر اس کو تو یہ فرنگی نے کر آئے ہیں، اس میں کل پرزے ہوتے ہیں اور تیل جلتا ہے اور اونچائی میں زمین سے دو گز بھی تو نہیں ہوتا۔"

ہلال بانو سانس لے کر پان کی دو گلوریاں نوش کر کے پھر یوں گویا ہوئیں۔

"مگر ایک بات ہے حضور نواب بیگم صاحبہ۔ موٹر میں بھی ایک خوبی ہے جو بہت پائے کی ہے۔ اے ہاں میں تو جو کہتی ہوں خدا لگتی کہتی ہوں۔ چاہے کسی کو بُرا بھی کیوں نہ لگے۔ وہ خوبی یہ ہے کہ موٹر ہاتھی کیا گھوڑے سے بھی تیز چلتا ہے بلکہ یوں کہو کہ وہ ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ اگر بھاگم بھاگ کا موقع ہو تو اس سے اچھی کوئی سواری نہیں۔ البتہ کسی کو اڑن کھٹولا مل جائے تو بات دوسری ہے۔"

ہلال بانو اتنا کہہ کر مسکرائیں اور رومال سے اپنا منھ پونچھنے لگیں۔ عفت آرا نے ساتھ والی لڑکی کے چٹکی لے کر کہا "اب لگائے گی یہ ہوا میں گرہ۔"

ہلال بانو نے اپنے سیدھے ہاتھ کے کنگن کو کلائی کے اوپر کھسکایا اور ہاتھ کو حرکت دے کر کہنے لگیں۔

ہلال بانو: "لیکن حضور عالیہ اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہو تو معاف کی جائے۔ برات میں بھاگم بھاگ کی کہاں گنجائش۔ برات تو ایسی چیز ہے جو مزے مزے چلتی ہے۔ اسی میں اس کا مزا ہے۔ تماشائی دو رویہ کھڑے ہوئے برات دیکھتے ہیں اور برات والے تماشائیوں کو دیکھتے چلتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو برات میں مزا کیا۔ تماشائیوں نے اگر برات کو نہ دیکھا تو سمجھ لیجیے کہ برات نہیں نکلی بلکہ جنگل میں مور ناچا۔ اور حضور بیگم صاحبہ مزے مزے چلنے کے لیے تو ہاتھی ہی موزوں ہے جو جھومتا ہوا چلتا ہے۔ کیا کہنا اس سواری کا۔ اس میں راجاؤں کا راج ہے، سپہ سالاروں کی دھاگ ہے اور

شاہوں کی شان ہے۔ جب سونے چاندی کا گنگا جمنی ہودا کسا جاتا ہے اس وقت بیٹھیو تو معلوم ہوتا ہے کہ گلفام کا بالاخانہ چل رہا ہے۔ بیٹھنے والا سب سے بالاتر رہتا ہے کہیں اس پر شہ بھی بیٹھے اور شہ بالا بھی تو وہ شان ہو کہ فرشتے رشک کھائیں اور حوریں بل بل جائیں اور سب کہیں "شان ارفع ہے تری مرتبہ اعلیٰ تیرا"

ہلال بانو کا میٹھا لہجہ، ہاتھوں اور ابروؤں کی حرکت اور نیم بان اور یہ طرز ادا، بیگمات سمجھ گئیں کہ اس پری کو شیشے میں اتارنا آسان نہیں۔

لڑکیوں نے جو قینچی کی طرح چلنے والی یہ زبان دیکھی تو آپس میں کہنے لگیں "چلو یہ آتش بازی صاحبہ طال بسا نہا و دام اقبالہا تو دو تین گھنٹے سے پہلے ٹلنے والی نہیں اور ان کی وجہ سے سب بزرگ خواتین بھی الجھی رہیں گی۔ اس لیے اس طرف سے تو بالکل اطمینان رکھو لیکن موئی فتنی شمشاد کو کیسے ٹالا جائے۔"

اتنے میں محل داری کے تحت کام کرنے والی خادمہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

"جناب علیا بیگم بہرام مرزا صاحبہ تشریف لا رہی ہیں، ان کے ساتھ فینس میں مسز کامران بھی ہیں۔ دونوں استقبال کی منتظر ہیں۔"

نواب بیگم نے عفت آرا سے کہا کہ تام جھام اور چھتر لے کر جاؤ اور استقبال کر کے لے آؤ، میری طرف سے مناسب الفاظ میں معذرت کر دینا۔

اس محل میں تام جھام اور چھتر کی ساخت اور استعمال میں بہت سی تبدیلی ہو چکی تھیں، تام جھام اب صرف ایک آرام کرسی جو مخملی گدوں سے آراستہ تھی رہ گئی تھی۔ اس میں ڈنڈے لگے ہوئے تھے جن کو تھام کر دو مضبوط کہارنیاں اٹھا لیتی تھیں۔ زربفت کے بڑے چھتر کی جگہ اب ایک چھتری ہوتی تھی جس پر ریشمی غلاف اور جھالر لگا دی جاتی تھی۔ یہ چیزیں یا تو ان بوڑھی ضعیف اور بیمار مہمان خواتین کے لیے استعمال ہوتی تھیں یا ان بیگمات کے لیے جو چلنے پھرنے کی ذرا بھی عادی نہیں تھیں یا چل کر صحن پار کرنے کو خلاف شان سمجھتی تھیں۔ خود نواب بیگم تام جھام کو اسی وقت استعمال کرتی تھیں جب ان کی طبیعت اچھی نہ ہو۔ لیکن بیگم بہرام مرزا کی بات دوسری تھی وہ استعمال کریں یا نہ کریں ان کے لیے تام جھام اور چھتر کا جانا ضروری تھا ورنہ وہ یہ سمجھ سکتی تھیں کہ ان کا استقبال ان کی شان کے مطابق نہیں کیا گیا۔

بیگم بہرام مرزا نواب بیگم کی سگی بڑی بہن تھیں۔ ان کی شادی ایک چھوٹے سے زمیندار گھرانے میں ہوئی، وہ جب بھی آتیں سادے مگر سلیقے کے کپڑوں میں آتیں اور ساتھ صرف ایک معمولی سی خادمہ ہوتی لیکن ان کا موڈ تھا کہ استقبال اور ادب و احترام کی سب شرطیں پوری کی جائیں۔ وہ جب آ کر بیٹھتیں تو بہت ٹھسے سے اور دے کر بیٹھتیں اور اپنی شان کے خلاف ذرا سی بھی بات برداشت نہ کرتیں۔

نواب بیگم کے حکم کے مطابق محل کی لڑکیاں ان کو اتارنے گئیں۔ عفت آرا نے آگے بڑھ کر جھک کر تسلیم عرض

کی اور بہت ادب سے کہا۔

اچھی خالہ اماں حضور خوب ہوا جو آپ آگئیں اس وقت زنانے دیوان خانے میں بڑا معرکہ درپیش ہے لڑکے والوں نے عجب چال چلی ہے جس سے مات کا اندیشہ ہے۔ انھوں نے یہ کیا ہے کہ "طلسم ہوش ربا" کے جھرلے بلا سے نکال کر ایک خوبصورت بلا بھیج دی ہے جو ایک طرف تو ملکہ تاریک شکل کی طرح کسی بے ہوشی کی دوا کا شکار نہیں ہو سکتی اور دوسری طرف صورت میں ملکۂ بہار ہے اور سیرت میں الف لیلہ والی بولتی چڑیا بھی اچھلتا پانی بھی اور گاتا درخت بھی بس یہ سمجھ لیجیے کہ برات نہیں آئی وہ آگئی۔ ابھی تک تو وہی حضور اماں بیگم پر چلائے چلی جا رہی ہے اب ذرا آپ چل کر اس موئی کی کاٹ کیجیے، اماں حضور نے کہا ہے کہ فوراً آجائیے آپ کے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔"

عفت آرا کا لہجہ، طرز ادا اور گفتگو اور ہاتھوں کی حرکتیں کچھ ایسی تھیں کہ سماں چھا گیا، ایسا لگتا تھا کہ گویا میدان جنگ میں ہار ہونے ہی والی تھی کہ خدا نے بیگم بہرام مرزا کو بھیج دیا اور اب تو جیت یقینی ہے، بس ان کے جانے کی کسر ہے۔

یہ طرز گفتگو اور زبان سن کر بیگم بہرام مرزا نے عفت آرا کی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا، ماشاء اللہ کیسی پیاری سی بیٹی ہے یہ! یہ گنگا جمنا سے دھلی ہوئی اور کوثر سے پاک کی ہوئی زبان، یہ شہد سے زیادہ میٹھا لہجہ اور یہ تہذیب اللہم زد فزد۔

مسز کامران جو پیچھے کھڑی تھیں انھوں نے کہا۔

"ہوں"

اس ننھی منی سی ہوں میں کچھ ایسی جلن اور کڑھن تھی کہ بیگم بہرام مرزا کھٹک گئیں۔

کیا بات ہے بہن، لڑکیوں سے کوئی شکایت کی بات سرزد ہو گئی ہو تو ضرور بتاؤ، اس بہانے اپنی لڑکیوں کی اصلاح ہو جائے گی۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ یہ لڑکیاں میری بچیاں ہیں۔ ان سے مجھے بھلا کیا شکایت ہوگی۔ جاؤ روزی ان میں جا کر کھیلو"

روزی نے تلملا کر کہا۔

"ان لوگوں میں؟ میں تو کچھ ہو جائے ان لوگوں کے ساتھ نہیں کھیلوں گی"

"کیوں بیٹی۔ کیا ان لوگوں سے لڑائی ہو گئی؟"

"بتلا دوں ممی؟ سب کے سامنے؟"

بیگم بہرام مرزا۔ بیٹیوں، تم جاؤ۔ میں ذرا اس معاملے کی تحقیقات کروں گی۔"
کہاریاں جو تام جھام لیے اور خواص جو چھتر لیے کھڑی تھی۔ بیگم بہرام مرزا نے ان کو بھی رخصت کردیا اور خود مسز کامران
اور روزی کو لیے کر صحن کے درختوں کے سائے میں حوض کے کنارے پڑے ہوئے سنگ مرمر کے ایک چبوترے پر ایک پاؤں
رکھ کر کھڑی ہوگئیں۔ بیگم کے کپڑے تو سادے تھے لیکن ان کے پاؤں میں سونے کی کام والی پشاوری گرگابی تھی جو ابھی
لکھنؤ میں کسی دکان پر بکتی نہیں تھی صرف پشاور سے آنے والے تحفے کے طور پر پیش کیا کرتے تھے یا پھر کابل سے آنے والے
درسود کا کام کرنے والے بغلیے لاتے تھے جو بہت ہی مہنگے داموں میں بیچتے تھے۔

" ہاں بیٹی کیا بات ہے؟"
بیگم بہرام مرزا کو محل کے چھوٹے موٹے مقدمے طے کرنے میں بڑا لطف آتا تھا کیوں کہ اس طرح ان کو یہ جتانے
کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ نواب بیگم کی بڑی بہن ہیں اور اس رشتہ سے محل پر ان کا بھی حق ہے۔
ادھر بیگم بہرام مرزا نے عدالت جمائی ادھر محل کی لڑکیوں نے صدر دالان میں جاکر شمشاد کو پکار کر کہا۔
" کچھ خبر ہے حضور بیگم بہرام مرزا صاحبہ ادھر تشریف لا رہی ہیں۔"
ان کا نام تو لاحول تھا شمشاد کے لیے، وہ سارا گانا ناچنا بھول گئی، محفل میں بھی بدمزگی پھیل گئی اور لوگ پہلو
بدلنے لگے اور اٹھنے کے ارادے کرنے لگے۔
اتنے میں عفت آرا آگئی اور اس نے عورتوں سے کہا۔
" بغل کے دالان کے پیچھے کا ہال بالکل خالی پڑا ہے۔ آپ لوگ کیوں نہ وہاں جاکر محفل جمالیں وہاں بیگم
بہرام مرزا جانے سے رہیں۔
" ہاں ہاں چلو ادھر ہی چلو۔"
ذرا دیر میں صدر دالان خالی ہوگیا، اب لڑکیاں وہاں اکٹھا ہوگئیں اور اس بات کا انتظار کرنے لگیں
کہ بیگم بہرام مرزا دیوان خانے کی طرف جائیں تو پھر یہاں کا کام شروع ہو۔
بیگم بہرام مرزا نے خواص کو نواب بیگم کے پاس بھیج کر کہلوا دیا کہ "میں ابھی آتی ہوں" اور روزی سے پھر آ
سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے آخر بیگم کامران نے کہا۔
" بتاؤ نا روزی۔"
روزی: " محل کی لڑکیوں میں ذرا بھی ایٹی کیٹ نہیں ہے۔ جب مجھے دیکھتی ہیں تو آپس میں کھسر پھسر
کرنے لگتی ہیں، ابھی برسوں ہیں ان لوگوں میں جاکر ذرا ہی دیر کے لیے بیٹھ گئی تھی، بس مجھے دیکھتے ہی آپس میں
سب کھسر پھسر کرنے لگیں، پھر ایک نے پکار کر کہا " یہ غلط بابا ہے" یہ کہہ کر وہ اور اس کے ساتھ سب مل کر کھل کھل

کرنے لگیں۔ ڈیم فول "

بیگم بہرام مرزا۔ لڑکیوں نے ایسا کیا تو بہت برا کیا۔ میں ان سب کی اچھی خبر لوں گی۔ لیکن یہ " غلط بابا کیا ہوتا ہے ؟"

بیگم کامران نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"غلط بابا۔ یعنی غلط سمجھ "

"ہماری لڑکیاں اور ایسی زبان بولیں!! یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ لڑکیاں نادانی سے کسی کے ساتھ نامناسب برتاؤ کر گزریں لیکن بات سمجھ میں نہیں آسکتی ہے کہ وہ اور ایسی زبان بولیں "

روزی " انھوں نے کہا تھا، بالکل یہی کہا تھا، لیکن بہت اٹھلاکر کہا تھا" غولط بوا با "

روزی نے بے حد جل کر مشک کر آخر فانے دونوں لفظ کہے۔

" میں لڑکیوں سے ضرور پوچھوں گی یہ بھی پوچھوں گی کہ یہ حرکت کیا تھی اور یہ بھی کہ تم زبان کون سی بولنے لگی ہو"

ادھر بیگم مرزا کامران اور روزی کو لے کر زنانے دیوان خانے کی طرف گئیں اور ادھر صدر دالان میں ڈھولکیہ کا پرا جم گیا اور ڈھولک پر تھاپ پڑی اور تالی پر تالیاں بجنے لگیں۔ پھر عفت نے آواز اٹھائی اور سب نے آواز ملائی اور سہرا گایا جانے لگا "جب مجھ پر یا سہرا " آیا تو لڑکیوں نے ایک دوبارہ یہ بھی گا دیا " مجھ پر آیا تیرا " وزن کی کمی بیشی کو تالیوں سے دبا دیا گیا۔

ادھر گانا ختم ہوا اور ادھر نواب بیگم کا پیام آیا کہ صدر دالان میں لڑکے کیوں ہیں، ان کے ہونے سے مہمان بیگموں کی بے پردگی ہو رہی ہے، اب شادی کے ختم تک لڑکے محل کے نیچے حصے میں نہ آئیں۔

سب لڑکوں کو سہرا گانے کے بعد کا مزا لیے بغیر رخصت ہو جانا پڑا۔

(۵)

اس دن رات کو شوکت مردانے سے آرہا تھا اور ایک راہداری سے گزر کر نیچے کی طرف جا رہا تھا ایک جگہ اندھیرا تھا وہاں سے گزرنے لگا تو اسے ایک چاپ کی آواز سنائی دی۔

" چاندنی "

واقعہ یہ تھا کہ محل کی محفلوں میں شرکت اور اس میں کامیابی نے شوکت کی جھجک ختم کر دی تھی اور اس کی ساتھ ہی ہمت بہت بڑھا دی تھی، اس کی آواز میں اس وقت کچھ خود اعتمادی تھی۔

" کون نواب شوکت بھائی ؟"

" ہاں میں ہوں "

نام تو میرا نادرہ ہے چاندنی تو نہیں۔

نادرہ جب ذرا بھی مسکراتی تو عجب شگفتگی اس کے چہرے پر آجاتی کیوں کہ اس کی آنکھیں ہنسنے میں ہمیشہ ہونٹوں سے آگے نکل جاتی تھیں اور اس وقت تو شوکت کو اندھیرے میں نادرہ کا مسکراتا ہوا مکھڑا کچھ ایسا چمکتا ہوا نظر آیا اور اس نے دل میں کہا ہو تو تم چاندنی ہی۔"

"اگر یقین ہوتا کہ آپ ہیں تو نادرہ کہہ کر پکارتا۔"

نادرہ نے محسوس کیا کہ شوکت نے چاندنی کا لفظ کسی مصلحت سے استعمال کیا تھا۔

"سمجھ گئی آپ نے اچھا کیا۔ شکریہ"

دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں، رخصت ہونا ابھی نہیں چاہتے تھے۔

شوکت "یہ بتلائیے کہ آپ کو یہاں کی سب باتیں اچھی لگیں؟"

"اچھی تو لگیں، کوئی خاص بات؟"

"مجھے ایک بات ذرا کھٹکی وہ یہ کہ محل کی لڑکیاں چاہتی ہیں کہ سب لڑکیاں انھیں کی ایسی زبان بولیں"۔

"ہاں (ذرا گرم ہوکر) وہ تو میں سمجھی ہی نہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے جب محل کی لڑکیاں کسی بات پر پھر پھیر کرکے ہنس دیتیں تو میں سوچنے لگتی تھی کہ یہ کس بات کی ہنسی اڑائی جا رہی ہے مجھے تو یہ سب باتیں اس وقت معلوم ہوئیں جب روزی نے شکایت کی کہ اسے "غلط بابا" کہا گیا اور پھر محل کی سب لڑکیوں کی بیگم بہرام مرزا کے سامنے پیشی ہوئی اور پھر یہ کھلا کہ فقرہ دراصل میرے اوپر کہا گیا تھا۔ سنا ہے کہ اس پر نواب بیگم لڑکیوں پر ناراض ہوئیں۔ اس پر عفت آرا نے سب کے ساتھ آکر مجھ سے معافی مانگی جب پورا قصہ معلوم ہوا تو مجھے بڑا غصہ آیا اور جی چاہا کہ ایک ایک کی خبر لے ڈالوں لیکن پھر مجھے ایسا لگا کہ ہیں سب لڑکیاں واقعی بہت شرمندہ پھر میں ہنس پڑی تب تو عفت بہن نے مجھ سے دوپٹہ بدلا اور میری بہن بن گئیں۔"

"اور غلط بابا والی کا کیا ہوا یہ بھی آپ کو معلوم ہے؟"

"بیگم بہرام مرزا نے مجھے بلاکر پوچھا تھا کہ واقعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے اغلاق الباب والی بات بتلا دی تھی" یہ کہہ کر نادرہ ہنسنے لگی۔

شوکت نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی میں مجیروں کی ایسی کھنک بھی ہے۔ نادرہ ذرا گدیلے بدن کی تھی اور وہی بھرا بھرا پن اس کے بدن کی ہر لہر اور تبسم کی ہر جھلک میں تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رسیلا پھل ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیب اور ذوق پر مشرق اور مغرب کی چھاپ تھی۔

نادرہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

نادرہ :۔ روزی بندی کو اب بھی یقین ہے کہ اسے غلط بابا کہا گیا تھا۔ وہ بھی میرے پاس آئی تھی اور یہ کہہ کر آئی تھی کہ جیسے کہ مجھے بھی محل کی لڑکیوں نے بنایا ہے اس لیے ہم دونوں دکھی ہیں اور دونوں میں احساس یگانگت پیدا ہو جانا چاہیے۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ میں کیسے مانوں کہ محل میں سب بابا کے معنی الٹے سمجھتے ہیں یعنی یہاں بچے کے بجائے بوڑھے کو بابا کہتے ہیں۔ کہنے لگیں بچپن سے آج تک لوگوں نے مجھے بابا کہا اور اب بھی لوگ میرے چھوٹے بھائی اور بہنوں کو بابا کہتے ہیں۔ تو کیا محل دنیا سے کچھ الگ واقع ہے جو وہاں کی زبان اور ہوگی اور وہ زبان نہ ہوگی جو ملک بھر میں بولی جاتی ہے "

شوکت کو روزی کی باتیں معلوم کر کے دل ہی دل میں بہت خفت ہوئی۔ کیوں کہ اس نے تو روزی کے بارے میں بہت اونچی رائے قائم کی تھی۔

"کیوں شوکت بھائی آپ نے سنا ہے کہ بابا کے معنی بچہ ؟"

"نہیں "

"مگر میں نے سنا ہے میں کانونٹ میں پڑھ چکی ہوں۔ وہاں سب بچہ کو بابا کہتے ہیں لیکن کانونٹ کے باہر میں نے کبھی اس لفظ کو اس معنی میں نہ اپنے خاندان میں سنا اور نہ قصبے میں کہیں اور سنا یہ

"آپ نے کانونٹ میں پڑھا ہے ؟"

"کیوں ؟"

"آپ کے لہجہ میں کچھ اثر نہیں "

"میں روزی تھوڑی ہوں، ابھی پارسال تک روزی میں دونوں ایک ہی کانونٹ میں تھے، میں اس سے سینیر تھی، وہ ڈے اسکالر تھی اور میں بورڈر تھی لیکن وہ روزی بن گئی اور میں نادرہ کی نادرہ رہی۔ بات یہ ہے کہ مجھ پر میرے ابا جان کی تربیت کا اثر ہے۔ پارسال کچھ ایسا ہوا کہ اچانک ابا جان کے خیالات بدل گئے انھوں نے مجھے کانونٹ سے اٹھا کر خود پڑھانا شروع کر دیا۔ بہت دنوں سے پڑھا رہے ہیں اور [illegible] چیزوں کے ساتھ الہلال بھی پڑھاتے ہیں اور اس میں لکھی باتوں کو دیر تک سمجھاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں آزاد کی زبان بولو اور اسی زبان میں سوچو "

یہی میں کہتا تھا کہ آپ کی زبان محل والیوں کی زبان سے بلکہ ہم سب لوگوں کی زبان سے [illegible] ہے۔ مگر ایک بات بتائیے۔ ہمارے لکھنؤ کی زبان میں کیا کوئی کسر ہے جو الہلال کی بوجھل زبان بولی جائے

نادرہ :۔ حسرت موہانی کا شمار بھی تو لکھنؤ کے شاعروں میں ہوتا ہے، دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر	نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

جب ابا جان کے سامنے کوئی ایسی بات کہتا ہے جیسی آپ نے کہی ہے تو وہ یہ شعر پڑھ دیتے ہیں۔

کیف کچھ باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں

کیا ہے دوسرا مصرع شوکت بھائی۔ دیکھیے یاد نہیں آرہا ہے ــــ ہاں یاد آگیا

کیف کچھ باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ ستانہ کر

اتفاق سے شوکت کو اس غزل کے کئی شعر یاد تھے اور وہ اس شعر کا دوسرا مصرع پڑھنے ہی والا تھا، لیکن اس نے پکڑ لیا کہ نادرہ نے عمداً اس شعر کا دوسرا مصرع

ہر جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

پڑھنا پسند نہیں کیا اور اس کی جگہ دوسرے شعر کا دوسرا مصرع پڑھ دیا۔ شوکت نے کہا۔

نادرہ بیگم آپ نے بہت اچھا شعر پڑھا۔

شکریہ۔ مگر آپ نے بیت بازی میں جتنے شعر دیے سب آپ کے اونچے ذوق کی شہادت دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ آکر مجھے محسوس ہوا کہ حسن ذوق اور تہذیب قدیم کسے کہتے ہیں۔ یاد رہیں گی یہاں کی شادی کی محفلیں!

اب کہاں یہ صحبتیں اور کہاں (نیچی آواز سے) آپ اور ہم۔

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ "ارض و سما کی ان بیکراں وسعتوں میں وہ شے بھی جو بظاہر ناممکن ہو امکان کا جامہ پہن کر رونما ہو سکتی ہے۔"

چند منٹ کی خاموشی کے بعد جب نادرہ رخصت ہونے لگی تو اس نے شوکت کو سلام کرکے آہستہ سے کہا۔

"آپ کا چاندنی بچھانا یاد رہے گا۔"

جب نادرہ چلی گئی تو شوکت کو راہداری قید خانہ معلوم ہونے لگی اور وہ بھاگ کر اس سے باہر نکل آیا۔

شوکت کے کانوں میں نادرہ کا آخری فقرہ مدتوں گونجتا رہا اور وہ سوچتا رہا کہ اس فقرہ کو سپاٹ لہجے میں کہا گیا تھا یا اس میں کچھ کسک بھی تھی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ایڈیٹر: پروفیسر آل احمد سرور

(۱) یہ اردو زبان کی تحریک کا ترجمان اور اردو ادب کا آئینہ دار ہے۔

(۲) اس میں صحافت کی چاشنی بھی ہے اور ادب کی لذت بھی۔

(۳) اس میں علمی و ادبی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔

(۴) یہ اردو میں اپنی نوعیت کا واحد اخبار ہے۔

سالانہ قیمت چار روپیہ

قیمت فی پرچہ ۱۲ پیسے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

کوثر چاند پوری

ابر کا ٹکڑا

یوکیمیا ۔
یوکیمیا ۔
نہیں ۔
یوکیمیا نہیں ہو سکتا ۔
کبھی نہیں ہو سکتا ۔

پروفیسر کپور کی پیشانی پر موٹی موٹی سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں، وہ میز پر جھکا نہایت غور سے خون کی ٹیسٹ رپورٹ دیکھ رہا تھا ۔ اسے دیکھتے دیکھتے وہ طیش میں آگیا اور بالکل مجنونانہ انداز میں آپ ہی آپ بولنا شروع کر دیا ۔

یوکیمیا ۔
یوکیمیا ۔
نہیں
[illegible]وکیمیا نہیں ہو سکتا
[illegible]ی نہیں ہو سکتا ۔

[illegible] کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور دیر تک یہی الفاظ دہراتا رہا ۔ اس کی رائے میں پیتھالوجسٹ نے یہ رپورٹ [illegible]ت بڑی غلطی کی تھی، اس نے سائنس کا رخ ایک غلط سمت کو موڑ دیا تھا، اور ایک ایسے پودے کو [illegible]ی کوشش کی تھی جو ابھی اچھی طرح ابھرا بھی نہ تھا ۔ پروفیسر کپور پہلے آہستہ پھر زور سے بولنے لگا ۔ [illegible]تا جیسے اس کے جسم میں کسی جگہ شدت کا درد ہو رہا ہے اور وہ اسے برداشت نہیں کر پا رہا، ادھیڑ [illegible]ا پروفیسر میڈیکل کالج میں پیتھالوجی پڑھاتا تھا، وہ اپنے شاگردوں سے باپ جیسی محبت کرتا تھا ۔

کالج میں صرف وہی ایک شخص تھا جو پاپا کے نام سے مشہور تھا، اس وقت اس کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی، کبھی رخساروں پر شفق سی کھل جاتی اور آنکھیں کنول کے پھولوں کی مانند شاداب ہو جاتیں، کبھی گالوں پر گیندے کی سی زردی چھا جاتی جیسے رگوں کا سارا خون نچڑ گیا ہو، اس لمحہ آنکھوں سے بھی بسنت رت جھانکنے لگتی، وہ اپنے ذہین اور ہونہار طالب علم راج کی بلڈ رپورٹ دیکھ رہا تھا، راج نہایت خوبصورت، کھلاڑی اور اسمارٹ قسم کا سٹوڈنٹ تھا شروع ہی سے اپنے کلاس میں فرسٹ آتا تھا اسے فرسٹ ایر ہی سے اسکالر شپ ملتا تھا پانچویں سال میں قدم رکھتے ہی وہ اچانک بیمار ہو گیا، اور سارے کالج کو جیسے 'جانڈس' ہو گیا ہو، جونیر اور سینیر سب ہی افسردہ ہو گئے، سب کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی سرخی کم ہو گئی۔ راج کو وارڈ میں داخل کر دیا گیا، طرح طرح کے ٹیسٹ ہونے لگے، بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ بڑی حوصلہ شکن تھی لیکن پروفیسر کپور نہ جانے کیوں اسے صحیح ماننے پر تیار نہ تھا، وہ اسے چاک کر ڈالنا چاہتا تھا اور اس ہاتھ کو قلم کر لینا چاہتا تھا جس نے اسے مکمل کیا تھا، اسے یقین تھا کہ راج مرنے کی چیز نہیں، وہ مر نہیں سکتا، بلڈ رپورٹ اس کے اعتماد کو جھٹلا رہی تھی، وہ بتا رہی تھی کہ سفید ذرات کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے، سرخ ذرات کا تناسب قطعی غیر متوازن ہو گیا ہے، وہ جانتا تھا کہ سفید ذرات کی تعداد دس فی صدی تک پہنچ جاتی ہے تو بیمار کسی مہلک بیماری کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے، لیکن ... لیکن راج، اس نے پیشانی کی سلوٹوں کو اور زیادہ گہرا کرتے ہوئے سوچا وہ مر نہیں سکتا، ذہانت، مسرت، امنگ اور ابھرتے ہوئے شباب کی اس گرمی تک موت کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ راج مرے گا نہیں وہ زندہ رہے گا اور زندگی کی تمام کامرانیوں سے لطف اٹھانے کی غرض سے پیدا ہوا ہے۔ میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ یہ سائنس کا زمانہ ہے، آدمی نے زمین سے چاند تک زندگی کی کرنیں بکھیر دی ہیں اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر زور سے کہا سائنس عظیم ہے، امر ہے، اس وقت اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا، رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے اور لالہ کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ پروفیسر کپور کوئی معمولی ڈاکٹر نہ تھا، اس نے معدہ اور آنتوں کے زخموں پر ایک کامیاب مقالہ لکھ کر ایم۔ ڈی کی ڈگری لی تھی، وہ پیتھالوجی پڑھا رہا تھا، اس سے چند کالجوں میں میڈیسن کا استاد بھی رہ چکا تھا۔ اب وہ ذرا سنجیدہ ہو کر اپنی سیٹ پر جم گیا تھا اور رپورٹ بار بار دیکھنے لگا تھا۔ وہ دیر تک میز پر جھکا رہا، پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی، اس کی آواز سنتے ہی چپراسی اندر آیا اور چپ چاپ پروفیسر کپور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سفید ریشمی بالوں کی لٹیں پروفیسر کے چہرے پر جھوم رہی تھیں شانت سمندر کی طرح خاموش تھیں۔

رگھبیر! اس نے چپراسی کو دیکھتے ہوئے کہا جو سفید یونیفارم پہنے یوں تنا کھڑا تھا جیسے کسی نے تختۂ سیاہ پر موٹے حروف میں لیوکیمیا (LEUKAMIA) لکھ دیا ہو، اسے رگھبیر پر ایک دم غصہ ہوا جیسے وہ ابھی ابھی سفید خون کے سمندر میں نہا کر آ رہا ہو۔

رگھبیر! ــــ اس نے تند لہجہ میں پکارا۔

ــــ سر!

تمھارے جی ڈیپارٹمنٹ میں کوئی ٹیکنیشین موجود ہے۔

ابھی ڈسٹنگ ہو رہی ہے۔

یہ تو سب کچھ ٹھیک کر دیا جائے، میں ایک مریض کا خون لے کر ابھی آرہا ہوں۔

یہ کہہ کر وہ ہسپتال کے اس وارڈ کی طرف چلنے لگا جو میڈیکل اسٹوڈنٹس کے لیے مخصوص تھا، وہ پردہ اٹھا کر دبے پاؤں اندر چلا گیا، راج سفید چادر اوڑھے ایک پلنگ پر خاموش پڑا تھا، اس کے گال زرد تھے، آنکھوں میں چمک باقی نہ رہی تھی۔ پروفیسر کپور نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے نرم و گرم ہاتھ میں لے کر دبایا اور مسکراتے ہوئے دھیمی میٹھی آواز میں کہا۔

مائی ڈیر بائے، تم اچھے ہو رہے ہو، آج میں تمھارا خون ٹیسٹ کر رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم جلدی سے وارڈ چھوڑ دو۔ اور جب اس کی زبان سے یہ جملہ ادا ہو رہا تھا اس کے سینے میں سچ مچ ایک شفیق باپ کا دل دھڑک رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا راج کے والدین اور بھائی بہنوں کو انتظار ہوگا کہ ان کا چہیتا اور لاڈلا راج اسی سال کے آخر تک ڈاکٹر بن جائے گا اور جب وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے گھر جائے گا تو... پروفیسر کا خون جمنے لگا، ہاتھ پیروں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی، راج کی بڑی بڑی آنکھوں میں پانی بھر آیا، اس لیے نہیں کہ وہ مایوسی کی اندھیری میں گھر گیا ہے، اس لیے بھی نہیں کہ ماں باپ بہت دور ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ پروفیسر کپور کی وہ ہمیشہ عزت کرتا رہا تھا لیکن اس وقت تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہو سکا تھا، اسے مکمل آرام کی ہدایت کی گئی تھی، اس نے بچوں کی سی ضد کے ساتھ پوچھا۔

"فادر، آپ کی ڈائگنوسس کیا ہے؟"

"میری ڈائگنوسس؟" ــــ پروفیسر کپور نے بڑی مشکل سے چیخ کو سینے میں روکتے ہوئے کہا۔

میری ڈائگنوسس یہ ہے راج کہ تم اچھے ہو رہے ہو۔

"میں پوچھتا ہوں مجھے بیماری کیا تھی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ تم اچھے تھے۔ اچھے ہو"

"پاپا! ــــ اس نے چیخ کر کہا، فریب نہ دیجیے میں بھی ڈاکٹر ہوں"

"اور یہ نہ بھولو مائی ڈیر بائے کہ میں تمھارا استاد ہوں"

راج ہنس کر چپ ہو گیا۔ راج اور اس کے والدین کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وہ کیا بیمار رہے، اس کی تمام

رپورٹیں راز میں رکھی گئی تھیں، کسی ساتھی کو بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اسے لیوکیمیا ہوگیا ہے۔ اس کے باوجود سب اپنی اپنی جگہ سمجھ بیٹھے کہ اصل بات کیا ہے، اور راج زندگی کے کن مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس کے دل میں ہمیشہ یہ آرزو مچلتی رہی تھی کہ وہ پروفیسر کپور جیسا ڈاکٹر بنے، اسی کی طرح شہرت اور مقبولیت حاصل کرے، درحقیقت کپور سے گہری عقیدت تھی، وہ اس کے طرزِ تعلیم اور طریقِ گفتگو کو بے حد پسند کرتا تھا۔

"سر!" راج پست آواز میں بولا۔ "آپ جتنے اچھے پیتھالوجسٹ ہیں اتنے ہی اچھے فزیشن بھی ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ میرے خون کا ٹیسٹ کریں گے تو ضرور کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائیں گے جو میری تندرستی کا ضامن ہوگا۔"

"ضرور! میں ایسے ہی نتیجہ کی تلاش میں ہوں، میں سچائی کو ڈھونڈھ رہا ہوں، سائنس اسی کی تلاش کا نام ہے۔"

پروفیسر کپور نے ایک ٹیوب میں راج کا خون لیا اور پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ میں چلا گیا، وہاں مائکرو سکوپ رکھا تھا اس کے ادھر ادھر میز پر اور بہت سی چیزیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پروفیسر چاہتا تھا کہ پہلے ٹوٹل اور ڈفرینشل کاؤنٹ کرے، ممکن ہے کہ سرخ اور سفید ذرات کا تناسب وہی نہیں ہو دو اور ایک کا ہو، اسی امید کے ساتھ اس نے گلاس سلائڈ پر خون رکھا اور فائن ایڈجسٹر کی مدد سے اس کو اونچا نیچا کرکے دیر تک دیکھتا رہا، اس کا رنگ جلد جلد تبدیل ہو رہا تھا، پیشانی کی سلوٹیں کبھی گہری ہو جاتیں اور کبھی آپ ہی آپ مٹ جاتیں۔ وہ سنہری عینک کے چمکیلے آئینوں سے نہایت انہماک کے ساتھ خون کے مختلف اجزا کی جانچ کرتا رہا اور جب وہ پیتھالوجی ڈپارٹمنٹ سے نکلا تو باہر بہت سے اسٹوڈنٹ سفید ایپرن پہنے گلے میں جرمنی اسٹیتھوسکوپ ڈالے کھڑے تھے انھوں نے ایک زبان ہوکر پوچھا۔

"پاپا! آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔"

پروفیسر کپور نے نہایت پروقار انداز سے ان کو دیکھا۔ ایک نوجوان نے راستہ روک کر کہا۔

"ٹیسٹ کا رزلٹ کیا رہا؟"

پروفیسر کپور خاموش رہا، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے وہ ڈیمانسٹریشن دینے سے بچ رہا ہے، اور چاہتا ہے کہ لڑکے سوالات کا سلسلہ بند کر دیں، اس کے راستے سے ہٹ جائیں، اس کی عینک کے شفاف آئینوں پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔ وہ سیدھا آفس میں چلا گیا اور دراز سے کاغذات نکال کر لکھنے میں محو ہوگیا، بلڈ رپورٹ کا مطبوعہ فارم اس کے سامنے میز پر پڑا تھا، اس نے فارم پر کالج کا خوبصورت سیر دیٹ لگا اور نہایت تیز گامی کے ساتھ دفتر سے نکل گیا، وہ پھر ایک بار راج کے وارڈ میں گیا، وہ اسی طرح خاموش پڑا تھا، اس نے چہرہ سفید چادر سے ڈھانک لیا تھا، اس وقت وہ پلنگ پر لیٹا ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک کا صفحہ کرد

پہاڑ کی چوٹی پر آ نکا کھڑا ہو، ہوائیں چل رہی ہوں اور ابر کے اس سفید ٹکڑے کو اڑا کر آسمان کی وسیع و عریض فضاؤں میں لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہوں۔

"کیا آپ ٹیسٹ کا رزلٹ بتانے آئے ہیں ؟"

"ہاں ——— نہیں"

"لگتا ہے جیسے آپ ان دونوں الفاظ کے درمیان لٹک رہے ہے۔ ایک ہاتھ ابر کے گالوں کی جانب بڑھ رہا ہو دوسرا ساون کی اندھیری میں سچائی کے جگنو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

پروفیسر کپور نے جواب نہیں دیا وہ بڑی مشکل سے صرف مسکرا سکا، اور کچھ کہے بغیر آفس کی کرسی پر جا بیٹھا اس نے ڈرتے ڈرتے فارم کے اوپر رکھا ہوا پیپر ویٹ الگ کیا، اس کے اندر چمکتا ہوا پھول مرجھا سا گیا تھا، پروفیسر کپور نے جیب سے پارکر نکالا اور فارم کی خانہ پری کرنے لگا۔ اب تک اس نے ہزاروں رپوٹیں لکھی تھیں کبھی اس کا ہاتھ نہیں کانپا تھا، اس وقت داہنا ہاتھ اس بری طرح لرز رہا تھا کہ لکھا نہیں جا رہا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے راج کا چہرہ گھوم رہا تھا، زمین سے آسمان تک اس کے گالوں کی زردی چھائی نظر آ رہی تھی، راج کے ان لبوں پہ تبسم نہ تھا جس کو کالج کی زبان میں غزل کے مصرعوں سے تعبیر کیا جاتا تھا اس وقت وہ مرثیے کے بند نظر آ رہے تھے، ان میں واسوخت کے اشعار کا سا سوز تھا پروفیسر کپور جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہے ——— راج کی تلی بڑھ گئی ہے، اس کی ہڈیوں کا گودا خراب ہو گیا ہے اسی بنا پر سفید ذرات بہت زیادہ ہو گئے ہیں، سرخی اور تازگی اب اس کے چہرے پر نہ آئے گی، تبسم کی لہریں لبوں پر رقص کرنا چھوڑ دیں گی اور جب اس نے رپورٹ میں سفید ذرات کی وہ تعداد لکھی جو قطعی مہلک تھی تو اس کا ہاتھ زور سے کانپنے لگا، اب لگ رہا تھا جیسے ہاتھ کو بخار آ گیا ہو، بڑی دیر میں رپورٹ مکمل ہو سکی۔ چند لمحہ ٹھہر کر پروفیسر کپور نے اس پر دستخط کیے، تاریخ لکھتے لکھتے وہ ٹھہر گیا، وہ سوچنے لگا کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی، لیکن ایسے کہنہ مشق اور تجربہ کار ریچالوجسٹ سے لغزش نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں پر آب ہو گئیں حالانکہ وہ رونے کے لیے بالکل تیار نہ تھا، اس نے رومال سے آنسو پونچھ لیے اور دل مضبوط کر کے سائنس کی شکست کے میثاق پر تاریخ لکھ دی۔ پھر وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا اور قلم کو زور سے فرش پر پٹک دیا ——— ابر کا ایک ٹکڑا نیلے آسمان کے نیچے تیزی سے خلا میں اڑتا چلا گیا۔

شرائطِ رکنیت ادبی حلقہ

(۱) حلقے کی رکنیت کی فیس سالانہ تینتیس ۳۳ روپے یک مشت یا گیارہ گیارہ روپے کی تین سہ ماہی قسطوں میں۔

(۲) حلقہ ممبروں کو ہر سال پچیس روپے کی کتابیں اور انجمن کا ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" قیمتی چار روپے اور سہ ماہی رسالہ "اردو ادب" قیمتی بارہ روپے کُل اکتالیس ۴۱ روپے کی مطبوعات پیش کرے گا۔

(۳) ارکان کو بقدر پچیس ۲۵ روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

(۴) تینتیس ۳۳ روپے کے عوض اکتالیس ۴۱ روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو ان پر پچیس فی صدی کمیشن دیا جائے گا۔

محصول ڈاک بہ ذمۂ خریدار ہوگا

مزید تفصیلات کے لیے دفتر سے خط و کتابت کیجیے

ادبی حلقہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

رام لعل

فرضی آگ کی لَو

آج بنٹی کو گھر میں پھر مار پڑی ہے۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔ گال تمتمانے لگے ہیں اور اغدار بھی ہو گئے ہیں آنسوؤں سے۔ کسی نے بھی اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زور زور سے رویا ہے اسے الٹا ڈانٹا، پھٹکارا ہی گیا ہے پہلے سے بھی زیادہ اور وہ ایک عجیب سے ارادے کے ساتھ بڑبڑاتا ہوا چھت پہ پلا آیا ہے۔

چھت پہ دھوپ بہت تیز ہے، اتنی تیز کہ وہ پوری طرح آنکھیں بھی نہیں کھول سکتا۔ ہر چیز چمک رہی ہے۔ بل سی رہی ہے۔ دور دور تک کی چھتیں اور کوٹھے اور چمنیاں اور ریڈیو کے بانسوں پہ لگے ایریئل۔

وہ ننھے ننھے قدموں سے تپتی ہوئی چھت پہ چلتے چلتے کاٹھ کے جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہے۔ ایک پاؤں کے اوپر دوسرا وں رکھ کر پھر جلدی سے دوسرے پاؤں کے اوپر پہلا پاؤں رکھ لیا ہے۔ چھت کی تپش اس سے برداشت نہیں ہو رہی ہے س کے تلوے جل رہے ہیں اور وہ دونوں پاؤں اٹھا کر کاٹھ کے جنگلے پہ بدن کا پورا بوجھ ڈال کر ترازو سا ہو گیا ہے ب اسی طرح جھولتا ہوا ہی نیچے دیکھ رہا ہے۔ نیچے چھت ہی کی طرح دھوپ میں جلتا ہوا آنگن ہے۔ کمروں کے آگے ہرے ٹھنڈے سائے سے لبالب بھرا ہوا برآمدہ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کمرے میں اس کے ممی، ڈیڈی کے ہقہے گونج رہے تھے۔ وہ ان قہقہوں کی آواز سن کر ہی ڈرائینگ روم چھوڑ کر کمرے کے اندر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلا ہی نا۔ لیکن اندر اندھیرا تھا۔ پہلے پہلے ایسا ہی لگا۔ پھر اسے کچھ کچھ دکھائی دینے لگا۔ اس کے ڈیڈی اس کی ممی کی گردن پہ دونوں ہاتھ رکھے اس کی جان لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ خوف زدہ سا ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی یک بار اس نے ایسا منظر دیکھا تھا۔ تب بھی اس کی یہی ممی تھی۔ اور یہی ڈیڈی تھے۔ اس کی نانی کہتی تھی تیرے ڈیڈی نے ہی تیری پہلی ممی کی جان لی ہے۔ بنٹی ہمیشہ ڈرتا رہتا ایک روز یہ ممی بھی مر جائے گی۔ لیکن ممی کو ڈیڈی سے رکبھی نہیں لگتا؟ وہ اس کی گردن پہ ہاتھ رکھتے ہیں تو ممی خوش کیوں ہو اٹھتی ہے؟ خوشی سے ڈیڈی کو پیار کیوں

کرنے لگتی ہے؟ آج بھی اس نے ڈیڈی کو ممی کی جان لیتے ہوئے دیکھا تو رونے لگا۔ ممی اور ڈیڈی دونوں نے ہی اسے ڈانٹ دیا۔ اس کا دل اس لیے بھی دکھا کہ اُسے ممی نے بھی ڈانٹا جس کی جان لی جاتی دیکھ کر وہ رو رہا تھا۔ اس نے باہر آنے سے انکار کیا تو اسے ڈیڈی نے تھپڑ بھی مار دیا۔

کاٹھ کے جنگلے کا ہرا روغن کہیں کہیں پر پگھلا ہوا ہے۔ گاڑھے گاڑھے روغن کی ننھی ننھی گیں مروڑ یاں اس نے مٹھی میں جمع کر لی ہیں۔ انھیں وہ دو انگلیوں کے درمیان مسل مسل کر کبھی چپٹا کر لیتا ہے کبھی گول اور سیلوں کی مانند۔

نیچے اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کچھ سنائی بھی نہیں دیتا ہے۔ اس کے ڈیڈی اب یقینی طور پر ممی کی جان لے چکے ہیں۔ ابھی وہ جھوٹ موٹ روتے ہوئے باہر آ جائیں گے۔ لوگوں کو جمع کر لیں گے۔

وہ ڈیڈی کی شکل نہ دیکھنے کی خاطر جلدی جلدی پڑوس کی ملی ہوئی دیوار تک چلا گیا ہے۔ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دیوار کا سایہ بنٹی کی ہی طرح ننھا منا سا ہے۔ وہ اسی سائے میں پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا کے سر اور چہرے اور آدھے جسم پر دھوپ نہیں پڑتی، صرف ٹانگوں اور پاؤں پر ہی پڑتی ہے۔

وہ کتنی دیر سے منھ پھلائے ہوئے بیٹھا ہے۔ اس کی سسکیاں رک گئی ہیں۔ اس کے آنسو جھک آئے ہیں۔ اس نے طے کر لیا ہے اب چھت سے نیچے نہیں اترے گا۔ نہ کھانا کھائے گا نہ اسکول جائے گا جب تک لوگ اس کے ڈیڈی کو پکڑ کر نہیں لے جاتے۔

اُسے اچانک یاد ہو آیا ہے، اس کے بیگ میں اودبلاؤ کا فیتہ ہے (اودبلاؤ ایک لڑکے کا نام ہے) فیتہ لوٹا دینا بہت ضروری ہے۔ اس نے اودبلاؤ سے وعدہ کیا تھا وہ اس کا فیتہ کل ضرور لوٹا دے گا۔ کل اسکول نہیں جائے گا تو اودبلاؤ اپنا فیتہ لے جانے اس کے گھر چلا آئے گا لیکن وہ یہ سوچ کر مسرور ہوتا ہے کل تک وہ یہاں اکیلا نہیں بیٹھا رہے گا۔ اودبلاؤ کے آ جانے پر سب کو اس کی یاد آ جائے گی۔

لیکن پھر یہ سوچ کر اس کے آنسو نکل پڑے ہیں کہ کل ممی تو اسے ڈھونڈنے کے لیے [illegible] وہ تو مر چکی ہے۔

"بنٹی! بنٹی —— اے بنٹی!"

اچانک اس کے کانوں میں کسی کے پکارنے کی آواز آئی ہے۔ دیوار کی اس اور سے [illegible] اس نے موری میں سے تاکا ہے۔ وہ کنو کی دبدی ہے (کنو جس کا ایک کان ہے ہی نہیں!) [illegible] ایک روڑے سے نشانہ بھی بنا رہی ہے۔ دیوار کی موریوں میں سے اس کی پیٹھ نظر آتی ہے [illegible] نہ ہلا بلکہ غرا کر پوچھ رہا ہے —— "کیا کہتی ہو دبدی؟"

نارائینی بھاگ کر اس کے پاس آ بیٹھی ہے۔ دیوار کی اسی طرف۔ موری کے ساتھ منہ لگا کر بولتی ہے "پاگل ہوا ہے تا۔ کس لیے جا رہا ہے؟"

وہ اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا ہے۔ نارائینی کے پھولے پھولے سرخ گال ایک موری میں بھرے گئے ہیں۔ اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں مسکرا رہی ہیں جیسے اس کے چہرے پر یہی سب کچھ لکھا ہوا نارائینی کو مل گیا ہو بنٹی ہے۔ "اوہو معلوم ہوتا ہے آج تو نے بڑی مار کھائی ہے! ضرور کوئی شرارت کی ہوگی! کی تھی نا؟"

بنٹی گردن گھمائے اس کے چہرے کو ایک ٹک دیکھے جا رہا ہے۔ اس طرف بھی بہت دھوپ ہے نارائینی کے بال دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ وہ بال سکھانے کے لیے ہی چھت پر آئی ہے۔ وہ مسکرا رہی ہے جانتا ہے اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اس کے کان اینٹھ دے گی۔ وہ ایسا ہی کرتی ہے۔ اس سے کئی سال بڑی ہے نا!

نارائینی نے موری میں ہاتھ ڈال کر اس کا گال تھپتھپا دیا ہے اور کہا ہے۔ "بنٹی میرے تو پاؤں جل رہے ہیں۔ تو ادھر آجانا۔ وہاں چھاؤں میں بیٹھ کر سب پوچھوں گی۔ تجھے آج کس نے مارا ہے۔ چل جا جلدی سے۔"

یہ کہہ کر وہ توے کی طرح تپتی ہوئی چھت پر بھاگتی ہوئی برساتی میں جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں سے پکارنے لگی ہے۔ "آ جا رے۔ جلدی آ نہیں تو ماروں گی۔"

لیکن اس کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے کوئی آواز نہ نکلتی ہے۔ وہ جانتا ہے نارائینی ہی تو کہہ رہی ہے۔

بنٹی بہت دھیرے سے اٹھتا ہے۔ موریوں میں پاؤں پھنسا کر دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔ اور پھر اس پار اتر جاتا ہے۔ وہ بھی نارائینی کی طرح پنجوں کے بل بھاگتا ہوا برساتی میں جا پہنچتا ہے۔ نارائینی اسے بازوؤں میں لے لیتی ہے۔ کہتی ہے۔ "تو تو میرا راجہ بنٹی ہے۔ یہاں بیٹھ تو۔ اب بتا تجھے کس نے مارا؟"

بنٹی کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے ہیں۔ وہ ممی کا گلا گھونٹنے کا واقعہ بتاتا ہے تو نارائینی اس کے گال پر ہلکا سا تھپڑ لگا دیتی ہے۔ "ہش! ایسا نہیں کہتے کبھی! کوئی آدمی اپنی عورت کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارتا۔ وہ تو اسے پیار کرتا ہے۔ پیار کرنے کے لیے اس کے ساتھ بیاہ کرتا ہے۔"

بنٹی کی آنکھوں میں خوف کی جگہ حیرت نے لے لی ہے۔ مکمل حیرت نے۔ وہ نارائینی کو بتا رہا ہے۔ "نارائینی میری پہلی ممی کی جان بھی ڈیڈی نے لی تھی۔"

اس پر نارائینی اسے مورکھ کہتی ہے۔"تیری پہلی ممی تو کینسر سے مری تھی۔اس روگ کا کوئی علاج نہیں تھا۔تیری نانی تو یونہی بکا کرتی ہے۔"

پھر یکایک نارائینی کسی سوچ میں ڈوب گئی ہے۔اس کے بالوں کی ایک لٹ چہرے پر اتر آئی ہے جسے وہ کان کے پیچھے نہیں جماتی ہے بلکہ اسے ہاتھ میں لے کر اس کا ایک ایک بال بکھیر ڈالتی ہے۔پھر بالوں کو گال کے ساتھ چپکائی ہوئی اسے تنبیہ کرنے لگتی ہے ۔۔۔"تو اس طرح اچانک ان کے کمرے کے اندر مت جایا کر بنٹی! وہ جب اندر رہیں تو باہر بیٹھ کر ہی کھیلا کر۔کبھی کبھی بند کمروں میں بلیاں یا بھوت بھی گھس جاتے ہیں جو آدمیوں کی طرح ہنستے اور باتیں کیا کرتے ہیں۔ہوسکتا ہے آج بھی وہی گھسے ہوں۔"

بنٹی کی آنکھیں پھر خوف سے بھر گئی ہیں۔لیکن نارائینی مسکرا رہی ہے۔کہتی ہے "تجھے ٹافی کھلاؤں؟ پانی بھی پیے گا نا! تو یہاں بیٹھ۔خود مجھے بھی بڑی پیاس لگی ہے۔یہیں پر بیٹھنا آتی ہوں ابھی۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے چلی گئی ہے۔بنٹی چارپائی پر الٹی رکھی ہوئی ایک کتاب کو دیکھنے لگا ہے۔اس کتاب میں کوئی تصویر نہیں ہے۔اسے دیکھنے میں اس کا من نہیں لگا۔جلدی سے اسے وہیں پر رکھ دیا ہے۔تب تک نارائینی بھی لوٹ آئی ہے۔اس کی مٹھی میں سچ مچ ایک ٹافی ہے۔دوسرے ہاتھ میں پانی کا لوٹا۔"لے پی۔بہت ٹھنڈا ہے برف پڑی ہے۔"

بنٹی جلدی جلدی سارا پانی پی گیا ہے۔پھر آستین سے منہ پونچھ کر اس نے ٹافی بھی لے لی ہے۔نارائینی اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہی ہے۔مسکرا رہی ہے۔

"بنٹی آ ہ بیاہ رچائیں۔بہت دنوں سے بیاہ نہیں رچایا۔"

کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ بیاہ رچانے کا کھیل کھیلا کرتی ہے۔اس کے سر پہ کوئی دھوتی باندھ دیتی ہے پگڑی کے انداز میں۔خود بھی اپنی دھوتی میں بالکل چھپ سی جاتی ہے دلہنوں کی طرح۔اور ایک فرضی آگ کے آس پاس اس کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر چلتی ہے۔اس طرح ان کا بیاہ ہو جاتا ہے۔اس طرح وہ اس کا دولہا بن جاتا ہے۔پھر وہ اسے بڑے راز میں سمجھاتی ہے "میں اب گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہوں گی تیرے انتظار میں تو ادھر چھت پہ سے ایک چکر لگا کر واپس آ جا۔میرے پاس آ کر پہلے میرا گھونگھٹ اٹھانا۔کہنا "گوری گھونگھٹ ہٹا دے۔میں تیرا دولہا ہوں۔" تب میں اپنا گھونگھٹ ہٹاؤں گی۔سمجھا! لیکن یہ بات کسی سے کہنا مت!"

لیکن وہ اس سے کوئی بات نہیں کہہ پاتا۔سب کچھ بھول جاتا ہے۔دراصل وہ اس کی باتیں سن کر اس کے ساتھ بیاہ کر کے بھونچکا سا رہ جاتا ہے۔وہ اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے تصور سے ہی کانپنے لگ جاتا ہے۔پتہ نہیں اندر سے اس کا چہرہ کیسا ہو گیا ہو! نارائینی اسے پیار سے ڈانٹ دیتی ہے۔اسے پھر سے سمجھاتی

نارائینی نے بنٹی کو آج بھی دولہا بنایا ہے، ایک فرضی آگ کے گرد اس کے پیچھے پیچھے چل کر سات پھیرے لگائے ہیں اور اس کی پھر سے دلہن بن گئی ہے۔ بنٹی کو بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ کتنی بار آگ کے گرد گھوم چکا ہے، کتنی بار اس کا گھونگھٹ اٹھا چکا ہے لیکن وہ ہر بار پہلے کی طرح شرماتی ہے۔ وہ ایک حیرت زدہ بچے کی طرح جس میں چابی بھر دی جاتی ہو اس کا دولہا بن جاتا ہے۔

ایک دن تو بنٹی کی حیرت کی کوئی حد نہیں رہی تھی جب ایک سچ مچ کا دولہا گھوڑے پر سوار ہو کر بہت سے باراتیوں کے ساتھ وہاں آگیا تھا۔ وہ نارائینی کو بیاہ لے جانے کے لیے ہی آیا تھا۔ بنٹی ایک حواس باختہ بچے کی طرح اپنے اور نارائینی کے گھر کے بیچ بھاگتا پھرا تھا۔ اسے وہ آدمی بالکل اچھا نہیں لگا۔ اس کی شکل بھی اچھی نہیں تھی۔ بنٹی کا جی چاہا کہیں سے چھپ کر اسے ایک ڈھیلا مار دے۔ یہ بات اس نے کنّو کو بھی بتا دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کنّو اور وہ مل کر ہی دولہے کو ڈھیلے ماریں لیکن کنّو نے انکار کر دیا بلکہ اپنے باپ سے کہہ دیا۔ اس کے باپ نے بھی اسے جھڑک دیا۔ پتہ نہیں کیوں کنّو خوش کیوں تھا۔ اُسے تو دکھ ہو رہا تھا نارائینی کے چلے جانے کے خیال سے۔

جس وقت وہ سچ مچ کی ایک آگ کے گرد اپنے دولہا کے پیچھے پیچھے سر جھکا کر چل رہی تھی اُس وقت تو کئی عورتوں کے آنسو نکل پڑے تھے۔ بنٹی بھی ایک جگہ بھیگی ہوئی آنکھیں لیے کھڑا تھا۔ وہ دو روز سے نارائینی کی صورت بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ اب سچ مچ کی دلہن بن گئی تھی۔ بھاری ریشمی کپڑوں میں بالکل چھپ سی گئی تھی۔ جس وقت اسے لے جانے کے لیے پھولوں اور ریشمی پردوں سے سجی ہوئی ڈولی منگائی گئی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اس کے قدم اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں تھے۔ بنٹی سب عورتوں اور مردوں کے آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ اسے اُمید تھی نارائینی جانے سے پہلے اس سے ضرور ملے گی، اس سے کچھ نہ کچھ کہہ کر ہی جائے گی۔ لیکن وہ اتنے لمبے گھونگھٹ میں اسے دیکھ ہی نہ پائی اور اسے ڈولی میں بٹھا دیا گیا۔ بنٹی کو یوں لگا جیسے اس سے نارائینی زبردستی چھین لی گئی ہے۔ وہ اسے بچا ہی نہیں سکا ہے۔

کچھ روز بعد نارائینی سسرال سے واپس آئی تو بھی وہ اُسے ملنے نہ گیا۔ وہ اس کے سامنے نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ہی ایسا کرتا رہا۔ ایک دن نارائینی کو اس کے گھر میں ہی ملا یا گیا تب بھی وہ اس سے نہ ملا ادھر ادھر چھپتا پھرا۔ لیکن نارائینی اسے بار بار پوچھتی رہی۔ سب لوگ نارائینی کے پاس آنے کے لیے بلاتے رہے۔ اس نے کسی کا کہا نہ مانا۔ تب نارائینی کو بھی معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے خفا ہے۔ وہ خود ہی اٹھ کر اس سے ملنے آئی۔ اس نے بھاگنا چاہا تو نارائینی نے بھی لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ اس کے پاؤں کی جھانجھر جس طرح بج اٹھی تھی وہ سنگیت ابھی تک اس کے کانوں میں گونجا کرتا ہے۔

تب وہ گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ سُرخ۔ اس کے ہونٹ بھی

سُرخ تھے اور پیشانی بھی اور مانگ بھی۔ اس کے کانوں، گلے اور کلائیوں میں سونے کے بہت سارے زیورات تھے۔ اتنے سارے زیورات کے ساتھ وہ اسے بالکل بھینس سی معلوم ہوئی۔ بھینسیں اسی طرح تو رنگ برنگے منکوں اور گھنٹیوں اور تعویذوں سے سجائی جاتی ہیں۔ جب نارائینی نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا تو اس کے شریر میں جگہ جگہ اس کے زیور چبھ چبھ سے گئے۔ اس نے اس کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا اور کان میں کہا ــــ" تو تو میرا راجہ بھیا ہے۔ مجھ سے دور کیوں بھاگتا ہے؟ کیا میں تجھے اچھی نہیں لگتی اب؟ اچھا سُن۔ میں تیرے لیے ایک بہت ہی سندر دلہن ڈھونڈ لاؤں گی۔ تیری ہی طرح سندر! اسے میں اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی۔ ٹھیک!"

تبھی نبٹی کو معلوم ہوا، اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے سب جھوٹ تھا دکھاوا تھا۔

نبٹی کتنی دیر سے موری پر آنکھیں گڑائے اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اس طرف کی چھت پر گہری خاموشی ہے۔ برسائی میں اب کوئی نہیں ہے۔ دو کھاٹیں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کھڑی ہیں۔ وہ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ موریوں میں پاؤں پھنسا کر اوپر اٹھتا ہے۔ وہاں سچ مچ کوئی نہیں ہے۔ کوئی آنے کا بھی نہیں۔ اس کا دل بھر آیا ہے جی چاہتا ہے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ اچانک کوئی اسے پکار اٹھتا ہے۔ وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ اُسے اپنے گھر سے ہی کسی نے پکارا ہے۔

وہ دیوار سے نیچے کود آتا ہے۔ دھوپ اُتر چکی تھی۔ دیوار کا ایک لمبا سایہ جنگلے تک چلا گیا ہے۔ اس کی ممی برآمدے کی محراب کے نیچے کھڑی اُسے بلا رہی تھی۔ وہ بہت ہی اداس لہجے میں پوچھتا ہے ــــ" کیا ممی؟" اسے یقین نہیں تھا اب ممی کبھی اسے پکارے گی۔

اس کی ممی سر اٹھا کر اوپر دیکھتی ہے اور غصّے سے ڈانٹ کر پوچھتی ہے:" اوپر دھوپ میں کیا کر رہا ہے چل نیچے آ۔ یہ لے پیسے۔ دوڑ کر نکڑ سے برف لے آ۔ پیاس کے مارے حلق سوکھ گیا!"

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے ہر قدم میں اکتاہٹ ہے بے زاری ہے۔ افسردگی ہے لیکن اچانک وہ برف چوسنے کے تصوّر سے بشاش ہو اٹھتا ہے۔ وہ برف چوستا ہوا گھر لوٹے گا۔

وہ جلدی جلدی نیچے اُتر آیا ہے، دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ کر۔ سوکھے آنسوؤں سے داغدار گالوں کو دونوں ہتھیلیوں سے رگڑ رگڑ کر کہہ رہا ہے:" ممی تھیلا بھی دے دو!"

اختر الایمان

بیدرد

کہیں بھی کندہ میری آہ میری فغاں

نہ تیرے قہقہے، جھنکار چوڑیوں کی، خرام

نہ سانحے نہ حوادث، جنھوں نے روحوں کو

لہو لہان کیا آگ میں جلایا تمام

نہ داد خواہ کوئی ہے نہ دادگر کوئی

فضا میں گونج رہا ہے فقط خدا کا نام

روش صدیقی

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

مرادِ تکملۂ ذوقِ رنگ و بو کہیے
تجھے بہشتِ تمنا کی آبرو کہیے

نشانِ منزلِ آشفتگاں، خلوص ترا
تری تلاش کو خود اپنی جستجو کہیے

ترے خیال کو ضد ہے کہ خوش جمال کو
بہانہ ساز نہ کہیے بہانہ جو کہیے

مری غزل میں جو اک شوخیِ تکلم ہے
ترا سلیقۂ اندازِ گفتگو کہیے

نشیدِ عشق و جنوں غیرتِ دمِ عیسیٰ
فسونِ عقل و خرد اسرہ درگلو کہیے

وہ حرفِ راز جسے زیرِ لب کہا تو نے
نسیمِ صبح کو ضد ہے کہ کو بہ کو کہیے

ہے تیری چشمِ سخن گو کو آج بھی اصرار
کہ حالِ دل کبھی کہیے تو رو برو کہیے

یہ استعارۂ نازک تجھے پکار اٹھے
بتانِ شہر کو اس درجہ نرم خو کہیے

کبھی حدیثِ رخِ لالہ رنگ ہو لب پر
کبھی فسانۂ گیسوئے مشکبو کہیے

سنبھالیے دلِ خوں گشتہ کو چھلکنے سے
بپاسِ نرگسِ میگوں سبو سبو کہیے

چراغِ راہِ وفا تیری یاد ہے جس کو
متاعِ قافلۂ شوق و آرزو کہیے

"ز دردِ ما وشبستانِ ما منور کن
دماغِ مجلسِ روحانیاں معطر کن"

درویش صدیقی

اِنھیں کیا کہوں

یہ گم گشتۂ وادیٔ کفر و دیں
نہ حسنِ گماں ہے نہ حسنِ یقیں
یہ بزمِ فضائل کے مسند نشیں
یہ نا محرمِ خلوت و انجمن
اِنھیں کیا کہوں اے ضمیرِ وطن

نہ آشفتۂ زلفِ حُسنِ خیال
نہ شائستۂ ذوقِ فضل و کمال
سراسر ہیں تصویرِ قحط الرجال
یہ دزدانِ آئینۂ علم و فن
اِنھیں کیا کہوں اے ضمیرِ وطن

یہ مدحت طرازانِ تاج و سریر
نہ اہلِ نظر ہیں نہ اہلِ ضمیر
یہ پرویز یہ رہزنِ جوئے شیر
یہ خنجر زنِ سینۂ کوہکن
اِنھیں کیا کہوں اے ضمیرِ وطن

نہ ذوقِ جنوں ہے نہ تمکینِ ہوش
بہ ہر حال درماندہ چشم و گوش
تہی دست و داماں مگر خود فراموش
گدائے درِ خلعت و پیرہن
اِنھیں کیا کہوں اے ضمیرِ وطن

یہ ایوانِ علم و ادب کے خطیب
بلندیٔ فکر و نظر کے نقیب
مگر سوزِ تخلیق سے بے نصیب
بظاہر بڑے خود گر و خود شکن
اِنھیں کیا کہوں اے ضمیرِ وطن

روش صدیقی

مسیحا

لذتِ شکر سے مدہوش ، دل بسمل ہے
کہ مسیحا بھی وہی ہے جو مرا قاتل ہے

ہم تو گم گشتۂ صحرائے محبت ٹھہرے
سامنے آئے جسے حوصلۂ منزل ہے

اے محبت کے چراغوں کے بجھانے والو!
تم نے آساں جسے سمجھا ہے، بہت مشکل ہے

یہ حقیقت ہے کوئی وہم نہیں اے ناصح
کہ مرا درد ، ہم آغوشِ سکونِ دل ہے

کیا کہوں، تجھ سے یہ اے شورشِ طوفانِ حیات
کون یہ محو تماشائے لبِ ساحل ہے

جانتا ہوں کہ تغافل کوئی دیوار نہیں
مانتا ہوں کہ مرا ذوقِ طلب حائل ہے

خود فراموش ہوں لیکن یہ سمجھتا ہوں روش
ہر تجلی میں مرا ذوقِ نظر شامل ہے

رَوش صدیقی

ایاغِ گل

مجھے کر گیا کہاں گم، مرا شوق نارسیدہ
کہ مری تلاش میں ہے وہ غزالِ خود رمیدہ

جو بنازِ بے رخی ہے ابھی گوشہ گیرِ مژگاں
رگِ جاں کی آبرو ہے وہ خدنگِ ناکشیدہ

جو سبوئے ماہ وانجم سے ایاغِ گل تک آئی
لبِ لعل بن گئی ہے وہ شرابِ ناچشیدہ

یہ ہجومِ لالہ و گل یہ جنونِ کیف و مستی
کوئی چاک چاک داماں کوئی پیرہن دریدہ

مجھے نازِ راستی ہے کہ مرادِ دین و دل ہے
وہی گیسوئے پریشاں وہی ابروئے خمیدہ

وہ تجلّی گریزاں ہے فروغِ ہم نشینی
ہے ستاعِ ہم کلامی وہ نوائے ناشنیدہ

ہمہ عمر شکرِ نعمت ہو ادا رَوش تو کم ہے
کہ ملا مجھے ازل سے دلِ دردآفریدہ

منیب الرحمٰن

برگد کا پیڑ

آنکھیں میچے، سوچ میں گم
دھونی رمائے کوئی سادھو جیسے بیٹھا ہو
بچے کھیل رہے ہیں
جن کی چیخوں سے
خاموشی کے ساکن جوہڑ میں ہلچل ہے
جھونکے آتے ہیں
لیکن یہ چپ سادھے رہتا ہے
موت بھی شاید اس کے بڑھاپے کو چھونے سے ڈرتی ہے
اس کا تن ماضی سے بوجھل ہے
اور ہمارے دن اس کے بھاری پن کو
سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہے ہیں
اس کے پتوں نے کیوں ہر کونپل کو ڈھانپ رکھا ہے
اس کی شاخیں کیوں مٹی میں گھس کر جڑ بن جاتی ہیں

مسعود علی ذوقی

آواز و نور کا سنگیت

ہوائیں سنکیں
ستاروں کے دیپ بجھنے لگے
خنک فضاؤں میں شبنم کی تازگی دوڑی
دراز قامت و دیرینہ سال جنگل نے
لٹیں جھٹک کے ایک انگڑائی لی
زمیں جاگی

پرند چونکے سرِ شاخ آشیانوں میں
پروں کو جھاڑ کے
اک ساتھ چہچہا اُٹھے،
تو بھیرویں کے سروں میں سرود بجنے لگا
سکوں میں جان پڑی،
جنبشوں نے لب کھولے۔
صدائیں جاگیں
خموشی کا سحر ٹوٹ گیا۔

سحر کی دھندلی، پر اسرار خواب گاہ کے گرد
اندھیرے چھٹنے لگے،
آسماں پگھلنے لگا۔
اُفق کے پاس گلابی غبار اُڑنے لگا۔

پلک جھپکتے ہی
آواز و نور کا افسوں
بلند و پست پہ سنگیت بن کے پھیل گیا!!

مسعود علی ذوقی

اندھیری رات

سناٹے کی چادر اوڑھے
خاموشی کی انگلی پکڑے
آدھی رات کی نیلی دیوی
سپنوں کی شرمیلی دلہن
نرم اندھیروں میں دھیرے دھیرے ڈول رہی ہے
تنہائی بے شبدوں کے بول رہی ہے
شبنم موتی رول رہی ہے
روح میں امرت گھول رہی ہے

آکاش پہ جگ مگ کرتے تارے
نیند کے مارے
بوجھل پلکوں کو رہ رہ کر جھپکاتے ہیں
تاریکی گیت سناتی ہے
سناٹے مسکاتے ہیں

تب رم جھم برکھے لفظوں کے گھنگھرو باندھے
ماتھے پر گیتوں کا آنچل ڈالے
شعر کی پریاں
رقص کناں
شاعر کے دل میں در آتی ہیں
گنگا جمنی خوابوں کا ست رنگا ناچ دکھاتی ہیں
ذہن کو پر لگ جاتے ہیں
تخیل جواں ہو جاتی ہے

تب رات کی رانی کی خوشبو
شبنم کی مدرا پی کر
اٹھلاتی بل کھاتی
کنج کنج لہراتی ہے
یادوں کو مہکاتی ہے
چوٹوں کو سہلاتی ہے
پھر اوشا کی باہوں پر سر رکھ کر
سو جاتی ہے
نیندوں میں کھو جاتی ہے

سلام مچھلی شہری

نئی اجین

آج میری سگریٹ کے سرمئی دھوئیں ! تجھ کو
ایک کام کرنا ہے
کالی داس کے ساتھی، میگھ دوت کی صورت
اس طرف گزرنا ہے
جس طرف لتاؤں میں
دلنشیں فضاؤں میں
ناگنیں خراماں میں
نقرئی خدا خوش ہیں، ناگنوں کی یورش میں
کچھ غریب انساں ہیں
چشم ولب کے نظارے
بن گئے ہیں انگارے
اور مضمحل انساں، سوچتے ہیں کیا ہوگا، زندگی اجیرن ہے
کالی داس کی اُجین اک حسین جنت تھی، یہ نگر تو مدفن ہے
—— آج میری سگریٹ کے سرمئی دھوئیں ! تجھ کو
ایک کام کرنا ہے
اُس "ملوں کی بستی" میں زندگی ہے ویراں سی، تجھ کو رنگ بھرنا ہے ؟!

سلام مچھلی شہری

جام سفالیں

مری مرضی پہ اب ہر منظرِ عالم نہیں شاید
تو یہ مٹی کا اک پیالہ ہے جامِ جم نہیں شاید
وہ اک نورِ یقیں یعنی کہ میں سوزِ مسرت ہوں
یہ عالم ہے کہ اب وہ بھی شریکِ غم نہیں شاید
فضائے زندگی بے ربط سی محسوس کرتا ہوں
کہیں اِس رات اُن کے گیسوؤں میں خم نہیں شاید
میں محوِ فکر تھا، وہ آئے اور جاتے ہوئے بولے
جو ہم سنتے تھے وہ دیوانے کا عالم نہیں شاید
ہم ایسے لوگ دنیا سے کبھی ہارا نہیں کرتے
وہ کوئی اور ہوگا اے زمانے! ہم نہیں شاید
بہ ایں افسردگی، دنیا میں اک طوفان آجاتا
ابھی مے خوارِ غم کی خشک پلکیں نم نہیں شاید
ہجومِ جلوۂ دانش میں اکثر دل یہ کہتا ہے
سلام! اپنا چراغِ فکر بھی کچھ کم نہیں شاید

سلام مچھلی شہری

کلامندروں میں آگ

معبدوں کے محافظ کے جذبات میں
نور ہی نور ہوتے ہیں، شعلے نہیں
لوگ کہتے ہیں، ایسے فرشتوں نے بھی
کل کلامندروں میں لگائی ہے آگ
فن کی دیوی! تری آستیں میں ہے ناگ؟!

سلام مچھلی شہری

خواب

سوال یہ ہے کہ میں خواب دیکھتا کیوں ہوں
جنازۂ دلِ بے تاب دیکھتا کیوں ہوں
مگر سلام! یہی خواب اک سہارا ہے
اسی کے دم سے حیات ایک ماہ پارا ہے
اداس ہو تو شرارے نہیں، گلاب اُگاؤ
زمیں کی گود سے خورشید و ماہتاب اُگاؤ!

سلام مچھلی شہری

موت کے بعد

— چلو اچھا ہوا، تم چل بسے اس بزم ہستی سے
تمہارے دشمنوں کو اک نئی ترکیب سوجھی ہے
تمہارا دن منایا جائے گا کل شان و شوکت سے
کریں گے یاد اب اہلِ ادب تم کو عقیدت سے
مقرر کے گلے کا ہار کل ہی سوکھ جائے گا
مگر اک پھول بھولے سے تمہارے گھر نہ آئے گا!

سلام مچھلی شہری

نحوست

— جب کسی گھر میں، کوئی شمع نہ جلنے پائے
گلِ تازہ میں، کوئی غنچہ نہ ڈھلنے پائے
بھول کر موجِ بہار آئے تو کترا جائے
صبح کی تازہ کرن اُترے تو مرجھا جائے
تب پڑوسی اُسے منحوس کہا کرتے ہیں
اور ہم ہیں کہ اُسی گھر میں رہا کرتے ہیں

سلام مچھلی شہری

گناہ سے پہلے

— چلو، اک وضعداری بھی ضروری ہے محبت میں
جو ہمت ہو تو اک معیار بن سکتا ہے غربت میں
رہی یہ بات، سازِ دل میں اب نغمہ نہیں کوئی
تغیّر کے لیے بھی ذہن میں شعلہ نہیں کوئی
تو پھر آؤ، ذرا تاریکیوں کو پوج کر دیکھیں
"غلط روحوں" کے ہاتھوں آتی ہے کیسی سحر دیکھیں
مگر تم یہ کہو گی اب خدا برہم نہ ہو جائے
ہماری یہ مُحبّت بھی کہیں کچھ کم نہ ہو جائے

———

بلراج کومل

چربہ

میری، ان سے دو ہی باتیں تھیں ذرا سی مختلف
شکل، جس پر میرا ممکن ہی نہیں تھا اختیار
نام، جو رسم زمانہ کے طفیل
اک ضرورت کے مطابق مجھ کو پہنایا گیا۔
ورنہ میں نے زندگی
کرنے کے سب انداز اپنی چونچ سے
تنکا تنکا، اُن کے آنگن سے، گریزاں دھوپ میں
رفتہ رفتہ چُن لیے
روز و شب کے تانے بانے میں خوشی سے بُن لیے

میں وہ چربہ ہوں کہ جس کی واژگوں ترتیب میں
ان گنت اضداد نے حصّہ لیا۔
گفتگو سے موت کے اسلوب تک
مجھ کو رسوا کر دیا۔
آئینہ ہوں! آؤ دیکھو اس میں تصویر ستم
ختم ہو جائے گا کل رنگ آرزو کا زیر و بم!!

بلراج کومل

تجدید

شکستہ، بریدہ
شجر ایک میرے بیابانِ دل میں
بہت دیر سے ایستادہ تھا، میرا لہو پی رہا تھا۔
مجھے اس کی موجودگی کا بہانہ
صداؤں کے سیلِ مسلسل میں برسوں بہاتا رہا تھا۔
کبھی زندگی کی،
کبھی موت کی داستانیں ہزاروں سناتا رہا تھا۔
یہ جب تک مرے دل میں موجود تھا، موت موجود تھی۔ ہر خوشی تھی فسانہ
حقیقت گریزاں،
گزرتا ہوا پل ہراساں، پریشاں
میں مرگِ مسلسل
میں بے کار، بے نام سا ایک تسلسل!

مرے خون سے کوئی نازک سی کونپل
شکستہ بریدہ شجر کی طرف جیسے بہنے لگی ہے
عجب بے کلی از سرِ نو مرے دل میں رہنے لگی ہے

باقر مہدی

نیا کلیم

کیوں سے جب آغاز ہو ساری باتوں کا
کیوں ہی جب انجام ہو ساری بحثوں کا
کوئی کیسے بات کرے ؟
کوئی کس سے بات کرے ؟

خاموشی کی جلتی نظریں
لفظوں میں
کیا ڈھل سکتی ہیں ؟

ٹھنڈی آگ سے روشن جذبے
ٹوٹے ٹوٹے جملوں میں
الجھ الجھ کر خار نہیں کیا پھول بنیں گے ؟

"امرت ڈھونڈ، "سرخ امرت" اب بھی ملتا ہے"
"سم، امرت میں اتنا بھی تو فرق نہیں ـ"
دونوں ہی فرسودہ باتیں
نسخوں کی آلودہ باتیں — !

لفظوں کا یہ سارا جادو توڑنے والا
اپنے نیل میں ڈوب چکا ہے —
کوئی کیسے بات کرے ؟
کوئی کس سے بات کرے ؟

باقر مہدی

میری بے آواز صدائیں

میری بے آواز صدائیں گونج رہی ہیں
"سنتی ہو؟ سنتی ہو؟"
اب بھی عشق میں دیوانہ پن ممکن ہے؟
ممکن ہے؟
یہ وحشت، یہ بے خوابی، یہ ہر شے سے بیزاری سی
توڑ کے سب زنجیریں میں نے اپنے پیروں میں
آج بگولے ڈال لیے ہیں
آوارہ ہو کر بھی قیدی
میرا سایہ، میرے بگولے
دونوں مل کر ناچ رہے ہیں!
چنگاری آنکھوں میں جلتی مسرت کو چھونا کرتی ہے
بیتابی باہوں میں لے کر سرگوشی کرتی رہتی ہے
تم ـــــ میری محبوبہ ـــــ میرا سایہ
کیوں حیرت سے تکتی ہو؟

میں پاگل بننے کی ہوس میں تیرے جلتے سینے کو
اپنے سوکھے ہونٹوں سے چوم رہا ہوں
میری راکھ مرے ہونٹوں سے تیرے ٹھنڈے شعلوں پر
چنگاری بن کر ناچے گی۔!
"سنتی ہو، سنتی ہو؟"
اب بھی عشق میں دیوانہ پن ممکن ہے؟
ممکن ہے؟

لیکن میرا ہر جذبہ ریت میں کیوں مل جاتا ہے؟
میری آنکھیں بجھتی چنگاری کو ڈھونڈا کرتی ہیں
تیرے جسم سے آگے مجھ کو کون بلاتا رہتا ہے؟
اک صحرا سے آگے کتنے اور نئے صحرا ہوں گے؟
"سُنتی ہو، سُنتی ہو؟"
میری بے آواز صدائیں گونج رہی ہیں

اقر مہدی

کون ؟

سائے سائے ، جالے جالے ، خاموشی ، خاموشی سی
ٹوٹی ٹوٹی —— الجھی الجھی ، بے خوابی ، بے خوابی سی
حرفوں سے بچتا بچتا ، معنی سے چھپتا چھپتا
رنگوں میں ڈوبا ڈوبا ، سانسوں میں ابھرا ابھرا
ذروں میں چمکا چمکا ، لہروں میں سہما سہما
تیز ہوا کے جھونکوں میں رک رک کر اڑتا اڑتا
نشتر ، زہر ، محبت ، درد ، خون کے اک اک قطرے میں
رہ رہ کر چھپتا چھپتا ——
کیا ہے یہ ؟
کون ہے یہ ؟
آنسو ریت بنے کیسے ، پلکوں پہ چمکے کیسے ؟
ہر منزل پہ لہراتا ہے کب سے زرد پھریرا - کون ؟
ٹوٹے آدرشوں کے شیشے گنتا ہے وہ بیٹھا کون - ؟
میرے ہر اظہار میں پنہاں بے معنی خاموشی کیوں ؟

میرے تھک کے سو جانے میں خوابوں میں بے چینی کیوں؟
میرے جام سے اڑ جاتا ہے قطرہ قطرہ نشہ نشہ کیوں؟

یہ روز و شب ، سارے لمحے ، ننھے ننھے ٹکڑے ٹکڑے
رگ رگ میں پیوست ہوئے ، خون بنے ، درد بنے ،
اک مدت سے ـــــ صبح ازل سے ،
میری روح میں کون چھپا ہے ؟
کون چھپا ہے ؟

باقر مہدی

دونوں ایک ہوئے

لفظوں کو نغمے میں ڈھالوں
ایک غزل لکھ ڈالوں
تشبیہوں کی مالا گوندھوں
دور افق پر پھینکوں
بجلی کو آخر میں پکڑوں
یا دل کو دامن میں لاؤں
بیخود ہو کر آئینہ خانے میں گاؤں
جام میں یادوں کی مے بھر کر
کاہکشاں پہ دوڑوں—!
دھرتی ناچے، میں بھی ناچوں!!

سرمستی کے عالم میں
خالق سے اک بات کہوں
"عشق کے دل میں جا کر دیکھ
تیری جنت، تیری دوزخ
دونوں کب سے ایک ہوئے!"

وحیدہ اختر

یہی تو ہوگا

غضب ہے روشنیٔ طبع کی سیہ بختی
بلا ہے دل کی شرافت کا دردِ تنہائی
ستم ہے فقر کی غیرت کا کربِ محرومی
جو ہاتھ بخششِ لطف و کرم کی عادت سے
تہی ہوئے ہیں، کوئی کاٹ لے تو ہو احساں
جو دل زمانے کی خاطر دھڑکتے رہنے سے
شکستگی کی صدا ہے، ہوا ہے بارِ گراں
جو سر بلند رہا چوکھٹوں کی پستی سے
ہجومِ سنگ میں اچھا ہے ٹوٹ ہی جائے
جو روشنی کا ہے مصدر، وہ سینۂ صد چاک
اندھیری قبر کا لقمہ بنے تو صبر آئے

جو ایک نجمِ جہاں تاب ٹوٹ جائے تو کیا
جو ایک گوہرِ نایاب چھوٹ جائے تو کیا

یہی تو ہوگا اندھیرے منائیں گے اک جشن
وہ چہرے جن پہ حروفِ جلی میں لکھے ہیں
حماقتوں کے فرامین، ہوں گے صدر نشیں
وہ آنکھیں جن میں سیاہی گھلی ہے دوزخ کی
سجا کے عدل کی میزاں اندھیرے اُگلیں گی
وہ ہونٹ جن پہ جہالت چہکتی رہتی ہے
ترانے چھیڑیں گے اس جشنِ بد مذاقی میں
وہ کان جن پہ گراں ہے صدائے اہلِ درد
طرب کے بے حس و بے روح گیت نگلیں گے
وہ سینے جن میں ہے دل کی جگہ پہ سنگِ سیاہ
ہوس کے تمغوں کی دوکاں سجا کے نکلیں گے
وہ سر جو جھکتے ہیں ہر آستانِ دولت پر
بصد غرور سُنیں گے قصیدۂ ذلت
تعصّبات کے شعلے دھواں اُڑائیں گے
توہمات کی لَو ظلمتوں میں ناچے گی
جہالتوں کے دیے نفرتوں کو پوجیں گے
ہوس کے سینوں میں بیٹھا ہوا ستم کا ناگ
تمام نور کی نہروں کا دودھ پی لے گا
قدامتوں کی سیاہی سے بیج پھوٹیں گے
خباثتوں کے قلم داستان لکھیں گے

کسی کا ہاتھ نہ تھامے گی کوئی سچائی
زباں کسی کی نہ پکڑے گی حرف حق بڑھ کر
خباثتوں پہ کوئی روشنی نہ ڈالے گا

جو ایک روشنیٔ طبع بجھ گئی تو کیا
جو ایک دل کی شرافت کو موت آئی تو کیا
جو ایک فقر کی غیرت ہوئی شہید تو کیا
یہی تو ہوگا کہ جو آج تک ہوا ہے، وہی
ہوا کرے گا، مگر کوئی لب نہ کھولے گا
نہ آنکھ روئے گی کوئی، نہ درد بولے گا

ق حنفی

امن پسندوں کا نعرۂ حق

جنگ ہی ہونی ہے تو ہو جائے پھر اک بار جنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

سمعنی سیلاب کی چھڑ جائے چپ ہو جلترنگ
سرکٹی لاشوں میں گھل مل جائے جینے کی امنگ
معبدوں کی نیو میں لگ جائے بارودی سُرنگ
امن کے کتبوں میں دیمک امن کی لاٹوں میں زنگ
شوک میں ڈوبے اشوک اور بُدھ کا سپنا ہو بھنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

ٹی سی بی ایم چلیں اور ہائیڈروجن بم پھٹیں
ک ننگی ناچ اُٹھے اور ہر طرف لاشیں بچھیں
وت کی آغوش میں سو جائیں سو دو سو کروڑ
ہ جنس و عمر و صحت رد مثلِ عذر لنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

ڈوب جائیں نیل کے کھیت در دہاں طوفاں میں اہرام
خاک میں مل جائیں آفیل اور پیازا کے بڑے مینار
ٹوٹ کر ہو جائے ریزہ ریزہ مٹی چین کی دیوار
گر پڑے، دھنس جائے، بکھرے تاج کا مرمر تمام
ٹوکیو، پیکنگ، لندن، ماسکو، نیو یارک، روم
بمبئی، لاہور، برلن، میڈرڈ، پیرس کے نام
یاد آئیں جیسے موہن جودڑو، بابل، سدوم
حال سے مغرور ہوں تاریخ میں پائیں مقام
اور پھر تاریخ بھی مغرور ہو ان سب کے سنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

کتنی تہذیبیں مٹیں کتنے تمدن گم ہوئے
عہد رفتہ میں بھی کیا کیا شہر کیا کیا ملک تھے
جن کو دعویٰ تھا نہ مٹنے کا بالآخر مٹ گئے
پھر ہماری پلاسٹک کی کانچ کی تہذیب کیا
اس مشینی عہد کی تعمیر کیا تخریب کیا
آخرش رہ جائیں گے دنیا میں خاک و خشت و سنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

ٹوٹ جائے جنگ کے خطرے کا یہ کالا طلسم
بھسم ہو جائیں صفات، افعال، معروضات اسم
خون میں لتھڑیں یہ روحیں خاک میں مل جائیں جسم
شعر و رقص و نقش و نغمہ کی بچے کوئی نہ قسم
یہ لکیریں بھی فنا ہوں بھاپ بن جائیں یہ رنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

پھر کسی ملبے کی تہہ سے یا کھنڈر یا غار سے
دود برلب، منہدم، آتش بہ پا آثار سے
کوئی مرد آئے گا اور لاشوں کے اک انبار سے
کھینچ لے گا نیم مردہ سی کسی عورت کا ہاتھ
حافظے کو چھوڑ کر دونوں چلیں گے ساتھ ساتھ
ٹوٹ جائے گی خموشی اک نئی کلکار سے
از سرِ نو ہوگا پھر تخلیق کا آغاز
تہذیب کا آغاز
تاریخ کا آغاز
پھر نئے سینے نئے دل اور نئی ہوگی اُمنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

کب تک آخر ایٹمی طاقت سے ہم ہوں بلیک میل
کب تک آخر شانتی اور جنگ کے نعروں کا کھیل
جانتے ہیں ہست بھی برحق ہے برحق نیست بھی
مانتے ہیں موت بھی برحق ہے برحق زیست بھی
جب تلک گردش میں ہے یہ مادر امکاں زمیں
نسلِ آدم نیست و نابود ہو سکتی نہیں
نوح کی کشتی کا قصہ، قصۂ طوفاں کا انگ
جنگ ہو خونخوار جنگ
جنگ سے آزاد ہونے کے لیے اک بار جنگ
جنگ ہو خونخوار جنگ

شمس الرحمٰن فاروقی

مشکل کُشا

اتھاہ رات کی چادر میں تم اکیلی ہو
مثالِ ماہ چمکتے ہیں زخم ہونٹوں کے

اندھیری رات کے پہلو میں تم اکیلی ہو
ہے شلِ دامنِ شب دامنِ الم ہی طویل

سیاہ کوہ کے دامن میں تم اکیلی ہو
مثالِ خار ہے پژمردہ ابروؤں کی لکیر
مجھے بتاؤ کہ تم کس کے انتظار میں ہو!

میں اجنبی ہوں مگر مجھ سے ڈر کے دور نہ جاؤ
تمھارے پاؤں کا پتھر میں ہی تو ہوں دیکھو
اندھیری رات کا پہلو مرا ہی پہلو ہے
اتھاہ رات کی چادر مجھے ہی کہتے ہیں

یہ ہنستی کھیلتی لہریں جو رک نہیں سکتیں
حقیقتاً وہ بھی میری ہی ایک صورت ہیں
نہ جانے کب سے کھڑی ہوں کہ پاؤں اٹھتے نہیں
دھوئیں سے نیند کے کجلا گئی ہے آنکھ کی لو
یہ گورا رنگ اترنے لگا امید کے ساتھ

ڈرو نہیں ـــــ
مرے پاس آؤ مجھ میں چھپ جاؤ
سیاہ کوہ کے دامن میں خود کو گم کر لو
سیاہ رات کے آگے کوئی بھی کچھ بھی نہیں
ڈرو نہیں ـــ مرے قدموں میں خود کو سمٹا لو
اتھاہ رات کی چادر میں تم اکیلی ہو

شمس الرحمٰن فاروقی

اجنبی کی موت

اکیلی جان چوپایوں کے جنگل میں بھٹکتی ہے
گھنے گنجان بالوں سے لدے جسموں پہ کالی مکھیاں، محوِ گل گشت چمن ہیں۔ ان کے قدموں
ہزاروں مکھیاں، اور بھی لپٹی ہیں سوئی

اکیلی جان
کسی صورت سے اپنے دامن عصمت کی، دودھیا چاندی سی سرفراز پاکی کو بچائے ہے

(صدائے صحرا)

رگ گل سے بڑھ کے، نازک یہ دامن
یہاں کی ہوا کو یہ کھنے سے مجبور ہے
یہاں کا چلن ہی سمجھتا نہیں
اسے پارہ پارہ ہی ہونا پڑے گا

قدآور سر بلند اشجار

چوپایوں
کی ٹانگوں سے پھوٹی ہیں الجھی جٹائیں

جٹاؤں سے چپکی گھنیری لتائیں
کچل جائیں قدموں سے تو پھر جنم لیں

(صدائے خیمۂ ارض)

کوئی راہ پھوٹے، کوئی بات نکلے
تو دامن بچالائیں ہم
اکیلی جان چوپایوں کے جنگل میں کھٹکتی ہے
بچالائیں ہم
چھڑالائیں ہم

کیا جائیں ہم؟

مرگِ بہاراں

قرنہا قرن سے یہ مکر و ریا کے بندے
رسمِ اخلاص کی محفل کو ہیں گرمائے ہوئے
کبھی مذہب کبھی ملت کا سہارا لے کر
ذہنِ اقوام کی میت پہ ہیں منڈلائے ہوئے
ٹوٹتے جاتے ہیں گو ان کے سرابوں کے طلسم
پھر بھی ذہنوں پہ ہیں بادل کی طرح چھائے ہوئے
"ذکر" سے اپنے خداؤں کو ہیں بہلائے ہوئے
"فکر" سے فطرتِ ابلیس کو شرمائے ہوئے

کس سے کہیے کہ گلستاں میں بہ فیضِ گل چیں
اب بھی جاری وہی آئینِ ہوس ہے کہ جو تھا
طائرِ فکر کی آواز پہ پابندی ہے
آشیانے میں بھی اندازِ قفس ہے کہ جو تھا

بوئے گل خاک بسر، موجِ صبا زخم بجاں
جلوۂ لالہ بہ اندازۂ خس ہے کہ جو تھا
زندگی مرحلۂ چند قدم ہے کہ جو تھی
سازِ دل زمزمۂ چند نفس ہے کہ جو تھا

ایسے لوگوں کو ملا خیر سے منزل کا سراغ
کھو گیا ذوقِ جنوں جن کے گریبانوں میں
لے کے نکلے تھے جو سلمائے تفکر کا جلوس
رہ گئے اپنے روایات کے بت خانوں میں
جن کو ارماں تھا محبت کے چمن زاروں کا
جم گئے وحشت و نفرت کے بیابانوں میں
جن کا ایماں تھا کہ ہے علم ہی خلاقِ شعور
خود بخود گھر گئے وہ جہل کے زندانوں میں
رات دن جن کا وظیفہ تھا مساواتِ بشر
وہ نہ چل پائے مساوات کے میدانوں میں
عدل و انصاف کے پڑھتے تھے قصیدے جو لوگ
ہو گئے ظلم و تشدد کے ثنا خوانوں میں
ذوقِ پروانگیٔ اہلِ نظر کیا کہیے
شمعیں منہ ڈھانپ کے روتی ہیں شبستانوں میں
بادۂ ناب کو ترسے ہے خمستانِ حیات

زہر کے گھونٹ پیے جاتے ہیں پیمانوں میں
آج بھی دیدۂ یزداں کو شکایت ہے یہی
کوئی انساں نظر آتا نہیں انسانوں میں

جب یہ عالم ہے تو پھر کس سے کہوں اے ہمراز!
کون سمجھے گا جہاں میں مری آوازِ ضمیر
آج بھی "علم" کی تقدیر میں ہے دار و صلیب
آج بھی عقل ہے گیسوئے توہم کی اسیر
نئے انداز سے تابان و درخشاں ہے ندیم!
آج بھی وقت کے ماتھے پہ غلامی کی لکیر
آج بھی لالہ و گل ہیں وہی جُھلسے جُھلسے
ہے سموم آج بھی صحنِ چمنستاں کی سفیر
نغمہ و فلسفہ و شعر و ادب کے خالق
آج بھی خیر سے ہیں وقفِ غم و دار و گیر
راز دارانِ غمِ زیست، رسولانِ زماں
آج بھی جبرِ سیاست کے بنے ہیں نخچیر
عظمتِ عیسیٰ و سقراط کی سوگند، یہاں
بے گناہی ہے وہی آج بنائے تقصیر
کتنی دوشیزہ تمنائیں نظر بند سی ہیں
کتنی معصوم خطائیں ہیں محلِ تعزیر
کتنے اربابِ بغاوت ہیں کہ ہیں مہر بہ لب

پاؤں میں مصلحتِ وقت کی ڈالے زنجیر
مجھ کو حیرت ہے کہ جب "فرش" ہی جنبش میں نہ آئے
"عرش" کو کیسے ہلا سکتی ہے آہِ دلگیر

وہم ہے فلسفۂ کشمکشِ ظلمت و نور
کس کو معلوم کہ اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
کون جانے کہ پسِ پردۂ آلامِ خزاں
شاہدِ صبحِ بہاراں کا گزر ہو کہ نہ ہو
کیا خبر، تیرہ و مسموم سمن زاروں میں
نکہت و نور کی دیوی کا سفر ہو کہ نہ ہو

شاید اقبال کے دعوے ہیں غلو سے مملو
"کارِ حق گاہ بشمشیر و سناں نیز کنند"
"چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا
وز ہماں آب و گِلِ ایجادِ جہاں نیز کنند
آنچہ از موجِ ہوا با پرِ کاہی کردند
عجبی نیست کہ با کوہِ گراں نیز کنند"

جب یہ صورت ہے تو اے میرے ندیم و ہمراز!
کیا ہی اچھا ہو کہ اس حال میں کچھ کر جائیں
آکہ اب مرگِ بہاراں کا منائیں ماتم
چیخ کر روئیں کچھ اس طرح کہ ہم مر جائیں

اختر انصاری

رباعیات

جو ہو نہ سکا ہم سے وہ کر جاؤ تم
اِس پار سے اُس پار اُتر جاؤ تم
ہم دیتے رہے چرخِ فلک کو الزام
ممکن ہو تو اس سے بھی گزر جاؤ تم

منعم! تیرے دن رات ہیں وارے نیارے
بہتے ہیں تری بزم میں مے کے دھارے
ہم پیتے ہیں جو چیز کبھی وہ بھی چکھ
دن میں نظر آ جائیں گے تارے پیارے

ساقی! غمِ دل سے ہے برا حال، پلا
ہوں گردشِ ایام سے پامال، پلا
اللہ مجھے بھلا چکا ہے دل سے
بے دغدغۂ پرسشِ اعمال پلا!

اللہ کو انسان سے غافل ٹھہراؤں
معبود کو بندوں کے مماثل ٹھہراؤں!
ممکن نہیں مَیں ترک کروں مے نوشی
اور کاتبِ تقدیر کو جاہل ٹھہراؤں!

افسردۂ احساس و نظر پیتا ہوں
درد و تپش و جذب و اثر پیتا ہوں
اندیشۂ بازپرسِ محشر کیسا
میں بادہ نہیں خونِ جگر پیتا ہوں!

کوتاہیٔ فطرت کی سزا کیوں بھگتوں؟
بدنظمیٔ قدرت کی سزا کیوں بھگتوں؟
کیوں اپنی تباہی پہ بہاؤں آنسو!
میں جرمِ مشیت کی سزا کیوں بھگتوں؟

بھر دے مرا پیمانہ لبالب ساقی!
جل اٹھنے کو ہیں سینے کے زخم اب ساقی!
یہ بھی مرا مقسوم ہے وہ بھی تقدیر
تقدیر ہے اک جہلِ مرکب ساقی!

اندوہ و تپش، کیف و طرب، فکر و مذاق
رعنائیِ غم، دردِ جنوں، سوزِ فراق
چھپ چھپ کے یہ افسانہ میں لکھتا ہی رہا
اللہ رے تاریک شبوں کے اوراق!

اے بار الٰہا! یہ مری ہستیِ زار
لائق نہیں اس تیرے جہاں کے زنہار
یا اِس کو پٹک دے غمِ دل کے سر پہ
یا گردشِ تقدیر کے منہ پہ دے مار!

یہ کیفِ جوانی کہ سرورِ مے ہے
یہ دردِ تمنّا کہ سرودِ نے ہے
سوئی ہوئی یہ ساعتیں بیداری کی
جاگی ہوئی یہ شبوں کی نیندیں ہے ہے

تقدیر ازل جیتے ہیں جس کے دم سے
اِک ساحرہ ہے، آج یہ سُن لو ہم سے
ہے جس کے گلے میں ہڈیوں کی مالا
مالا جو عبارت ہے بنی آدم سے

سانسوں میں لیے کرب و بلا جیتا ہوں
سلتے نہیں جو زخم انھیں سیتا ہوں
جی بھر کے زمانے نے پیا خوں میرا
باقی جو بچا اس کو میں خود پیتا ہوں

ہرگز نہیں جینے سے دلِ زار خفا
سینے میں مچلتی ہے تمنّائے وفا
جلتے رہے لیکن نہ ہوئے خاک اب تک
اک ڈھونگ ہے اے چرخ! تری سعیِ جفا!

ہر دل کو مرا سوزِ جگر دے ساقی!
ہر آنکھ کو میری سی نظر دے ساقی!
سب کا ہو بھلا جس میں ہیں اس میں خوش ہوں
ہر جام کو اس زہر سے بھر دے ساقی!

سلیمان اریب

رباعیات

یوں زیست کی کشتی کو مری کھیتا ہے
ہر سانس میں سو عمریں وہ لے لیتا ہے
کھانے کے لیے اس سے بھلا کیا مانگوں
جی بھر کے جو پینے بھی نہیں دیتا ہے

انسان پہ ہر لمحہ ہنسی آئی ہے
اس میں تو میاں اپنی ہی رسوائی ہے
جینے کے لیے چھپتا پھرا کرتا تھا!
مرتا ہے تو کیوں انجمن آرائی ہے؟

کب حوصلۂ غم سے سوا ملتا ہے؟
جو ملتا ہے قسمت کا لکھا ملتا ہے
صد حیف کہ خود کو بھی نہ پایا ہم نے
تم کہتے ہو ڈھونڈو تو خدا ملتا ہے

رسوا سر بازار تو مت ہونے دو
اپنے کو گنہگار تو مت ہونے دو
کیا درد کی تشہیر ضروری ہے اریب
ہر شخص کو غمخوار تو مت ہونے دو

میکش اکبر آبادی

○

جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو، صلح میں بھی ہیں جنگ کی شانیں
اُس جیسے معصوم کو یارب کس نے سکھادی ہیں یہ گھاتیں
بات ہوائی جیسے بادل، آنکھ جھپکتی جیسے بجلی
جسم مہکتا جیسے گلشن، چال لچکتی جیسے لہریں
جسم پہ یوں پوشاک سجی ہے، جیسے شبنم ہو پھولوں پہ
رنگ سنہری، گُل گالوں پر، جیسے مانگ ہو کندن میں
اس کی زلفیں جیسے ناگن بل کھائے بجلی لہرائے
اور نہ جانے کیسی ہیں وہ، چھوڑ کر ہم نے کب دیکھی ہیں
اُس کی آنکھیں؟ اُس کی آنکھیں! کیسی ہیں اب کیا کہیے
ٹھہریے مجھ کو سوچنے دیجیے — اس کی آنکھیں... اس کی آنکھیں

آل احمد سرور

○

لوگ تنہائی کا کس درجہ گلا کرتے ہیں
جو ہیں فن کار، وہ تنہا ہی رہا کرتے ہیں
وہ تبسم ہے کہ غالب کی طرحدار غزل
دیر تک اس کی بلاغت کو پڑھا کرتے ہیں
کوئی جادو، کوئی جلوہ، کوئی مستی، کوئی موج
ہم انھیں چند سہاروں پہ جیا کرتے ہیں
اپنے لفظوں سے نکھر جاتا ہے معنی کا جمال
ہر حقیقت سے ہم افسانے بُنا کرتے ہیں
دن پہ یاروں کو اندھیرے کا گماں ہوتا ہے
ہم اندھیرے میں کرن ڈھونڈ لیا کرتے ہیں
بستیاں کچھ ہوئیں ویران تو رونا کیسا
کچھ خرابے بھی تو آباد ہوا کرتے ہیں
سننے والوں کی ہے توفیق سُنیں یا نہ سُنیں
بات کہنے کی جو ہے، ہم تو کہا کرتے ہیں
شاید اک روز اسی ریت میں کچھ پھول کھلیں
تپتے سینے پہ لہو نذر دیا کرتے ہیں
لوگ باتوں میں بہا دیتے ہیں اس دور کا درد
اور اشعار میں ہم ڈھال لیا کرتے ہیں

آل احمد سرور

○

کسی جنوں کے پھر آثار دل میں ملتے ہیں
خبر نہ تھی کہ خزاں میں بھی پھول کھلتے ہیں
ہیں فاصلے بھی ضروری محبتوں کے لیے
کہ قربتوں کے سرے رنجشوں سے ملتے ہیں
دلوں کی برف پگھلتی نہیں کسی عنواں
ہماری بات پہ یاروں کے سر تو ہلتے ہیں
اسی دیار میں جذبہ بھی ولولہ بھی حرام
اسی دیار میں درد آشنا بھی ملتے ہیں

ق

اسی دیار میں کرنوں کا قتل ہوتا ہے
اسی دیار میں رہ رہ کے پھول کھلتے ہیں
اسی دیار میں سعیٔ وفا ہے لا حاصل
اسی دیار میں ارماں کے چاک سلتے ہیں

علی جواد زیدی

○

جو نامراد، کشاکش میں مبتلا نہ رہا
خودی تو کیا، وہ خدا کے بھی کام کا نہ رہا

بجھے گا کوئی دیا، کوئی پھول ٹوٹے گا
مجھے بھلا کے نہ سمجھو کہ مسئلہ نہ رہا

ہزار آندھیوں میں اک چراغِ فکرونظر
گھڑی گھڑی یہی دھڑکا رہا خدا نہ رہا

یہ پیلا چاند، یہ شبخوں کا بے زباں شاہد
اداس ہے کہ جوانوں کا قافلہ نہ رہا

وہی ہوا، وہی قطرہ، وہی سمندر ہے
جو سر اُٹھا کے چلا تھا وہ بلبلا نہ رہا

سُنا ہے تیرے سوا، اے غرورِ بے باکی
جہانِ نو کے لیے کوئی آسرا نہ رہا

وہ ناشناسوں کا جمگھٹ تھا جلوہ گاہوں میں
ادا شناسوں کو چلنے کا راستا نہ رہا

وجودِ ہوش تھا اک رہگزار کا جلوہ
سرکتی ریت پہ دم بھر بھی نقشِ پا نہ رہا

میں ایک زخم بدل، اجنبی سہی، لیکن
جو مڑ کے دیکھ لیا تم نے پھر گلہ نہ رہا

مجھے مٹا دو، مگر سُن لو پیش گوئی بھی
یہی کہو گے کہ ہستی میں ہمہمہ نہ رہا

سحر سے تا بہ سحر یہ بھی ہو گیا معلوم
چراغ بجھ تو گیا تھا مگر بجھا نہ رہا

ادب کی قدر کسی مشتری کے بس کی نہیں
یہ قدر کم ہے کہ غیروں کو حوصلہ نہ رہا

شعور سوز کو ترسے ہوئے زمانے میں
کمی ہی کیا ہے جو زیدی سا بے نوا نہ رہا

روشؔ صدیقی

○

دولتِ عشق کو زوال کہاں بوالہوس ہے ترا خیال کہاں
دل کا آئینہ توڑنے والے پھر یہ آرائشِ جمال کہاں
دین و دل سب خراب ہیں ہم سے کوئی ہم سا خراب حال کہاں
خامشی سے بنے تو بات بنے گفتگو ترجمانِ حال کہاں
نقشِ محرومیٔ نشاط کہو حُسنِ معصومیٔ ملال کہاں
زندگی نام ہے جدائی کا زندگی ہے تو پھر وصال کہاں
تیری محفل میں جس کو چھوڑ آئے اب وہ تنہائی خیال کہاں
دل ہی جب تک زباں نہ بن جائے ہم نشیں کیفِ حال و قال کہاں
آج بھی زندگی ہے مہر بہ لب حل ہوا عشق کا سوال کہاں

اے روشؔ! خوب ہے یہ رنگِ غزل
شوخ اتنا رمِ غزال کہاں

نشور واحدی

○

جلوہ اپنی ذات کی رعنائیوں کا نام ہے
زندگی شاید مری تنہائیوں کا نام ہے

میکدہ میں چھپ نہیں سکتا کبھی شیشے کا رنگ
بہکی بہکی سی ادا رسوائیوں کا نام ہے

ہے شبابِ زندگی بھی آمدِ فصلِ جنوں
حسن موسم ہے ادا پُروائیوں کا نام ہے

خاک کے پردے پہ ہے عکسِ تجلّی کی نمود
زندگی چلتی ہوئی پرچھائیوں کا نام ہے

نشۂ صہبا ہو یا دامانِ خوابِ نازِ دوست
رات جیسی ہو یہاں تنہائیوں کا نام ہے

کون ہے اس مقتلِ ارماں میں قسمت کا دھنی
خوش نصیبی اپنی بے پروائیوں کا نام ہے

صد حیات جاودانی ایک مرگِ ناگہاں
بدنصیبی زیست کی گہرائیوں کا نام ہے

زلف و رُخ شام و سحر حسن و جمالِ زندگی
شاعری بکھری ہوئی رعنائیوں کا نام ہے

دل کے ہنگامے سے ہے رنگِ تغزل بھی نشورؔ
غم بھی جیسے انجمن آرائیوں کا نام ہے

نشور واحدی

○

گل و برگِ گل کو رنگِ مے خام دے دیا ہے
جسے کچھ نہیں ملا ہے اُسے جام دے دیا ہے

یہ زمانے کی ادا ہے کہ بجائے سروِ گلشن
اُسی فتنۂ قیامت کو خرام دے دیا ہے

کبھی آرزوئے مبہم کبھی دردِ ہجر پیہم
کہ ہر اک ادائے غم کو کوئی نام دے دیا ہے

یہ صبا کے نرم جھونکے اُسے پھر سنا رہے ہیں
مری خاکِ بے وطن نے جو پیام دے دیا ہے

یہ ہجومِ ماہ و انجم ہے امانتِ تجلّی
کہ سحر نے نور اپنا سرِ شام دے دیا ہے

کسی جزو کو چمن میں نہیں بے نصیب چھوڑا
گل و غنچہ و صبا کو کوئی کام دے دیا ہے

مجھے دی ہے ایک قسمت میں بناؤں یا بگاڑوں
جسے جو عطا کیا ہے بہ تمام دے دیا ہے

سفرِ حیاتِ غم میں یہی فن ہے میرا توشہ
مجھے کچھ نہیں دیا تھا تو کلام دے دیا ہے

مسعود علی ذوقی۔

○

آنچ دھیمی ہو تو جلنے میں مزہ آتا ہے
دل کے آہستہ پگھلنے میں مزہ آتا ہے

مہرباں ہے کبھی بیزار، کبھی خود بے تاب
حُسن کے رنگ بدلنے میں مزہ آتا ہے

کھڑکیاں دل کی کھُلی رکھیے تو باوصفِ غبار
وقت کے ساتھ بدلنے میں مزہ آتا ہے

عشق میں روح بھی پیاسی ہو تو دونوں جانب
ساعتِ وصل کے ٹلنے میں مزہ آتا ہے

لذّتِ درد، تری راہ میں گاہے گاہے
غم کے انگاروں پہ چلنے میں مزہ آتا ہے

روح میں آج بھی روشن ہے محبت کا چراغ
آج بھی دل کے مچلنے میں مزہ آتا ہے

یادِ جاناں، تری آہستہ خرامی کے طفیل
چاندنی رات کے ڈھلنے میں مزہ آتا ہے

مسعود علی ذوقی

○

محبت کا یہ عالم بھی نہ جانے کون عالم ہے
کہ دل مسرور ہے لیکن طبیعت مائلِ غم ہے
چمن کو رات کی محفل اُجڑنے کا بہت غم ہے
گلوں کی نیم وا آنکھوں میں اب تک اشکِ شبنم ہے
مرے شکووں پہ ان کی چشم خواب آلود پُرنم ہے
کنایہ کتنا نازک ہے، اشارہ کتنا مبہم ہے!
پلا دے ساقیا اتنی کہ یادیں غرق ہوجائیں
ابھی تو زخم روشن ہیں، ابھی تو نشہ کم کم ہے!!
بہک جانے کی لذت سوچ کر حیران ہوں یارب!
ترا سب سے بڑا شہ کارِ شیطاں ہے کہ آدم ہے؟
دھند لکا ہے۔ دریچے دل کے کھولو، کچھ نظر آئے
خرد کی تنگ گلیوں میں جنوں کی روشنی کم ہے
ترے گلشن سے کچھ شاداب یادیں ساتھ لایا تھا
انھیں یادوں کی خوشبو آج تک زخموں کا مرہم ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

ہم لوگ وہ ہیں جن کی زمانے پہ نظر ہے
بیدار ہے دل آنکھ بھی سرگرم سفر ہے

اس واسطے کچھ لوگ خفا ہو گئے ہم سے
کیوں ہم کو تمیزِ صفتِ عیب و ہُنر ہے

جی چاہے تو ڈھونڈو کوئی جینے کا بہانہ
ورنہ غمِ ہستی سے یہاں کس کو مفر ہے

بے تیشہ یہاں راہ نکلتی نہیں کوئی
دل والو سنو سنگ دلوں کا یہ نگر ہے

ہر شمع سے لپٹی ہوئی زنجیر دھوئیں کی
اس دور میں پُر پیچ ہر اک راہگذر ہے

ہم کو بھی رہی ہے ہوسِ نانِ شبینہ
سرمایۂ جاں پھر بھی یہی خونِ جگر ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

ہم سے شاکی شہر کے سب عالم و فاضل ہوئے
ہے بس اتنی بات ہم پر شعر کچھ نازل ہوئے

تیرے کہنے پر کیا ترکِ وفا کا حوصلہ
ورنہ اے جانِ وفا ہم اور کس قابل ہوئے

لوگ لکھتے ہیں ہمارے نامۂ اعمال میں
ایسے ہنگامے نہ جس میں ہم کبھی شامل ہوئے

اُس نظر کے پھول ہم چنتے تو کوئی بات تھی
یوں تو دل کے زخم بھی وجہِ سکونِ دل ہوئے

کس سے پوچھیں جا کے اپنی نارسائی کا سبب
بارہا ہم خود بھی اپنی راہ میں حائل ہوئے

ہم نے کب جی بھر کے دیکھا تجھ کو اے عصرِ رواں
عمر کے لمحات نذرِ خوابِ مستقبل ہوئے

سلیمان اریب

○

جو پا کر بھی کچھ نہیں کھوتے وہ روتے ہیں اس دُنیا میں
آنسو ہوں دامن پہ کسی کے ہم دھوتے ہیں اس دُنیا میں

اندھوں کی بستی میں کب سے آئینے میں بیچ رہا ہوں
مجھ جیسے بھی عقل کے اندھے کم ہوتے ہیں اس دُنیا میں

خواب اگر جھوٹے ہوں بھی تو تعبیریں سچی ہوتی ہیں!
میری نیند اڑانے والے کب سوتے ہیں اس دُنیا میں

جب وہ ملے تھے زخم ہنسے تھے پات ہرے تھے پھول کھلے تھے
کتنی رُتیں آئیں بھی گئیں بھی ہم روتے ہیں اس دُنیا میں

کانٹوں کی برساتیں پا کر ہم نے تو گُل بانٹے لیکن
فصل خوشی کے کاٹنے والے غم بوتے ہیں اس دُنیا میں

صدیوں کی تہذیب کے خالق قبریں اپنی چھوڑ گئے ہیں!
اور ان کی قبروں کی مٹی ہم ڈھوتے ہیں اس دُنیا میں

وحید اختر

○

رہے وہ ذکر جو لب ہائے آتشیں سے چلے
چلے وہ دور جو رفتارِ ساتگیں سے چلے

ہزاروں سال سفر کر کے پھر وہیں پہنچے
بہت زمانہ ہوا تھا ہمیں زمیں سے چلے

خرد بنی رہی زنجیرِ خاکِ پا پھر بھی
جنوں کے جتنے بھی ہیں سلسلے ہمیں سے چلے

فرات جیت کے بھی تشنہ لب رہی غیرت
ہزار تیرِ ستم ظلم کی کمیں سے چلے

زمانہ ایک ہی رستے پہ لا کے چھوڑے گا
رواں ہے ایک ہی دھارا کوئی کہیں سے چلے

گمان و شک کے دوراہے پہ ہم سے آ کے ملے
وہ قافلے جو کسی منزلِ یقیں سے چلے

ہجومِ سنگِ ملامت رہِ وفا میں ملا
کٹے جو پاؤں ہم اس راہ میں جبیں سے چلے

ہمیں شکستِ حریفاں کا بھی ملال رہا
شکستہ دل جو ہم اس بزمِ دلنشیں سے چلے

تمام گمرہیاں دیر اور حرم میں پلیں
تمام سلسلۂ کفر اہلِ دیں سے چلے

وحید سیلِ قیامت نے راہ روکی تھی
جو بن کے اشک ہم اس چشمِ نازنیں سے چلے

شاذ تمکنت

○

کوئی امید کی صورت کوئی وعدہ کوئی آس
دینے والے نے دیا کتنے برس کا بن باس
دُور تک ڈھونڈتا جاؤں گا ترے نقش قدم
دُور تک سلسلۂ دشتِ تمنّا ہے اُداس
غرقِ دریا کیا ارباب کرم نے مجھ کو
چشمۂ ریگِ رواں تو نے جگائی تھی یہ پیاس
زندگی ایک نیستاں کے سوا کچھ بھی نہیں
کون پہنائے مرے شعلۂ عریاں کو لباس
اس نے پوچھا بھی نہیں مجھ سے نہ ملنے کا سبب
جس نے ملنے ہی پہ رکھی تھی محبّت کی اساس
گرہِ دل تھی، کھلی ہے تو رسن کی صورت
اے گلو رشکِ یقیں تھا مرے ناخن کا قیاس
شاذ بڑھ جائے نہ شائستگی کام و دہن
ڈر رہا ہوں کہ کہیں زہر ہی آجائے نہ راس

شاذ تمکنت

○

دل شکستہ ہوئے ٹوٹا ہوا پیمان بنے
ہم وہی ہیں جو تمھیں دیکھ کے انجان بنے

وہ بھی کیا فصل تھی کیا شعلۂ خرمن تھا بلند
وہ بھی کیا دن تھے کہ دامن سے گریبان بنے

چند یادیں مری زنجیرِ شب و روز بنیں
چند لمحے مرے کھوئے ہوئے اوسان بنے

ہائے کیا آس تھی کیا کیا نہ تمھیں بننا تھا
تم بنے بھی تو مرے درد کی پہچان بنے

اہل ساحل سے ندامت سی ندامت ہے کہ ہم
ایک کشتیٔ تہِ آب کا سامان بنے

ان کی دوری کا بھی احساں ہے مری سانسوں پر
مجھ سے اس طرح وہ بچھڑے کہ نگہبان بنے

گھر سجانا تو کجا شاذ لٹا بھی نہ سکوں
اُن سے شکوہ ہے کہ وہ کیوں مرے مہمان بنے

شمس الرحمٰن فاروقی

○

ان کا خیال ہر طرف ، ان کا جمال ہر طرف
حیرتِ جلوہ روبرو ، دستِ سوال ہر طرف

مجھ سے شکستہ پا سے ہے شہر کی تیرے آبرو
چھوڑ گئے مرے قدم نقشِ کمال ہر طرف

ہم ہیں جواں بھی پیر بھی ، ہم ہیں عدم بھی زیست بھی
ہم ہیں اسیرِ حلقۂ قولِ محال ہر طرف

نغمہ گرا ہے بوند بوند ، پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج!
اُڑتی پھرے ہے ذہن میں گردِ خیال ہر طرف

قلبِ حیات و موت سے مل نہ سکا کوئی جواب
پھینکا کیے ہیں گرچہ ہم سنگِ سوال ہر طرف

شہریار

○

آنکھوں سے خوں چھلکتا رہا دل دُکھا رہا
اور اس پہ بھی کسی سے نہ مجھ کو گِلا رہا

یا عشق تھا اُداسی و تنہائی سے مجھے
یا وقت ایک موڑ پہ صدیوں رُکا رہا

کیا جانے کس خیال میں تھے ناخدائے شب
کل چاند تیرگی کے بھنور میں پھنسا رہا

دل کے ورق پہ لکھا تھا جو کچھ سو مٹ گیا
لیکن جبیں پہ جو بھی لکھا تھا لکھا رہا

سب ہم سفر شہید ہوئے راہِ شوق میں
پرچھائیوں کے وار سے اک میں بچا رہا

شہریار

○

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

خود پشیمان ہوئے نے اُسے شرمندہ کیا
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے •

بشیر بدر

○

نیزوں نے مجھ کو جیسے زمیں سے اٹھا لیا میں تیرے نرم سینے سے جس دم جدا ہوا

وہ پھول، تیرے ہونٹوں کے چھونے سے جو کھِلا وہ پھول۔ اور جون کی آتش بھری ہوا

سفّاک آنکھیں۔ تیز ٹرک کی۔ مجھے لگا اک موت کا فرشتہ تھا، ہنستا گذر گیا

جیسے کہ سارے شہر کی بجلی چلی گئی آنکھیں کھُلی کھُلی تھیں۔ مگر سوجھتا نہ تھا

سنّاٹے آئے درجوں میں جھانکا۔ چلے گئے گرمی کی چھٹیاں تھیں۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا

باتیں کہ جیسے پانی میں جلتے ہوئے دیے کمرے میں نرم نرم اُجالا سا بھر گیا

اک لڑکی۔ ایک لڑکے کے کاندھے پہ سوئی تھی میں اُجلی دھندلی یادوں کے کہرے میں کھو گیا

ٹہنی گلاب کی مرے سینے سے آ لگی جھٹکے کے ساتھ کار کا رُکنا غضب ہوا

الفاظ۔ پُل صراط پہ جیسے گناہگار

تلوار سے بھی تیز چمکتی ہوئی صدا

ڈاکٹر محمد حسن

کنتھا کلی

کردار :- چھ [دو عورتیں، ایک نوجوان ایک معمّر
چار مرد / ایک عمر رسیدہ سیٹھ ۶۰ سال، ایک جوان سامنت (۳۵) ایک نوجوان (۲۹) ایک عمر رسیدہ ملا]

: یہ ہار !
: دیکھ لیا۔
: یہ موتیوں جڑا جھومر!
: یہ بھی دیکھ لیا۔
: یہ جڑاؤ بازو بند !
: ہاں ہاں سامنت! میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ تم بھی نرتکی سمجھ کر زیور سے میرا مول کرنا چاہتے ہو۔
: نہیں !
: تو پھر تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔
: کنتھا کلی! صرف کنتھا کلی! ایک اور دنیا کی اکلوتی کنتھا کلی!
: سامنت! تم سچ مچ زہریلا ناگ ہو اور سونا تمھارا زہر ہے مگر میں (ہنستی ہے) میں وش کنیا ہوں جو زہر پی پی کر پلی ہے اس پر زہر کا اثر نہیں ہوگا۔
: سچ مچ تم بہت عجیب ہو کنتھا کلی! نرتکی ہو کر روپے سے بھاگتی ہو۔ سندری ہو کر پیار سے ڈرتی ہو۔ میں تمھارے آگے زیور اور چاندی کے ڈھیر لگاتا ہوں تم انھیں ٹھکرا کر گزر جاتی ہو۔ میں تمھارے آگے دل کا خالی پیالہ لے کر بھیک مانگتا ہوں تم وہ پیالہ میرے ہاتھ سے چھین کر توڑ ڈالتی ہو۔ بولو! دیوی، تمھیں کیسے پوجوں۔

کتھا کلی: سامنت ایک آواز ایسی بھی ہوتی ہے جس سے بڑی کوئی آواز نہیں ہوتی اور وہ آواز ہے دل کی آواز! اور میرا دل تمھارے سونے کے زیور، ہیرے جواہر نہیں مانگتا۔ وہ جو کچھ مانگتا ہے وہ تم دے نہ سکو گے۔

سامنت: بولو، کیا مانگتا ہے وہ! بھگوان قسم اگر تم آسمان سے تارے بھی توڑ لانے کو کہو گی ——

کتھا کلی: میں نہیں کہوں گی۔

سامنت: بتاؤ! مجھے بتاؤ۔ کتھا کلی میں تمھارے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دوں گا۔

کتھا کلی: اس سے کچھ نہیں ہو گا سامنت۔ سب بے کار ہے۔ میرا دل خالی ہے اسے زیور نہ بھر سکے گا۔

سامنت: اسے میرا پیار بھر دے گا۔

کتھا کلی: شاید نہیں۔ پیار بہت بڑا لفظ ہے سامنت۔ وہ ایک نرتکی کے ہونٹوں کے لیے نہیں ہے۔

سامنت: (ہنستا ہے) شاید تم نے کبھی کوئی چوٹ کھائی ہے۔

کتھا کلی: شاید!

سامنت: تبھی تو ایسی اُداسی کی باتیں کرتی ہو۔

کتھا کلی: نہیں تو میں ہمیشہ ہنستی ہی رہتی ہوں۔

سامنت: کون تھا وہ!

کتھا کلی: یہ دنیا عجیب ہے سامنت۔ سچ مانو یہاں لوگ کیول اپنی پرچھائیوں ہی سے پیار کرتے ہیں۔ ان کو طرح طرح کے رنگ برنگے نام دیتے ہیں۔ یہاں ہر ایک اپنا ہی پجاری ہے۔

سامنت: تم بھی!

کتھا کلی: کیوں بھولتے ہو کہ نرتکی بھی انسان ہی ہوتی ہے۔

سامنت: میری بات مانو کتھا کلی۔ زندگی بہت بڑی دولت ہے اسے اس طرح نہ لٹاؤ۔ پچھلے زمانے کو بھلا دو یہ آنے والا دن کتنا خوبصورت ہے۔

کتھا کلی: وقت بڑا ظالم ہے سامنت۔ سب کچھ بھلا دیتا ہے اور پھر بھی سب کچھ جوں کا توں رہتا ہے۔ نئی لکیریں اُبھرتی ہیں مدھم ہوتی ہیں مٹ جاتی ہیں۔ وقت نہیں پالتا ہے زخمی کرتا ہے اور نہیں نکل جاتا ہے۔

سامنت: اُداسی میں تم کتنی اچھی لگتی ہو۔

کتھا کلی: اپنی خوشی اور دوسرے کی اُداسی ہر ایک کو اچھی لگتی ہے سامنت!

سامنت: میرا ہاتھ پکڑ لو کتھا کلی میں تمھیں راج سنگھاسن پر بٹھاؤں گا۔ اس نگری سے دور ہم اپنا راج محل سجائیں گے وقت وہاں سے دبے پاؤں گزرا کرے گا۔

کتھا کلی: میرے ہاتھ گندے ہیں سامنت! پاپی ہیں!
سامنت: مجھے پھر بھی بھلے لگتے ہیں۔
کتھا کلی: بھلا اور بُرا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔
سامنت: بہت کچھ ہوتا ہے۔ ان خوبصورت ہاتھوں سے زہر بھی پینا پڑے تو مسکرا کر پیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کتھا کلی تم ایک بار میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں ان اندھیری گلیوں سے نکال لے چلوں۔ تمھیں اپنے گھر کی سلطنت بخشوں، عزت اور آبرو بخشوں
کتھا کلی: مجھے معلوم ہے کتھا کلی ایک بے آبرو زندگی ہے، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بڑے ساہوکار کے بیٹے ہو، لکھ پتی ہو، آبرو والے ہو۔
سامنت: میں تمھیں آبرو دوں گا۔
کتھا کلی: بہت مشکل ہے۔
سامنت: زندگی دوں گا۔
کتھا کلی: ناممکن۔
سامنت: روپے کا چمتکار تم نے ابھی نہیں دیکھا۔
کتھا کلی: یہ بات اس سے کہہ رہے ہو جو زندگی بھر روپے کی تال پر ناچتی رہی ہے مگر جس کی آتما کو روپیہ آج تک مول نہ لے سکا۔
سامنت: تم بہت ہوشیار ہو، سمجھ دار ہو، خوبصورت ہو، تمھیں ان اندھیری گلیوں میں رکھنا پاپ ہے۔
کتھا کلی: کوڑھیوں کو کون مسند پر بٹھاتا ہے سامنت۔
سامنت: روپیہ!
کتھا کلی: بھولتے ہو۔
سامنت: کبھی کبھی کی بھول بھی بڑی قیمتی ہوتی ہے، انمول ہوتی ہے۔
کتھا کلی: سوچ لو، میرا ساتھ بڑا مہنگا ہے۔ کہیں تم میرے بوجھ سے ٹوٹ تو نہ جاؤ گے، بکھر تو نہ جاؤ گے۔ جس سماج میں مجھے لے جانا چاہتے ہو وہ مجھے برداشت کر سکے گی۔ کہیں وہ تمھیں بھی میرے ساتھ کوڑے گھر پر تو نہ پھینک دے گی۔
سامنت: میرے بازو میں اتنی طاقت ہے کتھا کلی۔ میرے اوپر بھروسہ تو کرو۔
کتھا کلی: (ہنستی ہے) یہ دنیا بڑی عجیب ہے سامنت۔ اسی آکاش کے نیچے میں نے یہ سبق سیکھا تھا کہ کسی پر بھروسہ

بکہ آج اسی آکاش کے نیچے تم مجھے بھروسے کا پاٹھ پڑھا رہے ہو۔

سامنت: تم عجیب ہو۔

کتھا کلی: شاید! مجھے نفرت کے خزانے ملے ہیں سامنت اب میرا دل اس سے بھر چکا ہے اور زیادہ نفرت اب نہ جھیل سکوں گی جب تم اپنی دنیا سے مجھے آواز دیتے ہو تو میرے اندر کی استری، میرے من میں چھپی ہوئی ماں جاگتی ہے، وہ تمھاری طرف لپکتی ہے دوڑتی ہے مگر میں جانتی ہوں تمھاری یہ عجیب دنیا میرے لیے نہیں ہے۔

سامنت: تمھیں نفرت نہیں ملے گی کتھا کلی ملے گی تو تم اسے ٹھوکر مار کر گزر سکتی ہو۔

کتھا کلی: اتنی شکتی اپنے میں نہیں پاتی۔

سامنت: شکتی میں دوں گا۔ وہ شکتی جو دنیا کو ٹھکرا سکے، اس پر فتح پا سکے۔

کتھا کلی: جب تم بولتے ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے میں خواب میں کوئی خوبصورت گیت سن رہی ہوں۔

سامنت: وقت دبے پاؤں گزر رہا ہے کتھا کلی، اور جوانی بھی۔

کتھا کلی: زندگی بھی۔

سامنت: ہاں زندگی بھی! جلد فیصلہ کرو۔ آؤ میرے ساتھ ہنستی ہوئی میری دنیا میں آؤ، میرا پیار تمھارے پاپ دھو دے گا۔ میرا تیاگ تمھیں پاکیزہ کر دے گا۔

کتھا کلی: تمھارے پتا جی کی خوفناک آنکھیں مجھے نگل جائیں گی۔

سامنت: ناممکن۔

کتھا کلی: تمھاری ماں بہنوں کا غصہ اور جلن مجھے جلا دے گی۔

سامنت: کبھی نہیں۔

کتھا کلی: اور جب میرا روپ مجھ سے بچھڑ جائے گا تو تم بھی منہ موڑ کر چلے جاؤ گے، بھول جاؤ گے کہ تم نے مجھے اپنی دنیا میں وچن دے کر بلایا تھا۔

سامنت: ہرگز نہیں۔

کتھا کلی: تمھاری بات کا کیسے بھروسہ کروں سامنت۔ زندگی میں کبھی کسی نے کسی کو ایسا سہارا نہیں دیا۔ ایسی انہونی بات کیسے ہو جائے گی۔ مجھے وشواس نہیں ہوتا، بالکل وشواس نہیں ہوتا۔

سامنت: درست۔ ڈر سب سے بڑا پاپ ہے۔ آؤ، لو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ لو۔ لو میرا ہاتھ پکڑ لو اور اس دلدل سے نکل آؤ۔

کتھا کلی: (HYSTERICAL) نہیں! نہیں!! تم چلے جاؤ۔ سامنت! تم میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ مجھے سوچنے دو۔

مجھے سوچنے دو۔ مجھے اچھی طرح سوچنے دو۔ مجھے اس طرح پاگل نہ بناؤ۔ سامنت تم میرے سامنے سے چ
جاؤ۔ بھگوان کے لیے چلے جاؤ۔

سامنت: اچھا۔ میں جاتا ہوں — پھر آؤں گا [زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز]

کتھاکلی: چلے گئے۔ سب چلے گئے۔ اب خاموشی ہے، ہر طرف خاموشی ہے، ہر طرف تنہائی کی خوشبو پھیلی ہو
ہے، ہر طرف کتھاکلی کی پرچھائیاں ہیں، ہر طرف پرچھائیاں میری پرچھائیاں — ایک عورت، ایک
ماں، ایک نرتکی —!!! تیرا راستہ کدھر جاتا ہے کتھاکلی — تیری منزل کہاں ہے؟!

[طبلے پر تھاپ پڑتی ہے]

کتھاکلی: کون ہے — اوہ استاد جی۔

استاد: سیٹھ برج موہن آئے ہیں۔

کتھاکلی: برج موہن؟!

استاد: ہاں بیٹی — کچھ سوچ میں ہو کیا؟

کتھاکلی: بیٹھ جاؤ استاد! تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

استاد: خیر تو ہے۔ بٹیا کا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔

کتھاکلی: باہر موسم کیسا ہے استاد جی؟

استاد: لو چل رہی ہے۔

کتھاکلی: تم نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے مجھے بتاؤ استاد جی۔ کیا باہر کی دنیا بہت بری ہے۔ کیا وہ نرتکی کو ناچتے ہی دیکھ سکتی
ہے۔ اس کو گرہستن کے روپ میں کبھی نہیں دیکھتی۔

استاد: کیوں پوچھتی ہو بٹیا؟

کتھاکلی: تم بھی اس کی وجہ پوچھتے ہو۔ کیا سب مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ ان سب کو فقط عورت کا جسم ہی نظر
آتا ہے، اس کی آتما دکھائی نہیں دیتی؟

استاد: کیسی باتیں کر رہی ہو؟

کتھاکلی: یہ اس لیے پوچھتی ہوں استاد کہ میں بھی ایک عورت ہوں میری آتما ہے، ماں کی آتما، بہن کی آتما، بیٹی کی آتما
میرا دل بھی چھوٹا سا گھر آنگن مانگتا ہے میرے ہونٹ بھی لوریوں کے لیے ترستے ہیں۔ مجھے بھی وہ دنیا پکارتی
ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی نہیں برتا۔

استاد: میں سمجھ گیا — تم آج عورت بن گئی ہو بٹیا۔ فقط عورت!

کتھا کلی : بہت بُری بات ہے کیا؟
استاد : نہیں۔ مگر دنیا بڑی ظالم ہے۔ وہ گناہوں کی قیمت چکا دیتی ہے بٹیا۔ گناہوں کو کبھی بخشتی نہیں۔
کتھا کلی : میں پاپ کی دیواروں میں نہیں رہوں گی۔ مجھے بھی تو جینے کا حق ہے۔ مجھے بھی عورت کی طرح سانس لینے کا ادھیکار ہے۔ برج موہن سے کہو اب کتھا کلی نہیں ناچے گی۔ اب کتھا کلی کے دروازے گاہکوں کے لیے بند ہو جائیں گے۔ آج سے کتھا کلی مرگئی ـــــ سنتے ہو کتھا کلی مرگئی۔
[شہنائی کی آوازیں۔ آہستہ آہستہ شہنائی کی آوازیں مدھم ہوتی جاتی ہیں]
سامنت : مبارک ہو۔ کتھا کلی۔ نئی زندگی مبارک ہو۔
کتھا کلی : تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے سامنت۔ میں کس منہ سے تمھیں دھنیہ باد دوں۔
سامنت : اب تمھاری دنیا کو تمھارے قدموں میں لا جھکاؤں گا کتھا کلی۔
کتھا کلی : کیا اب بھی مجھے کتھا کلی ہی کہو گے؟
سامنت : مجھے یہ نام بھلا لگتا ہے کتھا کلی کا ناچ بھی تو پاپ اور پن، نیکی اور بدی کی لڑائی کو پیش کرتا ہے۔ تم بھی پاپ سے پُن کی طرف آئی ہو۔ گناہ سے اچھائی کی طرف آئی ہو۔
کتھا کلی : سامنت! میرے اچھے سامنت!!
سامنت : لو، آج میں پھر سے یہ زیور تمھیں پہناؤں گا۔ آج تو تم انکار نہ کر پاؤ گی۔ یہ ہے تمھارا جھومر، یہ ہے گلوبند یہ ہے زمرد سے جڑا ہوا ٹیکا۔ یہ تمھارے ہاتھوں کے کنگن۔ آج تمھیں سچ مچ دلہن بنا کر دیکھوں گا۔
کتھا کلی : میں تمھاری داسی ہوں!
سامنت : کیسی دقیانوسی باتیں کرنے لگی ہو تم۔
کتھا کلی : میں سچ کہتی ہوں سامنت۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ تم اتنے اچھے ہو (ایک قہقہے کی آواز) یہ کون ہنس رہا ہے۔
سامنت : میرا بھائی ہے۔
کتھا کلی : اتنی رات گئے اس طرح کیوں ہنستا ہے۔
سامنت : پاگل ہوگیا ہے بے چارا۔ اس بے چارے کو سب سے اوپر والے کمرے میں بند رکھا جاتا ہے (دوسرا قہقہہ) اچھا ہوا میں تو خود ہی تم سے کہنے والا تھا کہ ادھر بھول کر بھی نہ جانا۔
کتھا کلی : میرے جانے نہ جانے سے کیا ہوتا ہے۔
سامنت : پاگل ہے نا۔ نہ جانے کیا کہہ بیٹھے۔ تمھارا من شیشے سے زیادہ نازک ہے اسے اسی طرح حفاظت سے

دیکھنا چاہتا ہوں ۔

کتھا کلی : وہ تمھارا بھائی ہے ، میرا بھی بھائی ہوا نا ۔

سامنت : مگر پاگل ہے ۔

کتھا کلی : پاگل سہی مگر تمھارا بھائی تو ہے اس کی سیوا بھی میرا دھرم ہے

سامنت : نہیں کتھا کلی ، نہیں ، تم ادھر نہ جاؤ گی ، کبھی نہیں جاؤ گی ۔

کتھا کلی : ارے تم تو خفا ہو گئے ۔ نہیں جاؤں گی ۔ کبھی نہیں جاؤں گی ۔ لو اب تو خوش ہو [تیسرا قہقہہ]

[دروازے پر دستک]

کتھا کلی : دروازہ کھولو نا ۔

سامنت : ماں جی ! آپ !!

کتھا کلی : ماں جی !

سیٹھانی : ہاں بیٹا ۔ ناشتہ تیار ہو گیا ہے ۔ جیتی رہو بیٹی ۔ سدا سہاگن رہو ۔ ارے رے پاؤں نہ چھوؤ ۔ سدا سکھی رہو ۔

کتھا کلی : آپ لوگوں کا دل بہت بڑا ہے ۔

سیٹھانی : بیٹھو ! ارے بھئی ہم لوگوں سے جس کسی کا اُدھار ہو سکتا ہے کرتے ہیں ۔ سامنت کے پتا تو ساری عمر سماج کلیان ہی کا کام کرتے رہتے ہیں اور سامنت کو تم دیکھ ہی رہی ہو ۔ جب سے اس نے تمھارا ذکر کیا سیٹھ جی تو اسی دن سے تمھارا نام جپ رہے ہیں ۔ اور سچ پوچھو تو بھئی جیسا تمھیں سُنا تھا ویسا ہی دیکھا ۔ ساکشات لکشمی ہو لکشمی ۔

کتھا کلی : میں آپ کی سیوا کر سکوں تو میرا مان بڑھے گا ۔ آپ نے مجھے پناہ دی ، ایک پاپن کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا یہ تو بہت بڑا احسان ہے ۔

سیٹھانی : ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹی ۔ چلو جلد چل کر ناشتہ کرلو ۔

سامنت : کیا ناشتہ تیار ہو گیا ہے ۔

سیٹھانی : ہاں ـــــ اور بیٹا سامنت ۔ تمھارے پتا جی نے تمھیں بلایا ہے ۔

سامنت : کوئی خاص بات ہے کیا ؟

سیٹھانی : اے لو ، اُلٹا مجھ سے پوچھتے ہو ۔ بھلا تم باپ بیٹوں کی باتیں میں کیا جانوں ۔

سامنت : اچھا تو میں جاتا ہوں ۔

سیٹھانی : تم دونوں کی جوڑی تو سچ مچ چندا اور سورج کی جوڑی ہے ۔ بھگوان نے اپنے ہاتھ سے یہ بر اُتارا ہے ۔ میرے ایسے

بھاگیہ کہاں تھے کہ ایسی بہو ملے۔ یہ تو پچھلے جنم کا کوئی پُن کام آگیا۔ بیٹی اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو ڈالو۔

کتھاکلی : ماں جی! آپ سچ مچ دیوی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا ماں جی کہ یہ دنیا اتنی اچھی ہے۔ یہ گرہست جیون اتنا ہے۔ میں نے تو اس کا فقط کالا روپ ہی دیکھا تھا۔

سیٹھانی : آؤ چلو ناشتے پر چلیں۔

CHANGE OVER

سامنت : آپ نے مجھے بلایا تھا؟

سیٹھ : بیٹھو سامنت۔ بات یہ ہے کہ پولیس نے ہر طرف چھاپے ارنے شروع کر دیے ہیں۔ خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ گوداموں کی قلت ہے۔ ایسے گودام ملنا مشکل ہے جہاں چیزیں اکٹھی کی جا سکیں۔ ہر وقت ہم چوکس رہنا چاہیے۔

سامنت : ضرور۔ ہم چوکس رہیں گے۔

سیٹھ : دواؤں کی قیمت بڑھ رہی ہے۔ ہمیں اپنے اسٹاک ہندوستان کے کونے کونے میں بانٹ دینے ہیں

سامنت : مجھے کیا کرنا ہے۔

سیٹھ : اب زیادہ دیر کا کام نہیں ہے۔ کتھاکلی پر پولیس کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوگا۔

سامنت : وہ یہ کام کر سکے گی۔

سیٹھ : تم جانتے ہو کہ اسے یہی کام کرنا ہے سامنت۔ وہ اسی کام کے لیے یہاں رکھی گئی ہے۔

سامنت : جانتا ہوں۔

سیٹھ : اسے کل ہی روانہ ہو جانا چاہیے۔

سامنت : مگر اتنی جلدی۔

سیٹھ : ہاں —— جلدی ہی کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ پولیس ہمارے گوداموں پر چھاپا مار سکے ہمیں ہوشیاری سے کام پورا کر لینا چاہیے۔

سامنت : مگر میں نے اسے ابھی کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔

سیٹھ : نہیں بتایا ہے تو بتا دو —— یہ ضروری ہے

سامنت : مگر ——

سیٹھ : مگر کیا؟ سامنت، بزدل نہ بنو۔ اب اس کے سامنے راستہ ہی کیا ہے۔ یا وہ اس دلدل میں لوٹ کر واپس چلی جائے گی یا تمھاری ہر بات مانے گی، ہر بات ماننی پڑے گی۔

سامنت: اور اگر وہ یہ کام نہ کر سکی۔
سیٹھ: اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔
سامنت: اگر ہمارا بھید کھل گیا۔
سیٹھ: (ہنستا ہے) اس کا بھی انتظام کیا جا سکتا ہے۔ چیونٹی جب کاٹنے لگتی ہے تو کچل دی جاتی ہے۔
سامنت: پتا جی!
سیٹھ: ڈرتے ہو؟ نہیں ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ پیسہ صرف بہادروں کے پاس آتا ہے جو اس کی خاطر جان جوکھم میں ڈال سکیں، جو خطرے مول لے سکیں ——— جاؤ، اسے تیار کرو۔
سامنت: تیار کروں گا ـ ضرور تیار کروں گا۔
سیٹھ: اچھا تو میں چلتا ہوں۔

CHANGE OVER

کملا کلی: رات ہوگئی ابھی تک نہیں آئے ... بہت رات ہوگئی۔ ماں جی بھی سوگئیں۔
دور سے آواز: پانی ... پانی ... پانی
کملا کلی: یہ کس کی آواز ہے۔ اتنی رات گئے کون کراہ رہا ہے۔
آواز: پانی ... پانی ... پانی
کملا کلی: کون ہے ... (ذرا زور سے آواز دیتی ہے) کون ہے۔
آواز: پانی ... پانی ... پانی۔
کملا کلی: یہ تو سامنت کا پاگل بھائی معلوم ہوتا ہے۔ پانی مانگ رہا ہے۔ کون پانی پلائے گا اسے؟
آواز: کوئی پانی پلا دو ... پانی
کملا کلی: چلو میں ہی پلا دوں گی ... کہاں ہے صراحی اور گلاس (پانی انڈیلنے کی آواز) چلو پلائے دیتی ہوں۔ مگر پاگل آدمی ہے۔ رات کا وقت ہے اگر مار بیٹھا تو کوئی بچانے بھی نہیں آئے گا۔
آواز: پانی ... پانی ... پانی۔
کملا کلی: پھر بھی سامنت کا بھائی ہے نا، اس کی سیوا میرا دھرم ہے ... یہ زینہ کیسا ٹیڑھا میڑھا ہے، اندھیرا بھی بہت (تھوڑی دیر بعد زینہ طے کر لینے کے بعد) لو بھیا، پانی پی لو۔
آواز: کملا کلی! تم آگئیں۔
کملا کلی: تم مجھے جانتے ہو ——— میں تمھاری بھابی ہوں۔

وہی آواز: تمھیں کون نہیں جانتا کتھا کلی۔
کتھا کلی: تم بھی جانتے ہو۔
وہی آواز: میں کیسے نہیں جانتا۔
کتھا کلی: تم نے پانی پیا نہیں ــــ پانی پھینک رہے ہو۔ ارے تم تو اتنی دیر سے پانی پانی چلا رہے تھے۔
وہی آواز: میں صرف تمھیں یہاں بلانا چاہتا تھا کتھا کلی۔
کتھا کلی: آخر کیوں؟
وہی آواز: مجھے آتما سے پیار ہے تمھاری آتما مہان ہے ماں۔
کتھا کلی: مگر میں تو ــــ
وہی آواز: ہاں تمھارا جسم پاپی ہے مگر تمھاری آتما پاپی نہیں ہے۔ وہ تو کنول کی طرح نردوش ہے اور تم جن لوگوں میں گھری ہوئی ہو ان کے جسم پاپی نہیں ہیں مگر ان کی آتمائیں پاپی ہیں، مجرم ہیں۔ ان کے ہونٹ مسکراتے ہیں۔ ان کے چہروں پر مہاتماؤں کی سی نرمی ہے مگر ان کے دل کالے ہیں۔ بھاگ جاؤ۔ کتھا کلی، یہاں سے بھاگ جاؤ۔
کتھا کلی: بھاگ جاؤں؟
وہی آواز: ہاں ــــ یہاں سے جتنی دور بھاگ سکو بھاگ جاؤ۔ تم انھیں نہیں جانتیں۔
کتھا کلی: تم کیا بتانا چاہتے ہو؟
وہی آواز: سچائی ــــ بے رحم سچائی۔
وہی آواز: یہ لوگ مہنگائی اور چور بازاری کر رہے ہیں۔ انھوں نے ضرورت کی ساری چیزیں اپنے گوداموں میں جمع کر لی ہیں ہر طرف سے سامان آ رہا ہے قیمتیں بڑھ جائیں گی، ہندوستان کے ان گنت آدمی ان چیزوں کے لیے ترستے ہوئے مرجائیں گے اور یہ لوگ ان کے خون سے روپیہ بنائیں گے، ان کے آنسوؤں سے سونا تیار کریں گے۔ اور تم ــــ
کتھا کلی: میں کیا کروں؟ میں کیا کرسکتی ہوں۔
وہی آواز: تم اسی لیے یہاں لائی گئی ہو کتھا کلی۔ یہ سب تمھیں اس کاروبار میں پھنسانا چاہتے ہیں تمھارے ہاتھوں افیم کوکین اور سونے کو ادھر اُدھر کرنا چاہتے ہیں۔ تمھیں اپنے جال میں اس طرح پھانس لینا چاہتے ہیں کہ تم اس سے پھر نہ نکل سکو۔
کتھا کلی: آخر کیوں؟
وہی آواز: اس لیے کہ تم عورت ہو۔ اس لیے کہ تم پہ پولیس کو آسانی سے شبہ نہ ہوگا۔
کتھا کلی: تو یہ سب دھوکا ہے۔

وہی آواز: ہاں یہ سب دھوکا ہے۔

کتھاکلی: یہ نہیں ہوسکتا۔ تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔ تمھاری باتوں پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے، پاگل

وہی آواز: مجھے اس لیے پاگل بنا دیا گیا ہے کیونکہ میں ان کے بھید جانتا ہوں، ان کے سارے بھید جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اس عمارت کے تہہ خانوں میں گودام ہیں اور ان گوداموں میں سونا اور اناج بھی بھرا ہے۔ افیم اور کوکین بھی بھری ہوئی ہے۔ ضروری دوائیں بھری ہوئی ہیں، وہ دوائیں جن کی آج ملک کو ضرورت ہے جن کی خاطر آج بھارت کے نہ جانے کتنے سپوت ایڑیاں رگڑ کر دم توڑ رہے ہیں [لہجے میں تبدیلی]
کتھاکلی تم دیوی ہو، جس مٹی، پتھر یا دھات سے دیویوں کی مورتیاں بنتی ہیں وہ مٹی بھی گندی ہوتی۔ وہ پتھر بھی بھدے اور میلے ہوتے ہیں، وہ دھات بھی تیزاب میں پڑی ہوتی ہے مگر اس سے تو دیا کا کیول جسم ہی بنتا ہے اس کی آتما تو گندی نہیں ہوتی۔

کتھاکلی: مجھے دیوی کہتے ہو؟!

وہی آواز: اپنی آتما کو گندہ نہ ہونے دینا۔ ان ہزاروں لاکھوں کا خون تمھاری گردن پر نہ ہو، ماں جو سامنت اور سیٹھ جی کی تجوریوں کی وجہ سے مر رہے ہیں ـــ ہندوستان کی مٹی میرے تمھارے سب کے بدن میں بسی ہے، انسانیت کی جوت سے تمھاری زندگی ہمارا تمھارا سب کا جیون اندھیرے سے بچ سکا ہے ہندوستان سے غداری نہ کرنا ماں! انسانیت سے غداری نہ کرنا ماں!!

کتھاکلی: تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ مجھے ماں کہتے ہو۔ مجھے ہندوستان اور انسانیت کا واسطہ دیتے ہو۔

وہی آواز: پاگل جو ٹھہرا۔ میں نے یہی سیکھا ہے کہ ہر عورت دیوی کا روپ ہوتی ہے، ماں کا روپ ہوتی ہے ـــ بولو میری بات مانوگی ماں؟

کتھاکلی: کون سی بات ہے تمھاری۔

وہی آواز: بس اتنی سی بات ہے کہ آتما کے پاپیوں کو سزا ملنی چاہیے۔ جن کے جسم پاپی ہیں انھیں سب دیکھ لیتے ہیں ماں، مگر جن کی آتما پاپی ہے انھیں کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ بس میں دیکھ پاتا ہوں۔ ان کے چہروں سے نقاب نوچ کر پھینک دو، ان کے جسموں سے رنگ برنگے قیمتی کپڑے اتار ڈالو، ان کی آنکھوں کی نقلی چمک، ان کے چہروں کا جھوٹا بھولاپن، ان کی زبانوں کی مٹھاس، ان کے فریب دینے والے بہروپ سب کچھ نوچ ڈالو جلا دو۔ مٹا ڈالو ـــ جاؤ بھاگ جاؤ ماں۔ کوئی سن لے گا۔ یہاں سچائی سب بڑا پاپ ہے۔
(قہقہہ لگاتا ہے)

CHANGE OVER

(گھنٹہ تین بجاتا ہے)

کتھا کلی: تین بج گئے۔ سامنت ابھی تک نہیں آئے۔

(دروازے پر دستک)

سامنت: (نشے میں بہکتا ہوا) بہت رات ہو گئی کتھا کلی!

کتھا کلی: سامنت، یہ کیا؟ تم نے شراب پی ہے۔

سامنت: ہاں!

کتھا کلی: کیوں؟

سامنت: کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کتھا کلی جن کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کتھا کلی: کون سی بات ہے وہ؟ مجھے بتاؤ۔

سامنت: تم بھولی ہو، بہت بھولی ہو کتھا کلی؟ تم نے میرے اوپر وشواس کر لیا۔ تم نے سب کچھ چھوڑ کر مجھے اپنا لیا مگر مجھے تم سے کام لینا ہے، بہت بڑا کام لینا ہے۔

کتھا کلی: تمھاری سیوا میرا دھرم ہے سامنت۔

سامنت: جانتی ہو وہ کام کیا ہے؟

کتھا کلی: نہیں جانتی —!

سامنت: میری بزنس پارٹنر بن جاؤ

کتھا کلی: بزنس؟ کون سا بزنس!

سامنت: ہم لوگ بیوپاری ہیں۔ ہم چیزیں جمع کرتے ہیں SMUGGLE کرتے ہیں۔ ان کی قیمتیں بڑھا چڑھا کر بیچتے ہیں۔ ہمارے چھپے ہوئے گودام ہیں۔ ہمیں ایسے ایجنٹ چاہئیں جن پر پولیس کو شبہ نہ ہو۔ تم ہماری ایجنٹ بنو گی۔

کتھا کلی: میں تمھاری پتنی ہوں۔

سامنت: اور ہماری شادی کی بنیاد اسی کام پر ہے۔ سمجھیں؟

کتھا کلی: میں نے تم سے شادی کی ہے سامنت! بیوپار سے نہیں۔

سامنت: مگر میں نے بیوپار سے شادی کی ہے، کتھا کلی سے نہیں۔

کتھا کلی: اور اگر میں انکار کر دوں؟

سامنت: انکار؟! (قہقہہ لگاتا ہے) ہر ایک کو اتنی طاقت دی جاتی ہے جتنی وہ برداشت کر سکے، تم

اتنی طاقت نہیں ہے کتھاکلی ہیں تمھیں اپنے ہاتھ کی چھنگلیا سے مسل ڈالوں گا۔ سمجھیں۔

کتھاکلی: پولیس مجھے پکڑے گی؟

سامنت: تو کیا ہوا؟

کتھاکلی: نہیں نہیں مجھ سے یہ دھندا نہ ہوگا۔

سامنت: ہوشیار عورتیں ہمیشہ نہیں سے بات شروع کرتی ہیں اور ہاں پر ختم کرتی ہیں۔

کتھاکلی: نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں انکار کرتی ہوں۔

سامنت: پاگل نہ بنو کتھاکلی۔ اب تمھارے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کیا تم پھر اسی دلدل کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہو۔ کیا تم پھر سے نرتکی بن کر اپنے کو تماشا بنا دینا چاہتی ہو۔ نہیں کتھاکلی۔ اب سارے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ اب کوئی راستہ نہیں ہے۔ نہیں کا وقت نکل چکا۔ اب نہیں کے معنی جانتی ہو۔

کتھاکلی: نہیں؟!

سامنت: نہیں کے معنی ہیں موت! تمھاری موت۔

کتھاکلی: (ہلکی سی چیخ) موت!! نہیں نہیں میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

سامنت: تو پھر کل رات کو ہمارے گوداموں سے خفیہ مال لے کر تم اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤگی۔ کل رات کو ـــ اچھا میں چلا۔

کتھاکلی: (خود کلامی) کل رات کو! کل رات کو!! بھگوان تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ بھگوان! تو نے مجھ سے کیوں منھ موڑ لیا ہے۔ میں امرت سمجھ کر جس طرف بھاگی تھی وہ زہر نکلا۔ جس کو میں نے دیوتا سمجھا تھا وہ شیطان نکلا۔ میں جسے زندگی سمجھ رہی تھی وہ موت کی پرچھائیں تھی۔ میں کیا کروں بھگوان؟! میں کیا کروں!

CHANGE OVRE

[دروازے پر دستک ہوتی ہے]

کتھاکلی: استاد جی

استاد جی: ہاں بیٹی۔ تمھیں دیکھنے چلا آیا۔

کتھاکلی: سب اچھے تو ہیں

استاد جی: میرا بڑا لڑکا بہت بیمار ہے۔

کتھاکلی: دوا کر رہے ہو۔

استاد جی: کیا دوائی کریں بیٹیا۔ شہر کے بازاروں میں دواؤں کا کال ہے ہر جگہ چور بازاری ہو رہی ہے۔ بازار میں دوا نہیں ملتی۔

کتھا کلی: تو کیا کر رہے ہو

استاد جی: جو شہر میں سب لوگ کر رہے ہیں۔ خدا پر بھروسہ۔

کتھا کلی: ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔

استاد جی: اس کے سوا ترکیب بھی کیا ہے۔

کتھا کلی: استاد جی۔ میرا ایک کام کرو گے۔ میرے پاس بہت کم وقت ہے۔ میرا یہ خط کسی پولیس تھانے تک پہنچا دو۔

استاد جی: ضرور۔

کتھا کلی: میں یہ جرم نہ ہونے دوں گی۔ یہ پاپ ہرگز نہیں ہوگا۔

استاد جی: کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی۔

کتھا کلی: کچھ نہیں۔ اب تم جاؤ استاد جی!

CHANGE OVER

(بارہ بجتے ہیں)

سامنت: رات کے بارہ بج گئے

کتھا کلی: ہاں سامنت۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی۔

سامنت: مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم نے میری بات مان لی۔ دیکھنا ہزاروں کے وارے نیارے ہوں گے۔ ان گوداموں سے لاکھوں کروڑوں روپے کی دولت کمائیں گے اور زندگی بھر عیش کریں گے عیش۔

کتھا کلی: مجھے کیا کرنا ہے۔

سامنت: لو یہ گوداموں کی چابی لو۔ پہلے گودام میں تمہیں سامان مل جائے گا اور آج ہی رات کو تم کلکتہ کے لیے روانہ ہو جاؤ گی۔

(خطرے کی گھنٹی بجتی ہے)

کتھا کلی: خطرے کی گھنٹی! کیا بات ہے؟

سامنت: جلدی کرو۔ شاید پولیس آ پہنچی جلدی کرو۔ دروازے بند کر دو۔ جلدی کرو۔ بھاگو۔ بھاگ چلو۔

[قدموں کی چاپ چاروں طرف سے قریب آ جاتی ہے]

کتھا کلی: میں نہیں بھاگوں گی سامنت۔

سامنت: مگر وہ تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے ـــــ وہ آ گئے۔ وہ سامنے آ گئے۔

کتھا کلی: آؤ! آؤ! گوداموں کی چابی میرے پاس ہے! یہ [illegible]!!

سامنت: کیا کر رہی ہو کتھا کلی، پاگل ہو گئی ہو۔
کتھا کلی: پاگل ہو گئی تھی، اب ہوش میں آگئی ہوں مجھے خون کی تجارت، آنسوؤں کا بیوپار نہیں چاہیے۔
سامنت: چابی مجھے دو۔
کتھا کلی: نہیں۔

[بندوق داغنے کی آواز]

کتھا کلی: (آہ کرکے گر پڑتی ہے) پتا جی! آپ
سامنت: پتا جی! یہ آپ نے کیا کیا؟ گولی مار دی۔
سیٹھ جی: وقت نہیں ہے بھاگ چلو
کتھا کلی: بہت اچھا کیا۔ میرا جسم پاپی تھا، اسے سزا ملنی ہی چاہیے تھی مگر میرے گولی مار دینے سے تمھارا پراشچت نہیں ہوگا ـــــ بھگوان تمھارا بھلا کرے سامنت۔

[قدموں کی آہٹ اور قریب آجاتی ہے]

سیٹھ جی: بھاگو! بھاگو!! جلدی بھاگو
سامنت: بھاگنا بے کار ہے۔ پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ مقابلہ بے کار ہے۔
(کتھا کلی قہقہہ مارتی ہے اور قہقہے کے ساتھ ہی بے دم ہو جاتی ہے)

انجمن کی چند نئی کتابیں

۱۔ گلشن سخن (تذکرہ شعرائے اردو) — پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب — ۹٫۰۰
۲۔ فائز دہلوی اور دیوان فائز — ۵٫۵۰
۳۔ کلام سودا — ڈاکٹر خورشید الاسلام — ۹٫۰۰
۴۔ تنقیدیں (دوسرا ایڈیشن) — ۶٫۰۰
۵۔ بازدید (مجموعۂ کلام) — ڈاکٹر منیب الرحمٰن — ۴٫۵۰
۶۔ مرزا محمد رفیع سودا — ڈاکٹر خلیق انجم — ۱۰٫۵۰

شعراء کے انتخابات

(ہر انتخاب کی قیمت ۷۵ پیسے)

اردو شاعروں کے کلام کا یہ مختصر انتخابی سلسلہ بہت مقبول ہوا ہے۔ ایک ایک انتخاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہر انتخاب ۶۴ صفحے کا ہوتا ہے جس میں شاعر کی تصویر اور اس کے مختصر سوانح حیات ہوتے ہیں۔

انتخابات کی تفصیل حسب ذیل ہے

اختر شیرانی	اختر انصاری	اثر لکھنوی	اصغر گونڈوی
آلم مظفر نگری	جگن ناتھ آزاد	جگر بریلوی	جوہر نظامی
حبیب احمد صدیقی	شفیق جونپوری	شمیم کرہانی	عمیق حنفی
فراق گورکھپوری	فیض	کیفی چریاکوٹی	کمال احمد صدیقی
ملا	مجاز لکھنوی	نشور واحدی	وجد
	یگانہ چنگیزی	سلام مچھلی شہری	

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

ورجین چندن

راجیشی

(ایکانکی)

اداکار

چندر گپت	موریہ حکمراں
چانکیہ	وزیر اعظم
چندر کیتو	امیر فوج
بھکشو	اندھا بھکاری
راجیشی	چانکیہ کی لڑکی
قاصد	
دربان	

(پہلا سین)

(چانکیہ کا دفتر۔ چانکیہ کمرے کی کھڑکی کے پاس ایک دیوان پہ بچھی مرگ چھالا پر بیٹھا ہے اور بار بار کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے جیسے کسی کا انتظار ہو۔ دیوان کے سرہانے کی طرف ایک صندوق پڑا ہے کمرے کے ایک طرف ایک چوکی پہ چند بڑی بڑی کتابیں رکھی ہیں۔ دوسری طرف ایک چھوٹی چوکی پہ پانی کی صراحی اور ایک گلاس رکھا ہے۔ دیواروں پہ بھبتیم۔ اندر اور دروناچاریہ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں وقت قریباً دس بجے قبل دوپہر)

چانکیہ۔ (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے) راج دھانی کی یہ وسیع سڑک کس قدر ہے۔ کس قدر ویران ہے۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی راجیشی کا ادھر گزر نہیں ہوا۔ لیکن میں بار بار راہ کیوں دیکھتا [illegible]

سامنے ہے۔ یہ دیکھو وہ ماں کی گود سے اچھل رہی ہے۔ میرے پاس آنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ گوتمی دادو لے مجھے دے دو (ہاتھ آگے بڑھا دیتا ہے لیکن کچھ نہ پاکر مایوس ہو جاتا ہے) پھر چلی گئی۔ بڑی نٹ کھٹ ہے مجھے یاد ہے تو میری گود میں آکر دادی اور ماں کو جُل دیا کرتی تھی۔ ان کے پاس جانے کے لیے ہاتھ بڑھاتی اور جب وہ لینے کے لیے آگے بڑھتیں تو پھر مچل کر میرے سینے سے لگ جاتی۔ پھر جب گوتمی پوجا کے لیے پھول لاکر رکھتی تو چھوٹی سی مٹھی میں پھول بھر کر میرے پاس آتی۔ گوتمی تمھاری شکایت دادی سے کرتی اور جونہی تم دادی کو میری طرف آتے دیکھتیں تو دبک کر میری گود میں بیٹھ جاتی۔ کتنی معصوم تھیں تمھاری شرارتیں۔ میں نے تمھیں ان سے منع نہ کیا۔ معلوم نہیں اس بدمعاش نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا جو تمھیں اٹھا کر لے گیا (اندر بھیشم اور دروناچاریہ کی تصویروں کی طرف دیکھتا ہے) دید اور نیتی کے ودوانو۔ کیا ہم نیتی والوں کو ایک سُونی زندگی بسر کرنے کا شراپ ہوتا ہے؟ کیا ہم حکومت اور شاہ کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھ سکتے؟ کیا ہم راج کے مادھو ہیں کہ جذبات کو سینے میں دبا کر گھٹن محسوس نہ کریں؟ (زنانہ قہقہوں کی آواز) یہ کون ہنس رہا ہے؟ (چاروں طرف دیکھتا ہے ایک عورت کی آواز آتی ہے) "تجھے کبھی بیٹی کا سکھ نہیں ملے گا" یہ تو چھایا کی آواز ہے۔ "تم نے چندر گپت سے میرا ملاپ ممنہ کیا تھا۔ اپنی راج نیتی کے لیے اس کا بیاہ ہیلن سے کروا دیا تھا۔ میرے ارمانوں بھرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اس ٹوٹے ہوئے دل نے تمھیں بد دعا دی "تجھے بیٹی کا سکھ کبھی نہیں ملے گا"

میری راج نیتی کا مقصد دیش کی بھلائی تھا۔

"مگر اس بھلائی کے لیے تم نے ایک معصوم لڑکی کے جیون بھرے سپنوں کی بلی دے دی"

یہی محسوس کرتے ہوئے میں نے تمھیں اپنی بیٹی بننے کے لیے کہا تھا۔

"تمھاری بیٹی؟ تمھارے اندر باپ کے جذبات ہی نہیں ہیں۔ تمھیں کبھی بیٹی کا سکھ نہیں ملے گا"

چھایا بیٹی مجھ پر رحم کرو۔ میں نے زندگی میں کسی سے رحم نہیں مانگا۔ صرف تمھیں سے یہ بھیک مانگ رہا ہوں۔

"نہ مانگی نہ دی۔ تم بے رحم ہو۔ تمھیں بیٹی کا سکھ کبھی نہیں ملے گا۔ میری بد دعا تمھارا پیچھا کرے گی"

(پھر وہی قہقہے)

(چانکیہ افسردہ ہے۔ سوچنے لگتا ہے)

راجیشی نہ جانے کس حال میں ہوگی؟ کس نگر میں ہوگی؟ کس گھر میں ہوگی؟ ...

مہا شکتی۔ مجھ پر رحم کر۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو واپس لوٹا دے۔ میری زندگی بوجھل ہو رہی ہے۔ راج کاج مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میرے من کا چین راجیشی ہی کے پاس ہے۔

(دوست سیناپتی کے آنے کی خبر دیتا ہے) چانکیہ اسے اندر آنے کی اجازت دیتا ہے۔ سیناپتی چندر گپتو

اندر داخل ہوتا ہے)

چندرگپتو: مہامنتری نمسکار۔ سمراٹ کا سندیش آپ کو مل ہی گیا ہو گا۔

چانکیہ: (نمسکار کے جواب میں دایاں ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے) مل گیا تھا۔

چندرگپتو: تو پھر جشن کی تیاری ہو گی؟

چانکیہ: (مضبوط آواز میں) جشن نہیں ہو گا۔

چندرگپتو: (حیرت سے) جشن نہیں ہو گا! مہامنتری یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

چانکیہ: یہ جشن کرنا ٹھیک نہیں۔

چندرگپتو: سبب؟

چانکیہ: (اسے پاس بٹھاتا ہے اور صندوق سے ایک کاغذ نکال کر اسے دکھاتا ہے۔ چندرگپتو کچھ دیر تک اسے پڑھتا رہتا ہے۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر حیرت اور سراسیمگی کے آثار ابھرتے رہتے ہیں) کوئی اور موقع دیکھ لیں گے آج یہ جشن نہیں ہو گا۔

چندرگپتو: لیکن سمراٹ اس کو کیوں کر برداشت کریں گے؟

چانکیہ: کیا اس کے بعد بھی سمراٹ خطرہ مول لے سکتے ہیں؟

چندرگپتو: لیکن وہ اتنی بڑی فتح پر، جس سے پورا دکشن بھارت ان کی سلطنت میں آگیا ہے، چپ سادھنا پسند نہیں کریں گے۔

چانکیہ: زیادہ نمائش اچھی نہیں ہوتی۔

چندرگپتو: لیکن جشن کے رُک جانے سے سمراٹ کے من پر جو گزرے گی اس کا اندازہ تو آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔

چانکیہ: میں تو ان کے من کی حالت کو سمجھ سکتا ہوں لیکن انھوں نے میرے من میں جھانک کر دیکھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی۔

چندرگپتو: وہ آپ کا بہت احترام کرتے ہیں۔

چانکیہ: احترام کرنا اور ہے اور من کا خیال رکھنا اور۔

چندرگپتو: انھوں نے کبھی آپ کے من کو ٹھیس بھی تو نہیں پہنچائی۔

چانکیہ: چندرگپتو۔ سمراٹ کی طرح تم بھی نہیں جانتے میں کتنا دکھی رہتا ہوں۔

چندرگپتو: سبب؟

چانکیہ: راجیشی کا آج تک کوئی سراغ نہیں ملا۔

چندرگپتو : (حیرت سے) کون راجیشی

چانکیہ : (دکھ اور حیرت سے) سیناپتی کو میری راجیشی کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں! ٹھیک ہے۔ آپ تو اس سمے بالک ہی تھے۔ سمراٹ کی تاج پوشی سے قبل کی میری زندگی چندرگپت ہی کو معلوم ہے۔

چندرگپتو : بھگون۔ کچھ مجھے بھی بتائیے۔

چانکیہ : راجیشی میری بیٹی ہے جس کو گم ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں۔

چندرگپتو : آپ کی بیٹی!

چانکیہ : ہاں۔ اس بدنصیب ماں کی بیٹی جس نے مجھ سے کوئی سکھ نہ پایا۔

چندرگپتو : مہامنتری، ایسا کیوں؟

چانکیہ : راج نیتی بڑی سرکش بلا ہے۔ اس کو سازگار بنانے کے لیے کئی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ تمھاری بہن کی کامناؤں کی قربانی سے یونان کے سامراجی سپنوں کو ناکام بنایا گیا۔ سیلیوکس کی بیٹی کا بیاہ چندرگپت سے ہو جانے سے بھارت کا ماتھا اونچا ہو گیا۔

چندرگپتو : لیکن چھایا نے اسے نہیں سمجھا۔ وہ آپ سے شاکی ہے۔

چانکیہ : اس راج نیتی کے لیے مجھے نہ صرف اپنی بیوی بلکہ اپنی ماں کی بھی قربانی دینی پڑی۔

چندرگپتو : ان واقعات کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔

چانکیہ : اور جسے پتہ ہے اس نے بھی کیا کیا؟

چندرگپتو : (حیرت سے) سمراٹ نے کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔

چانکیہ : نند نے میرے باپ کو جلا وطن کر دیا تھا۔ اس نے نند کے منتری شکتار کی نظربندی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس کے بعد میری بوڑھی ماں بہت دکھی رہنے لگی۔ وہ مجھ سے بہت پیار رکھتی تھی۔ اسے میرا آنکھوں سے اوجھل ہونا گوارا نہ تھا۔ ٹکشلا کے گروکل میں جب میری مصروفیت بہت بڑھ گئی تو وہ ہر روز اپنی اداسی اور سونے پن کا ذکر کرنے لگی۔ اسے میرے ارمانوں اور منصوبوں کا علم تھا۔ وہ ان سب سے ڈرتی تھی۔ ایک دن میرا چہرہ (صافہ) پکڑ کر بولی "وشنو مجھے تمھارے جیون میں راج یوگ دکھائی دیتا ہے۔" تو اس میں چنتا کی کیا بات ہے ماں؟ میں نے پوچھا۔ وہ بولی۔ "راجہ بننے پر تو مجھے بھول جائے گا اور بڑھاپے کا میرا ایک واحد سہارا چھن جائے گا۔" میں نے ماں کے ہاتھ سے پیتامبر چھڑا لیا اور پاس پڑے ایک پتھر سے اپنا ایک دانت توڑ دیا۔ (بیک گراؤنڈ میں ضرب کی آواز) ماں کی چیخ نکل گئی۔ اس نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ "یہ تو نے کیا کیا بیٹا؟" وہ روتے ہوئے بولی: "میرے لال

تمہاری شکل کتنی ڈراؤنی ہو گئی ہے۔" اب میں راجہ نہیں بنوں گا۔ میں نے کہا۔ انگ ہین کو کوئی راجہ نہیں بناتا۔ ماں روتی رہی اور میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں ہر شام کو گھر واپس آجایا کروں گا لیکن یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ دیش کے کاموں سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ پھر ماں کے سکھ اور اسے ایک ساتھی دینے کے لیے میں نے گومتی سے شادی کر لی۔ اس سے ایک لڑکی ہوئی۔ گومتی نے اس کا نام راج راجیشوری رکھا لیکن میں اسے لاڈ سے راجیشی بلایا کرتا تھا۔ راجیشی کے آنے سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ماں تو جیسے پھر سے جوان ہو گئی۔ بچی کو اٹھائے ہوئے وہ کٹیا کے باغیچے میں چلی جاتی۔ وہاں سے ہٹتی تو ندی کے تٹ پر چلی جاتی کیونکہ بچی کو ندی سے بڑا پیار تھا۔ وہ رو رو کر ندی کی طرف اشارہ کرتی اور ماں کو جیسے گھڑسواری کی ایڑ لگتی۔ وہ اسے گود میں اٹھائے ندی کی طرف چلی جاتی۔ راجیشی قریب ڈھائی برس کی ہو گئی تھی اور اب وہ خود ہی ادھر ادھر گھومنے لگی تھی۔ ایک شام، اس دن اماوس تھی، جب ماں کی دادی پوجا پاٹ میں مصروف تھی، ماں رسوئی میں کام کر رہی تھی اور میں دیش کے ایک دشمن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے گھر سے چلا گیا تھا راجیشی گھر سے باہر نکل گئی۔ ایسی نکلی کہ پھر واپس نہ آئی۔ ہم نے اس کی کھوج میں نگر کا کونا کونا چھانا لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ اس کی ماں اس کی جدائی کے غم میں چل بسی اور اس کے بعد اس کی دادی بچی اور بہو کے غم کو تیرتھ یاترا سے کم کرنے کی حسرت لے کر پرلوک سدھار گئی۔ میں راج نیتی میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ نہ ان کے غم کے بار کو ہلکا کر سکا نہ اسے تیرتھ یاترا کرا سکا۔ میں ان سے کتنا کٹھور اور لاپرواہ رہا! آج اس کی یاد سے میرا تن من کانپ جاتا ہے۔ گود میں آنے کے لیے راجیشی کا مچلتا ہوا جسم۔ پیاری پیاری ننھی باہیں، بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹے چھوٹے ہاتھ لحظہ لحظہ میرے سامنے آجاتے ہیں۔ ہائے کتنی پیاری تھی وہ!

چندر کیتو: میرا تو دل ہل گیا ہے۔

چانکیہ: وہ ایک مینا تھی جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے میرے دل میں مسرتیں جگا دیتی تھی۔ ایک پروائی تھی جو میری ساری تھکاوٹ دور کر دیتی تھی۔ ایک سنگیت تھی جو میری روح میں مٹھاس بھر دیتی تھی۔

چندر کیتو: مہامنتری۔ میں تو آج تک آپ کو نیتی کار اور جذبات سے عاری سیناپتی ہی مانتا رہا لیکن آپ تو اس سے کہیں بڑے انسان ہیں اور ایک درد مند باپ ہیں۔

چانکیہ: بڑی جذباتی سی باتیں کر گیا ہوں۔ آپ اس سے سمراٹ کو پریشان نہ کریں۔ صرف جشن کو رد کرنے کا سبب ہی بتا دیں۔

چندر کیتو: کیوں، اس میں کیا ہرج ہے؟

چانکیہ: سمراٹ دھن کے بڑے پکے ہیں۔ دھن کے علاوہ کوئی اور بات سننا پسند نہیں کرتے۔

چندرکیتو: آپ چنتا نہ کریں۔ میں راج بھون کی حفاظت کے لیے ضروری انتظام کرنے کے بعد سمراٹ کے پاس جارہا ہوں۔
چانکیہ: لیکن آپ کی دیر سے سمراٹ پریشان ہوں گے۔
چندرکیتو: تو میں اسی دوت کے ذریعہ سے کہلوا بھیجتا ہوں کہ میں ذرا دیر سے پہنچ رہا ہوں۔
(دوت کو بلاتا ہے اور اسے فوراً سمراٹ کو پیغام پہنچانے کے لیے کہتا ہے۔ چانکیہ کو نمسکار کہہ کر خود بھی چلا جاتا ہے)

دوسرا سین

(چندرگپت راج دھانی سے باہر قلعے میں بیٹھا ہے۔ وہ بے چین اور برہم ہے۔ چانکیہ داخل ہوتا ہے۔ دوار پال سر جھکا کر آداب بجالاتے ہیں)

چانکیہ: درشن، مجھے یہاں اچانک بلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟
چندرگپت: (برہم ہے) کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔
چانکیہ: فرمائیے۔
چندرگپت: (سخت لہجے میں) کیا یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے جشن کو مرانی روک دیا ہے؟
چانکیہ: جی ہاں۔
چندرگپت: کیا یہ بھی ٹھیک ہے کہ سینا پتی بھی آپ کے خیال میں شامل ہیں؟
چانکیہ: (حیرت سے) جی ہاں۔ وہ مجھ سے متفق ہیں۔
چندرگپت: (غصے سے) ہیں نہیں بنا لیے گئے ہیں۔
چانکیہ: راجیہ کے فائدے کے لیے ایسا کرنا بھی ضروری ہے۔
چندرگپت: اور یہ بھی ٹھیک ہے نا کہ راج بھون کے چاروں طرف مسلح فوج کے نئے دستے تعینات کردیے گئے ہیں؟
چانکیہ: جی ہاں۔ یہ بھی راجیہ کے فائدے اور آپ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ راجدھانی میں مسلح ....
چندرگپت: (بات کاٹتے ہوئے) مہامنتری۔ اب مجھے بچہ نہ سمجھیے۔ میں دیکھ سکتا ہوں کہ اس کارروائی کے لیے یہ کوئی موقع نہیں۔
چانکیہ: (مضبوطی سے) اس کا فیصلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔
چندرگپت: آپ ہمیشہ اپنی ہی چلاتے ہیں۔
چانکیہ: جلی کٹی باتوں سے میرا دل اور نہ دکھائیے۔
چندرگپت: دکھ تو اس وقت مجھے ہو رہا۔ آپ کو کیا دکھ ہے؟

چانکیہ : جانے دیجیے۔ یہ میری نجی بات ہے

چندرگپت : (سخت لہجے میں) آج آپ مجھ سے ہر بات چھپا رہے ہیں۔ میرے اندر شک کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

چانکیہ : آپ خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔ میرا من ...

چندرگپت : فقط آپ کے رطیرے کے سبب۔

چانکیہ : میرا من راجیشی کی یاد سے بے چین ہے۔

چندرگپت : (حیرت سے) راجیشی؟ اسے گم ہوئے تو کئی سال ہو گئے۔ آپ بھی تو اسے لاپتہ ہی مانتے تھے۔

چانکیہ : میں راجیشی کے بارے میں ایسی بات نہیں سُن سکتا۔

چندرگپت : راجیشی کی یاد نے آپ کو جشن کامرانی کی اہمیت سے غافل کر دیا ہے۔

چانکیہ : (بگڑ کر) جشن نہیں ہوگا۔

چندرگپت : مجھے آپ کے منصوبے کا پتہ چل چکا ہے۔

چانکیہ : (حیرت سے) کس منصوبے کا؟

چندرگپت : جو آپ نے سیناپتی کو ساتھ ملا کر بنایا ہے۔

چانکیہ : کس مقصد کے لیے؟

چندرگپت : حکومت، خزانے اور فوج کو اپنے اختیار میں لانے کے لیے۔

چانکیہ : وہ تو منتری ہی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔

چندرگپت : لیکن انھیں راجہ کے خلاف کام میں لانا منتری کا دھرم نہیں۔

چانکیہ : (سخت حیرت سے) تو آپ مجھ پر غداری کا الزام لگانا چاہتے ہیں؟

چندرگپت : سیناپتی کو آپ نے جس طرح بہکایا ہے دوت نے مجھے وہ سب بتا دیا ہے۔ راجیشی کے دُکھ کے ذکر سے سازش چھپ نہیں سکتی۔

چانکیہ : (آپے سے باہر ہو جاتا ہے) ایک اکھڑ دوت کی بات پر آپ اس حد تک جا سکتے ہیں۔ میں یہ سہن نہیں کر سکتا...

چندرگپت : (بات کاٹ کر) اس کی ایک ایک بات ٹھیک نکلی ہے۔

چانکیہ : میں اسی لمحہ اپنے عہدے سے الگ ہوتا ہوں۔ آج سے مجھے مہامنتری کے کام سے کوئی سروکار نہیں ہوگا (باہر چلا جاتا ہے چندرگپت دو قدم اس کے پیچھے جاتا ہے اور زیرِ لب بولتا ہے)

چندرگپت : اسے اپنے منصب اور اختیارات پر غرور ہو گیا ہے۔ میری اتنی بڑی کامیابی پر اس کا جشن چراغاں کرنے سے انکار، ضرور کوئی سازش ہے۔ میں ابھی چندرکیتو سے کہوں گا کہ وہ آنے والے خطرے سے بچاؤ کے لیے سینا کو تیار رہنے کا حکم دے۔

(چندرگپتو داخل ہوتا ہے)

رگپت: سیناپتی، دیش پر مصیبت آنے والی ہے۔ آپ فوراً فوج کو تیار رہنے کا حکم دیں اور مہامنتری کے تمام ٹھکانوں پر نظر رکھیں۔

ندرگپتو: کیا بات ہوئی ہے مہاراج؟

ندرگپت: چانکیہ نے جشن کامرانی اور دیپ مالا کے بارے میں میری حکم عدولی کی ہے مجھے اس کے ارادوں میں کچھ میل نظر آتا ہے۔

ندرگپتو: مہامنتری نے مجھے ساری بات بتادی ہے۔ انھوں نے آپ کو ایک بڑے سنکٹ سے بچا لیا ہے۔ دشمنوں نے راج دھانی پر قبضہ کرنے کے لیے جو نقشہ بنایا تھا مہامنتری نے اسے پکڑ لیا اور میں خود اسے دیکھ کر آیا ہوں۔

ندرگپت: (گہری حیرت سے) اس میں کیا تھا؟

ندرگپتو: نند کے سابق منتری کاتیائن اور نند کے سالے واچال نے آپ کو آپ کی خواب گاہ میں قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ سازشیوں کے لیے یہ وقت بڑا موزوں تھا۔ سیلیوکس اور اس کی سینا نے سندھو ندی پار کر لی ہے اور دشمن چاروں طرف چوکیاں بنا رہے ہیں۔ ان کی سازش یہ تھی کہ جونہی آپ جیت کی مستی میں مدہوش ہوں وہ آپ کے پہرے داروں میں شراب بانٹ کر انھیں آپ کی نگرانی سے غافل کر دیں اور آپ کی خواب گاہ میں پہنچ کر اپنا منصوبہ پورا کریں۔ انھیں یہ بھی امید تھی کہ دوسری طرف سے سیلیوکس کا حملہ ہو جائے گا اور اس طرح موریہ راج کو نقصان پہنچا کر وہ اپنا بدلہ لے لیں گے۔ لیکن مہامنتری کو اپنے جاسوسوں سے اس تمام سازش کی خبر مل گئی انھوں نے ہر طرف بچاؤ کا انتظام کر دیا ہے۔ اسی انتظام کے سلسلے میں جشن کامرانی اور چراغاں بھی بند کر دیا گیا۔

ندرگپت: مہامنتری نے یہ سب باتیں مجھے خود کیوں نہ بتائیں۔

ندرگپتو: یہ ان کا اختیارِ تمیزی ہے۔ آج کل وہ بہت اداس رہتے ہیں۔

ندرگپت: کیوں؟

ندرگپتو: انھیں اپنی بیٹی کا سُراغ نہیں ملا۔ وہ اس کی یاد میں پہروں ملول رہتے ہیں۔

ندرگپت: راجیشی بڑی بچی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ندی میں ڈوب گئی تھی۔

ندرگپتو: مہامنتری کا یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اس دن وہ حکومت کے اقدام کی باتیں کرتے کرتے اس طرح راجیشی راجیشی پکارنے لگے جیسے وہ کہیں دور سے ان کی طرف بھاگی آرہی ہو۔

ندرگپت: سیناپتی، آپ فوراً راجیشی کی کھوج کے لیے سپاہی بھیج دیں۔ مجھے مہامنتری کے اس دکھ سے غافل ہونے کا بڑا افسوس ہے۔ آج میں نے ان سے بہت سخت سست کہا۔ میں اپنی غلط فہمی پر نادم ہوں۔ راجیشی کو ڈھونڈھ لانے میں آپ کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔

چندرگپت : جو حکم۔ میں ابھی راجیشتی کو ڈھونڈھنے کے لیے دوت بھیجتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

(تیسرا سین)

(چانکیہ کی کٹیا کا صحن۔ صحن کے ارد گرد مٹی کی دیواریں بنی ہوئی ہیں۔ دروازے کے سامنے دیوار کے ساتھ گھاس پھوس کا چھپر بنا ہوا ہے جس پر لکڑیوں کا انبار لگا ہے۔ چھپر کے نیچے دیوار کے درمیان میں ایک دروازہ ہے جس کے پیچھے ایک کمرہ نظر آ رہا ہے۔ صحن کے ایک کونے میں تلسی کا پودا ہے۔ دوسرے کونے میں کشا کی ڈھیری لگی ہے۔ دروازے کے دائیں ہاتھ ایک چوکی رکھی ہے جس پر دری بچھی ہے۔ چانکیہ پہلے چوکی پر بیٹھا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے پھر ٹہلنے لگتا ہے۔ وقت رات)

چانکیہ : کتنا اندھیرا ہے! چاروں طرف کالک ہی کالک پوت دی گئی ہے۔ یہ صرف رات کی تخلیق نہیں۔ آکاش نے اسے بڑھایا ہے۔ دشمن کی امیدوں پر سمراٹ کے خیالوں میں، چانکیہ کے اختیاروں میں ایک ساتھ اندھیرا ہے ... اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ہی کرن ہے۔ راجیشتی راجیشتی کی یاد۔ راجیشتی کے ملنے کی امید۔ کیا یہ کرن نمودار ہوگی؟ ہر اندھیرے کے بعد اُجالا ہوتا ہے لیکن ہر اُجالے میں وہی روشنی تو نہیں جس کی تمنا ہوتی ہے ... دیش کی تعمیر اور ترقی کے لیے راج نیتی بھی ایک اُجالا ہے۔ لیکن اس کے معمار کو اس سے کیا ملتا ہے؟ میرے باپ کو شکٹار کی حمایت کرنے پر پاٹلی پتر سے نکال دیا گیا۔ مجھے چندرگپت کامیاب بنانے کے لیے مورا کی ناراضگی اٹھانی پڑی۔ نند کی پابندیاں اور سختیاں جھیلنی پڑیں اور اب مجھ پر غداری کا الزام لگ رہا ہے۔ ایک ملازم کی بات کو گرہ باندھا جا رہا ہے۔ شک اور وہم کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ جب کسی بڑے آدمی پر سوار ہوتے ہیں تو بڑے طوفان اٹھاتے ہیں۔ چندرگپت کا خیال ہے کہ راجیشتی کی یاد نے مجھے جشنِ کامرانی کی اہمیت سے غافل کر دیا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا اور میں چندرگپت کو فتح یابی کی مہم پر بھی نہ بھیجتا ... ماں اور گوتمی سے جو غفلت میں نے برتی ہے اس کی پیڑ کو چندرگپت کا کوئی احترام دور نہیں کر سکتا۔ اسے میرے فیصلے سے زیادہ اپنے جشن کی چنتا ہے۔ سمراٹ راگ رنگ اور تفریح کے کتنے خواہش مند ہوتے ہیں! انھیں کیا معلوم کہ ایک جشن کے انتظام کے پیچھے کسی کے من کو ٹھیس اور یاد کی پیڑ بھی ہو سکتی ہے ... میں راجیشتی کے فراق میں جل رہا ہوں اور اسے میرا غم معلوم ہی نہیں۔ (وقفہ) کتنا اچھا ہوتا کہ میں تکشا کے گورو کل میں پڑھاتا ہی رہتا اور اگر اس سے الگ ہی ہونا تھا تو راج نیتی میں آنے کی بجائے ایک کسان بن جاتا۔ جیون کا سچا سکھ کھیتی باڑی میں ہے۔ لیکن نیکی اور اخلاق کی گردن پر نند کے تانڈو ناچ نے مجھے بے

کر دیا۔ اس کے اذیت بھرے نظام نے میرے دماغ کو کچھ اور سوچنے ہی نہ دیا۔ برہمن کی بے قدری نے میری نیندیں حرام کر دیں۔ بھارت کے خلاف سکندر کے منصوبوں نے میرے من میں جد و جہد کے شعلے بھڑکائے (وقفہ) میرا آدرش ہمیشہ بھارت کا اتحاد اور استحکام رہا۔ میں نے موریہ راج ہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کی بھی فکر کی۔ ارتھ شاستر میں نظام حکومت کے سارے قواعد لکھ دیے۔ دیش کی خوش حالی اور بدیش سے ناتوں کے سارے طریقے بتا دیئے۔ راجا اور پرجا کی فلاح کی ساری راہیں دکھا دیں (وقفہ) سمراٹ اور سنسار میرے ارتھ شاستر کی قدر کریں گے؛ اس خیال سے مجھے بڑی راحت ہوتی ہے۔ اس کی تصنیف کی خاطر میں نے راتوں کی نیندیں حرام کیں۔ خون جگر صرف کیا۔ لیکن اس سے بھی عزیز مجھے اپنی راجیشی ہے۔ جس کی ایک مسکراہٹ سے میرے سارے مسئلے حل ہو جاتے تھے۔ جس کو گود میں لینے سے سارے تفکرات بھول جاتا تھا اور جس کا ایک ایک بول میرے جیون میں سکھ کا رس گھول دیتا تھا (وقفہ) چانکیہ افق کی طرف دیکھ رہا ہے۔ رات کا اندھیرا ختم ہو رہا ہے اور پو پھٹنے کی روشنی کچھ کچھ نمودار ہو گئی ہے)

وقت بڑے بڑے زخم بھر دیتا ہے لیکن راجیشی کی یاد کا زخم دن بدن گہرا ہو رہا ہے۔ یہ میرے سینے سے لگا رہا۔ دل میں چھپا رہا۔ روح میں بسا رہا۔ چندرگپت، اگر تو نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تو راجیشی کو ڈھونڈھنے ہی کی کوشش کی ہوتی۔۔۔ تم نے میری مریدی اور عزت کا عہد کیا تھا کیا وہ عہد پورا ہو گیا؟ اس کا جواب اپنے دل سے پوچھو جو مجھ پر نچھاور تھا۔ گنگا کے اس تٹ سے پوچھو جو ہماری امنگوں کا گواہ تھا۔ پاٹلی پتر کے اس بوڑھے برگد سے پوچھو جو ہماری ملاقاتوں کا مرکز تھا۔۔۔ تمھیں حکومت مل گئی، عزت مل گئی، شہرت مل گئی۔ چانکیہ نے اپنی ایک چھنی ہوئی چیز کی واپسی کی تمنا کی اور وہ بھی پوری نہ ہوئی۔۔۔

(صبح ہو گئی ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازیں آ رہی ہیں۔ باہر دور سے ایک لڑکی کے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ شروع میں آواز صاف نہیں سنائی دیتی۔ لیکن چانکیہ ادھر کان لگائے رکھتا ہے۔ پھر آواز صاف سنائی دینے لگتی ہے)

جگ کی ندیا بہتی جاتی   جگ کی ندیا بہتی جاتی

چانکیہ : (کان لگائے ہوئے ہے) کتنی پیاری آواز ہے۔ دل میں اترتی جا رہی ہے (گانے کی آواز نزدیک آ رہی ہے)

جگ کی ندیا بہتی جاتی
کیا لے آتی کیا لے جاتی   جگ کی ندیا بہتی جاتی

پانکیہ : کتنا اچھا گیت ہے۔ کتنی سُریلی آواز ہے۔

(آنگن سے باہر نکل کر باہر دروازے پر آجاتا ہے اور گانے والی لڑکی کو بلاتا ہے۔ لڑکی تیرہ چودہ سال کی نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ایک اندھا بھکاری ہے جس کی لاٹھی لڑکی نے تھامی ہوئی ہے۔ چانکیہ بھکاری اور لڑکی کو آنگن میں لے جاتا ہے اور ان سے وہی گیت سننے کی فرمائش کرتا ہے۔ لڑکی گیت سناتی ہے)

جگ کی ندیا بہتی جاتی — کیا لے آتی کیا لے جاتی — جگ کی ندیا بہتی جاتی
بھاؤ بھرے بے کل ہر دیہ کو — دھیمے سے کچھ کہتی جاتی — جگ کی ندیا بہتی جاتی
اس کی لہریں ادھ بھٹ کرنیں — سوئی یادیں جگاتی جاتی — جگ کی ندیا بہتی جاتی
یہ ندیا جیون کی سریتا — جگ جگ جن گن رہی بلاتی — جگ کی ندیا بہتی جاتی

(چانکیہ کے دل و دماغ پر گیت کا گہرا اثر ہو رہا ہے اور اس کا چہرہ کھلتا جا رہا ہے۔ اس کی نگاہیں لڑکی پر جمی رہتی ہیں۔ گانا ختم ہوتے ہی وہ بڑی بے تابی سے لڑکی کو تھام کر پیار سے اپنے پاس بٹھالیتا ہے اور بھکاری سے پوچھتا ہے)

نکیہ : بابا یہ تمھاری بیٹی ہے ؟

کاری : نہیں مالک یہ تو اس خداوند کی ہے جو ہم سب کا مالک ہے۔

نکیہ : اس کی ماں ہے ؟

کاری : جب سے یہ میرے پاس آئی ہے میں ہی اس کی ماں ہوں۔

نکیہ : یہ تمھارے پاس کب آئی تھی ؟

کاری : (پہلو بچانے لگتا ہے) مجھے کچھ یاد نہیں۔

نکیہ : ذرا یاد کرکے بتاؤ۔

کاری : ہمیں ابھی بہت دور جانا ہے۔ آپ جلد ہمیں بھکشا دیں۔ بھگوان آپ کا بھلا کرے گا۔

نکیہ : تمھارے بھوجن کا انتظام یہیں ہو جائے گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ لڑکی تمھیں کب اور کہاں ملی تھی ؟ میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے (پھر لڑکی کو پیار کرتا ہے اور بھکاری کو پاس بٹھانے کی کوشش کرتا ہے)

ری : (ہچکچاتا ہے) ہم پھر کسی دن آجائیں گے۔ آج تو ہمیں ایک بھگت نے بلایا ہوا ہے۔ وہ ہمیں بھوجن کے ساتھ دکشنا بھی دے رہا ہے۔

یہ : (اشارہ سمجھتے ہوئے) چنتا نہ کرو۔ میں تمھیں دکشنا میں کپڑے بھی دوں گا اور اگر تمھاری خواہش ہو تو تمھیں

تیرتھ یاترا کے لیے بھی خرچ دوں گا۔

بھکاری: (کچھ اطمینان کے ساتھ) پر بھگوان اپنی پتری کے بغیر میں تیرتھ یاترا نہیں کر سکوں گا (لڑکی کی طرف [illegible]

چانکیہ: اس کا انتظام ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ یہ تمھیں کب اور کہاں ملی تھی؟ (لڑکی کو بغور دیکھ رہا ہے [illegible] پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے)

بھکاری: یہ آج سے کوئی دس گیارہ سال پہلے مجھے ندی کے پاس ملی تھی۔ اس وقت دو برس کی تھی۔ یہ بابا بابا کہتی [illegible] ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ میں نے سمجھا بھگوان نے میری سن لی اور مجھ اندھے کے لیے ایک سہارا بھیج دیا۔

[illegible] اس کے گلے میں ایک کالا دھاگا تھا، [illegible] یاد نہیں۔

چانکیہ: جب تم اسے اپنے ساتھ لے گئے تو یہاں کے علاوہ اور کس کو پکارتی تھی؟

بھکاری: یہ دادی دادی اور بابا بابا ہی کہتی رہتی تھی۔

چانکیہ: (لڑکی کو بغور آشنا بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے) یہ اپنا نام کیا بتاتی تھی؟

بھکاری: راجے سی۔

چانکیہ: (ایک دم اسے سینے سے لگا لیتا ہے) یہ میری لڑکی ہے۔ میری راجیشی [illegible]

راجیشی: (فوراً دایاں گھٹنہ دکھاتی ہے) ہاں بابا میرے دائیں گھٹنے پر یہ تل ہے (چانکیہ [illegible] گلے سے لگا کر بہوت ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی بھکاری کو غصہ بھری نگاہ [illegible]

چانکیہ: تم چور ہو۔ تم نے اپنی غرض کے لیے اس معصوم بچی کی چوری کی۔ جانتے ہو [illegible] کا ٹکڑا ہے۔

بھکاری: (ہاتھ سے لاٹھی گر جاتی ہے) بھارت کے مہامنتری چانکیہ کی کنیا! بھگوان [illegible] کیا ہے (ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگتا ہے)

(ایک دوت آ کر چندرگپت کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ بھکاری اور لڑکی [illegible] داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک نظر لڑکی اور بھکاری کی طرف ڈالتا ہے۔ لیکن دونوں کو [illegible] سے بات کرتا ہے)

چندرگپت: آریہ میں آپ سے کشما مانگنے آیا ہوں۔

چانکیہ: (حیرت سے) وہ کیوں مہاراج؟

چندر گپت: کل غلط فہمی میں آپ کو سخت الفاظ کہے، ان کے سبب ساری رات نیند نہیں آئی۔
چانکیہ: میں بھی ساری رات نہیں سویا۔
چندر گپت: گرو دیو، میں نادم ہوں کہ میں نے راجیشی کی کھوج سے غفلت برتی۔ براہ کرم مجھے معاف کریں۔
اب اسے ڈھونڈنے کے لیے چاروں طرف دوت بھیج دیے گئے ہیں۔
چانکیہ: (مسکراتے ہوئے۔ راجیشی کو پھر گلے لگاتا ہے) ورشل، اب زحمت نہ اٹھاؤ۔ میری بیٹی تو مجھے مل گئی
ہے (راجیشی چانکیہ سے لپٹ جاتی ہے)
چانکیہ: میری بیٹی مجھے مل گئی ہے...
چندر گپت: (راجیشی کی طرف بڑھ کر پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہے) اس کے مل جانے سے میرا دل
بھی خوشی سے باغ باغ ہو رہا ہے۔ میں اس موقع کے اعزاز میں جشن کروں گا۔
چانکیہ: کس کے لیے؟
چندر گپت: آپ اور راجیشی کے سکھ اور آرام کے لیے
چانکیہ: وہ تو مجھے مل گئے۔
چندر گپت: لیکن مجھے آپ کا منصب بھی تو واپس کرنا ہے۔ اس کے لیے آپ سے گزارش کرتا ہوں۔
چانکیہ: مجھے اب کسی منصب کی ضرورت نہیں۔ میں اب پاٹلی پتر جا رہا ہوں۔ راج راجیشوری کے ساتھ
(راجیشی کو اپنے جسم سے لگا لیتا ہے)
چندر گپت: بھگون۔ یہاں آپ کو اب کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔
چانکیہ: میں فیصلہ کر چکا ہوں۔

عابد رضا بیدار

عظیم اور لازوال

زندگی بڑی نامعتبر چیز ہے، اگر جینے کے سہارے نہ ملیں۔ یہ سہارے عقیدوں میں ملتے ہیں، مقصد سے لگن میں
ہیں، محبوب چہروں میں ملتے ہیں، بے مثل قدرتی مناظر میں ملتے ہیں، اور اس عظیم اور لازوال آفاقی ادب میں ملتے ہیں
میں صدیوں کی فکر کا حاصل نسلوں کے تجربوں کا نچوڑ اور سوچنے یا لکھنے والے کی ایک عمر کی کاوش سمٹ کر لفظوں
کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی تین کتابوں کا نچوڑ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں، ہیمرشیلڈ، اقبال اور ــــــ اردو کے
مجلس اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل ہیمرشیلڈ جو ۱۹۶۳ء میں اپنے مقصد کی لگن اور امن و صلح کی اسا
میں کانگو کے مشن میں ہوائی جہاز کے حادثے میں شہید ہوگیا۔ ۱۹۶۳ء میں اس کے انتقال کے بعد ۱۹۶۱ء تک
تیس پینتیس سال کی ڈائری چھپی (مارکنگز) "نشانات" کے نام سے۔ کہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ دنیا کی تنظیم
سے بڑے ادارہ، دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے حاکم اعلیٰ کی ڈائری ہے حالاں کہ بیشتر اندراجات
کسی ملک کا نام ہے، نہ شخص کا نہ حادثہ کا! بس روح کا ایک کرب ہے جو لفظوں میں ڈھلتا گیا ہے۔
اور یہ ہیمرشیلڈ تو عجیب سی چیز ہے۔ (مغرب میں اس کتاب کو کچھ بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے
خصوصیت ہے اسی پر مغربیوں نے تنقید کی بوچھار کی ہے) اتنا بڑا صوفی فلسفی تو ابن عربی سے لے کر اب تک
پیدا نہیں کیا! حالاں کہ یہ بات بھی چپکے سے سن لیجیے کہ فیضان مشرق ہی کا ہے اس لیے کہ پوری کتاب میں
سطر میں رومی کا نام آگیا ہے جو ایک بڑی کلید بن گیا میرے لیے، کہ بالآخر سرچشمہ اس کا بھی وہی ہے
مشرق ہے (رومی کا نام دوسرے ایک جملہ تو وہی لکھا ہے جو مثنوی کے اولیں شعر "بشنو از نے ... کی ...
ہے!)

شاعر مشرق اقبال کی ڈائری منتشر افکار (اسٹرے ریفلیکشنز) کے نام سے ۱۹۶۳ء
جو کچھ ہے اعلیٰ ترین ہے۔ یہ اس زمانہ کی یادگار ہے جب رومی کا نشہ پوری طرح نہیں چڑھا تھا لیکن

کہ اس عمر میں فکر کی آزاد اڑان اور جذبہ کی شدت پورے عروج پر ہوتی ہے۔ اور اس آزاد فکری اڑان کے عجیب و غریب نمونے آپ کو اس کتاب میں مل جائیں گے۔

۱۹۱۰ء کے آس پاس کی لکھی ہوئی یہ دلچسپ ڈائری اقبال کی کتابوں میں قدیم ہونے کے باوجود اشاعت کے لحاظ سے اس کی تصانیف میں تازہ ترین ہے! ذاتی ڈائری ہے مگر سب کی سب انگریزی میں ہے۔

ترجمہ ایمانداری کا فن ہے مگر بعض ترجموں میں ایمانداری اپنے ساتھ بے ایمانی کے مترادف ہو جاتی ہے خصوصاً جہاں مترجم کو مصنف کی ہر آواز اپنی گم شدہ آواز اور ہر صدا اپنی صدائے بازگشت لگتی ہو! لیکن اس بے ایمانی کا کچھ اور مطلب ہرگز نہ لیجیے بلکہ صرف اتنا کہ مصنف کی آواز کو زیادہ موثر، اس کے لہجے کو زیادہ پر خلوص اور اس کے جذبہ کو زیادہ شدید کر دیا جائے ——— زیادہ میں نے غلط کہا ——— اس کی فکر کی مناسبت سے تیاں و لرزاں!

اس قسم کی تحریریں اپنے لطیف شعر کی رو دیتی ہیں جس سے ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق محظوظ ہوتا اور معنی نکالتا ہے سو کہیں شاید ایسا بھی ہوا ہو کہ مصنف کی نیت کسی مخصوص جملہ سے وہ نہ ہو جو اب ترجمے کے بعد معلوم دیتی ہے تو اس میں مجھے معذور سمجھیے، کسی اور وجہ سے نہ سہی تو محض اس لیے ہی کہ غالب کے اشعار سے لے کر قرآن و گیتا تک ہر شخص نے اپنی اپنی وسعت فکر و نظر کے لحاظ سے انھیں سمجھا اور برتا ہے اور اس تحسین و تشریح کا بڑا حصہ ایسا ہے جو شاید کہنے والے کے وہم گمان میں بھی نہ ہو!

ہیمر شیلڈ اور اقبال کی کتابوں کے وہ منتخب (لا تریاق) حصے جو ان کتابوں کی جان ہیں، ترجمہ (ترجمہ کی مندرجہ بالا تعریف کے حدود میں) کی صورت میں پیش ہیں۔ اور ——— ایک زندہ اردو ادیب کی عمر بھر کی کمائی میں سے کچھ پارے چن چن کے جمع کیے ہیں۔ انھیں بھی مندرجہ بالا تحریروں کے ساتھ پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ بس اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔ نام ظاہر کرنے میں ان کی عافیت اور اپنی عاقبت دونوں خطرے میں ہیں اس لیے وہ پھر کبھی۔

ایک بات اور۔ ادب میں بہترین کا لفظ استعمال کرنا ع اپنی اپنی وسعت فکر و نظر کی بات ہے۔ اس لیے اگر میں اقبال کی تصنیف کو ۱۹۶۳ء کی بہترین کتاب اور ہیمر شیلڈ کی ڈائری کو ۱۹۶۴ء کی بہترین کتاب قرار دوں اور آپ کسی وجہ سے متفق نہ ہوں تو اسے میرے مطالعہ کے محدود پن پر محمول کر کے اپنے فیصلے کو بحال رکھیے گا۔ مجھے مطلق شکایت نہ ہوگی۔ اتنا جانتا ہوں کہ عہد جدید میں انگریزی زبان کے پورے سرمائے میں اتنی وزنی اور جاندار، متعدی دردوں کے ایک ایک تار کو چھیڑ دینے والی کتابیں تعداد میں پندرہ بیس سے زیادہ مشکل ہی سے نکلیں گی۔

"بیدار"

(۱)

بشنواز نے چوں حکایت میکند

رومی نے کہا ہے

رومی نے کہا ہے اللہ والوں کا کوئی مخصوص مذہب نہیں ہوتا ان کا مذہب صرف اللہ ہوتا ہے۔

الحمد اللہ۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ اہدنا الصراط المستقیم

مالک! میرے اندر سب تجھے دیکھ سکیں۔ میں تیرے لیے راستہ بنا سکوں۔ میرے اوپر جو کچھ بیتے اس کے لیے تیرا شکر گزار رہوں ـــــ دوسروں کی ضرورتیں نہ بھولوں۔

اپنی محبت قائم رکھ۔ میں جو کچھ بھی کروں تیری عظمت کو دوبالا کرنے کے لیے کروں ـــ کبھی ناامید نہ ہوؤں۔ کہ میں تیرے سائے میں ہوں ـــــ اور تیرے پاس سب طاقت اور نیکی ہے ـــ مجھے پاک صاف دل دے دے کہ میں تجھے دیکھ سکوں! ایک حقیر دل، کہ تیری خدمت کر سکوں! ایک پُر اعتقاد دل کہ میں تیرے اندر رہ سکوں!!

جو کچھ ہو چکا ہے اس کے لیے شکر گزاری ـــــ اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کے لیے سر تسلیم خم...

سب سے پرے سب سے بالا

"ناشنیدہ" ـــ خدا کے ہاتھوں میں رہنا!

جب تک تم "ناشنیدہ" میں رہتے ہو تم سب سے پرے اور سب سے بالا ہو۔ یہ تمھاری اخلاق کی کتاب کا یہ سبق ہے اس کی مضبوطی سے گرفت کر لو!

خودنوشت

یہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا بھی کیسی حماقت ہی ہے۔ آخر اس چیز کی تمھارے لیے اس قدر اہمیت کیوں ہے کہ کم سے کم کوئی ایک فرد تمھارے اندرون جھانک سکا ہے؟ آخر یہ سب کچھ لکھنے کی تمھیں کیا پڑی؟ میرے خیال میں اپنے ہی لیے۔ شاید!! پر دوسروں کے لیے بھی تو!

خودگزشت

سائنسداں صرف اس چیز کا ریکارڈ کر لیتا ہے جو غیر متنازع فیہ حقیقت طے پا جاتی ہے۔ اسی طرح کسی کے تجربات میں بھی جو کچھ نادر و نایاب چیز تجربتہً سامنے آجائے وہ لکھ لینے کے لائق ہے تاکہ دوسروں کی عبرت یا موعظت کا

بن سکے!

لفظ کا احترام

لفظ کا احترام — انتہائی احتیاط اور سچ سے بے لوث دلی محبت کے ساتھ اس کا استعمال ضروری ہے، اگر سماج یا نسل انسانی کو آگے بڑھنا ہے۔ لفظ کا غلط استعمال انسان کی توہین کرنا ہے۔ ایسا کرنے سے پل اڑ جاتے ہیں، کنوؤں میں زہر پھیل جاتا ہے اور انسانی ارتقا کے پہیئے کو پیچھے کی طرف گھما دیتا ہے!

اندر کی آواز

جتنا زیادہ تم اپنے اندر کی آواز کو سنو گے اسی کے بقدر بہتر طور پر تم باہر کی دنیا میں پیدا ہونے والی آوازوں کو سن سکو گے — اور بول وہی سکتا ہے جو سنتا ہے!

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

ہر لمحہ انتخاب کا کام تم خود کرتے ہو مگر تم خود کبھی اپنے آپ میں ڈوب کے اپنے کو بھی انتخاب کر پاتے ہو؟ جسم اور روح میں ہزاروں امکانات پوشیدہ ہیں جن کے ذریعہ تم کتنے ہی "انا" تعمیر کر سکتے ہو لیکن ان میں سے صرف ایک "انا" میں "انتخاب کرنے والے" اور "منتخب ہونے والے" کا تال میل ہے!

تنہائی

تنہائی موت کی آمد تک طاری ہونے والی بیماری نہیں ہے! قطعی نہیں۔ لیکن موت کے سوا اس کا کوئی علاج؟ اور کیا جوں جوں موت نزدیک آتی جاتی ہے تنہائی کا سہنا دشوار سے دشوار تر نہیں بنتا جاتا!

اطلبوا العلم ولو کان ...

کوئی ایسا نہیں ہے جس سے تم سیکھ نہ سکو! خدا سب انسانوں کے ذریعہ اپنا اظہار کرتا ہے اور تم خدا کے سامنے ابھی تعلیم کے ابتدائی مراحل بھی نہیں طے کر پائے ہو۔

تسبیح و مناجات

عبادت الفاظ میں منجمد ہو کے ایک مستقل لمبی لہر کا سلسلہ پیدا کر دیتی ہے جس پر اس سے مکالمہ جاری رہے گا اس وقت بھی، جب ہمارے دماغ کسی دوسرے معاملہ میں الجھے ہوئے ہوں!

اب تم جواب دینے کے قابل ہو گئے

جب تم ایسے مقام تک پہنچ جاؤ جہاں پھر تمھیں کسی سے جواب ملنے کی توقع نہ رہے، تو بالآخر تم جواب دینے کے قابل ہو سکو گے، اس طور پر کہ کوئی دوسرا تمھارا جواب پا سکے اور پھر وہ اس کے لیے شکر گزار ہو!

تکمیل عشق

جب محبت پختہ تر ہو جائے اور خودی کو نور میں تحلیل کر دینے سے خود اس میں روشنی کی جوت نکلنے لگے۔ اس وقت عاشق محبوب کے سہارے سے بے نیاز ہو کے آزاد ہو سکے گا ـــــ اور محبوب بھی اسی وقت تکمیل کو پہنچ سکے گا جب عاشق سے آزاد ہو جائے!

میرا ماحول میری زندگی ہے

جس سماج میں وہ پیدا ہوا ہو اس سے اپنے آپ کو الگ کر لینا، انقلاب کے لیے زندگی نہیں موت کی راہ ہے۔

خاموش گفتگو کا بدل کہاں

دو افراد کے درمیان خاموش مکالمہ کا بدل، وہ الفاظ میں کچھ بھی کہنے کی کوشش کیوں نہ کریں ممکن ہی نہیں ہے!

رنگوں کی پرکھ

اگر کوئی آنکھ رنگوں کو پرکھنا چاہتی ہے تو اسے اپنے آپ کو سارے رنگوں سے ناوابستہ کرنا پڑے گا!

معافی

ہمیں معافی ملنا بھی چاہیے، اور دوسروں کو معاف کرنا بھی چاہیے ـــــ خدا کی حضوری میں ہمارے اور اس کے درمیان کوئی چیز نہیں ہوتی، اور ہمیں معافی مل جاتی ہے۔ لیکن ہمیں اس کی موجودگی کا احساس ہو ہی نہیں سکتا اگر ہمارے اور دوسروں کے درمیان اس کے علاوہ کوئی اور چیز بھی آجاتی ہے۔

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

اطاعت شعاری کے بعد ـــــ اس طور پر کہ نظریں منزل پر جمی رہیں ـــــ خوف سے آزادی مل جاتی ہے۔ خوف سے آزادی کے بعد زندگی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اور اس سے پرے محبت کا راج ہے۔

پھر اس کے بعد؟ یہ کیا پوچھنا! اس کے بعد تو ایک مطالبہ اور مانگ ہے جو تم پہلے ہی جانتے ہو جتنا کچھ کہ اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے! اس کا تنہا پیمانہ تو تمھاری قوت ہے!!

نیک رفاقت

مجھے بھوک ہے رفاقت کی، نیکی کی ـــــ اس رفاقت کی، جس کی بنیاد نیکی پر ہو، اور اس نیکی کی جو رفاقت میں مل جائے۔

زندگی کے مطالبوں کو زندگی ہی پورا کر سکتی ہے ـــــ اور یہ میری بھوک بھی بجھ سکتی ہے، اس لیے کہ زندگی کا انداز اس قسم کا ہے کہ میں اپنی انفرادیت کو پا سکتا ہوں، دوسروں کے لیے پل بن کر، نیکی کے مندر میں ایک پتھر بن کر!

خالی انڈے کا خول

خالی انڈے کا خول پانی کے اوپر آسانی سے تیرنے لگتا ہے، خوب بہتا چلا جاتا ہے۔ ایسے کام کے لیے وہ خاصا

ہلکا پھلکا ہوچکا ہے۔ اب سوائے چھلکے کے اس میں ہے ہی کیا، نہ اصل چیز رہی نہ غذا!

خودسپردگی

دوسروں کی طرف ہم بڑھتے ہیں ـــــ اور مایوس لوٹتے ہیں۔ اس لیے کہ خودسپردگی کی ہم نے کبھی ہمت ہی نہیں کی!

وقت، شہرت اور اہلیت

وقت گزر رہا ہے ـــــ شہرت بڑھ رہی ہے ـــــ اہلیت گر رہی ہے۔

بات چیت

دوسروں سے صرف وہ بات کرو جو ان کے لیے اہمیت رکھتی ہو، صرف وہ بات پوچھو جس کے جاننے کی تمھیں ضرورت ہے اور صرف اس لیے بحث کرو کہ تمھیں کسی نتیجہ پر پہنچنا ہے۔ بلند آواز سے سوچو تو صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے لیے اس کا کچھ مفہوم ہو۔ چلتی ہوئی بات کہہ کے وقت یا خاموشی کی خانہ پُری کی کوشش مت کرو۔ الا یہ کہ وہ سرسری ات بہت سے ان ناگفتہ پیغامات کی حامل ہو جو ایسے دو افراد کے درمیان گفتہ بن جاتی ہیں جو ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔

ام کے لیے

آخر ہم سب میں یہ کوشش کیا ہے کہ جب ہم دنیا سے گزر جائیں تو زندوں کے خیالات بار بار ہمارے نام کے گرد ہوتے رہیں! ہمارا نام!! بے نام، ابدیت سے تو ہم یوں بھی بچ ہی نہیں سکتے۔ ہماری زندگیوں اور ہمارے اعمال کے نتائج کھرچے ہیں جاسکتے۔ نہ انھیں امتیاز و نشان ملنے سے روکا جاسکتا ہے ـــــ وہ عزت کا باعث ہوں یا شرمندگی کا!

ہاں تو ہے

تو قلم سنبھالتا ہے اور سطریں ناچ اٹھتی ہے تو بانسری لیتا ہے اور نغمے پھول برسانے لگتے ہیں تو برش پھیرتا ہے اور رنگ ے بن جاتے ہیں۔ اس طرح اس مکان میں جو زماں سے پرے ہے ہر شے کا ایک مفہوم اور ہر چیز میں ایک حسن ہوتا ہے ـــــ ہاں تو ہے! پھر میں کس طرح کوئی چیز تجھ سے بچا رکھ سکتا ہوں۔

ا الحق

میں! میں نہیں، بلکہ میرے اندر موجود خدا!

داز پہ آواز

لبیک کہنا، کسی کی ہر آواز پہ آواز دینا!!

دھر تو لے جائے

کہاں؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اس کے بارے میں پوچھتا بھی نہیں!

زیست کرنے کا سلیقہ: صوفیانہ

اس امر کی تشریح کہ زندگی کیسے گزاری جائے، مجھے قرونِ وسطیٰ کے صوفیوں کے یہاں ملی جن کے لیے خود سپردگی ہی خود آگاہی کی راہ تھی، اور جنھوں نے ذہنی یکسوئی اور اندرونیت میں وہ قوت پالی تھی کہ اپنے اردگرد کی ہر امنگ پر لبیک کہہ سکیں اور ہر آنے والے واقعہ کو مقدّرہ کہہ سکیں جو زندگی نے ان کے لیے مقدر کر رکھا تھا۔

طویل ترین سفر

طویل ترین سفر روح کا سفر ہے اندرون کا سفر۔ اس کا سفر جس نے اپنی تقدیر کو چن لیا ہے، جو اپنی کھوج میں چل پڑا ہے، اپنے وجود کے سرچشمہ کی کھوج۔ اور کیا واقعی کوئی سرچشمہ ہے بھی!

کوئی تنہائی سی تنہائی ہے

تنہائی کا اتنا وسیع سمندر جس میں سے میں نکل ہی نہیں سکتا۔ شاید اس قدر تنہائی تو نے مجھے اس لیے بخشی ہے کہ سب کچھ صرف تجھے سونپ سکوں۔

وحدت الوجود

اس دنیا میں جو کچھ بھی تمھارے سامنے آئے اس میں خدا موجود ہے بالکل اسی طرح وہ تمام و کمال تمھارے اندر ہے۔

زندگی کا مطالبہ

زندگی تم سے صرف اس قوت اور سکت کا مطالبہ کرتی ہے جو تمھارے اندر ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں!

آخری پونجی بھی لگا دینے والے

ناکامی کے بعد خود رحمی، اور کامرانی کے بعد فخر و غرور کے جذبے اس سے ناآشنا تھے۔ شاید وہ اس راز کو جانتا تھا کہ بچی سکت بھر اس نے تو اپنی آخری پونجی بھی لگا دی ہے، اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آ نکنے والے کیا فیصلہ دیتے ہیں۔

انسانی حدود

جو چیز بھی زندگی کو قدر بخشتی ہے اسے تم حاصل کر سکتے ہو، اسے تم کھو بھی سکتے ہو، مگر مستقل طور سے اس پر قابض نہیں ہو سکتے۔

اس بات کا سب سے زیادہ جس قدر پر اطلاق ہوتا ہے وہ ہے "زندگی کے بارے میں حقیقت کا انکشاف"

تم نے سننا ہی نہیں چاہا

تم اپنی قوتِ سماعت کیسے بحال رکھ سکتے ہو جبکہ تم نے کبھی سننا ہی نہیں چاہا؟ یہ بات کہ خدا تمھارے لیے خاص فرصت رکھتا ہوگا، تمھارے نزدیک ایک امر طے شدہ ہے، بالکل ایسے ہی جیسے یہ بات کہ تم اس کے لیے وقت نہیں نکال سکتے!

سچ لکھنے والا

مائسٹر ایکہارٹ کہتا ہے: "وہ ہاتھ جو تحریر کے عقب ہے وہی سچی بات لکھ سکتا ہے!

...من السمع والبصر والفواد

جیو تو ایسے جیو کہ جو کچھ تمھیں ملا ہے (من السمع والبصر والفواد) اس کا استعمال کر سکو، پورا پورا اور اچھا استعمال!

دوسرے اور ہم

خیال کا ایک کوندا سا چمکتا ہے: "کیا اچھا ہوتا اگر میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا"۔۔۔ جب کہ دوسرے لوگ تمھیں ایک معقول تنخواہ، بینک بیلنس، اور بغل میں دبے ایک چرمی تھیلے کے ساتھ دیکھ کر سمجھتے ہوتے ہیں کہ تم اپنے وجود کو کبھی نہیں جھٹلا سکتے: "تم کیا ہو؟" ان کی دلچسپی اس میں ہو سکتی ہے! نہ کہ اس میں کہ "تم ہوا اور نہ ہوتے تو"

زر خرید

یہ بات کہ ہمارے دام سستے لگیں، یا قیمت ہی نہ لگے، یا ہم سے ہماری قیمت کے بارے میں فریب کیا جائے، یہ بات ممکن ہی کیسے ہے جبکہ اپنی ہر خدمت کے لیے ایک عرصہ ہوا ہم استحقاق سے زیادہ مزدوری پا چکے ہیں!

وہ آنے والا لمحہ

وقت کی گاڑی اس آخری دن کی جانب ہمیں کشاں کشاں کھینچے لیے جائے ہے۔

اس لمحہ کا تصور بھی کتنا اطمینان بخش ہوتا ہے۔ کیسا جاں بخش ہے یہ تصور، کہ ایک لمحہ ایسا بھی ہے جس کے بعد جس سے پرے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ وہ لمحہ، جس ایک لمحہ کے اندر دن اور سال سمٹتے چلے جاتے ہیں!

ان دیکھا ہاتھ

کسی اہم فیصلہ پر عملدرآمد سے پہلے یکایک کوئی تمھارا ہاتھ دبوچ لیتا ہے اور ایکا ایکی ان بہت سی باتوں کا ثبوت مل جاتا ہے جن پر یقین کرنے کی تم کبھی جسارت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقت کی اضافیت

وقت کا عرصہ اس بچہ کے لیے ہمیشہ طویل لگتا ہے جو انتظار کرتا ہوتا ہے، کرسمس کا انتظار، برسات کی رم جھم کا انتظار، بڑے ہونے کا انتظار! پھر وقت کا یہ عرصہ اس وقت بھی طویل لگتا ہے جب وہ اپنی روح کا ایک ایک شمہ ایک خوشگوار دن کے ہر ہر لمحہ کی نذر کر چکا ہوتا ہے۔

لمحہ کے امکانات

موجودہ لمحہ کی اہمیت ہے، جانے والے اور آنے والے زمانوں میں پل کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے امکانات کے سبب، اپنی دین کے باعث! اس لمحہ میں کیا کیا کچھ نہیں ہے جو ہمارے اندر خالی پن کو بھر سکتا ہے، جو سب کا سب ہمارا

ہوسکتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہم اس کے اہل ہوں!

نئی سرزمینوں کی دریافت

بوڑھوں کو مہم آزما ہونا چاہیے۔ جستجو، آرزو میں کھوئے ہوئے کچھ ایسے بندھے ہوئے جاتے ہیں کیوں کہ ایک آشناسی چیز کی سرحدیں ان سے قریب تر ہوتی جارہی ہیں لیکن نئی سرزمینوں کی دریافت کا سہرا کم ہی کے سر بندھتا ہے۔

ناشنیدہ

اب — جبکہ میں نے اندیشوں اور وسوسوں پر قابو پالیا ہے، خود اپنے اندیشوں پر، دوسروں کے اندیشوں پر، اور چھائے ہوئے گھور اندھیرے پر، جو ناشنیدہ کی سرحد پر طاری ہے۔ یہاں ہر جانی پہچانی چیز ختم ہوتی ہے لیکن اس سے پرے ایک سرچشمہ ہے جو میرے وجود کو اپنے امکانات سے سرشار کیے دے رہا ہے۔

عظیم موت

موت کے متلاشی مت بنو، موت خود ہی تمھیں پالے گی۔ اس کے بجائے اس راستہ کی تلاش کرو جو موت کو تکمیل بنا دیتا ہے (اور عظمت و جلال بخشتا ہے)!

موت سے مانوسیت

تمھارے جسم کو اپنی موت سے مانوس ہونا چاہیے، ساری صورتوں، درجوں اور حیثیتوں میں — جو صاف، واضح اور جذباتی لحاظ سے متوازن اقدام ہے، اس منزل کی طرف جو تم نے اپنی زندگی کے لیے بہتر سمجھ کے اپنایا ہے!

تکمیلِ زندگی

قربانی میں ایک عنصر کی حیثیت سے، موت ایک تکمیل کا نام ہے لیکن بسا اوقات یہ تنزل میں تبدیل ہوجاتی ہے

موت پر فتح

تنہا وہ شخص موت کو فتح کرسکتا ہے جس کے جسم نے اپنے بارے میں یہ سیکھ لیا ہے کہ کس طرح وہ محض ایک ذریعہ کے طور سے برتا جاسکتا ہے۔

تصورِ موت

آخری طور پر یہ ہمارا تصورِ موت ہی ہے جس پر ان سارے سوالوں کے جوابات کے فیصلے منحصر ہوتے ہیں جو زندگی ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ اس لیے اس کے لیے مناسب زمان و مکان کی ضرورت ہے، بترجیح کے حق کے ساتھ! اسی لیے ضرورت ہے کہ اس کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہا جائے!

یہ جھومتی گاتی فطرت

یہ ننگی زمین، اس پر یہ جھومتے گاتے درخت، صبح کی خاموش مگر تیز روشنی انھیں لپٹائے لیتی ہے، اور میں کتنی

ندت سے چاہنے لگتا ہوں کہ اس جھپٹنے میں میں بھی شریک ہو سکوں جیسے وہ وفادار جسم!! ـــــ زمین، پانی، آسمان،
ہوں کی سائیں سائیں، زمین کے جسم سے اُبلتی خوشبو، ہواؤں کا شور، پانی اور روشنی کا ملن!!

اطمینان و سکون؟ نہیں نہیں، نہیں! بلکہ صرف تازہ دم ہونے کے لیے، ایک ذرا وقفۂ آرام کے لیے، عالم انتظار میں!!

ری محبت کا جواب

کسی بڑی محبت کو شاید جوابی محبت نہیں ملتی مگر ایسا ہو تاکہ دوسری طرف سے گرمی اور پناہ گیری ملتی تو شاید اس بڑی
مت کے پختہ تر ہونے میں رکاوٹ پڑ جاتی۔

یہ محبت ہمیں کچھ دیتی نہیں ہے لیکن تنہائی کی دنیا میں یہ بصیرت کی بلندیوں کے دریچے وا کر دیتی ہے!

چسپ موت

کیوں موت کو دلچسپ بنانے نہیں دیتی۔ دنیا مجھے بے عشق کیے بھی تو فنا ہے!

ں کی سادگی

نیکی بھی کیسی سادہ چیز ہے، ہمیشہ دوسروں کے لیے جینا، اور خود اپنا فائدہ کبھی نہ چاہنا!

ـس، پرکھ اور تول

وہ جس نے اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں دے دیا ہے، انسانوں کے سامنے کیسا آزاد اور مطمئن کھڑا ہوا ہے!
ن کے سا مکمل سکون و اطمینان کے ساتھ کھڑا ہے کیوں کہ اس نے انھیں یہ حق دے دیا ہے کہ وہ اسے آنک،
ا اور تول سکیں!

ار کا تحفہ

آخر کار "قربانی" کا کیا مفہوم بچتا ہے؟ یا "تحفہ" کا؟ وہ جو نادار ہے کیا دے سکتا ہے؟ تحفہ خدا کا ہے!
ہی کے حضور!!

ـب کی راہ

وہ جو اپنے آپ کو اس کے قدموں میں لا چکا ہے وہ جانتا ہے کہ "راستہ" صلیب ہی پر ختم ہو گا، چاہے سامنے
وہ کامرانی کی فتح کے دروازے وا نظر آ رہے ہوں!

ہ روی، قلندریت

آزاد زیست! ہاتھ جھاڑ کے ایک دم اُٹھ کھڑے ہونا اور ایک بار مڑ کے دیکھے بغیر اپنے پیچھے اپنا سب کچھ
ینا ـــــ سر تسلیم خم کر دینا! لبیک کہنا!

زندگی کا خلا

کیا تمھارے پاس زندگی کے خلا کو بھرنے کے لیے بس اتنا ہی کچھ ہے کہ اپنے کھوکھلے پن پر اظہار کرتے رہو۔

دیانت داری

ایسا کبھی نہ کرو کہ خود اپنے تجربات اور معتقدات کو جھٹلا دو، محض سکون و عافیت کی خاطر!

ہائے وہ نصب العین

مجھے کچھ دو، جس کی خاطر میں مر سکوں!

اس تنہائی کو روح فرسا بنانے والی یہ بات نہیں ہے کہ میرا بوجھ بانٹنے والا کوئی نہیں ہے بلکہ یہ کہ اپنا بوجھ ہی اٹھائے ہوئے ہوں!

اس لیے —— دعا کرو کہ تمھاری تنہائی تمھیں کوئی ایسی چیز تلاش کر لینے پر آمادہ کر دے جس کی خا[طر] زندہ رہ سکو، جو اتنی عظیم ہو جس کے لیے تم مر بھی سکو!

انسان سے پیالہ و ساغر بنا ہوں میں

لو میں اس کام کی تکمیل کروں جس کے آغاز کی مجھے اجازت ملی تھی ... جام کا سرمایۂ افتخار یہ ہے کہ ا[س سے] کچھ پیا جائے؛ اس کی نیازمندی اس میں کہ وہ خدمت گزاری کرے۔ پھر اس کے نقائص کی کیا اہمیت ہے!

[اور غالب اس کے برخلاف کہتا ہے: انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں]

آہ انساں کی خواہشِ بے تاب

کمرے میں گرد بے کراں جاتی ہے۔ ہوا رک رک کے بھاری پڑ رہی ہے۔ روشنی مدھم پڑتی جاتی ہے اور ہم ہیں کہ آخری لمحے تک اس کمرے کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں۔

یادوں کے سائے

"ہم بھائی بہنیں گھر پر کیسے خوش تھے، مجھے وہ کرسمس یاد ہیں جب ہم سب جمع ہوتے تھے، اس وق[ت] یقین کر سکتا تھا کہ کبھی بھی زندگی ایسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کے بکھر جائے گی؟" یہ الفاظ لکھے ہوئے مجھے تیس سال ہو گئے اب اس کی بچی اپنے بچپن اور اپنی زندگی کے بارے میں بعینہٖ یہی "کتبہ" لکھ رہی ہے!

تعطیل کی منسوخی

کار کے حادثے میں لڑھک کے نیچے وادی میں گرتے ہوئے اُسے تنہا ایک خیال آیا: "لو بالآخر میں نے

پورا کر دیا، اس کا اکیلا، تھکا ماندہ مگر مسرور خیال!
ایسا نہیں تھا کہ زندگی ختم ہو چکی تھی۔ زندگی اب بھی چلتی۔ لیکن زندگی کے اس خاص سفر پر اس کا راستہ
، اور پھر جب وہ ہوش میں آیا اور حقیقت کی دنیا نے اسے گھیر لیا تو وہ بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کر سکا، خود بھی
، ناامیدی کے آنسو! کہ "چھٹیاں بنانے" کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے!

یں کھیلنے والا

اس نے نئی سرزمین کے نئے راستے کھول دیے، کیونکہ اس میں جرأت تھی کہ چلتا چلا جائے اس سے بے نیاز
رہے پروا کہ دوسرے بھی اس کے پیچھے چل رہے ہیں یا نہیں ——— یا اسے سمجھ بھی رہے ہیں!

یت کا اظہار

نظم (شاعری) بھی ایک کام کی مانند ہے، اس حد تک کہ اس کو بھی اس کے خالق کی شخصیت کے اظہار
سمجھا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نظم کے جمالیاتی معیارہائے تکمیل کی رو سے اس کے حسن کو
کر دیا جائے؛ بلکہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے استناد کو اور صحت کو، ایک اندرونی زندگی
مطابقت دے کے دیکھا جائے!

ں

اپنے آپ سے ہراساں مت ہو۔ اپنی انفرادیت کے بس بھر زندگی گزارنے کی کوشش کرو، دوسروں
کے لیے! اور ہاں دوسروں کی نقل مت کرو، ساتھی خریدنے کے لیے۔

انہ قلندری

زاد ہونا اور ذمہ دارانہ زیست کرنا، بس انسان کو اسی لیے پیدا کیا گیا تھا۔ تو جو کوئی راستہ اپنانے میں
ہے، وہ راستہ جو اس کا اپنا راستہ تھا، تو وہ ہمیشہ کے لیے گیا!

ت کے بقدر استحقاق

مہم آزمائی چاہتا ہے اس کی ہمت کے بقدر اسے اس کا تجربہ ہو کے رہتا ہے۔ اور جو کوئی قربانی دینا
وہ قربان ہو کے رہتا ہے، اپنے قلب کی پاکیزگی کے بقدر!

ں ناداری

کی محبت نادار ہو جاتی ہے، اگر ہم میں اپنے منتہی کو قربان کر دینے کی ہمت نہیں۔

ہ دوسرے مقصد

سروں کو مقصد سمجھو نہ کہ ذریعہ! اور اپنے آپ کو مقصد، محض اس لحاظ سے، کہ وہ ایک ذریعہ کا کام کرے۔

قرض

اب، ابھی ابھی، اسی لمحہ، مجھے وہ سب قرضہ لوٹانا ہے، جو اب تک مجھے ملا ہے۔ ماضی اور اس کے قرض کا بوجھ، حال کے سامنے صف بندی کیے ہوئے ہے، اور ـــــ مستقبل پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

قرض کی واپسی

کیا ہر اُس ٹکراؤ میں حسن پیدا نہیں ہوتا جو انسان اور زندگی کے درمیان ہوتا ہے، جب وہ اپنا سارا قرض (سود در سود) لوٹاتا ہوتا ہے، زندہ لمحے پر اپنی ساری قوت مرکوز کیے ہوئے جو زندگی نے اسے ایک فریضہ کے طور پر دی تھی۔

خوبصورتی اس کے لیے ہے جو اپنا قرض ادا کرتا ہے۔ شاید دوسروں کے لیے بھی ہو۔

آدابِ مجلسی

تو خود حجابِ خودی حافظ از میاں برخیز!

مجلسی ہونا، کچھ بات کرنا محض اس لیے کہ دستور و رواج کے مطابق خاموشی نامناسب ہے، ایک دوسرے سے گھلنا ملنا محض یہ دھوکا کھانے کے لیے کہ اس طرح موانست اور تعلقات پیدا ہوں گے؛ انسان بھی کہاں آپہنچا ہے! قدرتی طور سے، ان کے نتیجہ میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم خالی خالی ہوگئے ہیں۔ روحانی قوتوں کا نامناسب استعمال ہر جگہ یہی نتائج پیدا کرتا ہے ـــــ روحانی موت کا جہنم!

دیوار

تمہارا شاندار لباس ایک نقاب ہے جو تم نے اہتمام سے اپنے اوپر اس لیے ڈال رکھی ہے کہ لوگوں کو بہترین نظر آسکو یہ ایک دیوار بن گئی ہے تمہارے اور اس ہمدردی کے درمیان جو تم نے مانگی ہے، وہ ہمدردی جو تمھیں اس دن ملی جب تم وہاں لباس سے عاری کھڑے تھے۔

اقتدار کا مستحق

قوت یا اقتدار کا استحقاق اسی کو پہنچتا ہے جو ہر روز اس استحقاق کو ثابت کرتا جائے!

خاموش

بہترین اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز جو تمھیں اس زندگی میں پیش آسکتی ہے، یہ ہے کہ تم خاموش ہو جاؤ اور خدا کو بولنے دو، اور کام کرنے دو!

کبھی اے حقیقتِ منتظر...

کوئی آہستگی سے کہتا ہے یہاں ہر شے تیری منتظر ہے، تیرے ہی لیے بنی سنوری! سال بہ سال! ہزارہا نغمات جیسی!

کہاں رہ گیا ہے! کہاں ہے تو؟ کہاں ہے؟

کبھی اے حقیقتِ منتظر!

سی لمحہ

پیچھے مڑ کے مت دیکھو اور آئندہ کے بارے میں خواب بھی مت بُنو۔ اس سے نہ ماضی تمھیں واپس مل سکتا ہے
تھارے دوسرے دن کے خوابوں کا اطمینان ہوسکتا ہے۔ تمھارا فرض، تمھارا انعام، تمھاری تقدیر، یہاں اور ابھی ابھی ہیں!

م اور اندمال

خدا کے حضور سر تسلیم خم، مقدر کے سامنے لبیک، اور اپنے لیے بھی "جی ہاں"۔ اس سے روح زخمی ہوسکتی ہے،
ن اسی میں اندمال کی طاقت بھی ہے!

ک

تمھیں بالآخر ہر چیز چھوڑنا ہوگی۔ پھر اس چھوٹی موت پہ کیوں روتے ہو؟ اسے انگیز کرو، تیزی کے ساتھ، مسکراہٹ
ماتھ، یہ موت 'مرو' اور آگے جانے کے لیے آزاد ہوجاؤ! اپنے کام کے لیے یکسو! لمحہ جو فرض عائد کرے اس کے لیے
ن تیار!

نے حق ادا نہیں کیا

تم نے حق ادا نہیں کیا؛ جتنا کچھ تم کرسکتے تھے نہیں کیا! اتنا کچھ تم نے کبھی نہیں کیا ہے جب تک کہ تمھارے
ممکن رہا ہے کہ تم کسی نہ کسی قدر و قیمت یا درجے میں کچھ نہ کچھ اب بھی پیش کرسکتے تھے!

مدت العمر ان اجنبیوں کے درمیان زندگی بیت گئی، جو نہ اس روح کے کرب کو پاسکے نہ اس زندگی کی زیریں
ں کو: تنہا! بالکل تنہا!! مدت العمر زندہ چشموں کی پیاس رہی اور ان کی تلاش کی آزادی سے بھی محرومی رہی!
ں کی زندگی!!

اس کا جواب، سیدھا، صاف، کڑا اور وحشیانہ جواب صرف "ایک" ہے: "اس ایک میں تم اپنے آپ کو کبھی
وس نہیں کروگے۔ اس ایک میں تم کو ہمیشہ اپنی فضا کا احساس رہے گا، اجنبیت کا نہیں!

دالله

میں کیا اور میرا ارادہ کیا! ہاں جو تو چاہے!!

نرہ

تمھیں کمرے سے باہر کردیا جائے تو کنجی کے سوراخ سے مت جھانکو۔ دروازہ توڑ ڈالو یا یہاں سے چلے جاؤ!

وہ سامنے سرِ منزل...

پیچھے مڑ کر مت دیکھو مسافر! وہ سامنے سرِ منزل چراغ جلتے ہیں!

میں

میں کیا، میری بساط کیا! مگر میرے اندر تو جو ہے!

گھٹیا قیادت

کیا اس وار سے تمھیں تکلیف پہنچی؟ اس وار میں پوشیدہ حماقت کے باوجود؟ اس لیے تکلیف پہنچی کہ قیادت کلرک کو سونپ دی گئی تھی؟ مگر کیا تمھیں اس سے بھی رنج ہی پہنچے گا اگر وہ کلرک اپنے میں سچ مچ قائد جیسا سمجھنے۔

کس کے لیے

کامیابی کس کے لیے؟ خدا کی عظمت و برتری کے لیے، یا خود اپنے لیے؟ بنی نوع انسان کے سکون کے لیے، تمھارے اپنے لیے؟ اس سوال کے جواب پر تمھارے اعمال کے نتائج کا انحصار ہے!

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی زندہ رہنے سے ناپی جاتی ہے اور انسانوں کی زندگیوں کے دن ناپنے کے طریقے دوسرے ہیں۔

ماضی و حال سے آزاد

میں وہ قوت کہاں سے لاؤں کہ ایک آزاد فرد کی حیثیت سے جی سکوں، میرے ماضی میں جو کچھ نادرست نامناسب ہے، اس سے، اور میرے حال میں جو کچھ پیچ پن ہے اس سے الگ تھلگ رہ کے جی سکوں؛ اور اس طرح اپنے تئیں معاف کر سکوں!!

ہر دن ایک زندگی

رات ڈھل چکی ہے ــــــ

ہر روز زندگی کا روزا ولیں ہے۔ ہر دن ایک پوری زندگی ہوتا ہے

ہر صبح ہمیں اپنی پوری شخصیت کو کچھ اخذ کرنے، کچھ تجربہ کرنے، اور دوسروں کو، زندگی کو، کچھ واپس دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

واپسی کا سوال ختم

ایک نقطہ ایسا بھی ہے جس پر ہر چیز بڑی سادہ و بے پیچ ہو جاتی ہے، اور جب دو مختلف راہوں میں کسی ایک کے انتخاب کا سوال اٹھتا ہی نہیں۔ یہ اس لیے کہ جو کچھ بھی اب تک تم نے داؤں پر لگایا ہوا ہے وہ

کھ جائے گا۔ اگر پیچھے مڑ کے دیکھنے لگو گے! زندگی کا وہ نقطہ جہاں واپسی کا کوئی سوال ہی نہیں!

شہرت کے تاریک سائے میں

مجھے اس شخص سے ہمدردی ہے، ترس بھی آتا ہے، جو اپنی اس تصویر سے محبت کرتا ہے جو پبلسٹی کے
ہومانی سائے میں عوامی رائے نے بنائی ہے۔

دوراہے

وہ جو اس اصول کو نہیں مانتا کہ کوئی ایک راستہ انتخاب کر لینے کے بعد دوسرے سب راستے اس سے
ٹ جاتے ہیں —— تو اسے چاہیے کہ اپنے کو یہ سمجھنے کے لیے آمادہ کر لے کہ پھر منطقی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ
دوراہوں پر بسر ہو۔ مگر پھر اس شخص کو بھی الزام تو نہ دو جو ایک راستہ چن لیتا ہے۔ اس کی تعریف نہ کرو،
الگ بات ہے!

ل من مزید

دونوں مسرور تھے، دونوں نے وہ انکسار اور فروتنی سیکھ لی تھی جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے، ایسی فروتنی
س میں پہنچ کے پھر آدمی تقابل نہیں کیا کرتا، جو چیز موجود ہوتی ہے اُسے کسی اور کسی مزید کی خاطر رد نہیں کرتا!

ماری فطرتی ابلیسیت

ہم ایسے نقطہ تک پہنچ سکتے ہیں جہاں ہمارے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ہم اولین گناہ کو پہچان سکیں، جو اس کے
وا در اصل کچھ بھی نہیں کہ ہماری فطرت اور خمیر میں بدی، ابلیسیت، سیاہ مندی ملی ہوئی ہے یعنی اگرچہ یہ ہماری فطرت
ں داخل نہ ہو، مگر اسی فطرت کا ایک حصہ ہے کہ ہمارے اندر مسرت کی ایک لہر اٹھتی ہے، جب خاص اس
نصر کو ضرب پہنچ رہی ہوتی ہے جس میں ہم لگے ہوئے ہیں —— یا جب بعض ایسے افراد پر کوئی مصیبت آتی
ہے جو ہمیں عزیز ہیں۔

پنے نیچ پن کی تشخیص

اپنے نیچ پن پر نہ تو اپنے وجود کی مستقل تحقیر زیبا ہے اور نہ اُسے وجہ افتخار سمجھنا مناسب۔ اس کی تشخیص
ر پہچان البتہ ضروری ہے؛ کہ جہاں یہ نظروں سے اوجھل ہوئی یہ میرے کسی عمل کی بے لاگ صداقت کے واسطے
لیے ایک خطرہ بھی بن سکتی ہے!

ریخ

روح کی تاریخ کے سوا کسی اور تاریخ کا وجود ہی نہیں! سکون و اطمینان کا لفظ بے معنی ہے
اسے روح کے سکون کے!

تکمیل

اپنے آپ کو اپنی راہ میں پتھر سمجھ کے ٹھکراتے ہوئے اس خول سے نکل آؤں کہ اپنے آپ میں سما سکوں تکمیل کی خاطر! اے کاش!

وقتی

تمھیں سب کچھ اسی موجودہ لمحہ میں کرنا ہے، لیکن محض موجودہ لمحہ کے لیے مطلق نہیں! اور اپنی آئندہ یا شہرت کے لیے تو ہرگز نہیں!!

انھیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو تھوڑا بہت تمھاری کوششوں کی بدولت تمھارا استحقاق ہو چکا ہے وہ تمھیں نہ۔ تمھاری ساری جد و جہد کسی ایسے فرض کے ساتھ لگن کی زائیدہ ہو جس میں تم اپنے آپ کو بھی بھول جاتے ہو۔ صرف ایسی صورت میں تم ان کوششوں کی قدر قیمت پہ ایمان رکھ سکتے ہو۔ اور اگر ایسا ہے تو منزل مقصود پہنچنے کے لیے تمھاری سعی پیہم کو تمھیں یہ بھی سکھانا چاہیے کہ جب دوسرے اس منزل تک تم سے پہلے یا تمھارے بغیر پہنچ جائیں، تو تم اس پہ بھی مسرت سے سرشار ہو جاؤ!

نافع اور مضر

ایسی کسی بھی چیز سے اپنے آپ کو محروم کیوں کرو جس سے کسی دوسرے کو ضرر نہیں پہنچتا، اور تمھیں فائدہ۔ بشرطیکہ وہ تمھارے منتخبہ راستے سے ٹکراتی نہ ہو!

سیرت کے رُخ

ہر نازک اقدام کے وقت ہماری سیرت کا ہر رخ اہم رول ادا کرتا ہے: کمینہ پن کا بھی، شرافت کا بھی سیرت کا کون سا رخ دوسرے کو جگہ دیتا ہے جب وہ دونوں ہمارے کسی عمل کے موقع پہ یک جا کھڑے ہوتے ہیں؟

قائد

اُسے قائد بننے سے کوئی نہیں روک سکتا جس کی جرأت اور سیرت ایسے ہیں کہ وہ اپنی بھاگتی ہوئی منزل مقصود کے سمندروں میں اپنے کو بہہ جانے دیتا ہے!

شیطنت کی شکست

شیطنت کو فتح مندی کے بعد بھی شکست دی جا سکتی ہے اس وقار اور ضبط سے جو ہم اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے میں اختیار کریں!

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

کسی ایسے فرد کے لیے جس کے سپرد ایسا کام ہے جو انسان کے اندر موجود غیر معمولی ذمہ داریوں اور غیر معمولی امکانات کے ثبوت فراہم کرتا ہے، اگر وہ اس احساس کو فراموش کر دے کہ وہ ان بڑے کاموں کے لیے کہیں سے مامور ہے، تو وہ قابلِ معافی نہیں ہے۔ اور جب تک اسے اس امر کا احساس ہے، تو وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس کے کچھ بڑے معنی بھی ہوتے ہیں، قیمت کسی کی نہیں ہوتی! —— اس لیے اگر وہ کوئی شکایت کرنے لگ جائے تو وہ محض اپنے آپ کو ملزم گردان رہا ہے، اور بس!

روشنی کے انعکاس کا ذریعہ

تم تیل نہیں ہو، تم ہوا نہیں ہو، تم تو محض جل اُٹھنے کے عمل کا وہ نقطہ ہو جہاں روشنی کی تخلیق میں شعلہ کی پہلی چمک نمودار ہوتی ہے! تم محض روشنی کی کرن کا شیشہ ہو، تم روشنی کو لے، دے، اور اپنا سکتے ہو، بس اتنا ہی جتنا ایک شیشہ! اگر تم خود اپنے آپ کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے سرگرم عمل کرتے ہو، تو تیل اور ہوا کو شعلہ بنانے کے لیے جلنے میں رکاوٹ ڈالتے ہو، تم نے شیشہ سے اس کی شفافیت چھین لی!

عظیم روشنی کا نقطۂ انتشار

تقدیس —— عظیم روشنی بننے میں، یا اپنے کو عظیم روشنی سے بڑھ کر دینے میں تاکہ اس کی تخلیق مزید ہو سکے؟ اپنے آپ کو قابل کر دینے میں، کہ عظیم روشنی کا نقطۂ انتشار قائم ہو سکے جس سے وہ اور زیادہ وسعتوں میں پھیل سکے؟

وسیلہ نہ کہ مقصد

تم زندگی کو اس حد تک جان سکو گے، اور زندگی تمھیں اس درجہ تک پہچان سکے گی جس حد تک تمھارے اندر شیشہ کا یہ شفاف پن موجود ہے اور یہ صلاحیت ہے کہ تم ایک مقصد کی حیثیت سے قطعی ختم ہو جاؤ اور یہ کہ خالص ایک وسیلہ بن کے رہ جاؤ، محض ایک ذریعہ!

جواب دہی

تمھاری ذمہ داری یقیناً لرزہ خیز ہے۔ اگر تم کہیں ناکام ہوتے ہو تو اصل میں تو خدا نے انسان کو ناکام کر دیا۔ تمہارا خیال ہے کہ تم خدا کے سامنے جواب دہ ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو خدا کی ذمہ داریاں تم نے سنبھال لی ہیں؟

دخلوا فی السلم کافہ

محض یہ بات کافی نہیں ہے کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو، اہم بات یہ ہے کہ تم صرف اسی کے ماتحت رہو۔ ... داری کا ہلکا سا بٹوارہ بھی جانے کن کن نیچی چیزوں کی راہ کھول دیتا ہے: دن کے خوابوں کی راہ، حقیر چھوٹی ... نگوئی راہ، نیچ غرور کی راہ، پست بغض و کینہ کی راہ، ساری پستیوں کی راہ جن میں موت کے عناصر ہیں۔

تم محض تم نہیں کچھ اور بھی ہو

تم کسی بات کو دھیان سے سنتے ہو نہ ٹھیک سے پڑھتے ہو ——— سوائے اس کے کہ بات تمھارے بارے میں ہو رہی ہو یا کتاب تمھارے سلسلہ میں لکھی ہو۔ تبھی تم پوری پوری توجہ دیتے ہو۔ تو کیا تمھاری ساری توجہ محض اپنے بارے میں ہے؟

ناشنیدہ کے حضور

میں شکرگزار ہوں جنھوں نے مجھے یہ سب کچھ سکھایا ہے، ان ایّام کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے یہ کچھ دیا ہے۔

تب میں نے دیکھا کہ وہ "دیوار" تو کبھی بھی نہ تھی اور ناشنیدہ یہاں ہے، یہ ہے نہ کہ کچھ اور چیز یا کہیں اور! جو کچھ اس کے حضور "پیش کرنا ہے" وہ یہاں اور اسی لمحہ میں ہے! ہمیشہ اور ہر جگہ ——— خدائی پیشکش! خدا کے حضور!

اعتقاد کے معنی

اعتقاد کے معنی ہیں ہچکچاہٹ کا یکسر ختم کر دینا!

صرف ہم ہی ہم ہیں

یہ سفرِ حیات جہاں ہم اپنے آپ سے ملتے ہیں! صرف اپنے آپ سے! تنہا اپنے آپ سے!! اور کسی سے بھی نہیں!!!

ایسی بلندی ایسی پستی

عقیدہ خاکساری اور غرور دونوں کا باعث ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ خدا کے اندر میری حیثیت کچھ بھی تو نہیں ہے ——— لیکن پھر یہ بھی، کہ خدا مجھ میں ہی تو ہے!

زندگی کی آواز پر

زندگی کی آواز پر آواز دینا بالکل وہی چیز ہے کہ تم خود اپنی آواز پر لبیک کہو!

سرسبز و شاداب مناظر خدا کی عظمت کے گیت گا سکتے ہیں تو ——— جسم روح کے نغمے گنگنا سکتا ہے۔

میری آرزو

میری آرزو ہے کہ میں زیادہ مضبوط، زیادہ سادہ، زیادہ خاموش اور زیادہ گرم دل بن سکوں۔

غیر مرئی ہاتھ

اگر معاملات میں انتخاب کا کام تم نے اپنے اوپر چھوڑ رکھا ہے تو فکر کرو کہ تمھاری زندگی کی بنیادیں غائب ہیں!

تم محفوظ ہو

جو ہونا ہے وہ بالآخر ہو کر ہی رہے گا، اور ـــــ ان حدود میں تم محفوظ ہو!

درمیانی لمحہ

تجربہ کرنے اور تجربہ ہو جانے کا درمیانی لمحہ، جب تجربہ ہم پر اپنے آخری اسرار کھولتا ہوتا ہے ـــ لمحہ، جو دریافت ہوتے کے ساتھ ہی ماضی بن جاتا ہے؛ اس پر دھبّے اور خراشیں پڑتی جاتی ہیں اور چمک دمک ماند پڑتی جاتی ہے؛ اور پھر ہم حیرت کرتے ہوتے ہیں کہ وہ کیا تھا، جس میں ہمارے لیے کبھی ایسی کشش تھی!

آخری چھلانگ

دیکھو! پرواز چھوڑ کے اتر نہ پڑنا! آشیانہ کے فسوں میں گرفتار ہونا نہیں ہے، جب تک آخری چھلانگ نہ لگ جائے، جب گہرائی اپنے آپ کو واپس لے لے!!

اپنی نفسیات سے آگاہی

دوسرے کے طرزِ عمل کو سمجھنے کی کوشش اتنی اہم نہیں، جتنا خود اپنے طرزِ عمل کی بنیادوں سے آگاہی حاصل کرنا۔

ہر جھگڑے کا حل ممکن ہے

تم ہر آویزش اور قضیہ کا ایک پائدار حل تلاش کرسکتے ہو، مگر دوسرے کو کسی پہلے سے قائم کیے ہوئے خیال کے تحت نہ دیکھو، اور دوسرے کی مشکلات کو اس طرح سمجھو جیسے وہ تمھارے اوپر گزر رہی ہوں۔

تجربہ کی قیمت

براہِ راست تجربہ بڑی قیمتی شے ہے۔

تقدس

ہمارے زمانے میں تقدس و تقویٰ کی شاہراہ قطعی طور سے اس عملی دنیا سے ہو کے گزرتی ہے۔

راستہ کی کھوج

راستہ ہم نہیں کھوجتے! راستہ ہمیں تلاش کر لیتا ہے۔

ہمیشگی

چیزوں کی 'ہمیشگی'!! تمھارے ملکیت کے دعووں پر ایک کھلی طنز!!

فطرت کی زندگی

پہاڑی چشمے کے کنارے ایک بار پھر تم اپنی تنہائی سے ہمکنار ہو گئے۔ جو اس سے پہلے بھی موجود تھی، اور اب بھی ہے ـــــ اور جو ہمیشہ رہی ہے، اس وقت بھی جب اکثر پرخلوص دوستی نے اس کی عریانیت کو بے نقاب

ہونے سے بچائے رکھا ہے! لیکن! چشمہ زندہ ہے!!

ترے انفاس کی لو

سرگرمیوں کے انتہائی عروج کے دوران بھی تمھارے اندر یہ احساس جاگ اٹھتا ہے کہ آدمی حقیقت میں تم تک نہیں پہنچ پایا! تم جو کسی دوسرے کے انفاس کے قریب نہیں آئے۔ وہی قدیم دیو پری کی کہانی!! جس میں کسی کو نظروں سے غائب یا جانور کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے "اور اب وہ اپنی انسانی شکل میں صرف کسی محبت کے ذریعہ ہی واپس آسکتا ہے!

لاجواب کر دیا

ایک پاگل بیچ بازار میں کھڑا چیخ چلا رہا تھا۔ پر کوئی اُسے جواب دینے کو نہیں رُکا! سو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس کے تمام اقوال بالاتفاق غیر متنازع فیہ تھے!!

بدترین اور بہترین

ناکامی! کیا تم مطمئن ہو کہ تم نے اپنے اندر کے بدترین کو کھل پھینکا ہے؟ کسی بھی معاملہ میں جہاں انسان زیچ میں آتا ہو یہ محض فریب دہی اور دھوکہ بازی ہے، اگر کوئی شخص ہر ہر لمحہ اپنے آپ کو ممکن طور پر بہترین صورت میں پیش کر سکے!

جواب کتنا آسان تھا

سوال تو اسے پتا ہی نہیں کیا تھا۔

سو اس کے لیے یہ بڑا آسان تھا ـــــ کہ جواب دے سکے

معافی یا قربانی

(غلطی یا جرم کی) معافی سبب اور نتیجہ کے سلسلہ کو بیچ سے توڑ دیتی ہے۔ اور یہ اس طرح پر کہ وہ جو اپنی محبت سے تمھیں معاف کر دیتا ہے، وہ تمھارے اس عمل کے سارے نتائج اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہے۔ اس لیے جانو کہ ہر معافی کے ساتھ ایک قربانی وابستہ ہے۔

تجربہ کی ابدیت

یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم کسی بھی تجربہ کو بھول سکیں، سب سے زیادہ تکلیف دہ تجربہ کو بھی نہیں۔

جانے والے آنے والے

گزرے ہوؤں کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک محفل میں ہوں۔ اور وقت وہ ہے جب وہ شخص رخصت ہو چکا ہے جس کے اعزاز میں محفل برپا ہوئی تھی۔

اور جب آنے والوں یا اپنے بعد باقی رہنے والوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی

ایسی دعوت کی تیاریوں میں شریک ہوں جس کی مسرتیں میرے حصے میں نہیں آئیں گی۔

دور افق کی اور

اگلا قدم ڈالنے سے پہلے، زمین کا اندازہ کر لینے کے لیے، نیچے کی طرف کبھی مت دیکھو۔ صرف وہ صحیح شاہراہ کو پالے گا جس نے اپنی نظریں دور افق پر جما رکھی ہیں۔

بخشے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں

زندگی صرف فاتح کے آگے جھکتی ہے، ایسی شے کبھی قبول نہ کرو جو عطیۃً یا عنایت کے طور پر حاصل ہو رہی ہو۔

پہاڑوں کی پستیاں

پہاڑ کی اونچائی کو اس وقت تک مت ناپو جب تک تم اس کی چوٹی تک نہ پہنچ جاؤ۔ اور اس وقت تم دیکھو گے کہ پہاڑ کتنا نیچا تھا۔

(۲)

اپنی کم مائگی کا احساس

ہمیں اپنے آپ کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے جب ہماری روح کسی عظیم ذہن سے متصادم ہوتی ہے۔

عقل انسانی

عقل انسانی کیا ہے؟ فطرت کی ایک سعیٔ جمیل، جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرتی ہے۔

احساس برتری کی تسکین

احساس برتری کی تسکین اپنا ایک معاشی پہلو بھی رکھتی ہے۔ آپ مجھے ڈسپنسر کی جگہ ڈاکٹر کہہ کر پکاریں تو میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا، چاہے آپ میری تنخواہ میں ایک پائی بھی اضافہ نہ کریں!

ہندستانی مسلمان

بحیثیت ایک سیاسی قوت کے اب غالباً ہندستانی مسلمانوں کی کوئی وقعت نہیں رہی لیکن میرا ایمان ہے کہ ہمارا وجود اس لحاظ سے دنیا کے لیے ناگزیر ہے کہ زمین پر خدائے واحد کی یہ آخری حجت ہے اور اس طرح قوام عالم میں ہماری حیثیت خالصتہً شاہد عادل کی ہے۔

تجربہ

زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے۔

تین انقلابی

فکر انسانی کی تاریخ میں تین بڑے انقلابی آئے گوتم، محمد، اور کانٹ۔

میرا ہندستان

میرے مالک! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ایسے دیس میں پیدا کیا جہاں گلابی سحر شعلہ زار خود رو جنگلوں میں فطرت کی گزری ہوئی راتوں کی افسردگی ایک ابدی نیند میں آرام کر رہی ہے۔

یہ دلکش غروب (کرم کتابی نہ بن)

تمہاری لائبریری کے سارے حیرتناک کتابی علوم مل کر بھی، راوی کے کنارے ایک دلکش غروب کے برابر قیمت نہیں رکھتے۔

طاقت

طاقت میں سچ سے زیادہ یزدانیت ہے۔ خدا طاقت ہے۔ تو پھر تم اپنے آسمانی باپ کی طرح کیوں نہیں؟

مصائب

مصائب خدائی تحفہ ہیں جن کے ذریعہ انسان مکمل زندگی کو دیکھ لیتا ہے!

پارسائی

گناہ کی ایک تعلیمی قدر و قیمت بھی ہے۔ نیک پارسا لوگ اکثر و بیشتر گدھے ہوتے ہیں۔

صرف ایک خیال

اگر تمھاری آرزو ہے کہ دنیا کے شور اور ہنگامہ میں تمھاری آواز لوگ سن لیں ——— تو تمھیں اپنی روح پر صرف ایک، تنہا خیال کو جاری و ساری کرنا ہوگا۔ ایک اور صرف ایک خیال کو اپنے میں سموئے رہنے والا ہی وہ شخص ہوتا ہے جو سیاسی اور سماجی انقلاب لاتا ہے، جو سلطنتیں قائم کرتا ہے اور جو دنیا کو قانون دیتا ہے (جس پر دنیا چلتی ہے)۔

وہ ایک لمحہ

میں اپنے دنوں، مہینوں اور برسوں کی قدر و قیمت اس تجربہ سے آنکتا ہوں جو وہ میرے لیے لاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی میں کتنی حیرت میں پڑ جاتا ہوں جب مجھے یہ پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک لمحہ ایک پورے سال سے بھی زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔

شعر

فلسفہ سال خوردہ بناتا ہے شعر جواں سال؛ ماہر نفسیات تیرتا ہے شاعر غوطہ لگاتا ہے!!

انجان

جس طرح ایک پودا جو چشمہ کے کنارے اگا ہو، اُسے اس چشمہ کا شیریں، سیمیں نغمہ سنائی نہیں دیتا وہ نغمہ جو اُسے عدم سے وجود میں لایا ہے ـــ بس ایسے ہی انسان ہے جو لامتناہی کے کسی سرے پر اُگ آیا ہے جو اس خدائی ترنم آواز کو نہیں سنتا جو اس کی روح کو زندگی اور توازن بخش رہی ہے۔

سچی سیاست

سچی سیاسی زندگی حقوق کے مطالبوں سے نہیں شروع ہوتی۔ یہ شروع ہوتی ہے فرائض کی انجام دہی سے!

شاعر یا فلسفی

فطرت اخیر تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ افلاطون کو کیا بنا کر دنیا میں لائے، شاعر یا فلسفی۔ گوئٹے کے سلسلہ میں بھی فطرت کا یہی عالم رہا (اور شاید اقبال کے سلسلہ میں بھی!!)

انسان کتنا حقیر ہے

۱۵ مئی ۱۹۱۰ء، کل ۴ بجے کے قریب میں نے ہیلی کا کومیٹ دیکھا۔ ۷۵ سال میں ایک بار یہ ہمارے آسمانوں پر نمودار ہوتا ہے۔ اب اسے میرے بچوں کے بچے ہی دیکھ سکیں گے۔ اب میں اسے کبھی نہیں دیکھ سکوں گا! کبھی نہیں!! ایک دم ذہن میں اس تکلیف دہ حقیقت کا خیال آیا کہ میں کتنا حقیر ہوں کتنا معمولی۔ اور کچھ دیر کے لیے تو میری ساری توانائی، سارے حوصلے جیسے شل سے ہو کے رہ گئے۔

مورخ!

تاریخ صرف انسانی محرکات کی تاویلوں کا نام ہے۔ پھر جبکہ ہم خود اپنے ہمعصروں کے بہت سے محرکات کو غلط فہمی سے غلط طور پر پیش کر سکتے ہیں اور اپنے قریب والوں اور دوستوں کے محرکات کو نہیں سمجھ پاتے تو پھر ان صدیوں پہلے کے لوگوں کے محرکات کو کیا سمجھیں گے؟ اسی لیے میرے خیال میں، تاریخ کا سارا ریکارڈ جوں کا توں قبول ماننے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

خدا کا وجود

میرے احباب اکثر مجھ سے پوچھ بیٹھتے ہیں "کیا تم خدا کے وجود میں عقیدہ رکھتے ہو" اور میں سوچنے لگتا ہوں مجھے بھی اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب دینے سے پہلے جو الفاظ یہ استعمال کر رہے ہیں ان کے معانی پوچھ لوں۔ میرے ان دوستوں کو اس بات کی وضاحت کرنی ہوگی کہ "عقیدہ" سے ان کی کیا مراد ہے "وجود" سے وہ کیا مطلب لیتے ہیں اور "خدا" کو کن معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ خاص کر آخری دو کے بارے میں تو کم ضرور پوچھنا چاہوں گا، اگر وہ اپنے سوال کے جواب پر مصر ہیں۔ مجھے اقرار ہے کہ میں ان اصطلاحوں کو نہیں

سمجھ پایا ہوں اور جب کبھی میں ان لوگوں سے جرح کرتا ہوں تو پتا چلتا ہے کہ وہ بھی میری طرح ناواقف ہیں!!

بڑی لائبریری کے مالک

اگر تمھارے پاس ایک بڑی لائبریری ہے اور تمھیں اس لائبریری میں موجود ساری کتابوں کے ...
تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایک دولتمند آدمی ہو، یہ ضروری نہیں کہ تم ایک مفکر بھی ہو! تمھاری بڑی لائبریری
صرف یہ بتاتی ہے کہ تمھاری جیب اتنی بھاری ہے کہ تم بہت سے دوسرے لوگوں کو اپنے لیے سوچنے کے واسطے ...
پر بلا سکتے ہو (کہ تم بیٹھو اور آرام کرو اور وہ سوچیں)

کامران

اپنی حدود (کمزوریاں، خامیاں اور کمیاں) تسلیم کرلو، اپنی صلاحیتوں کا اندازہ لگالو ——— اور زندگی میں کامیابی تمھاری منتظر ہے۔

عزم

یہ عزم ہے نہ کہ ذہانت ——— جو زندگی میں کامیاب ہوتا ہے۔

زندگی ——— اظہار

زندگی، مصوری اور شاعری کی طرح، یکسر اظہار سے عبارت ہے۔ محض فکر، جس کے ساتھ عمل نہ ہو موت (کی راہ) ہے۔

یہ بدلتا ہوا زمانہ

● ہم بدل گئے، زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی، رنج وراحت، عزت و دولت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی جدوجہد وہی ہے لیکن جد و جہد کا لطف باقی نہیں رہا۔ تصورات میں رنگینی باقی رہی نہ حرارت۔ عزائم میں نہ استواری ہے نہ برکت۔ مانا کہ موجودہ عہد کے مسائل اور مطالبات، کچھ اور ہی ہیں، فرائض اور ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن کوئی یہ بتائے، یہ کیسے فرائض ہیں جن سے دماغ میں روشنی، دلوں میں ولولے، ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا ہوتی ...... اور زندگی کی حرارت مفقود ہو چکی ہے،

●● عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بڑے کاموں کے لیے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔

اچھا مسلمان

اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لیے ان میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔

شخصیت

● آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔

●● شخصیت عطیہ الٰہی ہے جو ریاضت اور انتظار سے جلا پاتی ہے۔

●●● شخصیت کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ معمولی کو غیر معمولی بنا دے۔

تقدیر ساز

اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے گو والدین کی تقدیر بگاڑنے میں اولاد کا دخل بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔

آفرینندۂ عہد

وہ آفرینندۂ عہد تھے اس لیے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے ہوتی جو زائیدہ عہد ہوتے۔

سہارا

جو شخص ہارجیت میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نیابت صدر اور پھر صدارت

حکومت کیسی بھی ہو، آزادی اور تندہی سے قوم کی خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ موثر طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

دھوپ کے پھول

بعض پھول ایسے ہوتے ہیں جو سایہ سے زیادہ دھوپ میں اپنی پوری بہار دکھاتے ہیں۔

علم اور نااہل عالم

● علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے۔ کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو۔

●● علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک ہیں۔

●●● اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں جو صرف علم کا بیوہار یا بیوپار کرنا جانتے ہیں۔ علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے۔

موت کی ضرورت

اس دنیا میں موت بھی کتنی سستی، یقینی، ہر جگہ، ہر وقت آسانی سے مل جانے والی چیز ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی کی طرح یہ بھی ہر جاندار کے لیے کتنی ضروری ہے!

موت کی شکست

اگر انسان موت کو تسخیر نہیں کر سکا ہے تو موت بھی انسان کے ان کارناموں کو نابود یا بے نور نہیں کر سکی ہے جو موت سے زیادہ عجیب و عظیم مانے گئے ہیں۔ وہ انسان کو تسخیر بھی کس طرح کر سکتی ہے جب انسان سوا ازلی و ابدی ہونے کے ان صفات سے بھی کسی نہ کسی درجہ میں متصف ہے جو خدا کے ہیں ــــ اور کیا معلوم بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان خدا میں ازلی اور ابدی بھی ہے۔

موت مامور و مجبور ہے وہ کتنا ہی چاہے اپنے کو بدل نہیں سکتی۔ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ توفیق الٰہی اور استعداد انسانی کے مطابق اپنے کو بہتر و برتر بنا سکتا ہے۔ لامتناہی حد تک بہتر و برتر۔ موت کی یہ شکست مسلم ہے۔ انسان موت کے ہاتھ میں کھلونا نہیں ہے۔ ہم میں ایسے اکابر گزرے ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی آتے رہیں گے جن کے ہاتھ میں موت کی حیثیت کھلونے کی رہی ہے۔ انسان اپنی شکست میں زندہ رہتا ہے!

کوئی نہ کوئی کمی

زندگی میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے اکثر محسوس ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور روکھا پھیکا۔ کوئی ہنسنے ہنسانے والا ہوا تو یہ محسوس ہوا کہ اس میں گنوارپن بھی ہے۔ کوئی عالم فاضل ہوا تو اس میں نخوت، تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی نہ کسی حد تک پائی گئی۔ اللہ والے ملے تو انھیں دنیا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر یزداں کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت اور عظمت کا تو قائل ہوتا...

مشن کی دریافت

ہر شخص کسی نہ کسی وظیفہ، عبادت یا مشن کے لیے خلق کیا گیا ہے جس کے مطابق اس میں استعداد ودیعت کی گئی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنا مشن یا اپنی عبادت دریافت کرے اور اسے پورا کرے۔ اسی عبادت میں اس کی نجات مضمر ہے!

شرافت، خوشدلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے

مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقائد کی خانہ پری کر کے اعمال کی طرف سے بے فکر

ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات نہیں سمجھنا چاہتے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقائد و عبادات کو خدمتِ خلق کے رستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھے گا۔ عقائد اور اعمال کو یہ لوگ علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا فرمان اور منشا علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں نہیں بٹا ہے۔ دنیا کیا چیز ہے، زندگی کا کیا مقصد ہے، انسان کیوں پیدا کیا گیا، مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ ان باتوں نے مجھ میں کبھی تجسس پیدا کیا نہ تشویش۔ شرافت، خوشدلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے! انسان انسان ہی نہیں خدا بھی ہے۔ اس کو دوسروں پر نہیں اپنے اوپر خدائی کے لیے خدا نے بھیجا ہے اس لیے انسان مجبور نہیں مختار ہے۔ مختار اس کو نہیں کہتے کہ جو چاہے کر ڈالے۔ مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعدادوں کو پورے طور پر اور آخر تک بر سرِ کار لا سکے خواہ وہ استعداد معمولی ہو یا غیر معمولی۔ اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو!

تن آسانی

مجھے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور تن آسانی کی زندگی پسند نہیں۔ یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اس قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا شاق ہوتا ہے۔

کام کا نشہ

کام زبردست نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر طرح کے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں۔

اچھی گفتگو

اچھی گفتگو پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا کرتی۔

ایک تمنا

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنا رہی۔ میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجتمند کی اپنے حوصلہ یا اطمینان کے مطابق مدد کر سکتا یا میرا ایسا کوئی دولتمند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر سے پورا کر دیتا۔

مقتدی اور امام

ہندستانی مسلمانوں میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے ہیں۔ وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے جتنے جانماز کے! وہ بیماری کو علاج صبر و پرہیز سے دور کرنے کے بجائے اس کو پروپگنڈا بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے ہیں۔

دربارداری

مجھے درباداری سے سخت نفرت ہے۔ درباداری کے وہ لوگ محتاج ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں، اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو کرایہ کے قصیدہ خواں اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں۔

لگن

جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدہ، ارادہ، مقصد یا شخصیت کا احترام اور اس سے بےلوث شغف نہ ہوگا آپ اپنے لیے کسی مصرف کے رہیں گے نہ کسی دوسرے کے لیے۔

نامۂ اعمال

آدمی فرشتوں ہی کے لکھے پر نہیں پکڑا جاتا، اپنے لکھے پر اور زیادہ پکڑا جاتا ہے ——— اور کیا معلوم فرشتوں کا نام کس مصلحت سے لیا جاتا ہے، ورنہ دراصل ہمارا نامۂ اعمال ہمارے سوا کوئی دوسرا لکھ ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ صرف فرشتہ ہو!

مذہب

مذہب کو روزی کمانے، جہالت پھیلانے، اور فتنہ اٹھانے کا وسیلہ بنانے کے بجائے فہم و بصیرت حوصلہ مندی اور انسانیت دوستی کا محرک اور ترجمان بنانے پر زور دینا . . .

تباہی اور تلافی

ہر تباہی اپنی تلافی بھی ساتھ لاتی ہے۔ اتنی بڑی تباہی اتنا ہی بڑا شخص پیدا کر سکتی تھی۔

مطلق العنان آزادی

محکومی میں غلامی کو بدنصیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ لیکن آزادی میں مطلق العنانی تو لعنت محض ہے۔

شرمائیے مت

فنون لطیفہ اور اس کے عوارض و عواقب کو اگر اسلامی شریعت نے زندگی میں وہ اہمیت یا وقعت نہیں دی ہے جو آج کی دنیا دے رہی ہے تو شرمانے کی ضرورت ہے نہ معذرت خواہ ہونے کی۔ مسلمان جن فرائض مہمہ اور عزائم حسنہ کے تقاضوں میں جکڑا ہوا ہے وہاں سے فرصت کار و بار شوق کے۔ یا کے شور سودائے خط و خال کہاں!

زیادہ سونا

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا نحوست اور بدتوفیقی ہے۔ یہ حرکتیں صرف مریضوں کے لیے روا رکھی جا سکتی ہیں۔

...نیا اور اس کے کاروبار اتنے دلکش ہیں اور ہر آن انسان کو بہتر اور بدتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے ہیں کہ
...رنے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کر سکتا۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعل عبث ہے۔ دنیا کو دیکھنے اور برتنے
...ا جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی سونے پر آمادہ نہ ہو۔

...دا کا مقصد

خدا کا مقصد نہ جنت دوزخ ہے، نہ ہم تم۔ وہ خود مقصد ہے!

...بچہ کی عاقبت

بچہ اپنی عاقبت شاید ہی ساتھ لاتا ہو۔ اکثر و بیشتر اس کے والدین اپنی عاقبت بچے کے سر منڈھ دیتے ہیں۔

...اصد جلیلہ کی زندگی

انسان کی زندگی اس کے مقاصد جلیلہ کی زندگی سے کم ہوتی ہے۔ وہ کتنی طویل عمر کیوں نہ پائے بالآخر مرے گا۔
...ے مقاصد کی بھی زندگی ہوتی ہے لیکن ہوتی ہے ہماری آپ کی زندگی سے علیٰحدہ، جس پر کبھی موت نہیں
...ری ہوتی۔

...ن دوستی

انسان دوستی بغیر وطن دوستی ایک واہمہ، اور وطن دوستی بغیر انسان دوستی ایک مغالطہ ہے۔

...ذکو چھونے کا قصہ پھول پی جانے کی بات

کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سرزد نہیں ہوئی اس کے لیے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

...ی زبان

کوئی زبان بدیسی نہیں اگر وہ دیس کے کاموں کے لیے مفید و کارآمد ہو۔

...یب و شرافت

اب محسوس کرتا ہوں تہذیب و شرافت بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت؛ اسی لیے ذمہ داری ہے۔

...ب کی عملی شکل

اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔ مذہب سے علیٰحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جن کی
...بالعموم بخیر نہیں ہوتی۔

...ت حیات

مدت حیات کا حساب کتاب سال اور ماہ گزرنے سے نہیں کرتے، عزیزوں کی مفارقت سے بھی کرتے
...ے [illegible] زندگی سے اتنی عبارت نہیں

ہوتی جتنی عزیزوں کی زندگی اور خوشی سے ہوتی ہے۔

ناگزیر

وہ اتنے اچھے تھے، اتنے ارزاں اور اتنے ناگزیر!

دنیا اور عقبیٰ

اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لیے جس احساسِ ذمہ داری اور احترام انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پورا کر سکتے ہیں جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی ذمہ داریوں کو بھی سمجھنے اور نباہنے کی توفیق نہیں رکھتے۔ دنیا و عقبیٰ، زمان و مکان زندگی ہی کے دو رخ ہیں اور انسان کے نتائجِ اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے ... جو شخص دنیاوی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا وہ عقبیٰ میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مذہبی سیاست

ادھر کچھ عرصے سے ہمارے طبقہ میں جس نا اہل کو نفع یا نمود کی کہیں گنجائش نہیں نکلتی وہ اس مقصد کے لیے مذہب کو آلہ بنا کر ملک و ملت کا محسن بن جاتا ہے۔

موت

زندگی کا یہی دستور چلا آ رہا ہے اور رہتی دنیا تک اس میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ دنیا کا کاروبار اور آپس کا نفع نقصان اتنا پیچیدہ اور پھیلا ہوا ہے اور پیٹ پالنے، جان بچانے، عزت پانے، لذت اٹھانے [illegible] اور روزمرہ کے معمولات ادا کرنے کا جذبہ اتنا قوی اور عالمگیر ہے اور ان کی ہمہ وقت اتنی دیکھ بھال رکھنی [illegible] ہے یا وہ ہمہ وقت ہماری اتنی دیکھ بھال رکھتے ہیں کہ ہم کسی حادثے کو اپنے اوپر زیادہ دیر تک مسلط نہیں [illegible] اور رکھ بھی نہیں سکتے۔ دنیا کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ وہ موت کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ثابت نہیں ہونے دیتی بلکہ زندگی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام بناتی ہے، ایسا انعام جو ہر محرومی کی تلافی کرتا [illegible] ایسا انعام جو بے بود اور غیر متعین ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عالم اور عامی کے دلوں کو مسخر کیے ہوئے ہے زندگی کی ہما ہمی اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ کوئی شخص موت کے عمل دخل پر زیادہ دیر تک غور کر سکے!

- آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دے سکتے تھے وہ نہ دے سکے۔ غم اسے ہو جس نے ایسا [illegible] نہ دیا۔ جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا آپ نے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے۔ جب آپ کو یا مجھے کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول [illegible] ہمارا کیا قصور۔ اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو زندگی کی مہم میں فتح ہماری رہی!

مجھے تو اس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا۔ فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہوگیا تو اس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا اور کہا: بارِخدایا! خشکی ختم ہوگئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے ... اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا بھی یہی معاہدہ ہوتا ہے!

کردار

● وہ اپنے الطاف و اکرام کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار کے ساتھ پہلے ہی بار ہر اس شخص پر لگا دیتے تھے جس کو اس کی ضرورت ہوتی!

●● دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہوتے ہیں!

●●● زندگی اپنا چولا افراد میں بدلتی ہے جماعت میں نہیں!

●●●● انھوں نے اپنے نفس کا اعتماد کچھ اس طرح حاصل کر لیا تھا کہ وہ اس کی آسودگی کے لیے کچھ کریں یا نہ کریں وہ ان سے راضی اور خوش رہتا۔ آخر آخر میں تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ان کے نفس نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہو۔

سکندر علی وجد

اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط

لاہور۔ ۹؍جون ۱۹۳۶ء

جنابِ من ۔ آپ کا خط مع اشعار مل گیا ہے۔ بہت بہت شکریہ قبول فرمائیے۔ جو مضامین آپ میری کتابوں پر لکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ۔ تنقیدی مضامین کے لیے ہر شخص آزاد ہے۔ البتہ میں آپ کو اتنا مشورہ دوں گا کہ مضمون لکھنے سے پہلے آپ ان کتابوں کو بغور تمام پڑھیں تاکہ آپ کو مصنف کے حقیقی مقاصد سے آگاہی ہو۔ ہندوستان میں عام طور پہ اُدَبا کو زمانۂ حال کے فنِ تنقید کے اصولوں سے واقفیت حاصل نہیں ہے ، اس واسطے یہ بھی مفید ہوگا کہ آپ انگریزی میں چند مشہور اور مستند کتابیں پڑھیں۔ ان کے طرزِ بیان اور اندازِ تنقید سے آگاہی حاصل کریں ۔ اگر آپ ان کے اصولوں اور ان کے اسلوبِ بیان کو اختیار کر سکیں تو یہ بجائے خود اردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی ۔ والسلام

محمد اقبال

جناب سکندر علی وجد بی۔ اے (عثمانیہ)
ویجاپور دکن
پوسٹ منارڈ

VIJAPUR(DECCAN)

دیویندر پرشاد سکسینہ

مشاہیر کے چند غیر مطبوعہ خطوط

مارچ ۱۹۳۴ء میں سورگیہ منشی دیا نراین نگم مدیر "زمانہ" کانپور نے سر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کی چائے نوشی کی دعوت کی تھی۔ جگر بریلوی اور جوش ملیح آبادی بھی اس میں مدعو تھے۔ بعد چائے نوشی شعر خوانی شروع ہوئی۔ جوش صاحب نے ایک چھوٹی سی نظم پڑھی۔ اس کے بعد جگر بریلوی نے اپنی مثنوی "پیام ساوتری" سے وہ چند اشعار پڑھے جو ساوتری کے حسن و جمال کی تعریف میں ہیں۔ چیف جسٹس صوفے پر بیٹھے تھے جب آپ نے یہ بیت پڑھی ؎

دکھلاتی تھی جسم میں جوانی
مینا میں شرابِ ارغوانی

پانچ سات بار یہ آپ سے پڑھوائی۔ آپ اس انداز سے داد دے رہے تھے معلوم ہوتا تھا سارے جسم میں حظ و انبساط کی بجلی دوڑی ہوئی ہے۔ سر شاہ سلیمان کے ایک انگریزی خط کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے جگر صاحب کو لکھا ہے :۔

(۱)

الہ آباد
۳۱ رمئی ۱۹۳۴ء

مائی ڈیر شام موہن لال صاحب

مارچ گزشتہ میں منشی دیا نراین نگم کے مکان پر آپ کی بہترین نظم کے اقتباسات سننے بڑی مسرت مجھے حاصل ہوئی۔ مشکل سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ میں ان کی جمالیاتی خوبی اور کیفیت سے بہت بلند پایہ رفعت پر متاثر ہوا۔

ان تعطیلات (دیوالی) میں دو کتابوں میں بہت مصروف ہوں لیکن جولائی آیندہ میں اپنی

رائے جیسے ہی مجھے مسرت حاصل ہوگی۔

آپ کا مخلص

شاہ محمد سلیمان

رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی نے ڈپٹی کلکٹری سے سرکاری ملازمت شروع کی۔کئی اعلیٰ منصبوں پر فائز رہے آپ کی دو کتابیں جو انگریزی زبان میں بہت مشہور ہیں۔ ایک ہسٹری آف اردو لٹریچر اور دوسری یورپین اینڈ انڈو یورپین پوئٹس آف اُردو۔ پہلی کتاب بی۔اے کے نصاب میں ہے دوسری پر آپ کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ جگر صاحب بریلوی نے آپ سے ملاقات ہونے کا حال اپنی غیر مطبوعہ خود نوشت مفصل سوانح عمری میں یوں لکھا ہے :۔

"رائے بہادر ڈاکٹر رام بابو سکسینہ بریلی میں رہ چکے تھے یہاں میرے خاندانی [illegible] ہو چکے تھے۔ علم دوست اور خود مصنف [illegible] کے ناتے میرے علمی مشاغل سے [illegible] ضلع الہ آباد میں نائب تحصیلدار [illegible] ء میں آپ وہاں کے حاکم پرگنہ تعینات [illegible] لیتے ہی آپ نے مجھے الہ آباد بلا [illegible] آپ خوش ہوں گے کہ میں آپ کا حاکم [illegible] ہاں ہوں کردی۔ اس خوشی [illegible] نہ ہو سکا جس کی انھیں توقع تھی۔ [illegible] ترغیب تھی کہ جب تحصیل میں آتے [illegible] مجھے بُلاتے۔ کچھ ادبی گفتگو [illegible] دن دوران گفتگو میں آپ نے فرمایا۔ آپ کچھ اس خیال کے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ

"رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

میں نے کہا۔ تھا تو نہیں۔ زندگی کے تجربات نے ایسا بنا دیا ؎

قسمت سے داغ سینہ بنے اس کو کیا کریں
خونِ جگر میں رنگ بہت تھے بہار کے

آپ نے اس کی صراحت چاہی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنی نامراد زندگی اور ملازمت کی تلخیوں کی سرگزشت سنائی۔ خلوص اور ہمدردی کے جوش میں آکر میز پر ہاتھ مار کر فرمایا "میں دیکھوں گا نامزدگی کا وقت آنے دیجیے لیکن ؎

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

تحصیلداری میں نامزدگی کا وقت آنے سے دو تین مہینے پیشتر ہی اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف پبلسٹی ہو کر نینی تال چلے گئے۔"

میرے پاس رام بابو سکسینہ کے پندرہ خطوط محفوظ ہیں۔ یہ انگریزی زبان میں ہیں۔ حضرت جگر بریلوی کے نام تین انگریزی خطوط کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

پوپس ولا۔ نینی تال
۱۱ جون ۱۹۵۶ء

مائی ڈیر جگر صاحب

آپ کے جون ۱۹۵۶ء کے نامۂ عطوفت و محبت کا بہت بہت شکریہ اور قطعہ کے عطیہ کا بھی۔ میرے ... خیر مقدم کا باعث ہے اس لیے کہ آپ نے ایسے وقت لکھا جب آپ بہترین صحت میں نہیں ... شوق سے اسے دل میں جگہ دوں گا اور اس کی قدر کروں گا۔

... "آج کل" میں آپ کی مثنوی "پیام ساوتری" پر تعریفی تنقید بڑی دلچسپی سے پڑھی۔ میں اسے ... ایک جواہر سمجھتا ہوں اور آپ کا شاہکار۔ اپنی کتاب جدید اردو ادب میں اس پر ...

... آمیز تعظیم اور دوبارہ شکریہ قبول ہو۔

آپ کا بندۂ محبت
رام بابو سکسینہ

(۳)

۱۱ مال روڈ۔ آگرہ
۲ جنوری ۱۹۴۳ء

مائی ڈیر جگر صاحب

آپ کا خط ملا۔ آپ کے اس اندوہناک[۱] حادثہ سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا اور رنج ہوا۔ اس جانکاہ ... دل خراش غم میں میرا دل آپ کے ساتھ ہے۔ یا کوئی اور شخص کیا کہہ سکتا ہے۔ الفاظ آپ کے اس ... ہماری غم میں کوئی تسکین نہیں دے سکتے۔ سوا ضبط کے ہم کو چارہ نہیں۔ ہماری ناہموار زندگی ان مصائب سے معمور ہے۔ بس مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔ پروردگار آپ کو تسکین کا مرہم

---

[۱] جگر صاحب کے بڑے نوجوان بیٹے کا انتقال

اور ذاتی مرحمت فرمائیے۔

ایسی حالت میں بہتر ہے تو یہی کہ ادب میں زیادہ مشغولیت ہو۔ آپ اپنے اعلیٰ تصنیف کا کام انہماک کے ساتھ تکمیل کو پہنچائیں۔

بحیثیت ایک بلند پایہ شاعر و مصنف کے آپ کی ایک مستقل جگہ ہے۔ ادبی تخلیق ہی وہ چیز ہے جو اس مختصر زندگیوں اور بے ثباتیوں کی دنیا میں قدر و قیمت رکھتی ہے باقی سب ہیچ۔

میں اس دن کا منتظر ہوں جب آپ سے مل سکوں۔

التفات آمیز تعظیم کے ساتھ

آپ کا شریک غم
رام بابو سکسینہ

(۴)

گورنمنٹ یونائیٹڈ پراونس
سول سکریٹریٹ
پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ

مائی ڈیر جگر صاحب

آپ کے نامۂ عطوفت و محبت کا بہت بہت شکریہ ابھی تک ڈاکٹر تاراچند کا[1] مجھے کوئی جواب وصول نہیں ہوا ہے مگر میں آپ کو مطبوعات کی ایک فہرست بھیج رہا ہوں جس سے آپ کا کام چل جائے گا۔ ہر ایک کے نام سے اس کا موضوع ظاہر ہو جائے گا۔

یہاں حالات جلد جلد بدل رہے ہیں۔ میں بحیثیت ڈائرکٹر کام کرتا رہوں گا لیکن کسی کو اعتماد نہیں ہو سکتا جی جان سے چاہتا ہوں کہ آپ میرے قریب ہوتے میں ایک ہم جنس روح کی ہمدردی محسوس کرتا اور ادب تہذیب کی فضا کا والہانہ طور پر لطف اٹھاتا مجھے ایک ڈپٹی ڈائرکٹر بابو سیتلا سہائے دے دیے گئے ہیں۔ ہندی کے یہ دفتر کانگریس کے سکریٹری ہیں اور اردو کے لیے کسی دوسرے شخص کے تقرر کا انتظار ہے جو غالباً مسلمان ہوگا اور جہاں تک میرا خیال ہے کانگریس نزیق کا ہی آدمی ہوگا۔ خیر کیا میں آپ کا ہمنوا ہو کر کہہ سکتا ہوں ؎

ناکامیاں نوشتۂ تقدیر ہی سہی
کٹتی نہیں ہے عمر تمنا کیے بغیر

میرے ساز دل کا ایک ایک تار اس کا ہم آہنگ ہے۔ ہماری امیدیں آغوش ناکامی میں پرورش پاتی

[1] ممبر پارلیمنٹ اور مشہور مورخ

ہیں کیسی امیدیں آہ! ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جب بھی آپ لکھ سکیں یا لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہو مجھے خط ضرور لکھیے۔ ان خوابوں میں محو ہو جانے سے مجھے عشق ہے۔ یہ وہ خواب ہیں جو میری سمجھ میں زندگی سے زیادہ حقیقت دار ہیں اور یقیناً رذالت و دنائت کی زندگی سے پاکیزہ تر ہیں ایسی زندگی سے جو یکسر بے لطف ہے اور سفاہت سے معمور۔

آپ کا مخلص،

رام بابو سکسینہ

نیاز فتحپوری کا شمار اردو ادب کے محسنوں اور معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کے مکاتیب کا ایک ایسا مجموعہ شائع ہونا چاہیے جو انھوں نے اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو لکھے ہیں۔ میرے پاس (۸) نیاز فتحپوری کے پچاس سے زیادہ مکاتیب محفوظ ہیں۔ حضرت جگر بریلوی کے نام کے چھ خطوط ملاحظہ فرمائیے۔

"حدیث خودی" میں جگر صاحب رقمطراز ہیں:

"میری غزلیات زیادہ تر رسالہ "نگار" میں شائع ہوتی رہی ہیں اس کے اڈیٹر حضرت مولانا نیاز فتحپوری ان کے رنگ سے واقف ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں انھیں میں نے لکھا کہ میری خاطر یا ادب نوازی کی خاطر میری غزل پر آپ مقدمہ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ انھیں اس سے لکھا کہ میرا خیال ہے ان کی تحریر کو کوئی پروپیگنڈا نہ سمجھے گا جواب آیا مجموعہ بھیج دیجیے ضرور اس پر لکھوں گا۔ مجموعہ بھیج دیا گیا جو چار پانچ مہینے ان کے پاس رہا۔ اس اثنا میں مقدمات کی رسم میری نظر میں بہت مبتذل معلوم ہونے لگی۔ میں نے طے کر لیا کہ میری غزل بغیر کسی تمہید کے شائع ہوگی نیاز صاحب سے مجموعہ واپس منگا لیا۔" اس خط کی شان نزول یہ ہے خط ملاحظہ فرمائیے

(۵)

کار لٹن ٹک۔ لکھنؤ

مکرمی

حد درجہ نادم ہوں کہ اب تک تعمیل ارشاد نہ کر سکا اور نہ جلد اس کی توقع ہے۔ کچھ دنوں سے بعض ایسی الجھنوں میں مبتلا ہوں کہ دل و دماغ ٹھکانے نہیں میری خود تمنا تھی کہ مقدمہ لکھتا، وہ تمنا ہی کیا جو پوری ہو جائے۔ آپ نے نگار کے جن پرچوں کا مطالبہ کیا ہے افسوس کہ پورا نہیں کر سکتا۔ کوئی زائد پرچہ اُن شاعروں

کا موجود نہیں۔

نیاز

جگر صاحب نے رتن ناتھ سرشار پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے سلسلے میں ڈاکٹر لطیف حسن ادیب بریلوی کی مدد حاصل کرنے کے لیے نیاز فتحپوری کو ایک خط لکھا تھا یہ خط اس کے جواب میں ہے۔

(۶)

دفتر نگار

۱۷ دسمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی تسلیم۔ سرشار پر مقالہ لکھنے کے لیے سب سے پہلے سرشار کی تمام تصانیف حاصل کرنا چاہیے اور لکھنؤ آکر اودھ اخبار اور اودھ پنچ کے فائل دیکھنا چاہیے۔ یہاں کے بعض معمر اہل قلم سے ملنے کی ضرورت ہے۔ آپ کے دوست شوق سے تشریف لائیں جو رہبری میرے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کروں گا۔
آپ کی غزل پڑھ کر دل خوش ہو گیا انشاءاللہ "نگار" میں شائع ہوگی۔ کبھی کبھی یاد فرماتے رہیں۔

نیاز

(۷)

جگر صاحب نے اپنی نظم "فریاد بشر" "نگار" میں شائع ہونے کے لیے بھیجی یہ خط اس نظم کے سلسلے میں ہے:-

نگار۔ لکھنؤ

۶ مئی ۱۹۵۴ء

تسلیم۔ نظم "فریاد بشر" مل گئی خوب ہے لیکن اس کی اشاعت مناسب نہیں معلوم ہوتی اس لیے نہیں کہ نظم میں کوئی کمی ہے بلکہ محض اس لیے کہ اس درس کے سننے کا سلیقہ اب کسی کو حاصل نہیں۔ ممکن ہو تو دو چار غزلیں بھیج دیجیے۔

نیاز

(۸)

یہ خط مثنوی "پیام ساوتری" کے سلسلے میں ہے:-

لکھنؤ۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء

مکرمی۔ والانامہ اور "پیام ساوتری" دونوں کا شکریہ۔ مثنوی جستہ جستہ دیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی

شاعری کا عروج و کمال اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ستمبر کے پرچہ میں ریویو ہوگا۔ آپ کی غزل شائع ہو چکی ہے۔
نیاز

(۹)

نگار لکھنؤ

۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء

مکرمی۔ گرامی نامہ کا شکریہ۔ "پیام ساوتری" پر عطاء انعام کی خبر مجھے اخباروں سے معلوم ہو گئی تھی۔ "پیام ساوتری" اور آپ کی غزل گوئی پر جو مقالے مجھے ملے تھے وہ بالکل نامکمل و تشنہ تھے۔ اس لیے ان کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ "نگار" میں ایسے مبتدیانہ مضامین شائع نہیں ہوتے۔ نظریے کے اختلاف کا کوئی سوال نہیں بلکہ کسی بات کو سلیقے سے کہنے کا سوال ہے اور یہی چیز ان مضامین میں نہیں پائی جاتی آپ کی شاعری کا میں بڑا معترف ہوں اس لیے میں اس پر کوئی مضمون ایسا چاہتا ہوں جو حقیقتاً آپ کی شاعری کی عظمت کو ظاہر کردے۔
نیاز

(۱۰)

لکھنؤ

۲۹ نومبر ۱۹۵۶ء

مکرمی۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ اگر کبھی دہلی جانا ہوا تو کوشش کروں گا کہ ایک دن کے لیے میرٹھ میں آپ کے پاس قیام کروں۔ خدا آپ کو صحیح و تندرست رکھے۔ آپ کی ذات سے اس وقت ہماری کلاسیکل شاعری کی آبرو قائم ہے۔
نیاز

(۱۱)

نگار بلڈنگ۔ لکھنؤ

نیاز نواز

کرم نامہ کا شکریہ۔ اسمٰعیل میرٹھی پر آپ کا مضمون یقیناً شائع ہوگا لیکن مارچ یا اپریل سے پہلے ممکن نہیں کیونکہ دسمبر کا پرچہ شائع ہو گیا اور جنوری فروری کا مشترکہ نمبر سالنامہ ہوگا جو وقف ہے "انشائے لطیف" کے لیے
امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔
نیاز

جناب تلوک چند محروم کی وفات سے اردو ادب کا ایک ستون گر گیا۔ آپ کے پندرہ مکاتیب میرے پاس محفوظ ہیں۔ حضرت جگر بریلوی کے نام کے دو مکاتیب ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱۲)

[illegible]

راولپنڈی

۲۹ر دسمبر ۱۹۴۴ء

مکرمی نمستے

امید کہ کارڈ مل چکا ہوگا۔ بہت سا ایسا کلام جو رسائل و اخبارات میں شائع ہو چکا ہے لیکن کتابی صورت میں نہیں آیا موجود ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ ارسال ہے۔ امید کہ لاہور سے کتب مل چکی ہوں گی۔ جگن کو میں نے تاکید اً لکھ دیا تھا لیکن چونکہ وہ امتحان میں مصروف تھا جلدی نہ بھیج سکا۔ اگر اب تک موصول نہ ہوئی ہوں تو آپ ایک کارڈ اُسے لکھ دیں پتہ غالباً آپ کو معلوم ہے کیونکہ اس نے ایک عریضہ آپ کو لکھ دیا تھا۔

اکبر اور اقبال کی رائیں منسلکہ اشتہار "کلام محروم" میں درج ہیں ملاحظہ فرمائیں اس کے علاوہ "گنج معنی" میں اکبر کی ایک رباعی ہے اور اس پر میرا جواب بھی۔

گیتا کے بعض حصص کے ترجمے۔ اپنشد کے بعض مقامات اور وید منتروں کے منظوم ترجمے بھی ہیں افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث وہ شامل نہیں کر سکا۔ اگر ان کی ضرورت ہو تو تحریر فرمائیں بلا اختصار بھیج دیے جائیں گے۔ فارسی اشعار پر تضمینیں بھی رہ گئی ہیں۔

بعض رسائل مثلاً "زمانہ"، "ادبی دنیا"، "شاہکار"، "سہیل"، "ریاست" دہلی "چندن"، "رہنمائے تعلیم" وغیرہ میں محروم اور کلام محروم پر مضامین شائع ہوئے وہ جگن نے کسی خاص مقصد کے لیے میرے پاس محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اگر چاہیں تو ان میں سے اوراق متعلقہ نکال کر بھیج دوں لیکن آپ کو انھیں واپس بھیجنے کی تکلیف فرمانا ہوگی کیونکہ جگن کی امانت ہے اور اس کی تاکید ہے کہ ضائع نہ ہو۔

کوئی تین سال ہوئے "نگار" لکھنؤ کے "شاعر نمبر" کے لیے نیاز نے مجھ سے حالات اور انتخاب کلام طلب کیے تھے معلوم ہوا کہ وہ "نگار" میں شائع ہوئے وہ پرچہ مجھے نہیں ملا۔ امید کہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا اگر اتفاق نہ ہوا ہو تو بہتر ہوگا اگر دفتر "نگار" سے عاریتاً منگوا کر دیکھ لیں۔ ان کاغذات کی رسید سے مطلع فرمائیں۔

امید کہ مزاج مبارک بخیر ہوں گے۔

نیاز مند

تلوک چند محروم

(۱۳)

تیج "ڈیلی (Daily)"

۲۷ر فروری ۱۹۴۸ء

کرم فرمائے محترم۔ تسلیم و نیاز

"تینوں چیزیں موصول ہوئیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ میں جناب کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں" حمد" میں آپ کی جدت قابلِ رشک ہے۔ ذاتِ باری کا اعتراف اس سے بہتر اور کمتر الفاظ میں ناممکن ہے۔ اسے "تیج" کے جوبلی نمبر کے لیے رکھ دیا ہے۔ مثنوی بھی اس نمبر میں جائے گی۔ غزل ویکلی میں شائع کروں گا۔

"تیج" اب آپ کی خدمت میں باقاعدہ حاضر ہوتا رہے گا۔

آپ کے ہمدردانہ جذبات کا شکریہ۔ جگر صاحب اس انقلاب نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ ایشور کا شکر ہے جان اور عزت سلامت لے کر نکل آئے۔ ورنہ ہزاروں نہیں لاکھوں ایسے ہیں جنھیں　　　کے علاوہ جان اور آبرو بھی مغربی پنجاب اور سرحد میں گنوانی پڑی۔

سچ ہے مصیبت تنہا نہیں آتی یہاں پہنچ کر میری صحت بھی بگڑ گئی، کچھ بحال ہو رہا تھا کہ ۱۹ کی صبح کو باولے کتے نے کاٹ لیا۔ علاج انجکشن کرا رہا ہوں، ایشور کی دیا سے شفا ہو جائے گی۔ ع۔

چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

نثر کے مضمون کا منتظر رہوں گا۔

آپ ایک تذکرہ شعرائے ہنود کا لکھ رہے تھے اس کا کیا ہوا۔

عزیز موہن ناتھ نمستے عرض کرتا ہے۔

نیاز مند
تلوک چند محروم

(۱۴)

من موہن لال شمیم کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا مجموعہ "مکاتیبِ شمیم" میرے پاس محفوظ ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت فانی بدایونی، حضرت جگر بریلوی اور ڈاکٹر محمد اسحٰق کے نام خطوط شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ حضرت جگر بریلوی کے نام کے دو خطوط ملاحظہ فرمائیے۔

بریلی۔ یکم اگست ۱۹۲۱ء

گرامی نامے کے جواب میں بہت دیر ہو گئی ہے اور مجھے خود اس کا احساس ہے مگر کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ میں فرصت کا وقت نہ نکال سکا۔ اس اتوار سے پہلے والا اتوار جواب کے لیے مخصوص کر دیا تھا مگر سنیچر کی شب میں مُنّمُن ہیضہ میں مبتلا ہو گیا اور مسلسل دو تین روز اس کی تیمارداری میں مصروفیت رہی، شکر ہے وہ اب اچھا ہے۔ میں تحسین و آفریں کی نیازمندانہ نیاز[1] پیش کرنے کے لیے بے چین تھا اور یقین ہے آپ بھی بہت بے صبری سے میری حقیر رائے کا انتظار کرتے ہوں گے۔ نظم خود کہہ رہی ہے کہ آپ نے نہایت کاوش اور عرق ریزی

---

[1] پپیہا اور پی کہاں

ے اس کو تیار کیا ہے اور آپ اس پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ حقیقت میں تو اس قابل بھی نہیں کہ کما حقہ اس
تعریف و توصیف بھی کر سکوں۔ کسی بدنصیب مہجور کے دل میں جو جذبات کسی دردانگیز تحریک سے پیدا ہو سکتے
یں ان کی تصویر کھینچنے میں آپ نے کمال کیا ہے۔ میری رائے میں مسلسل اور نیچرل نظموں میں اردو شاعری اس
ے بہتر رنگ ابھی تک پیدا نہیں کر سکی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آمین۔ چھٹا بند خوب ہے اور نہایت
ب ہے۔ سبحان اللہ ؎

کاش زاہد پر بھی کھل جائے ترا رازِ فغاں
نعرۂ ہو کھینچ کر دکھلائے اعجازِ فغاں

مگر اس بند کے تیسرے شعر میں پروانگی آپ نے جن معنوں میں استعمال کیا ہے غالباً وہ صحیح نہیں۔ آپ
ے پروانہ سے اسم بنایا ہے اور سوز و گداز کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ پروانگی کے معنی دراصل اجازت کے ہیں اور
الباً اس پروانہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنی حکم یا رقعے کے ہیں۔ مثلاً قرقی کا پروانہ کسی شاعر کا شعر ہے ؎

گرم ہے بزم تو ہو پروانگیٔ بزم بھی ہو
ہم بھی ہیں شمعِ تجلی تیرے پروانوں میں

یہاں پروانگی کے معنی اجازتِ باریابی بزم ہیں شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔
ساتویں بند میں "سر رسوائی محبوب" میں کچھ کلام ہے۔ سر بمعنی خیال غالباً اس طرح صحیح نہیں۔ فارسی تراکیب
ساتھ آتا ہے اور اسی طرح فصیح ہے۔ کم از کم سر کے ساتھ اردو فعل بھی لگا دینا جائز نہیں۔ غالباً حالی کی ایک رباعی ہے
میں فرماتے ہیں ؎

یہ قوم ذرا عاقبت اندیش نہیں
سودا تو ہے نوش کا سرِ نیش نہیں

آپ کے یہاں اور حالی کے یہاں طریقہ و محل استعمال مختلف ہیں۔
اسی بند کا آخری مصرع ملاحظہ فرمائیے :-

"اک صدائے سوز تھی سازِ فنا میں مل گئی"

صدا ساز میں ملتی تو ہے مگر یوں نہیں جیسے آپ نے ملایا ہے آپ نے ملنا بمعنی گم ہو جانا لیا ہے مگر ان معنوں
صدا ساز میں نہیں مل سکتی۔ اگر ملنا بمعنی ہم آہنگ ہو جانا ہوتا تو ٹھیک تھا جیسے گانے والوں کی آواز باجے
مل جاتی ہے۔
"نیرنگ" مل گئی ہے مگر جب آپ ... کو تشریف لائیں گے ہی تو آپ ڈاک کا احسان کیوں اٹھائیے۔

معرکۂ چکبست و شرر بھی منتظر ہے۔

مشتاق زیارت
منموہن لال

(۱۵)

محلہ ذکاتی
۶ مارچ ۱۹۲۵ء

خورشید ذرہ پرور تسلیم۔ آپ کی نوازش ہائے پیہم کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ یہ آپ ہی کی کریم النفسی ہے کہ مجھ کو منھ لگا رکھا ہے۔ ورنہ میں تو خط کے ذریعہ سے بھی لائق خطاب نہیں۔ ایک دو نہیں کم از کم آپ کے آٹھ دس خط آچکے ہوں گے لیکن یہاں خبر ہی نہیں ہوتی۔ بھلا کوئی بات ہے! آپ ایک شخص کو آوازوں پر آوازیں دیتے ہیں اور وہ ہم و بکم خموش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کو بجز دیوانگی اور کیا کہیے گا۔ بس اس پر قیاس کر لیجیے اور میری طویل طویل خاموشی کو نوع از جنوں سمجھ لیجیے!

یہ آپ اپنی گرانقدر نظمیں میرے پاس کیوں بھیج دیتے ہیں؟ یہی نہیں بلکہ مجھ سے "بنظر اصلاح" دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں! آخر اس ستم ظریفی کے کیا معنی ہیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ آپ ایک محروم بصارت سے تصویر کے پردوں کی دلکش رنگ آمیزی کی داد چاہیں یا کسی معذور سماعت سے سامعہ نواز نغموں سے لذت اندوز ہونے کی توقع رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تو شعر کے حسن و قبح کو سمجھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ آپ کے کلام کو "بنظر اصلاح" دیکھوں! مجھے شعر و سخن یا علم و ادب سے کیا واسطہ! مہینوں کیا برسوں گزر جاتے ہیں کہ کوئی کتاب ہاتھ میں اٹھانے کی نوبت نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ کبھی کوئی کوئی نظیر نکال لی یا شرع محمدی اور دھرم شاستر کے صفحوں کی ورق گردانی کر لی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اہل بریلی کو علمی صحبتوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ نہ مطالعہ ہے نہ مکالمہ پھر بتائیے کہ علم و ادب کا ذوق کیسے پیدا ہو اور کس طرح نشو و نما پائے۔ اس معاملے میں آپ قابل رشک ہیں کہ میدان ترقی میں نہایت تیزی سے قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ؂

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مرزا یاس دنیائے ادب میں بلند پایہ شخص ہیں لیکن خود ستائی اور تعلّی میں شوکت میرٹھی سے کسی طرح کم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی قابل اور تیز طبیعت ہیں۔ "موہنی کا تصور" مع مرزا یاس کے جواب ضرور بالضرور میرے پاس بھیجیے گا۔

"[illegible] کی رات" نہایت پاکیزہ اور پیاری نظم ہے اور شروع سے آخر تک نورٌ علیٰ نور۔ آپ کیسی غائر نظر سے فطرت کا مشاہدہ کرتے ہیں اس نظم سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

کچہری کا وقت بالکل قریب ہے۔ گیارہ بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ نہانا ہے کھانا کھانا ہے لہذا رخصت

بندہ
منموہن لال

(۱۶)

وحشیؔ کانپوری مرحوم کا ایک خط ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط حضرت جگرؔ بریلوی کے نام ہے۔

از کانپور۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی جناب جگرؔ صاحب تسلیم۔ میں دنیائے ادب میں گمنام رہنا چاہتا تھا کیونکہ شاعری کو میں نے حادثات زندگی سے پناہ لینے کے لیے مونس تنہائی بنایا تھا نہ کہ شاعر ہونے کے لیے۔ اس وجہ سے آپ کی تعمیل ارشاد میں تاخیر ہوئی۔ اب جناب ناشادؔ صاحب (کانپوری) کے شدید تقاضے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کچھ اپنا ناچیز کلام مع مختصر سوانح حیات کے ارسال خدمت کروں۔ میری خرافات کی جس میں غزلیں، رباعیات، نظمیں اور نوحے درج ہیں تین بیاضیں ہیں جن سے اشعار کا انتخاب کرنا میرے امکان سے باہر تھا اس لیے سب سے چھوٹی بیاض سے ایک یا دو اشعار ہر غزل سے لے کر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

میں نے سر تیج بہادر سپرو کے اصرار سے اس وقت تک کا کلام یکجا کر کے اس کا نام "سرود عرفاں" رکھا تھا اور ان کے پاس بغرض تقریظ بھیج دیا تھا مگر اس دوران میں وہ سخت علیل ہو گئے اور ارادہ بھی کس مپرسی کی حالت میں پڑ گئی لہذا وہ مجموعہ ویسا ہی رکھا ہے۔

نیاز مند
وحشیؔ کانپوری